اسلام اور سیاست

(پہلی جلد) قانون سازی

نماز جمعہ تہران کے خطبوں سے قبل تقاریر کا مجموعہ آیۃاللہ مصباح یزدی

مترجم: اقبال حیدر حیدری

مجمع جہانی اہل بیت علیہم السلام

فہرست مطالب

حرف اول ۱۰
پہلی تقریر ۱۳
اسلامی سیاست کے سلسلے میں چند اہم سوالات ۱۳
اسلام اور اس کا نظریۂ سیاست ۱۴
اسلامی حکومت کی حقیقت اور اس کے ارکان ۱۸
دوسری تقریر ۲۵
اسلامی نظریۂ سیاست پر بحث کی اہمیت و ضرورت ۲۵
اسلامی انقلاب کے ساتھ مغرب و مشرق کا رویہ ۲۵
جوانوں کے خلاف طویل المدت ثقافتی سازش ۲۷
تیسری تقریر ۴۴
دین میں سیاست کا مقام ۴۴
سلام کی ہمہ گیری اور اسلامی حکمراں کی حیثیت ۵۱
چوتھی تقریر ۵۷
دین میں سیاست کا مقام ۵۷

دنیوی اعمال و کردار میں دین کا رنگ......۶۴

دین اور حکومت میں رابطہ......۶۹

پانچویں تقریر......۷۳

اسلام میں آزادی......۷۳

پہلا حصہ:......۷۳

علم اور دین کے اپنے اپنے حدود......۷۴

دینی حاکمیت آزادی کے منافی ہے......۷۴

قرآن کے انداز بیان میں فرق کی وجہ......۷۸

چھٹی تقریر......۹۱

اسلام میں آزادی کا تصور......۹۱

ایک شبہ......۹۱

خدا کی نافرمانی کی تاریخ......۹۷

۶۔ خدا کی اطاعت اور آزادی......۱۰۱

ساتویں تقریر......۱۰۴

آزادی کا دائرہ......۱۰۴

اسلام کا سیاسی نظریہ اور آزادی پر پابندی کا غلط تصور...۱۰۴

آزادی کے بارے میں مختلف طرز فکر...۱۰۶

آزادی،نہ مطلق ہے،نہ دین پر مقدم... ۱۰۸

ہر معاشرے کے اقدار، معیارات اور مقدسات کی رعایت... ۱۱۱

آزادی کا نعرہ،ناجائز مقاصد...۱۱۳

آٹھویں تقریر...۱۱۹

حکومت کا ڈھانچا...۱۱۹

عنصری اور مصداقی تعریف کی اہمیت...۱۱۹

اسلام اور قوتوں کی تقسیم...۱۲۰

الف۔ قوۂ مقننہ...۱۲۱

ب۔ قوہ عدلیہ...۱۲۲

ج۔قوۂ مجریہ...۱۲۲

قوانین کی مختلف اقسام اور قابل تغیر قوانین بنانے کی ضرورت... ۱۲۵

قوانین کے اسلامی ہونے کا مطلب... ۱۲۸

اسلامی حکومت میں قانون سازی...۱۳۱

نویں تقریر ۱۳۵

دینی نظام میں قوانین کی حیثیت ۱۳۵

اسلامی سیاسی نظریہ کے اصول ۱۳۵

الف ۔ قانون ۱۳۵

طبیعی اور حکومتی قوانین کی حیثیت ۱۳۶

ب ۔ قوانین کے لئے الٰہی اور مذہبی سر چشمہ ۱۴۰

اسلام اور مسلمہ اصول کی معرفت ۱۴۴

قرآن کریم کے مسلمہ اور قطعی احکام و معارف ۱۴۶

دسویں تقریر ۱۵۳

قانون اور طرز فکر اور بنیادوں میں فرق ۱۵۳

قوانین کے دائرے معین کرنے کے دو مختلف نظریے ۱۵۵

انسانی حقوق کا آئینی سر چشمہ ۱۵۷

قوانین خلقت اور انسان کے اختیارات ۱۶۰

الٰہی شریعت ترقی اور فلاح و کمال کی ضمانت ۱۶۳

شہری قوانین اور اخلاقی قوانین میں فرق ۱۶۶

اسلام اور لبرلزم کے رجحان میں فرق............ ۱٦۸

گیارہویں تقریر............ ۱۷۲

اہم سیاسی مسائل پر گہری تحقیق کی ضرورت............ ۱۷۲

قانون کی سرکاری حیثیت اور دائرۂ کار............ ۱۷۴

اسلامی قوانین کی برتری............ ۱۷۹

اسلامی انقلاب اور معنوی مصلحتوں کی برتری............ ۱۸۵

بارہویں تقریر............ ۱۸۸

اقدار کے حوالے سے اسلام اور مغربی طرز تفکر میں فرق............ ۱۸۸

اسلام کی نظر میں بہترین قانون اور فکری آمیزش کے خطرات............ ۱۸۹

مذہبی افکار کے دائرے میں فکری آمیزش اور انحراف............ ۱۹۲

یورپ میں علم اور دین کے ٹکراؤ کا سد باب............ ۲۰۱

اسلام اور لبرلزم میں عوامی مطالبات کی حیثیت............ ۲۰۳

جوانوں کے لئے ایک نصیحت............ ۲۱۰

تیرہویں تقریر............ ۲۱۲

قانون کے سلسلے میں اسلام اور مغربی طرز فکر میں بنیادی فرق............ ۲۱۲

انفرادی آزادی کے ساتھ قانون کا رابطہ.................... ۲۱۳

مغربی ثقافت کے اصول اور اسلامی ثقافت سے ان کا موازنہ.................... ۲۱۷

اسلام کی لبرلزم سے مخالفت.................... ۲۲۴

چودھویں تقریر.................... ۲۳۱

قانون اور مغرب کی مادی نگاہ.................... ۲۳۱

مغرب میں انسانی حقوق کے دائرے.................... ۲۳۵

مغرب میں آزادی کی حدبندیوں پر اعتراضات.................... ۲۳۹

پندرھویں تقریر.................... ۲۴۸

اسلامی حکومت، ثقافتی حربے اور خطرے.................... ۲۴۸

فطری حق کا حقیقی مفہوم.................... ۲۵۶

روایتی تعریف دراصل اسلام کی حقیقی تعریف.................... ۲۵۷

دین اور قانون آزادی کا دائرہ معین کرتے ہیں.................... ۲۶۲

سولھویں تقریر.................... ۲۶۷

قانون اور آزادی کے دائرے میں الٰہی اور الحادی ثقافت کا فرق.................... ۲۶۷

اخلاقی اور آئینی قوانین میں فرق.................... ۲۷۰

الٰہی اور الحادی ثقافت او ران کے طرز فکر کا اختلاف ۲۷۳

سترہویں تقریر ۲۸۶

حکومت اور قانون سازی کے ساتھ تشریعی ربوبیت کا تعلق ۲۸۶

خدا کی حکمرانی اور تشریعی ربوبیت ۲۸۹

قانون سازی کا حق خدا سے مخصوص ہونے کے دلائل ۲۹۸

اٹھارہویں تقریر ۳۰۴

قانون سازی کے شرائط اور اسلام میں اس کی اہمیت ۳۰۴

قانون سازی کے سارے شرائط خداوندعالم کی ذات میں منحصر ہیں ۳۰۶

انسان کی حکمرانی کا خدا کی حکمرانی کے ساتھ کوئی ٹکراؤ نہیں ۳۱۹

انیسویں تقریر ۳۲۳

حکومت اور سیاست کے دائرہ میں اسلام کی خصوصیت ۳۲۳

انسانی معاشرہ کی حقیقت اسلام کی نگاہ میں ۳۲۸

اسلامی قوانین اور لبرل قوانین میں اختلاف ۳۳۵

بیسویں تقریر ۳۴۲

قانون اور حکومت کی ایک نئی تصویر ۳۴۲

پورے معاشرہ کو ایک پیکر تصور کرنا ۳۴۲

اکیسویں تقریر ۳۵۷

اسلام اور جمہوریت ۳۵۷

قانون نافذ کرنے والوں کے لئے بھی اذن خدا کی ضرورت ۳۵۸

عصر حاضر میں جمہوریت کا مفہوم ۳۶۴

بائیسویں تقریر ۳۷۳

اسلام اور جمہوریت ۳۷۳

سیکولر نظام کی فلسفیانہ بنیادوں میں مغالطہ ۳۷۵

مدیریت کے دائرے میں جمہوریت کا کردار ۳۷۷

اسلام میں قابل قبول جمہوریت ۳۸۴

تیئیسویں تقریر ۳۸۶

انسانیت اور شہریوں کی قومیت میں اتحاد کی اساس ۳۸۶

اسلام کی نظر میں حقوق کی بنیاد ۳۸۶

شہریت کے قوانین میں لوگوں کی درجہ بندی ۳۹۳

نظام ولایت فقیہ کا دوسرے نظاموں سے علمی فرق ۳۹۶

حرف اول

جب آفتاب عالم تاب افق پر نمودار ہوتا ہے کائنات کی ہر چیز اپنی صلاحیت و ظرفیت کے مطابق اس سے فیضیاب ہوتی ہے حتی ننھے ننھے پودے اس کی کرنوں سے سبزی حاصل کرتے اور غنچہ و کلیاں رنگ و نکھار پیدا کرلیتی ہیں تاریکیاں کافور اور کوچہ و راہ اجالوں سے پرنور ہوجاتے ہیں، چنانچہ متمدن دنیا سے دور عرب کی سنگلاخ وادیوں میں قدرت کی فیاضیوں سے جس وقت اسلام کا سورج طلوع ہوا، دنیا کی ہر فرد اور ہر قوم نے قوت و قابلیت کے اعتبار سے فیض اٹھایا۔

اسلام کے مبلغ و موسس سرورکائنات حضرت محمد مصطفی ﷺ غار حراء سے مشعل حق لے کر آئے اور علم و آگہی کی پیاسی اس دنیا کو چشمۂ حق و حقیقت سے سیراب کردیا، آپ کے تمام الٰہی پیغامات ایک ایک عقیدہ اور ایک ایک عمل فطرت انسانی سے ہم آہنگ ارتقائے بشریت کی ضرورت تھا.

اس لئے ۲۳ برس کے مختصر عرصے میں ہی اسلام کی عالمتاب شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں اور اس وقت دنیا پر حکمراں ایران و روم کی قدیم تہذیبیں اسلامی قدروں کے سامنے ماند پڑگئیں، وہ تہذیبی اصنام جو صرف دیکھنے میں اچھے لگتے ہیں اگر حرکت و عمل سے عاری ہوں اور انسانیت کو سمت دینے کا حوصلہ، ولولہ اور شعور نہ رکھتے تو مذہبِ عقل و آگہی سے روبرو ہونے کی توانائی کھودیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ایک چوتھائی صدی سے بھی کم مدت میں اسلام نے تمام ادیان و مذاہب اور تہذیب و روایات پر غلبہ حاصل کرلیا۔

اگرچہ رسول اسلام ﷺ کی یہ گرانبہا میراث کہ جس کی اہل بیت علیہم السلام اور ان کے پیرووں نے خود کو طوفانی خطرات سے گزار کر حفاظت و پاسبانی کی ہے، وقت کے ہاتھوں خود فرزندان اسلام کی بے توجہی اور ناقدری کے سبب ایک طویل عرصے کے لئے تنگنائیوں کا شکار ہوکر اپنی عمومی افادیت کو عام کرنے سے محروم کردی گئی تھی، پھر بھی حکومت و سیاست کے عتاب کی پروا کئے بغیر مکتب اہل بیت علیہم السلام نے اپنا چشمۂ فیض جاری رکھا اور چودہ سو سال کے عرصے میں بہت سے ایسے جلیل القدر

علماء و دانشور دنیائے اسلام کو تقدیم کئے جنھوں نے بیرونی افکار و نظریات سے متاثر اسلام و قرآن مخالف فکری و نظری موجوں کی زد پر اپنی حق آگین تحریروں اور تقریروں سے مکتب اسلام کی پشت پناہی کی ہے اور ہر دور اور ہر زمانے میں ہر قسم کے شکوک و شبہات کا ازالہ کیا ہے، خاص طور پر عصر حاضر میں اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد ساری دنیا کی نگاہیں ایک بار پھر اسلام و قرآن اور مکتب اہل بیت علیہم السلام کی طرف اٹھی اور گڑی ہوئی ہیں،

دشمنان اسلام اس فکری و معنوی قوت واقتدار کو توڑنے کے لئے اور دوستداران اسلام اس مذہبی اور ثقافتی موج کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑنے اور کامیاب و کامراں زندگی حاصل کرنے کے لئے بے چین وبے تاب ہیں،یہ زمانہ علمی اور فکری مقابلے کا زمانہ ہے اور جو مکتب بھی تبلیغ اور نشر و اشاعت کے بہتر طریقوں سے فائدہ اٹھاکر انسانی عقل و شعور کو جذب کرنے والے افکار و نظریات دنیا تک پہنچائے گا،وہ اس میدان میں آگے نکل جائے گا۔

(عالمی اہل بیتؑ کونسل) مجمع جہانی اہل بیت علیہم السلام نے بھی مسلمانوں خاص طور پر اہل بیتؑ عصمت و طہارت کے پیرووں کے درمیان ہم فکری و یکجہتی کو فروغ دینا وقت کی ایک اہم ضرورت قرار دیتے ہوئے اس راہ میں قدم اٹھایا ہے کہ اس نورانی تحریک میں حصہ لے کر بہتر انداز سے اپنا فریضہ ادا کرے، تاکہ موجودہ دنیائے بشریت جو قرآن و عترت کے صاف و شفاف معارف کی پیاسی ہے زیادہ سے زیادہ عشق و معنویت سے سرشار اسلام کے اس مکتب عرفان و ولایت سے سیراب ہوسکے۔

ہمیں یقین ہے عقل و خرد پر استوار ماہرانہ انداز میں اگر اہل بیتؑ عصمت و طہارت کی ثقافت کو عام کیا جائے اور حریت و بیداری کے علمبردار خاندان نبوتؐ و رسالت کی جاوداں میراث اپنے صحیح خدو خال میں دنیا تک پہنچادی جائے تو اخلاق و انسانیت کے دشمن، انانیت کے شکار، سامراجی خوں خواروں کی نام نہاد تہذیب و ثقافت اور عصر حاضر کی ترقی یافتہ جہالت سے تھکی ماندی آدمیت کو امن و نجات کی دعوتوں کے ذریعہ امام عصر (عج) کی عالمی حکومت کے استقبال کے لئے تیار کیا جاسکتا ہے۔

ہم اس راہ میں تمام علمی و تحقیقی کوششوں کے لئے محققین و مصنفین کے شکر گزار ہیں اور خود کو مؤلفین و مترجمین کا ادنیٰ خدمتگار تصور کرتے ہیں، زیر نظر کتاب، مکتب اہل بیت علیہم السلام کی ترویج و اشاعت اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، حضرت آیت اللہ مصباح یزدی کی گرانقدر کتاب ''اسلام اور سیاست ''کو فاضل جلیل مولانا اقبال حیدر حیدری نے اردو میں اپنے ترجمہ سے آراستہ کیا ہے جس کے لئے ہم دونوں کے شکر گزار ہیں اور مزید توفیقات کے آرزومند ہیں،اسی منزل میں ہم اپنے تمام دوستوں اور معاونین کا بھی صمیم قلب سے شکریہ ادا کرتے ہیں کہ جنھوں نے اس کتاب کے منظر عام تک آنے میں کسی بھی عنوان سے زحمت اٹھائی ہے، خدا کرے کہ ثقافتی میدان میں یہ ادنیٰ جہاد رضائے مولیٰ کا باعث قرار پائے۔

والسلام مع الاکرام

مدیر امور ثقافت، مجمع جہانی اہل بیت علیہم السلام

پہلی تقریر

اسلامی سیاست کے سلسلے میں چند اہم سوالات

تمہیدی گفتگو بے شک ہمارے اسلامی نظام اور انقلاب کے ثمرات میں سے ایک نماز جمعہ بھی ہے جس سے امت اسلامیہ کو بہت سے فوائد پہنچے ہیں مثلاً اس کا ایک ضمنی فائدہ مومنین کو ضروری معلومات اور مسائل سے آگاہ کرنا ہے، مختلف شہروں میں نماز جمعہ کے خطبے اور اس سے قبل یا نماز جمعہ اور نماز عصر کے درمیان تقاریر کا سلسلہ لوگوں کے لئے قائم کیا گیا ہے، چنانچہ شروع انقلاب سے آج تک مختلف علماء و دانشور، خطباء و مقررین مختلف موضوعات منجملہ عقائد اخلاق و تربیت،اقتصاد اور تمام فکری و نظری میدانوں میں نماز جمعہ پڑھنے والوں کے درمیان بڑی ہی اہم اور قیمتی گفتگو کرتے رہے ہیں،اور ذرائع ابلاغ کے ذریعہ دوسرے لوگوں تک بھی یہ آواز پہونچتی رہی ہے۔

''اسلامی اعتقاد و اقدار پر مبنی نظام میں توحید کی اہمیت'' کے موضوع پر ہماری تقریر بھی الحمد للہ چھپ کر قارئین کرام تک پہونچ چکی ہیں، فی الحال بعض احباب اور قدردانوں کی فرمایش اور اصرار پر ''اسلام کے سیاسی نظریات'' کے عنوان سے کچھ تقریریں آپ کے سامنے کرنی ہیں اور دعا ہے کہ خداوند عالم اس سلسلہ میں مدد فرمائے،اور جو بھی اس کی مرضی ہو اور امت اسلام کے لئے مفید ہو وہ الہام کرے،اور ہماری زبان پر جاری کردے،تاکہ اس شہید پرور اور حزب اللّٰہی قوم تک پہونچا سکیں، ہماری اس بحث کا عنوان بہت وسیع اور جامع ہے،اس کے اندر مختلف سطحوں کی بہت سی بحثیں کی جاسکتی ہیں کہ جن میں سے بعض بہت آسان اور سادی ہیں اور بعض خالص علمی اور عمیق ہیں۔

اگرچہ اس سلسلہ میں امام خمینی کی تحریک کے آغاز (یعنی ۱۹٦۲ء)سے لے کر اب تک مختلف عنوان سے کافی گفتگو ہو چکی ہے ،مضامین اور کتابیں لکھی گئی ہیں،اور بہت سی تقاریر بھی ہوتی رہی ہیں، لیکن متوسط سطح کے لوگوں کے لئے منظم انداز میں بہت ہی کم

قابل استفادہ مطالب بیان ہوئے ہیں، اسی لئے احباب کا اصرا ر تھا کہ ان مطالب کو اس طرح سے نظم و ترتیب سے بیان کیا جائے کہ سبھی لوگ اس سے استفادہ کر سکیں ،اور مختلف لوگوں خصوصاً جوان طبقہ کی ضرورتوں کو پورا کر سکے، الحمد للہ ہماری قوم ثقافت کے لحاظ سے بہت اچھی ہے، خصوصاً آخری چند برسوں میں ثقافتی لحاظ سے بہت زیادہ ترقی کی ہے، اور پیچیدہ قسم کے دقیق و عمیق مسائل سمجھنے کی خوب صلاحیت رکھتی ہے، بہر حال علمی اور فنی زبان، علمی مراکز، یونیورسٹی، کالج اور حوزات علمیہ سے مخصوص ہے، اور اگر عام لوگوں کے درمیان گفتگو کرنا ہو تو حتی الامکان علمی اصطلاحات استعمال نہیں ہونی چاہیئے تاکہ زیادہ تر لوگ جن کا مطالعہ فنی نہیں ہے ،ان بحثوں سے فائدہ اٹھا سکیں، البتہ اس بات کا خیال رہے کہ ''اسلامی فلسفہ سیاست'' کے ذیل میں جو گفتگو کی جا سکتی ہے اس قدر وسیع ہے کہ ١٠٠ تقریروں میں بھی بیان کرنا مشکل ہے، اس وجہ سے ہم اپنے پیش نظر وقت اور تقاریر کی محدودیت کی بنا پر مجبور ہیں کہ ان ہی مسائل کا انتخاب کریں کہ جن کی معاشرے کو زیادہ ضرورت ہے، اور جن کے سلسلہ میں طرح طرح کے سوالات اور شکوک و شبہات پیدا کئے گئے ہیں ۔

چونکہ ہمارا موضوع بنام ''اسلامی فلسفہ سیاست'' تین الفاظ سے مرکب ہے جس کا ہر ایک لفظ مفصل بحث اور تحقیق کے قابل ہے اور ''فلسفہ سیاست'' کی اصطلاح کئی موارد میں استعمال کرتے ہیں (مثلاً فلسفہ علم سیاست اور خود علم سیاست دونوں کے لئے بھی ''فلسفۂ سیاست'' بولتے ہیں لہٰذا خیال رہے کہ فلسفہ سیاست سے ہماری مراد حکومت و سیاست کے بارے میں اسلامی نظریات کی توضیح و تفسیر ہے جو مخصوص اصولوں پر قائم ہے، اور اسلامی حکومت کے سیاسی افکار ان ہی اصولوں کی بنیاد پر قابل توضیح ہیں ۔

اسلام اور اس کا نظریۂ سیاست

جس وقت ہم یہ کہتے ہیں کہ اسلام ''سیاست و حکومت'' کے سلسلہ میں ایک خاص نظریہ رکھتا ہے، جو اسلام کے قبول کردہ اصول و ضوابط پر استوار ہے تو سب سے پہلے یہ سوال اٹھتا ہے کہ کیا دین کو سیاست و حکومت کے بارے میں بھی خاص نظریہ کا حامل ہونا چاہیئے کہ اسلام اپنا سیاسی نظریہ بیان کرنا چاہتا ہے ؟ یہ وہی مشہور سوال ہے جو صدیوں سے مختلف ممالک اور مختلف معاشروں میں

اٹھایا جاتا رہاہے، ہمارے ملک میں بھی یہ سوال خصوصاً مشروطہ یا آئین سلطنت کے زمانے سے اس طرف برابر اٹھایا گیا ہے،اور اس سلسلہ میں مختلف پہلوؤں سے بحث بھی ہوئی ہے ،یقیناً امام خمینیؒ کے بیانات اور مرحوم شہید مدرس کے مشہور و معروف جملہ کے پیش نظر کہ ''ہمارا دین ہی سیاست اور ہماری سیاست ہی عین دین ہے'' جو ہمارے ذہن پر نقش ہوگیاہے، یہ مسئلہ ہم لوگوں کے لئے واضح اور روشن ہوچکا ہے، اور ان لوگوں نے اس سوال کا واضح جواب دیدیا ہے پھر بھی دین سیاسی نظریہ اور دین کی سیاست میں مداخلت کے طریقے جیسے مسائل پر تحقیق اور بحث کی ضرورت ہے ۔

مغربی تمدن میں دین کو ہمہ گیری نہیں حاصل ہے اور اس طرح تعریف کی گئی ہے کہ دین کا تعلق اجتماعی و سیاسی مسائل سے نہیں رہ گیا ہے، دین صرف انسان اور خدا کے رابطہ تک محدود ہے، اور ایک فرد کا ذاتی رابطہ خدا سے کیا ہے صرف اس چیز کو دین کے دائرے میں مجسم کیا گیا ہے، لہٰذا سیاسی، اجتماعی اور بین الاقوامی مسائل حکومت اور عوام کے درمیان اور اسی طرح حکومتوں کے ایک دوسرے سے روابط ،انسان اور خدا کے رابطہ کے دائرے سے باہر تصور کئے جاتے ہیں

لہٰذا نتیجہ میں ان کا دین سے کوئی ربط نہیں ہے، لیکن مسلمانوں کے نقطہ نگاہ سے دین ایک وسیع اور جامع مفہوم رکھتا ہے کہ جس میں انسان کے تمام فردی واجتماعی مسائل شامل ہیں اور اس کے اندر انسان کا خدا سے رابطہ اور انسان کا آپس میں رابطہ اور دیگر سیاسی، اجتماعی اور بین الاقوامی روابط سبھی آتے ہیں یعنی یہ ساری باتیں دین ہیں، چونکہ اسلام کے اعتبار سے خداوندعالم پوری دنیا اور تمام انسانوں پر حاکم ہے لہٰذا سیاست، اقتصاد (معاش) تعلیم وتربیت، انتظام و انصرام اور وہ تمام مسائل جو انسانی زندگی سے متعلق ہیں وہ سب دینی احکام اور مذہبی اقدار میں شامل ہیں۔

اسلامی نظریۂ سیاست تخلیقی ہےاب جبکہ ہم قبول کرچکے کہ اسلام حکومت اور سیاست کے سلسلے میں اپنی ایک رائے اور نظر رکھتا ہے ، اور حکومت و سیاست کے بارے میں اسلام کی طرف ایک مخصوص نظریہ کی نسبت دی جاتی ہے تو اس نظریہ کی ماہیت و

کیفیت کے بارے میں چند سوال پیدا ہوتے ہیں کہ:آیا اسلامی نظریۂ سیاست اُس کا اپنا تخلیقی نظریہ ہے یا کسی اور کی تقلید ہے کہ جس پر اسلام نے صرف صاد بنا دیا ہے؟یعنی کیا اسلام نے یہ نظریہ خود اختراع اور ایجاد کیا ہے اور خدا کے نازل کردہ تمام تعبدی احکام کی طرح اللہ کی جانب سے یہ نظریہ نازل ہوا ہے یا یہ کہ اسلام نے کسی اور سے ایک نظریہ لے کر اس کی تائید کردی ہے؟اس سوال کو واضح کرنے کے لئے ہم یہ عرض کریں گے کہ اسلام نے بہت سے مسائل میں سیرت عقلاء کی تائید کی ہے،جسے اصطلاح میں اسلام کی جانب سے ''امضاء روش عقلاء''یعنی ''عقلاء کی روش قبول کرلینا''کہا جاتا ہے، مثال کے طور پر انسان جو لین دین کے معاملات کرتا ہے مثلا خرید وفروخت، کرایہ داری اور بیمہ کے مسائل وغیرہ ان سب کو عقلاء کی سیرت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، لوگوں نے ان کو ایجاد کیا ہے اور شارع مقدس نے بھی ان کی تائید فرمادی ہے ۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا حکومت اور سیاست کے سلسلہ میں اسلام کا نظریہ اسی طرح کا ہے کہ عقلاء نے حکومت و سیاست کے بارے میں کچھ نظریات قائم کر دیئے،اور شارع مقدس نے ان ہی نظریات کی تائید کر کے منظوری دیدی ہے؟ یا یہ کہ خود اسلام نے اس سلسلے میں اپنا ایک خاص الٰہی نظریہ دیا ہے ؟اور دنیا کے تمام نظریات کے مقابلے میں خود اپنا اسلامی حکومت کا نظریہ پیش کیا ہے ؟ حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے حکومت وسیاست اور تمام سیاسی و اجتماعی زندگی کے بنیادی اصولوں اور طریقوں سے متعلق ایک موجد اور خلاق کا کردار ادا کیا ہے ۔

نہ یہ کہ اسلام کے نظریات تقلیدی اور تائیدی ہیں جو حضرات حکومت کی مختلف شکلوں اور سیاسی فلسفہ کے متعلق بحثوں سے آگاہی رکھتے ہیں جانتے ہیں کہ اس سلسلے میں مختلف نظریات ہیں جن میں سے ایک نظریہ ''تھیوکریسی''یعنی الٰہی حکومت کا نظریہ بھی ہے یہ نظریہ عہد وسطیٰ کے یورپ میں کلیسا کی طرف سے پیش کیا گیا کلیسا مخصوصاََ کیتھولک عیسائیوں کا کہنا تھا کہ ہم خدا کی طرف سے لوگوں کے حاکم ہیں،اس کے مقابلہ میں عیسائیوں کے بعض فرقوں کا کہنا تھا کہ حضرت عیسی مسیحؑ کے دین کا سیاسی مسائل سے کوئی تعلق نہیں تھا،یعنی وہ دین اور سیاست میں جدائی کے قائل تھے۔

بہر حال عہد وسطیٰ میں کیتھولک فرقے کا عقیدہ یہ تھا کہ پوپ اور اس کی جماعت کو حکومت کرنے کا حق ہے،یہ لوگ سیاست میں دین کو داخل جانتے تھے اور کہتے تھے کہ خدا کی طرف سے کلیسا کو یہ اقتدار حاصل ہے کہ وہ لوگوں پر خدا کی طرف سے حکومت کریں، اور لوگوں کو بھی خدا کے حکم سے پوپ کی اطاعت کرنا چاہئے،حکومت کی اس شکل کو تھیوکریسی کا نام دیا گیا ہے۔

اور جب یہ کہتے ہیں کہ لوگوں کی ایجاد کردہ حکومتوں سے الگ اسلام نے اپنے خاص نظریہ کے تحت اسلامی اور الٰہی حکومت پیش کی ہے تو کیا اس سے یہی ''تھیوکریسی حکومت'' مراد ہوتی ہے جو مغرب میں پائی جاتی ہے اور الٰہی حکومت ان کے تمدن میں کیا اسی معنی میں جانی جاتی ہے ؟اور جس طرح تھیوکریسی میں خدا وند عالم نے حاکم کو وسیع پیمانے پر اختیارات دئے ہیں اور وہ اپنی مرضی کے مطابق جس طرح بھی چاہے لوگوں پر حکومت کر سکتا ہے۔

اور لوگوں پر بھی واجب ہے کہ بہر حال حاکم کی مرضی اور خواہش کی اطاعت کریں کیا الٰہی اور ولائی حکومت کہ جس کا ہم دعوی کرتے ہیں اور اسلام کے سیاسی نظریہ اور ولایت فقیہ کے نظریہ کے تحت بھی ولی فقیہ اپنی مرضی کے مطابق جیسے چاہے لوگوں پر حکومت کا حق رکھتا ہے اور کیا اس کو یہ حق ہے کہ جس طرح بھی چاہے اپنی مرضی کے قوانین بنا کر لوگوں پر حکومت کرے ؟اور لوگوں پر بھی اس کی اطاعت واجب ہو؟

یہ سوال بہت ہی اہم ہے اور سنجیدگی کے ساتھ اس سلسلے میں ایک مناسب بحث اور تحلیل کی ضرورت ہے تاکہ اس سلسلہ میں جو غلط فہمی پائی جاتی ہے وہ دور ہوجائے ۔

مذکورہ سوال کا مختصر سا جواب تو یہ ہے کہ جس الٰہی حکومت کے ہم معتقد ہیں اس میں اور مغرب میں رائج تھیوکریسی میں زمین آسمان کا فرق ہے ، یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ اسلام کی منظور نظر الٰہی حکومت وہی حکومت ہے کہ جس کے عیسائی قائل ہیں خصوصاً فرقہ کیتھولک خدا اور پوپ کے بارے میں جو نظریہ رکھتے ہیں۔

عام طور پر سیاسی نظریہ پردازوں نے حکومت کو ایک وسیع دائرۂ نگاہ کے تحت، دو قسموں میں تقسیم کیا ہے:

۱(ڈکٹیٹرانہ حکومتیں

۲(ڈیموکریٹک یا عوامی حکومتیں، اور ان دونوں کی ہی بہت سی قسمیں ہیں لیکن مجموعی تقسیم میں اُن کی دو قسمیں کی گئی ہیں ۔ پہلی قسم میں وہ حکومت آتی ہے جس میں حاکم مطلق العنان ہوتا ہے، اوراپنی مرضی سے حکومت کرتا ہے،خودسرانہ فرمان جاری کرتااور مختلف طریقوں کا سہارا لیتا ہے، رعب و وحشت اور اپنی فوجی طاقت کے ذریعہ لوگوں کو اپنی اطاعت پر مجبور کرتا ہے،اس کے برخلاف:دوسری قسم حکومت کی وہ ہے کہ جس کی تشکیل میں،عوام کی رائے اوران کی خواہش ہے، لوگ اپنی مرضی سے اپنے حکمراں کو چنتے ہیں اور حاکم بھی لوگوں کی خواہشات کے مطابق عمل کرنے کے پابند ہوتے ہیں یعنی ان کی حکومت کا حق عوام کے ووٹ اور ان کی چاہت پر موقوف ہے۔

اسلامی حکومت کی حقیقت اور اس کے ارکان

جن لوگوں نے مغرب میں رائج حکومت کی اس تقسیم کو قبول کیا ہے اور خیال کرتے ہیں کہ حکومت دو قسموں سے خالی نہیں ہوسکتی. یا تو ڈکٹیٹرانہ حکومت ہوگی یا عوامی حکومت، یہ سوال کرتے ہیں کہ آیا اسلامی حکومت ایک ڈکٹیٹرانہ حکومت ہے؟ یعنی جو بھی حکومت پر فائز ہوجائے مثلاً ہمارے زمانہ میں ولی فقیہ، تو کیا وہ اپنا اقتدار اسلحہ کے بَل پر قائم رکھتا ہے؟ اور اپنی مرضی کے مطابق حکومت کرتا ہے یا اسلامی حکومت کی کوئی دوسری شکل ہے؟

اس صورت میں آیا وہی جمہوریت ہے جو ڈکٹیٹر شپ کے مقابلہ میں ہے یا اسلامی حکومت کی کوئی تیسری شکل ہے جو نہ ڈکٹیٹر شپ ہے اور نہ جمہوریت؟بہر حال حکومت کی دوگانہ تقسیم کے تحت جس کو قبول کیا گیا ہے اسلامی حکومت مذکورہ دو قسموں سے الگ نہیں ہوسکتی یا یہ حکومت ڈکٹیٹرانہ ہے یا جمہوری؛ اگر اسلامی حکومت جمہوری ہے تو اسلامی حکومت کو یورپی طرز پر ڈیموکریٹک

حکومت کے طور طریقے بھی اپنانا اور نافذ کرنا چاہئے، اگر ایسا نہیں ہے تو پھر اسلامی حکومت عوامی حکومت نہیں ہو سکتی بلکہ ڈکٹیٹرانہ حکومت ہوگی جو ایک خاص فرد کی مرضی پر قائم ہو، اس سلسلہ میں کوئی تیسرا انتخاب ہمارے سامنے نہیں ہے، لہٰذا ضرورت ہے کہ ہم اس اہم سوال کا جواب بھی دیں اور بیان کریں کہ اسلامی حکومت ڈکٹیٹر شپ ہے یا جمہوری یا کوئی تیسری قسم.

ان ہی سوالوں میں سے ایک سوال یہ بھی ہے کہ اسلامی حکومت کے بنیادی ستون اور ارکان کیا ہیں؟ وہ کون سے ارکان ہیں کہ جو حکومت اور اس کے نظم و تدبیر کے لئے ضروری ہیں تاکہ واقعی طور پر اسلامی حکومت وجود میں آسکے؟ جو حضرات ہماری تہذیب اور فقہ سے واقف ہیں ان کو معلوم ہے کہ اگر نماز کے ارکان میں کوئی ایک بھی رکن چھوٹ جائے چاہے جان بوجھ کر چھوڑا جائے یا بھولے سے چھوٹ جائے تو نماز باطل ہوجائے گی در حقیقت ان کے بغیر نماز نہیں کہلائے گی، اسی طرح اسلامی حکومت کے بھی کچھ ارکان ہونے چاہئے کہ اگر وہ ارکان اور ستون ہوں گے تو اس حکومت کو اسلامی حکومت کہا جائے گا اور اگر ان ارکان میں کوئی خلل (کمی و کسر) آجائے تو اس کو حکومت اسلامی نہیں کہا جائے گا ۔

اب ان ارکان کی اہمیت اور اس بنیادی کردار کے پیش نظر جو اسلامی حکومت کی تشکیل میں ادا کرتے ہیں ان ارکان سے آگاہ ہونا ضروری ہے، کیونکہ اس صورت میں جب حکومت کے اسلامی ہونے کا معیار و ملاک ہمیں سمجھ میں آجائے گا تو شکل و ماہیت کے لحاظ سے ہم اسلامی اور غیر اسلامی حکومت کے فرق کو پوری طرح سمجھنے پر قادر ہوجائیں گے، اسی وجہ سے اس اہم سوال کا جواب بہت ضروری معلوم ہوتا ہے ۔

اسلامی حکومت کا ڈھانچا ،اختیارات اور ذمہ داریوں کا دائرہ اس سلسلہ میں ایک اور سوال یہ ہے کہ کیا اسلام نے حکومتِ اسلامی کی کوئی مخصوص شکل وصورت بھی معین کی ہے؟ جیساکہ آپ حضرات کو معلوم ہے موجودہ دنیا میں حکومت کی مختلف شکلیں پائی جاتی ہے اور قدیم زمانے میں بھی حکومت کی کچھ شکلیں تھی جو اس وقت نہیں پائی جاتیں۔

حکومتوں کی بعض قسمیں اس طرح ہیں:

۱۔ شاہی حکومت. اس کی دو شکلیں ہیں مطلق العنان بادشاہت اور آئینی بادشاہت۔

۲۔ جمہوری حکومت (فیڈرل یا پارلیمانی نظام حکومت)۔

۳۔ دینی حکومت (پوپ یا پادریوں کی حکومت)۔

اسلام نے آیا حکومت کی ان ہی شکلوں میں سے کسی ایک کو قبول کیا ہے یا خود کوئی مخصوص شکل معین کی ہے؟ جو مذکورہ شکلوں سے فرق رکھتی ہے یا سرے سے حکومت کی کوئی مخصوص شکل معین نہیں کیا ہے، اور فقط حکومت کے لئے کچھ معیار معین کردئے ہیں کہ جن کا ہر زمانہ اور ہر طرح کی حکومت میں پاس و لحاظ ضروری ہے؟ مثال کے طور پر اسلام کا حکم ہے کہ حکومت میں انصاف ضروری ہے۔

لیکن یہ کہ انصاف کا کس طرح لحاظ رکھا جائے؟ اس کا فیصلہ زمانے اور جگہ کے اعتبار سے ہوگا، چنانچہ دنیا کے کسی بھی حصے میں کسی بھی وقت حالات کے اعتبار سے مخصوص شکل میں انصاف قائم کیا جاسکتا ہے، اسلام نے کسی مخصوص شکل وصورت میں عدالت کی برقراری پر اصرار نہیں کیا ہے؟!. اسلام کی نظر میں حکومت کی کون سی شکل مناسب ہے، اس کا دارو مدار ہے اس کے معیار پر قائم ہے۔

اور اگر اسلام نے حکومت کے لئے کسی مخصوص شکل وصورت کا انتخاب کیا ہے تو آیا اس کی نظر میں حکومت کا یہ ڈھانچا اٹل اور ناقابل تغیر ہے؟ یا یہ کہ نہیں، حالات کے اعتبار سے اس ڈھانچا میں تھوڑی بہت تبدیلی ہوسکتی ہے اس طرح کے سوالات اسلامی حکومت کے ڈھانچے اور شکل وصورت کے بارے میں اٹھتے ہیں. جن کا جواب ضروری ہے۔

فلسفۂ حکومت کے سلسلے میں ایک اور سوال یہ اٹھتا ہے کہ اسلامی حکومت کا فرمانروا اور سربراہ چاہے وہ کسی ایک فرد یا ایک گروہ، کونسل یا مخصوص انجمن کی شکل میں ہو، بہر صورت اسلامی حکومت کے اختیارات کیا ہیں؟

اور ان کے مقابل حکومت کی ذمہ داریاں کیا ہیں؟ کیونکہ گذشتہ زمانے اور عصر حاضر کی مختلف حکومتوں میں عوام کی تئیں ذمہ داریوں کے لحاظ سے کافی فرق نظر آتا ہے۔ بعض حکومتیں اختیارات اور وظایف کے لحاظ سے کافی محدودیت رکھتی ہیں حکومتیں کلی طور پر فقط لوگوں کے مخصوص امور اور نظام کے تحفظ کی ذمہ دار ہوتی ہیں، بقیہ تمام کاموں کو خود لوگوں پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔

لیکن بعض حکومتوں میں حکومت کے اختیارات بہت وسیع ہیں اور نتیجہ میں اس کے فرائض اور ذمہ داریاں بھی سخت ہیں، حکومت نے اہم ذمہ داریاں قبول کر رکھی ہیں ان کے بارے میں وہ جواب دہ ہیں، اور ان ذمہ داریوں کو لوگوں پر نہیں چھوڑا جاسکتا۔ کیونکہ لوگوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ حکومت سے ان فرائض اور ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے سلسلے میں مطالبہ کریں۔

اب یہ بات بھی روشن ہونی چاہیے کہ اسلام کے سیاسی فلسفہ میں اسلام نے حکومت کے کیا کیا اختیارات اور کون کون سی ذمہ داریاں معین کی ہیں، بلا شبہ ان اختیارات اور ذمہ داریوں میں مناسبت اور اور توازن ہونا چاہئے، اور اگر وہ امور کہ جن پر کوئی کام موقوف ہے اختیار میں نہ ہوں اور ضروری وسائل فراہم کئے بغیر کوئی ذمہ داری سونپ دی جائے تو یہ صحیح نہیں ہے، لہٰذا اس سوال کا جواب بھی ضروری ہے کہ اسلامی حکومت کی کیا کیا ذمہ داریاں ہیں ؟ اور اس کے مقابل اس کے اختیارات کیا ہیں۔

اسلامی حکومت میں لوگوں کا کردار اور چند دیگر سوالات اسی طرح عصر حاضر کے اہم سوالوں میں ایک نہایت ہی سنجیدہ سوال یہ بھی ہے کہ حکومت اسلامی میں عوام کا کردار کیا ہے؟ عوام کے اختیارات اور ان کی ذمہ داریاں کیا کیا ہیں؟؟ان ہی سوالوں میں سے ایک سوال یہ بھی ہے کہ صدر اسلام کی حکومت یعنی حضرت رسول خدا ، حضرت علی علیہ السلام اور حضرت امام حسن علیہ السلام کی حکومتوں کی شکل کیا تھی؟ اسی طرح وہ تمام حکومتیں جو خاندان بنی امیہ، خاندان بنی عباس اور دوسرے تمام خاندانوں کے نام سے

اسلامی سر زمینوں پر حکمراں رہی ہیں، کس حد تک اسلامی تھیں؟اور جس وقت اسلامی حکومت کی گفتگو ہوتی ہے تو مذکورہ حکومتوں میں سے کون سی حکومت کو ہم اسلامی حکومت کا نام دے سکتے ہیں؟بنیادی طور پر تاریخ میں اسلامی حکومت کی تشکیل کن حالات سے دچار ہو رہی کہ اس کے نتیجہ میں اسلامی حکومت کی یہ شکل انقلاب اسلامی کی برکت سے ایران میں وجود میں آئی ہے؟

البتہ مذکورہ سوالات کے ذیل ہی میں کچھ اور جزئی سوال بھی اٹھتے ہیں منجملہ یہ کہ کیا ہماری یہ حکومت سو فی صدی اسلامی حکومت ہے؟ اور کیا اس میں اسلامی حکومت کے تمام معیارات موجود ہیں؟اور اگر اس میں وہ تمام اصول و معیارات موجود ہیں تو کیا اس حکومت نے ان سب کی رعایت کی ہے؟اور اپنے تمام فرائض اور وظیفہ انجام دیئے ہیں؟اسی طرح یہ سوال کہ اس حکومت میں کیا کمیاں اور کمزوریاں پائی جاتی ہیں؟

اسلام کے سیاسی نظریہ کو پہچاننے کے طریقے قبل اس کے کہ ہم مختلف سوالات اور شکوک کا جواب دیں اور ''فلسفۂ سیاسی اسلام''کی بحثوں میں وارد ہوں اس چیز کی ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ اس راہ و روش کو پہلے بیان کردیں کہ جس کی ضرورت مذکورہ بحث کی تحقیق اور جائزے میں ناگزیر ہے،اس بحث کی روش (Methoodology) کیا ہے،دراصل یہ ایک مقدماتی بحث ہے کہ جو شروع ہمیں بیان کردینا چاہئے،اور وہ یہ کہ آیا ہماری بحث کا طریقہ خالص عقلی ہے؟اور ہم عقلی دلیلوں اور بنیادوں پر اسلام کے نظریات کو بیان کرنا چاہتے ہیں؟.یا ہماری روش اور شیوہ بحث خالص تعبدی اور منقولی ہوگا یعنی قرآن وسنت کے تابع ہے؟اور اس حکومت کا ڈھانچہ اس کے اصول اوراس کی پالیسیاں آیات و روایات سے اخذ کی جائیں گی؟

یا یہ کہ اسلامی سیاست بھی بنیادی طور پر ایک تجربہ کی طرح ہے؟جس کے صحیح اور غلط ہونے کا فیصلہ عملی تجربہ کی بنیاد پر کیا جائے گا؟ اس صورت میں ہماری گفتگو کا شیوہ تجرباتی روش پر استوار ہوگا اور فیصلہ کا معیار بھی حکومت اسلامی کے تجربہ کو قرار دینا ہوگا۔

اب چونکہ ہماری بحث عقلانی پہلو رکھتی ہے اور عقل و خرد پر استوار ہے، اس نکتہ کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے کہ عقلی بحث کے طریقے اور (Methoodo) کم از کم دو قسم کے ہوتے ہیں: (۱) جَدلی طریقہ ۔ ۲ (برہانی یا استدلالی طریقہ ۔

یعنی جب ہم کسی سے بحث و گفتگو کو شروع کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ عقلی لحاظ سے کسی موضوع کا جائزہ لیں تو کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہم اور ہمارے مخالفین ان اصول و مقدمات کی بنیاد پر بحث کرکے ایک نتیجہ تک پہنچتے ہیں جن کو ہم دونوں قبول کرتے ہیں. اس کے مقابلہ میں وہ استدلالی راہ و روش ہے کہ جس میں تمام مقدمات بھی عقلی دلیلوں پر قائم ہوتے ہیں اور آخر کار یہ بحث خود قضایائے اولیہ یعنی یقینی و قطعی فیصلوں پر منتج ہوتی ہے تاکہ اس طرح ہمارا استدلال اور برہان یقینی اور قطعی قرار پائے، اور ظاہر ہے، اگر ہم اس راستہ کو اختیار کریں تو بحث طولانی ہو جائے گی۔

مثال کے طور پر اگر ہم برہان اور استدلالی روش پر حکومت اسلامی میں عدل و انصاف کی رعایت ثابت کرنا چاہیں تو سب سے پہلے ہمیں عدل و انصاف کے مفہوم اور حقیقت کو واضح کرنا ہوگا اور اس کے بعد اس سوال کا جواب دینا ہوگا کہ عدالت کا نفاذ کس طرح کیا جائے؟ اسی طرح یہ سوال اُٹھتا ہے کہ انصاف اور آزادی ایک جگہ جمع ہو سکتی ہے یا نہیں؟ انصاف کے معیار کو کون معین کرے گا؟ آیا عدالت کا معیار خداوند عالم معین کرے گا یا لوگوں کی عقل؟

مذکورہ سوالات کے جائزے کے بعد یہ سوال ہوتا ہے کہ اس سلسلہ میں عقل کس حد تک فیصلے کا حق رکھتی ہے؟ کیا عقل کے فیصلے تناسب کے اعتبار سے ہیں یا مطلق ہیں؟. اس طرح یہ بحث طول پکڑتی جاتی ہے یہاں تک کہ خود اصول اولیہ اور شناخت کے مسائل کے بارے میں سوال اُٹھتے ہیں کہ اُن کو بھی واضح و روشن ہونا چاہئے، اور وہ یہ کہ بنیادی طور پر عقل کیا ہے؟ اس کا کام اور اس کی دلالت کس طرح انجام پاتی ہے؟ عقل کس طرح استدلال کرتی ہے؟ عقل کس حد تک قابل اعتبار ہے اور اس کا حکم کس حد تک قابل قبول ہے؟

ظاہر ہے اگر ہم نے اس طرح کے تمام سوالات اور مسائل اولیہ کا جائزہ لیا تو مختلف علوم سے بحث کرنا پڑے گی، جو ایک طولانی وقت چاہتی ہے، اور یہاں اس کا امکان نہیں ہے۔

یقیناً بحث کی برہانی روش اپنی جگہ ایک مقدس، یقینی اور محترم روش ہے لیکن جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا برہانی اور استدلالی بحث کے لئے بہت سے علوم کا سہارا لینے کی ضرورت ہے، اس سے قطع نظر بہت کم افراد تمام علوم میں مہارت رکھتے ہیں اور کسی بھی علم کے ماہرین اس علم کے محدود مسائل پر ہی دسترسی رکھتے ہیں، یہ کام کافی مشکل ہے اور اس طریقے پر تمام مسائل کا الگ الگ جائزہ لینے کے لئے ایک طویل وقت درکار ہے، اور یہ بھی محدود وقت جو ہم کو میسر آیا ہے اگر ہم نے اس روش کو اپنایا تو پیش نظر تمام مباحث کی وضاحت کے لئے ہم اپنی منزل مقصود تک نہیں پہونچ سکیں گے۔

لہٰذا جہاں کہیں پیچیدگی کے بغیر آسان اور مختصر دلائل اور براہین سے کام چل سکتا ہے وہاں برہانی اور استدلالی بحث سے استفادہ کریں گے ورنہ بقیہ تمام موارد میں جدلی بحث سے کام لیں گے کیونکہ جدلی روش در اصل بحث کی وہ مناسب ترین درمیانی راہ ہے جس کے ذریعہ کسی ہدف اور نتیجہ تک پہنچا جاسکتا ہے جو ہر ایک کے لئے عام ہے، اور دوسروں کو قانع کرنے کے لئے مفید بھی ہے، خداوند عالم نے قرآن مجید میں جگہ جگہ مخالفین کو قانع کرنے اور اپنی طرف سے اتمام حجت کے لئے اس روش کو اپنایا ہے، اور ہمیں بھی حکم دیا ہے کہ اس راستہ کو اپنائیں اور دوسروں سے اسی روش پر بحث و گفتگو کریں۔

(أُدعُ إِلیٰ سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالحِکْمَةِ وَالمَوْعِظَةِ الحَسَنَةِ وَجَادِلهُم بِالَّتِی ہِیَ أَحْسَنُ[١]) ''حکمت اور موعظہ حسنہ کے ذریعہ اپنے پروردگار کے راستے کی طرف دعوت دو، اور ان کے ساتھ جو اچھا طریقہ ہے، اس کے ذریعہ سے بحث وجدل کرو۔

[١] سورۂ نحل آیت ١٢٥۔

دوسری تقریر

اسلامی نظریۂ سیاست پر بحث کی اہمیت و ضرورت

ہم نے پہلی تقریر میں اسلامی فلسفۂ سیاست سے متعلق مباحث کی فہرست اور اس سلسلہ میں منتخب شدہ مسائل کے موضوعات بیان کئے تھے تاکہ ناظرین کو معلوم ہوجائے اس سلسلہ میں ہم کیا مطالب عرض کرنا چاہتے ہیں، آج جس حد تک خداوندعالم کی مدد شامل حال رہی ہے اس بحث کی اہمیت اور موجودہ معاشرہ میں اس کی ضرورت پر گفتگو کریں گے۔

اسلامی انقلاب کے ساتھ مغرب و مشرق کا رویہ

اس بحث کی اہمیت اور ضرورت کو واضح کرنے کے لئے ہم مجبور ہیں کہ ادھر آخری دور میں اپنے ملک اور اسلامی ممالک کی تاریخ پر ایک نظر ڈالیں، چنانچہ جیسا کہ آپ حضرات جانتے ہیں کہ تاریخ کے ہر دور میں دنیا پرست، تسلط پسند، اقتدار طلب، طاقت کے نشہ میں چور افراد ہمیشہ زیادہ تر فتنہ و فساد کے باعث رہے ہیں اور آج بھی ہیں، جس قدر انسان کی زندگی زیادہ ماڈرن اور متمرکز ہوتی جارہی ہے اور معاشرتی نظام، قاعدۂ و قانون اور متعلقہ علوم کی بنیاد پر ترقی کی طرف گامزن ہیں، سرگرمیاں بھی اسی اعتبار سے علمی قواعد و ضوابط کے تحت اور زیادہ استوار دقیق ہوتی جارہی ہیں۔

بہر حال دوسری جنگ عظیم کے بعد دنیا کی دو بڑی طاقتیں مغرب کے سرمایہ دارانہ بلاک اور مشرق کے مارکسسٹ اور کمیونسٹ بلاک کی شکل میں موجود ہیں اور جنگ کے ذریعہ انہیں جو کامیابیاں ملی تھیں دونوں نے کوشش کی کہ اپنا اقتدار قوموں پر مسلط کردیں اور اپنے مقابلے میں کسی اور قوت کو جو قد علم کرسکے اور اپنے پاؤں پر کھڑی ہوسکے اُسے ابھرنے کا موقع نہ دیں، دوسری طرف پوری تاریخ میں جن لوگوں نے ان فتنہ گر مفسدوں کے مقابلہ میں آواز بلند کی ہے وہ انبیاء اور ان کے پیرو رہے ہیں یہ وہ دیندار لوگ ہیں جو

کسی بھی قیمت پر کسی بھی زمانہ میں ستم گروں اور ظالموں کے سامنے تسلیم نہیں ہوئے، اسی وجہ سے ظالموں اور ستمگروں نے ہمیشہ انبیاء اور ان کے پیرووں کو اپنا دشمن سمجھا ہے اور ان کے ساتھ ظالمانہ سلوک کیا ہے۔

لیکن دوسری جنگ عظیم کے بعد اور اس کے بعد کہ یورپ میں دینی اقتدار کا مظہر کلیسا تھا میدان سے پوری طرح خارج ہوگئیوہ گمان بھی نہیں کرسکتے تھے کہ دنیا میں ان کی طاقتوں کے مقابل کوئی طاقت وجود میں آئے۔

یہاں تک کہ بیسویں صدی کی آخری تین دہائیوں میں انھوں نے غیر یقینی طور پر مشرق وسطیٰ یعنی ایران میں ایک حیرت انگیز انقلاب آنکھوں سے دیکھا، شروع میں تو یہ سونچا کہ ایران کی یہ تحریک بھی دوسری اسلام نواز محدود تحریکوں کی طرح ایک تحریک ہے جو کبھی کبھی اسلامی ممالک کے گوشہ و کنار میں سر ابھارتی ہے کہ جس کو آسانی سے کچل دیا جائے گا، انھوں نے یہ سوچا تھا کہ ہم اپنے مخصوص طریقوں سے اُن تجربات کے ذریعہ جو انھیں حاصل ہیں اس تحریک کو بھی جڑ سے اکھاڑ پھینکیں گے، لیکن جیسے جیسے زمانہ گذرتا گیا انھوں نے دیکھا کہ یہ تحریک دوسری تحریکوں سے بہت زیادہ مختلف ہے۔

بالآخر ایران کی اسلامی تحریک کے نتیجہ میں اس علاقے میں ایک ایسی بڑی طاقت رونما ہوئی کہ جس نے نہ تو مشرق و مغرب کے کسی بھی بلاک پر بھروسہ کیا اور نہ ہی فوجی بغاوت جیسی سرگرمیوں کے ٹکراؤ کا سہارا لیا، پھر بھی مغرب کے آلہ کار ایک خود سر حکمراں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کردیا اور اس کے بعد ایران میں ایک اسلامی حکومت تشکیل دیدی۔

ظاہر ہے اسلام دشمن طاقتوں کے پاس، دینداری سے جنگ کا جو کچھ بھی تجربہ تھا وہ سب یہاں پر بھی مختلف سرگرمیوں اور سازشوں کی شکل میں انقلاب اسلامی کی نابودی کے لئے بروئے کار لائے مگر کامیاب نہ ہوسکے، آپ حضرات کے سامنے تفصیل بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے ہم ان سازشوں کی طرف فقط اشارہ کرتے ہوئے گذرنا چاہتے ہیں۔

شروع میں اندرونی جنگ و کشمکش کی راہ اپنائی اور چاہا کہ یہاں ایک ایسی فوجی حکومت تشکیل دیں جو مغرب کے لئے کام کرے، لیکن انھوں نے دیکھا کہ عوام کی طاقت وقدرت اس سے کہیں زیادہ ہے کہ جسے خود باختہ گروہوں کی مخالفت انقلاب اسلامی کے لئے کوئی خطرہ ایجاد کر سکے یہاں تک کہ مختلف حربے استعمال کئے منجملہ یہ کہ ایران کے خلاف پروپگنڈہ مہم سے کام لیا، اقتصادی پابندی لگائی، عراق کے ذریعہ آٹھ سال کی طویل جنگ تھوپی، ان تمام حربوں کے ذریعہ وہ انقلاب اسلامی کو جھکنے پر مجبور کرنا چاہتے تھے لیکن خدا کے فضل سے کسی طرح بھی کامیاب نہ ہو سکے۔

جوانوں کے خلاف طویل المدت ثقافتی سازش

چونکہ دشمنوں کو کسی بھی میدان میں کامیابی نہیں مل سکی تو اُن کی امید اس بات سے وابستہ ہو گئی کہ ایران میں ایک طویل مدت ثقافتی پروگرام پر کام کیا جائے، چنانچہ اس پروگرام کے تحت انھوں نے مختلف طریقوں سے ملک میں اثر رسوخ کرنا چاہا (کیونکہ اس سلسلے میں ان کے پاس کافی تجربہ موجود تھا) ان کی کوشش تھی کہ ایک ایسا مرکز بنایا جائے کہ جس کے ذریعہ اپنے افکار ونظریات کی نشر واشاعت کی جا سکے اور اس مرکز کے ذریعہ ملت کے مختلف طبقوں تک اپنی تشہیراتی لہریں پہونچائی جائیں تاکہ آہستہ آہستہ اپنی مرضی کے مطابق ماحول تیار کریں، ظاہر ہے کہ اس سلسلے میں بھی اُن کے اندازے دوسرے پروگراموں کی طرح علمی نیز حساب وکتاب کے تحت ہیں۔

چنانچہ جب انھوں نے دیکھا کہ انقلاب کی نسل جوانی سے بڑھاپے کی طرف بڑھ رہی ہے، اور مستقبل جوانوں کے ہاتھوں میں ہے (وہ جوان کہ جو نہ تو شاہ کے ظلم وستم سے صحیح طریقہ سے آگاہ ہیں اور نہ ہی انقلاب سے پہلے اور اس کے بعد اسلامی سرفروشوں کی جاں نثاریوں سے باخبر ہیں، صرف اپنی خواہشوں کے پیرو ہیں۔

وہ خواہشیں جو کبھی مادی مطالبات اور کبھی نفسانی ہوس کا رنگ اختیار کرلیتی ہیں، بیشک ان جوانوں میں جن کی اس وقت اکثریت ہے ممکن ہے وہ کسی طرح اثر و رسوخ پیدا کرلیں اور آہستہ آہستہ چند دہائیوں میں شاید ایک ایسی حکومت کے لئے راہ ہموار کرلیں جو ان کے مفادات کے لئے کام کرے البتہ وہ اپنا یہ پروگرام کہاں سے شروع کریں اور کس طرح اثر و رسوخ پیدا کرکے جوان نسل کے افکار و عقائد تبدیل کردیں تاکہ ان کے شرمناک مقاصد کے لئے زمین فراہم ہوجائے، انھوں نے اُن اسباب کا گہرائی سے مطالعہ کیاہے کہ آخر اس قدر لوگ کیوں حکومت اسلامی کے حامی اور وفادار ہیں کہ تمام مشکلات، پریشانیاں، کمیاں کوہتائیاں، مہنگائی، بموں اور میزائلوں کے حملے اور دوسری سختیاں سب کچھ بر داشت کررہے ہیں پھر بھی حکومت اسلامی کی حمایت سے باز نہیں آتے، اور پھر دشمن اس نتیجہ پرپہنچے ہیں کہ اس عمومی حمایت کی جڑیں لوگوں کے دینی اعتقادات میں پیوست ہیں۔

ثقافتی سازشوں کے تین نشانے

چونکہ ایرانی عوام اہل بیت علیہم السلام کے مکتب کے پیرو ہیں اور انھوں نے ائمہ علیہم السلام مخصوصاً سید الشھدا امام حسین علیہ السلام کی سیرت کو اپنے لئے نمونہ عمل بنایا ہے، اور یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ اسلام کے لئے اپنی جان، مال اور عزیزوں کو بھی قربان کیا جاسکتا ہے، اور یہ اعتقاد دلوں میں راسخ ہے اور اس طرح دودھ کے ساتھ پلایا گیا ہے کہ جب تک زندہ ہیں یہ ان کی جان کے ساتھ وابستہ ہے مگر دشمن اس عقیدہ کو کمزور کرنا چاہتے ہیں،

دشمن وہ کام کرنا چاہتے ہیں کہ آئندہ کی نسلیں مذہبی حکومت کی اس طرح عاشق اور فریفتہ نہ رہیں اور ایسے افکار جوانوں میں پھیلادیں کہ ان کے اعتقادات اسلامی حکومت اور اس کے ذمہ دار افراد کے سلسلہ میں کمزور پڑ جائیں، کیونکہ عوام اور جوانوں کا اعتقاد یہ ہے کہ دین کو حاکم ہونا چاہئے، اور حکومت کی باگ ڈور مذہبی علماء، دانشور اور دیندار افراد کے ہاتھوں میں ہونا چاہئے کہ جن میں سر فہرست

ولی فقیہ ہے اور جب تک یہ عقیدہ جوانوں میں راسخ ہے اس حکومت اسلامی کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا، اور نہ ہی اس نظام کو سرنگوں کیا جاسکتا۔

پس یہ اعتقاد ختم ہونا چاہئے لیکن کس طرح؟ ظاہر ہے افکار کی نشر و اشاعت ایک روشن فکر طبقہ کے ذریعہ ممکن ہوسکتی ہے، لہٰذا کوشش کی گئی کہ یونیورسٹی اور ثقافتی مراکز کے درمیان ایک اپنا مرکز قائم کریں، کچھ افراد کو آگے بڑھائیں فریب میں مبتلا کریں اور ابھاریں کہ ان کے افکار کو معاشرہ میں پھیلائیں تاکہ آہستہ آہستہ اس طرح کے افکار پھیلنے سے کم از کم لوگوں کے دلوں میں خصوصاً جوان طبقہ میں شک و شبہ پیدا ہوں اور اسلامی حکومت اور ولایت فقیہ کی نسبت ان کے عقائد کو کمزور اور پھسپھسے ہوجائیں، جوانوں میں حکومتِ اسلامی کی نسبت عقیدہ کمزور کردینا ان کا آئیڈیل ہے کیونکہ اگر ان کے دلوں میں شک پیدا ہوگیا تو پھر کوئی ۱۳ سالہ نوجوان کمر میں بم باندھ کر ٹینک کے نیچے نہیں جائے گا، یہ کام تو اسی وقت ہوسکتا ہے کہ جب آخرت، حساب وکتاب پر عقیدہ و ایمان ہو اور اپنے راستہ کے صحیح ہونے کا یقین اوراس کے اقدار و معیارات کی اہمیت سے واقف ہو، لیکن اگر شک پیدا ہوگیا تو اس بات کے لئے کافی ہے وہ ایک قدم آگے بڑھائے اور پھر پیچھے ہٹ جائے اور یہ شک و شبہ کی حالت دشمن کے مقاصد کی تکمیل کے لئے کافی ہے۔

ان ہی مقاصد کی راہ میں اپنے فریب خوردہ آلہ کاروں کی مدد سے اور ماضی تاریخ میں اپنے کامیاب تجربوں کی بنیاد پر ان لوگوں کو کہ جن کے عقائد و نظریات میں لچک اور کمزوری پائی جاتی ہے مخفیانہ طور پر انہیں فریفتہ کرکے اپنے مقاصد کی طرف متوجہ کیا اور چند موضوعات کو محور بنا کر اپنا کام شروع کردیا۔

الف: دین اور سیاست میں جدائی کی فکر عام کرنا ان سرگرمیوں کا سب سے پہلا نقطہ دین کو سیاست اور حکومت سے جدا کرنا ہے اس کے پروپگنڈے کے لئے راستہ کافی حد تک ہموار تھا کیونکہ صدیوں سے مغرب اور یورپ میں اس موضوع پر کافی کام ہوچکا تھا

بہت سی کتابیں لکھی گئی اور وسیع پیمانے پر تحقیقات کی گئی تھیں جس کے نتیجہ میں مغربی ممالک میں یہ فکر رائج ہو چکی ہے کہ دین سیاست سے الگ ہے اور مغربی معاشروں میں سیکولرزم کا مسئلہ اپنی جگہ بنا چکا ہے۔

انہوں نے سوچا کہ اپنے اس ہدف کو حاصل کرنے کے لئے یہاں بھی کوئی راستہ نکالنا چاہئے تا کہ کم از کم کچھ لوگوں میں یہ عقیدہ پھیل جائے کہ دین کا مسئلہ سیاست سے جدا اور الگ ہے۔ البتہ اس کے لئے تھوڑی بہت زمین پہلے سے ہموار تھی کیونکہ انقلاب میں جن لوگوں نے سرگرم کردار ادا کیا تھا اور انقلاب کے بعد بھی حکومت کے عہدوں پر فائز تھے اُن میں ایسے افراد بھی تھے جن کا اعتقاد یہ تھا کہ دین اور سیاست کے درمیان سرحدیں حائل ہیں چنانچہ انہوں نے اس موضوع پر تقریریں بھی کیں، اور کتابیں بھی لکھیں اور اس نظریہ کی مزید تقویت، ان تہذیبوں کے ذریعہ ہوئی جو مغربی ممالک میں کارگر ہو چکی تھیں، یہ کوئی مشکل کام نہ تھا۔

پس معلوم ہوا کہ دشمن کی ثقافتی سرگرمیوں میں سے ایک چیز دین کو سیاست سے جدا کرنے کی فکر فروغ دینا ہے، یقیناً اس فکر سے تمام لوگ متاثر نہیں ہو سکتے، کیونکہ جن حضرات نے اس اسلامی حکومت کے لئے اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کو قربان کیا ہے، مالی قربانیاں پیش کی ہیں، اور تمام مشکلات کو برداشت کیا ہے، آسانی سے اس فکر سے متاثر نہیں ہوں گے، خاص طور پر اس لئے بھی کہ ابھی تک ان کے کانوں میں امام خمینیؒ کی دل نشین آوازیں گونج رہی ہیں، اور آیت اللہ مدرس مرحوم کی یہ آواز کہ '' دیانت ما عین سیاست ما است '' (ہماری دینداری ہی ہماری سیاست ہے) اتنی جلدی نہیں بھلائی جا سکتی۔

ب: ولایت فقیہ کا انکار دشمنوں اور مغرب زدہ روشن فکروں کی سرگرمیوں کا دوسرا محور ملت کے ذہن میں یہ شبہ ایجاد کرنا ہے کہ اگر سیاست اور اجتماعی کاموں میں دین کی مداخلت قبول بھی کر لیں اور مان لیں کہ معاشرہ میں اسلامی احکامات پر عمل درآمد اور سیاسی امور میں بھی مذہبی معیارات کی طرف توجہ ضروری ہے پھر بھی اسلامی حکومت کا مطلب فقہاء کی حکومت نہیں ہے بلکہ اسلامی پارلیمنٹ میں جو قوانین پاس ہوں اُن کے لئے ایک فلٹر کافی ہے کہ بعض قوانین دین کے خلاف نہ ہوں، یہی کہ قوانین خلاف دین نہ

ہوں حکومت کے مذہبی ہونے کے لئے کافی ہے کیونکہ اس صورت میں تمام قوانین دین کے مطابق عمل میں لائے جائیں گے اور اسلامی حکومت کا مطلب اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔

معلوم ہوا دشمن کی سیاست کا دوسرا محور یہ ہے کہ کہ اگر تمام لوگوں کو اس بات پر قانع نہ کیا جا سکے کہ دین سیاست سے الگ ہے، ہم کہیں گے: ہاں دین اور سیاست باہم تو ہیں لیکن دینی حکومت کا مطلب یہ ہے کہ دینی احکام نافذ ہوں، لیکن ان احکام کا نافذ کرنے والا کون ہے؟ اس مسئلہ کا دین سے کوئی ربط نہیں ہے، احکام دین جاری کرنے کے لئے عوام جس کا انتخاب کردیں گے اسی کو مذہبی حکمراں کہا جائے گا، پس ایک حکومت کے اسلامی ہونے کا مطلب اسلامی قوانین کی حکمرانی ہو، نہ یہ کہ حاکم، متدین مومن اور فقیہ ہو یعنی دین کا سیاست میں دخیل ہونا تو قبول کرتے ہیں لیکن دینی احکام کا نافذ کرنے والا بھی مجتہد ہو اس کو قبول نہیں کرتے، دوسرے لفظوں میں حکومت کا سربراہ ولی فقیہ ہو یہ قابل قبول نہیں ہے۔

بلا شبہ ولایت فقیہ کے نظریہ اور تھیوری سے اسلامی حکومت کو الگ کردینے میں انھوں نے بہت کام کیا ہے اور اس وقت بھی ان کی سرگرمیاں جاری ہیں مختلف اخباروں حتی کثیر الاشاعت اخباروں اور رسالوں میں مختلف طریقوں سے مختلف مطالب شایع کئے جارہے ہیں، اس موضوع پر یونیورسٹیوں اور دوسرے مراکز میں جلسے کرتے رہتے ہیں تاکہ دیندار طبقوں میں جواب بھی دین کے سیاست سے جدا نہ ہونے کا نظریہ رکھتے ہیں یہ فکر ڈالیں کہ اسلامی حکومت تو قابل قبول ہے لیکن ولایت فقیہ اور مذہبی حکومت لازم و ملزوم نہیں ہے۔

اس قسم کی تبلیغی سرگرمیاں، اسلامی احکامات اور فقہی بنیادوں سے کامل آشنائی نہ رکھنے والے جوانوں میں موثر ہوسکتی ہیں خصوصاً اگر اس سلسلے میں ثقافتی وسائل بھی فراہم ہوں اور وسیع سطح پر اس کے لئے پروپگنڈہ کیا جائے، لیکن اب بھی معاشرہ میں ایسے افراد موجود ہیں جن پر اس طرح کی تبلیغات کا کوئی اثر نہیں ہوتا، اور ولایت فقیہ کو جسے اسلامی جمہوریہ ایران کے آئین میں بھی اصلی محور

قرار دیا گیا ہے، اپنی فکری، علمی زندگی کا ستون قرار دیتے ہیں اور یہ کہ دنیا بھر میںیہ انقلاب بجا طور پر ،انقلابِ ولایت فقیہ، اور حکومت، حکومتِ ولایت فقیہ کے نام سے مشہور ہے اس پر ایمان رکھتے ہیں۔

ج۔ ولایت فقیہ کی شکل بگاڑنا ظاہر ہے جو لوگ ولایت فقیہ کے قائل ہیں ان کے درمیان ان لوگوں نے اثر و رسوخ کا ایک دوسرا طریقہ انتخاب کیا، وہ یہ کہ ان لوگوں کو سمجھایا جائے کہ ولایت فقیہ کی بہت سی شکلیں ہوسکتی ہیں اور ولایت فقیہ کی یہ شکل جس کا ایران میں نفاذ کیا گیا ہے درست نہیں ہے، اس پر نظر ثانی کی جانی چاہئے اور یہ ولایت جو ایران میں نافذ ہے صحیح نہیں ہے، کیونکہ یہ ڈیموکریسی کے اصول اور لبرلزم کے ساتھ میل نہیں کھاتی، لہٰذا ایک ایسا طریقہ اپنانا چاہئے کہ ولایت فقیہ کا نظریہ جمہوریت اور دور حاضر میں رائج معیارات کے ساتھ ہم آہنگ ہوجائے، پس دشمن کی فکری سرگرمیوں کا تیسرا محور جمہوری اسلامی ایران میں رائج ولایت فقیہ کا چہرا بگاڑنا ہے۔

اب تک کی بحث کا خلاصہ یہ نکلا کہ فکر و نظر کے دائرے میں دشمن اور عالمی استکبار کی تمام تر کوشش یہ رہی ہے کہ تین طریقوں سے اس اسلامی حکومت کو کمزور کردیا جائے اگرچہ انھوں نے عملی میدان میں بھی مخصوص پروگرام ترتیب دیئے ہیں اور اس وقت بھی ان پر عمل درآمد جاری ہے لیکن وہ طویل مدت منصوبے جن کے لئے اُن کو توقع ہے کہ آئندہ نسل ان کو قبول کرلے گی وہ ایک فکری منصوبہ ہے۔

اس فکری پروگرام کا پہلا مرکزی نقطہ دین کو سیاست سے الگ کرنا ہے ان کو امید ہے کہ ایک طبقہ اس کو قبول کرلے گا۔ دوسرا نقطہ نظریہ ہے کہ دین سیاست سے جدا نہیں ہے لیکن اسلامی حکومت اور ولایت فقیہ دو الگ چیزیں ہیں، یہ نظریہ بھی ایک طبقہ میں قابل قبول ہوسکتا ہے۔

تیسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ جو لوگ ولایت فقیہ پر ایمان راسخ رکھتے ہیں ان میں یہ نظریہ رائج کریں کہ ولایت فقیہ قابل قبول ہے لیکن ایران میں جو ولایت فقیہ ہے اس کی موجودہ صورت کو تبدیل ہونا چاہئے، خلاصہ یہ کہ دشمن ہر ممکن ذریعہ سے کوشش میں ہے کہ جوانوں کے درمیان شک وشبہ پیدا کرے تاکہ اس نظام اور اس کے معیارات کے سلسلے میں ان کے اعتقادات کمزور پڑ جائیں، اوراگر ایسا ممکن ہوگیا تو اسلامی معاشرہ میں عالمی استکبار کے اثر و رسوخ کے لئے راستہ ہموار ہوجائے گا حتی اسلامی حکومت میں اُن کے لئے راہیں کھل جائیں گی۔

جو لوگ ان تینوں نظریات میں سے کسی ایک کا بھی شکار ہوگئے ہیں سمجھ لیجئے وہ کسی بھی جگہ ہوں، کسی بھی مقام و حیثیت کے حامل ہوجائیں، معاشرے کے کسی بھی طبقے میں پائے جاتے ہوں، عالمی استکبار کے لئے مددگارثابت ہوسکتے ہیں، اور ان کے اغراض ومقاصد کے حصول میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔

۴۔دشمن کی تین رخی سازشیں اور ہماری ذمہ داریاں اس بات کے پیش نظرکہ دشمن نے ان تینوں نقطوں پر اپنی پوری طاقت لگا رکھی ہے لہذا وہ حضرات جواس حکومت کودل وجان سے چاہتے ہیں (کہ الحمد للہ لوگوں کی اکثریت اس حکومت کو دل وجان سے چاہتی ہے جس کے نمونہ وہ عظیم مظاہرے ہیں جو موقع بہ موقع ہوتے رہتے ہیں اور تمام دنیا کو تعجب میں ڈال دیتے ہیں) سب کو ہوشیار رہنا چاہئے کہ دشمن ان تینوں طریقوں سے انکے درمیان جگہ نہ بنا سکے، کوشش کریں کہ روز بروز یہ عقیدہ اور زیادہ مستحکم ہوکہ دین سیاست سے جدا نہیں ہے، اس بات کا یقین رکھیں کہ اگر دوسرے مذاہب سیاست سے جدا ہوں تو ہوں،لیکن مذہب اسلام سیاست دین سے جدا نہیں ہے۔

دوسرے یہ کہ اپنے ذہنوں میں یہ بات اچھی طرح راسخ کرلیں کہ حکومتِ اسلامی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ صرف پارلیمنٹ میں تصویب شدہ قوانین اسلامی ہوں یا یہ کہ اسلام مخالف نہ ہوں،بلکہ اسلامی حکومت اس اصول پر قائم ہو کہ قانون کا نفاذ کرنے والے بھی

اسلام کے عاشق ہوں، اسلام کی معرفت بھی رکھتے ہوں، اور احکام الٰہی کے نفاذ کی بہترین صلاحیت رکھتے ہوں ورنہ اگر قانون کاغذ پر لکھا ہو اور اس کو نافذ کرنے والے ان قوانین کاپاس ولحاظ نہ کریں تو اس سے معاشرہ کو کیا فائدہ حاصل ہوگا؟ کیا گزشتہ شاہی زمانے میں آئین کے تحت ایران کا سرکاری مذہب شیعہ نہیں تھا؟ لیکن قانون کس حد تک اسلام مخالف کا خواہشات کے غلام حکمرانوں کی رفتار میں موثر ثابت ہوسکا؟!

اگر قوانین صرف کاغذ پر لکھے ہوئے ہوں اور ان پر عمل درآمد کرنے والا مومن، دیندار، طاقتور و شجاع شخص نہ ہو تو اس کا کوئی فائدہ نہ ہوگا، لہٰذا اگر اسلامی پارلیمنٹ میں اسلامی قوانین پاس ہوں لیکن جس شخص کے ہاتھ میں اقتدار ہے اس قانون سے زیادہ دلچسپی نہ رکھتا ہو اور اس قدر مذہبی فکری قوت نہ رکھتا ہو کہ ان قوانین کو جاری کر سکے، تو ان قوانین پر عمل در آمد کی کوئی ضمانت نہیں ہوگی، پس ہماری دوسری ذمہ داری یہ ہے کہ روز بروز ولایت فقیہ کے اصول پر اپنے اعتقاد کو مزید پختہ کریں اور اس نظریہ کو محکم دلیلوں کے ساتھ اس طرح بیان کریں کہ ہمارے یقین میں بھی اضافہ ہو اور آئندہ نسلوں کو بھی یہ باور کرا سکیں کہ صرف ولایت فقیہ کے سایہ میں اسلامی حکومت کی بقا ممکن ہے۔

ان دو مرحلوں کے بعد تیسرے مرحلے میں یہ دیکھنا ہے کہ آیا ولایت فقیہ کی موجودہ شکل جو ایران میں گزشتہ دو دہائیوں سے رائج ہے وہی ولایت فقیہ ہے جو مکتب اہل بیت علیہم السلام میں بیان ہوئی ہے یا یہ کہ اس کی شکل بدلنے کی ضرورت ہے؟ یہ تیسرا مرحلہ ایک فرعی مسئلہ ہے کہ جو گذشتہ دو مرحلوں کے بعد بیان کیا جانا چاہئے لہٰذا پہلے ان دو مرحلوں پر بحث کرنا ضروری ہے اور اسی بنیاد پر ہماری یہ بحث اسلامی نظریۂ سیاست کے تحت ترتیب دی گئی ہے۔

۵۔ ایک مناسب روش دشمن کی سازش کے مقابل ضروری ہےمذکورہ مطالب سے واضح ہوجاتا ہے کہ دشمن نے اپنی سیاسی سرگرمیاں تین سازشوں پر مرکوز کر رکھی ہے:

۱۔دین کوسیاست سے جدا کرنا۔

۲۔اسلامی حکومت کو ولایت فقیہ سے جدا کرنا۔

۳۔ایران میں ولایت فقیہ کی کارکردگی میں شک و شبہ ایجاد کرنا۔

لہٰذا فطری طورپر ہم تین گروہوں سے روبرو ہوں گے، ایک وہ جو خیال کرتے ہیں کہ دین سیاست سے جدا ہے یعنی دین کا دائرہ مساجد، امامباڑے اور مقدس مقامات تک محدود ہے اور سیاست وحکومت کا تعلقمعاشرہ سے ہے، لہٰذا ان لوگوں سے مقابلے کے لئے ہمیں بحث کا ایک خاص راستہ اپنانا پڑے گا۔

اور وہ لوگ جو مذہب کی حکومت کو قبول کرتے ہیں لیکن دینی احکام کے نفاذ کے سلسلے میں اختلاف رکھتے ہیں، ان لوگوں سے بحث کرنے کا طریقہ بھی دوسرا ہوگا، جیسا کہ اگر فرض کیجئے دینی مسائل میں کوئی خدا کا قائل نہیں ہے تو اس سے بحث اس طرح شروع کی جائے گی کہ پہلے خدا کا وجود کا اثبات ہوسکے اوراس کے بعد نبوت عامہ (تمام انبیاء کی نبوت) اور نبوت خاصہ یعنی حضرت محمد مصطفی کی نبوت کے بارے میں بحث کی جائے گی لیکن جو شخص خدا کی الوہیت اور بعض انبیاء کی نبوت کو قبول کرتا ہو اور حضرت محمد مصطفیؐ کی نبوت کا منکر ہو اس کے ساتھ نبوت خاصہ کے اثبات سے بحث شروع کی جائے گی۔

ظاہر ہے جو لوگ خداکی وحدانیت کے قائل ہیں لیکن پیغمبر اکرمؐ کی نبوت قبول نہیں کرتے تو ان کے سامنے آنحضرتؐ کی نبوت ثابت کرنے کے لئے ضروری نہیں ہے کہ پہلے خدا کے اثبات سے بحث شروع کی جائے کیونکہ وہ یہ مرحلہ طے کرچکے ہیں اور

مانتے ہیں کہ ایک خدا ہے اور اس نے انسانوں کی ہدایت کے لئے انبیاً کو بھیجا ہے. اسی طرح دوسرے مسائل میں بھی ہمیں مناسب راستے اپنانے ہوں گے،بلاشبہ جس موضع پر بھی بحث کرنا چاہیں اس کے کچھ اصول اور مقدمات ہوتے ہیں ایمانی مدارج کے لحاظ سے بعض کو لوگ قبول کرتے ہیں اور بعض کو قبول نہیں کرتے، اور بعض بالکل ابتدائی مراحل میں ہوتے ہیں کچھ بھی قبول نہیں کرتے۔

لہٰذا مذکورہ تینوں نقطۂ نگاہ کے تحقیقی جائزے میں ہمیں بھی کئی پہلوؤں سے بحث کرنا ہوگی، اور اُن کے لئے مختلف روش (Method) درکار ہے یعنی ممکن ہے بعض جگہ فقط عقلی دلیلوں کے ذریعہ اپنا مدعا ثابت کریں اور جو کچھ انسان کی عقل درک کرتی ہے اس کے علاوہ کسی اور چیز کا سہارا نہ لیں، اس صورت میں معیار عقلی دلیلوں اور برہانوں کو قرار دیں گے جیسا کہ اگر کوئی خدا کو نہ مانتا ہو اور اس کے سامنے خدا کے وجود کوثابت کرنا ہو تو ایسے موقع پر قرآن اور معصومین علیہم اسلام کی احادیث کو بنیاد بنانا بے فائدہ ہے وہ خدا کو ہی نہیں مانتا ، قرآن وحدیث کی کیا بات ہے!اس کو سمجھانے کے لئے فقط عقل کا سہارا لینا پڑے گا اور عقلی مسلمات اور دلیلوں کے ذریعہ خدا کے وجود کوثابت کرنا ہوگا۔

جن لوگوں نے مذہبی حکومت کو قبول کرلیا ہے ایک قدم طے کرچکے ہیں ان لوگوں سے بحث کے لئے ایسا راستہ اپنا ناپڑے گا جو ان کے اپنے دین کی تعلیمات سے جو وہ قبول کرتے ہیں ہم آہنگ ہو، ان کے سامنے وہ دلیلیں پیش کریں کہ جن میں دینی مطالب بیان ہوئے ہیں،یعنی ان کو قائل کرنے کے لئے قرآن و حدیث دینی روایات اور تاریخی شواہد کا حوالہ دینا ہوگا۔

اور جب حکومت کی کارکردگی پر بحث ہوگی تو پھر تاریخی شواہد اور ثبوت کو مد نظر رکھ کر بحث کی جائے گی،یہاں پر صرف حدیث و روایت اور تعبدی احکام سے کام نہیں چلے گا بلکہ ہمیں عملی اقدامات، اور روش ورفتار کا جائزہ لے کر فیصلہ کرنا ہوگا۔
اب جبکہ واضح ہوگیا کہ ہماری بحث مختلف پہلو رکھتی ہے تو ہم صرف ایک روش پر اکتفاء نہیں کرسکتے مختلف طریقوں سے کام لیں گے، بعض پہلوؤں پر عقلی طریقہ سے بحث ہوگی اور بعض پہلوؤں پر قرآن و حدیث اور شرعی دلیلوں کی روشنی میں بحث ہوگی، اور

بعض پہلوؤں کے لئے ہمیں تاریخی شواہد کا سہارا لینا پڑے گا، ہم نے اس کی وضاحت اس لئے ضروری سمجھی کہ ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ یہ بحث عقلی ہے یا نقلی؟ لہٰذا پہلے ہی ہم نے یہ عرض کر دینا مناسب سمجھا کہ ہماری بحث مختلف پہلوؤں کی حامل ہے اور بحث کے ہر پہلو کا اس کے مناسب حال طریقہ سے ہم تحقیق کریں گے۔

۶۔ دین کی تعریف اور اس کا دائرہ یہاں ایک اور اہم مسئلہ بھی ہے جس پر ایک مستقل موضوع کی حیثیت سے جداگانہ بحث ہو سکتی ہے لیکن اس وقت ہم اس کی طرف صرف ایک اشارہ کر دینا کافی سمجھتے ہیں: بحث اس بات پر ہے کہ بنیادی طور پر دین کا دائرہ کہاں تک مناسب ہے؟ جب ہم اس بات کا جائزہ لینا چاہتے ہیں کہ حکومت اور دین میں رابطہ ہے یا نہیں؟ اور دین و سیاست کا جدا کرنا صحیح ہے یا نہیں؟۔

تو سب سے پہلے خود دین کی معرفت ضروری ہے، دین کیا ہے دین کی صحیح تعریف ہم کو معلوم ہونا چاہئے تاکہ اس کی بنیاد پر ہم اس کا دائرہ معین کر سکیں، اس منزل میں بعض لوگوں نے یہ سعی فرمائی ہے کہ خارج از بحث یہ جائزہ لیں کہ آیا دین کی ضرورت کیا ہے؟ اور پھر یہ طے کرتے ہیں کہ انسانی زندگی میں دین کا مقام اوراس کا دائرہ کیا ہے، اس مرحلہ کے بعد دیکھتے ہیں کہ اسلام میں سیاست،دین کا جز ہے یا نہیں؟ ان لوگوں نے اس سلسلہ میں بہت سی بحثیں چھیڑی ہیں، جیسا کہ آپ حضرات بھی یقیناً اس طرح کی بحثوں سے کم وبیش واقف ہوں گے کہ دین سے ہماری توقعات کیا ہیں اور یہ کہ دین سے ہماری امیدیں ادنیٰ ترین درجہ پر ہیں یا وسیع ترین درجہ پر، یعنی کیا دین کا دائرہ انسان کی تمام زندگی کے مسائل پر محیط ہے؟ یا یہ کہ انسانی زندگی کے صرف بعض پہلو اس میں شامل ہیں اور انسانیات کے زیادہ تر مسائل کو عقل، علم و دانش اور لوگوں کی خواہشوں پر چھوڑ دینے کی ضرورت ہے۔

وہ حضرات جو دین کو حکومت سے الگ مانتے ہیں انہوں نے جب دین کی تعریف کرنی چاہی تو ایسی تعریف کی جو سیکولرزم کے عقیدہ کے موافق تھی مثلاً دین کی تعریف یوں کی کہ: ''دین یعنی انسان کا اپنے خدا سے ایک معنوی رشتہ قائم کرنا''، یا اس سے ایک

قدم اور آگے بڑھے اور کہا: ''دین وہ چیز ہے جو انسان کے لئے آخرت میں اگر اُخروی زندگی کا کوئی وجود ہے تو موثراور کارگر ہوسکتا ہے،یعنی دین کا کام انسان کی زندگی کو آخرت سے ہم آہنگ کرنا ہے. ظاہر سی بات ہے اگر دین کی یہ تعریف ہو تو پھر یہ کہنا بہت آسان ہے کہ دین کا سیاست سے کیا رابطہ؟ اپنے خدا سے انسانی رابطہ کے دائرے میں سیاست کا کیا دخل ہے؟ سیاست تو انسانوں کے درمیان ایک دوسرے سے رابطہ کو واضح کرتی ہے،اور دین کے دائرے سے خارج ہے،اسی طرح سیاست کا انسان کی دنیوی زندگی سے تعلق ہے اور اس کا عالم آخرت سے کوئی رابطہ نہیں ہے، علاوہ از این اگر دین کے دائرہ میں صرف وہ چیزیں آتی ہیں جن کو انسان کی عقل سمجھنے سے قاصر ہے تو جہاں عقل خود فیصلہ کرسکتی ہے وہاں دین کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے کیونکہ دین کا دائرہ وہیں تک محدود ہے کہ جہاں عقل کی رسائی ممکن نہ ہو ۔

اب اگر ہم نے دین کی تعریف کرنے میں اس کے دائرہ کو محدود کردیا اور اس بات کے قائل ہوگئے کہ جن مسائل کو ہماری عقل حل کرسکتی ہے وہاں دین کی کوئی ضرورت نہیں ہے، ہم کو دین کی ضرورت صرف ان مسائل میں ہے کہ جہاں ہماری عقل مسائل کو سمجھنے اور ان کو حل کرنے سے عاجز ہو، تو بلاشبہ جیسے جیسے زمانہ گزرتا جارہا ہے اور انسان ترقی کررہا ہے دین کی ضرورت کم ہوتی جائے گی؛ کیونکہ اس بنیاد پر دین کی ضرورت صرف وہاں ہے جہاں عقل مسائل کو سمجھنے اور حل کرنے سے عاجز ہے ۔

شروع میں جب انسان کوئی خاص علم و تمدن نہیں رکھتا تھا،اس کو دین کی ضرورت زیادہ تھی،چونکہ وہ خود اپنی عقل سے مسائل کو حل نہیں کرسکتا تھا لہٰذا اس کو دین کی زیادہ ضرورت تھی، آہستہ آہستہ دین کی ضرورت کم ہوتی گئی،اور اب اس زمانہ میں انسان کے لئے دین کی ضرورت تقریباً نہیں کے برابر ہے، ہاں بعض جزئی مسائل میں جن کو عقل انسانی ابھی تک سمجھنے سے قاصر رہی ہے اور امید بھی نہیں ہے کہ زمانہ قریب میں ان کو حل کیا جاسکے گا ۔

انسان دین کی طرف رجوع کرلیتا ہے، (افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ جو لوگ مسلمان ہونے کا دعوٰی کرتے ہیں انھوں نے اپنے شکوک و شبہات کے ذیل میں یہ شکوک ذکر کئے ہیں کہ اس وقت چونکہ عقل بشری کامل ہو چکی ہے، اب دین و وحی اور شرعی قوانین کی ضرورت نہیں ہے) دین کی اس تعریف اور طرز فکر کے مطابق نتیجہ یہ نکلے گا کہ سیاست کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہے،اور جب ہم عقل وشعور اور عقلی استدلالوں کے ذریعہ تمام سیاسی مسائل حل کر سکتے ہیں، تو پھر ہم کو دین کی کیا ضرورت ہے؟

اب تک جو کچھ ہم نے عرض کیا اس سلسلے میں اٹھائے گئے کچھ شکوک و شبہات ہیں، اب ہم ان کے مختصر جوابات عرض کرتے ہیں۔ سب سے پہلے گوش گزار کردیں کہ ان لوگوں نے دین کی جو تعریف کی ہے اس کی بنیاد پر دین فقط اخروی زندگی اور خدا سے انسانی رابطہ برقرار رکھنے کا وسیلہ ہے، ہماری نظر میں یہ تعریف باطل اور ناقابل قبول ہے اور یہ کہنا کہ انسان کے سیاسی مسائل خدا سے کوئی ربط نہیں ہے۔

اور یہ چیزیں خدا کے ساتھ انسان کے رابطہ کے دائرے سے خارج ہیں، یہ دین کی حقیقت سے ناواقفیت کی دلیل ہے، دین کا مطلب ہے انسان کی صحیح روش و رفتار، اس طرح کہ جس طرح خدا چاہتا ہے اگر انسان اپنے اعتقاد میں معیارات کے انتخاب میں اور اپنی شخصی و اجتماعی زندگی میں خدا کی مرضی کے مطابق عمل کرے تو یہ شخص دیندار ہے اور اس کے مقابل اگر انسان کا عقیدہ خدا کی مرضی کے خلاف ہو اور ایسے معیار و اصول کے خلاف ہو جو خدا کی کی نظر میں قابل قبول ہیں اور انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی اوراس کے اعمال و کردار خدا پسند اصول کے خلاف ہوں اور ان سب میں نقص ہو تو اس کا دین بھی ناقص ہوگا، پس معلوم ہوا کہ دین مذکورہ تمام چیزوں پر محیط ہے۔

۷۔ معرفت دین کے لئے دینی سر چشموں کی ضرورت اگر ہم دین کی تعریف کرنا چاہیں تو ہمیں دیکھنا ہوگا کہ دیندار حضرات اور جس نے دین بھیجا ہے دین کی کس طرح تعریف کی ہے؟ ورنہ اگر ہم خود اپنی طبیعت سے دین کی کوئی تعریف کریں اور اپنی من گھڑت

تعریف کی بنا پر ہم یہ کہیں کہ سیاسی اور اجتماعی مسائل دین کے دائرے سے خارج ہیں یا یہ کہ سیاسی واجتماعی مسائل کا دین سے کوئی ربط نہیں ہے تو یہ تعریف ہمارے خود ساختہ دین کی تعریف ہوگی نہ کہ دین کی جو خدا نے بھیجا ہے پس ہمارے لئے ضروری ہے کہ دین خدا کی معرفت اور اس کی تعریف کے لئے خود اپنے ذوق اور خواہش کے مطابق تعریف نہ کریں بلکہ دین کی معرفت اس کی تعلیمات اور دائرہ عمل کی شناخت کے لئے ضروری ہے کہ دینی مطالب وماخذ کا جائزہ لیں۔

ہوسکتا ہے کوئی یہ کہے : میں اسلام کو نہیں مانتا، کیونکہ اسلام کے صحیح ہونے کی جو دلیلیں دی جاتی ہیں وہ ضعیف ہیں یا (نعوذ باللہ) یہ کہے کہ ہمارے پاس اسلام کے جھوٹ اور باطل ہونے پر دلیل موجود ہے، تو اس طرح کے دعوے پر بحث وگفتگو کی جاسکتی ہے، لیکن اگر کوئی اسلام کو قبول کرے اور پھر بھی کہے کہ اسلام وہ ہے جو میں کہتا ہوں نہ یہ کہ جو قرآن، پیغمبرؐ اور ائمہؑ کہتے ہیں اور جس کے مسلمان معتقد ہیں تو یہ بات درست اور منطقی نہیں ہے، اگر کوئی اسلام کے حق یا نا حق ہونے کے بارے میں بحث کرتا ہے چاہے وہ اس کا طرفدار ہو یا اس کا مخالف اس کے لئے ضروری ہے کہ پہلے وہ اسلام کی شناخت اور معرفت حاصل کرے اور بلا شبہ اسلام کی پہچان کے لئے خدا کے فرمان کی طرف رجوع کرنا ہوگا، جو اسلام کا بانی ہے اور جس نے اسلام کو بھیجا ہے، اور قرآن کے ذریعہ اسلام کو سمجھنا پڑے گا اسی حقیقت کے پیش نظر ہم نے کہا ہے کہ دین کی پہچان۔

اس کی تعریف اور اس کی فرمانروائی کے دائرے کو سمجھنے کے لئے دینی منابع، یعنی قرآن وسنت کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے، نہ یہ کہ اپنی مرضی کے مطابق یا کسی امریکی اوریورپی مستشرق کے کہنے کے مطابق (کہ جن کی باتیں ہمارے نزدیک غیر معتبر ہیں) دین کی تعریف کریں۔

اب اگر کوئی مسلمانوں کے اسلام کے بارے میں کچھ کہنا چاہے تو اسے چاہئے کہ اس اسلام کی بات کرے جو قرآن، پیغمبرؐ اور ائمہ علیہم السلام نے بیان کیا ہے، اوراسی اسلام کی بنیاد پر کہ جس کے اصول قرآن وسنت پر استوار ہیں دین کی حقیقت اور اس کی

فرمانروائی کے دائرے کو بیان کرے نہ یہ کہ وہ اسلام جس کو فلاں مستشرق فلاں مؤلف یاایک خاص مقصد رکھنے والے فلاں سیاستداں نے یا فلاں انسائیکلوپیڈیا نے اسلام کی تعریف کی ہے، کیونکہ ایسا اسلام ہمارے کسی کام کا نہیں ہے۔

اسلامِ حقیقی کی طرف رجوع کے بعد ہمیں معلوم ہوگا کہ نہ صرف یہ کہ دین کی فرمانروائی انسانی عقل و فہم پر ختم نہیں ہوتی بلکہ خود عقل کا، اسلامی شناخت کے سرچشموں میں شمار ہوتا ہے، دوسری طرف اگر کوئی عربی زبان سے تھوڑی بھی واقفیت رکھتا ہو (اگرچہ قرآن کی تفسیر سے، چاہے اجمالی طور پر بھی آشنا نہ ہو) جس وقت قرآن کی طرف رجوع کرتا ہے تو یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اسلام نے معاشرتی مسائل کو چھوڑا نہیں ہے بلکہ قرآن نے اسے بیان کیا ہے، پس کس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ دین سیاست سے جدا ہے!

اگر دین وہ ہے جس کو قرآن میں بیان کیا گیا ہے، تو دین میں معاشرتی اور سیاسی مسائل شامل ہیں، اس میں عبادات اور شخصی اخلاقیات کے ساتھ شہری قوانین، جرم و سزا کے قوانین اور بین الاقوامی قوانین سبھی موجود ہیں، اور گھریلو زندگی، شادی بیاہ، اور اولاد کی تربیت، کاروباری معلومات اور تجارت وغیرہ تک کے اصول بیان کردئے گئے ہیں، پس کون سی چیز باقی بچتی ہے جو دین کے دائرے سے خارج ہے قرآن کریم کی سب سے بڑی آیت معاملات، قرض دینے اور رہن رکھنے اور رہن رکھوانے کے بارے میں ہے اگر اسلام وہی دین ہے جو قرآن نے پیش کیا ہے تو کس طرح کوئی کہہ سکتا ہے کہ اسلام کا لوگوں کی معاشرتی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے؟

اگر نکاح وطلاق کے معاملے دین کا جز نہ ہوں، اگر تجارت، رہن خرید وفروخت اور سود کے مسائل دین سے تعلق نہیں رکھتے اگر ولایت کا مسئلہ اور ولی امر کی اطاعت دین کا حصہ نہیں ہے تو پھر دین میں کیا باقی بچتا ہے؟! اور آپ کس دین کی باتیں کرتے ہیں؟ قرآن کریم نے تو مسلسل ان چیزوں کے بارے میں گفتگو کی ہے۔

اگر آپ کہتے کہ وہ دین کہ جس میں سماجی وسیاسی مسائل شامل ہیں ہم اس کو نہیں مانتے!تو ٹھیک ہے نہ مانئے، اسلام کو نہ ماننے والوں کی تعداد کم نہیں ہے، اس وقت بھی بہت سے لوگ اسلام کو نہیں مانتے، ہمارا بھی ان سے کوئی جھگڑا نہیں، اگر وہ چاہتے ہیں تو آئیں اور بیٹھ کر بحث کریں ہم اس اسلام کی جامعیت اور حقانیت کو ثابت کریں گے اوراگر نہیں چاہتے تو جو راستہ چاہیں اپنائیں: (وَقُلِ الْحَقُّ مِن رَبِّكُمْ فَمَن شَاءَ فَلْيُؤْمِن وَمَن شَاءَ فَلْيَكْفُرْ[1]) ''(اے رسول) آپ کہہ دیجئے کہ سچی بات (کلمۂ توحید) تمہارے پروردگار کی طرف سے (نازل ہوچکی ہے) بس جو چاہے مانے اور جو چاہے نہ مانے''۔

لیکن اگر آپ کہتے ہیں کہ ہم اسلام کو قبول کرتے ہیں تو کیوں اسلام میں ان مسائل کے شامل ہونے کا انکار کرتے ہیں؟اوراسلام کے سماجی مسئلے کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں؟ کیا جو کچھ قرآن وسنت میں ہے وہ اسلام نہیں ہے؟آپ نہ نماز کو قبول کرتے ہیں اور نہ دوسری عبادتوں کو؟ نہ احکام پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ اسلام کے سیاسی و معاشرتی مسائل پر۔نہ آپ اسلامی نکاح کو قبول کرتے اور نہ ہی طلاق اور دوسرے تمام احکام کو قبول کرتے تو پھر اس میں کیا چیز باقی رہتی ہے اور آپ کس اسلام کی بات کرتے ہیں؟آیا یہ باتیں بعض جاہل و سادہ لوح افراد کو فریفتہ کرنے کے علاوہ اور کچھ کرسکتی ہیں؟!اسلام توانسانی زندگی کے الٰہی رنگ میں ڈھل جانے کا نام ہے:(صِبْغَةَ اللَّهِ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ صِبْغَةً[2]) ''رنگ تو بس خدا ہی کا رنگ ہے اور اللہ کے رنگ سے بہتر کون سا رنگ ہوسکتا ہے!!''۔

انسانی زندگی الٰہی رنگ ڈھنگ میں بھی ہوسکتی ہے اور شیطانی رنگ ڈھنگ میں بھی، اب اگر انسانی زندگی الٰہی رنگ میں ہو تو پھر گویا اسلام کا مجسمہ ہے، رہا یہ مسئلہ کہ اس الٰہی رنگ کا پتہ کیسے چلے گا تو اس کے لئے اس کے منبع و سرچشمہ سے آشنائی ضروری ہے، ہم کو اسلام کی شناخت کے لئے قرآن، سنت اور عقل کے علاوہ کسی اور سرچشمہ کا علم نہیں ہے،اور ان کی بنیاد پر اسلام کے دائرے میں تمام عبادی، سیاسی، اجتماعی اورانفرادی مسائل شامل ہیں اسلام تمام پہلوؤں پر محیط ہے۔

---

[1] سورۂ کہف آیت ۲۹۔
[2] سورۂ بقرہ آیت ۱۳۸۔

اور جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ قرآن پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے ہماری یہ بات ثابت ہوجائے گی کہ وہ دین جو قرآن نے بیان کیا ہے اورقرآن جو دین کا اصل سر چشمہ ہے، ممکن ہی نہیں ہے کہ اس اسلام سے سیاسی اور معاشرتی مسائل کو الگ کردیا جائے اور قوانین و اقدار کا وہ مجموعہ سیاسی اور معاشرتی مسائل سے خالی ہو،یہاں تک کہ خالص عبادی مسائل ہی کیوں نہ ہوں، کیونکہ وہ اسلام جو قرآن نے بیان کیا ہے

اور ہم جس اسلام کا دفاع کررہے ہیں وہ تمام سیاسی، معاشرتی اور عبادی مسائل کا مجموعہ ہے اور سیاست کا شمار اسلام کے اہم ارکان اور اس کی فرمانروائی کے اصلی دائرے میں ہے،اوروہ اسلام جو امریکی اور یورپی مصنفین کے اقوال اور ان کی تحریروں کی روشنی میں پیش کیا جائے،اُس سے ہمارا کوئی ربط نہیں ہے، ہم اس کو اسلام کی حقیقی روح اور تعلیمات سے دور اور بیگانہ سمجھتے ہیں۔

تیسری تقریر

دین میں سیاست کا مقام

۱۔گذشتہ مطالب پر ایک نظر اسلامی منابع وماخذ (یعنی قرآن، سنت اور عقل کی روشنی میں ''اسلام کے سیاسی نظریہ''کی وضاحت کرتے ہوئے ہم نے عرض کیا تھا کہ اسلام نے انسانی زندگی کے مختلف سماجی مسائل بلکہ کلی طور پر تمام دنیوی امور میں اپنے نظریات بیان کئے ہیں جس کا خود یہ مطلب ہے کہ اسلام دنیوی زندگی میں دخیل ہے،اور ہم نے یہ بھی عرض کیا تھا کہ اس سلسلہ میں نظریات رکھنے والے مختلف افراد سے بحث وگفتگو کی روش اور طریقہ کار بھی مختلف ہونا چاہئے ،جو لوگ ہمارے ساتھ بہت سے عقیدوں میں مشترک ہیں ان سے بحث کا طریقہ اور ہوگا اور جو لوگ ہمارے اعتقادات کے مخالف ہیں ان سے بحث کا طریقہ اور ہوگا اور ہم نے یہ بھی عرض کیا تھا کہ فریق مخالف کو مطمئن کرنے کے لئے کبھی عقلی استدلال کو بنیاد بنایا جاتا ہے اور کبھی جدلی طریقہ اپنانا پڑتا ہے اور ہمیں اس طرح کی بحثوں میں دونوں طریقوں سے استفادہ کرنا چاہئے،اور ہم نے یہ بھی عرض کیا تھا کہ اسلام سیاست کے بارے میں ایک مخصوص نظریہ رکھتا ہے اور ہمارے لئے ضروری ہے کہ اس نظریہ کو معلوم کریں اور اس کو عملی جامہ پہنائیں، ہمارے انقلاب کے ارکان میں سے ایک یہی مسئلہ تھا کہ اسلام سیاسی مسائل میں دخیل، اور اسی وجہ سے ہمارا یہ انقلاب ''اسلامی انقلاب'' کے نام سے مشہور ہوا ۔

اسی طرح ہم بیان کرچکے ہیں کہ اسلام کے سیاسی نظریہ اور اس کے سیاسی پہلو کے اثبات اور اس سے دفاع کی راہ میں ہمارے مقابل دوطرح کے گروہ ہیں:ایک گروہ : ان لوگوں کا ہے جو ممکن ہے اسلام کو نہ مانتے ہوں یا یہ کہ کسی بھی دین پر یقین نہ رکھتے ہوں، ان لوگوں کے جواب کے لئے آیات و روایات سے دلیل پیش کرنا بے فائدہ ہے، ان سے بحث و مناظرہ کے لئے عقلی استدلال کا

طریقہ اپنا نا پڑے گا، پہلے اسلام کو ثابت کریں اور بتائیں کہ ایک خدا، ایک دین نیز پیغمبر اور قیامت کا وجود ہے، اور یہ بات مسلم ہے کہ ایسے گروہ سے کہ جو دین سے بالکل بیگانہ ہے، ہماری بحث ایک کامل اعتقادی بحث ہوگی۔

دوسرا گروہ: ان لوگوں کا ہے جو مسلمان ہیں اور دین کو قبول کرتے ہیں یا اگر اسلام پر اعتقاد نہ بھی ہو، مگر مسلمان ہونے کا دعوی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اسلام کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے اور اسلام سیاست کے بارے میں کوئی نظر نہیں رکھتا، اس گروہ کے مقابلہ میں ہم کو چاہئے کہ اسلامی تحقیق و جائزے سے کام لیں کہ جس کے مسلمان معتقد ہیں، دیکھیں کہ یہ اسلام سیاسی نظریہ رکھتا ہے یا نہیں؟ اس گروہ کے مقابلے میں ہمیں خالص عقلی روش سے استفادہ نہیں کرنا چاہئے بلکہ اسلام کے سیاسی نظریہ کی شناخت کے لئے اُن اسلامی ماخذوں کی طرف رجوع کرنا چاہئے کہ جن پر اسلام کی بنیاد قائم ہے،

پھر اسلامی منابع؛ یعنی قرآن، سنت اور عملی روش و رفتار بیان کرنے والی معتبر روایتوں کے ذریعہ ثابت کریں قرآن وسنت اور رسول اسلامؐ اور ائمہ [علیہم السلام] کی سیرت اور ان کے اقوال کے مطابق اسلام سیاست کے بارے میں کیا نظریہ رکھتا ہے یا یہ کہ آیا سیاسی امور میں مداخلت بزرگان دین کی سیرت و روش رہی ہے یا نہیں؟ سیاست کی تعریف اور اسلام میں عدلیہ، مقننہ اور مجریہ کی حیثیت ہم سب سے پہلے سیاست کی ایک واضح وروشن تعریف بیان کر دینا ضروری سمجھتے ہیں تاکہ اس کی روشنی میں معلوم ہو سکے کہ قرآن مجید میں سیاست کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے یا نہیں؟ سیاست یعنی معاشرے کا نظم و نسق اور اس کو چلانے کا طریقہ کہ جو معاشرہ کو ترقی دے سکے، اور اس کی ضروریات پوری ہو سکیں یا بہ الفاظ دیگر: سیاست یعنی ملک چلانے کے اصول و ضوابط۔ البتہ سیاست سے ہماری مراد وہ مفہوم نہیں ہے جو منفی رخ رکھتے ہیں اور فریب کاری، مکاری، حیلہ بازی دھوکہ دھڑی کو سیاست کے ساتھ ملا دیا جاتا ہے۔

سیاست اور ملکی نظام کے سلسلے میں ''مانٹسکیو'' کے زمانے سے حکمراں طبقے کو تین قوتوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

۱۔ ''قوۂ مقننہ''، قانون ساز کونسل (پارلیمنٹ)

۲۔ ''قوہ مجریہ''، حکومت کی کابینہ

۳۔ ''قوۂ عدلیہ''، عدل و انصاف کا شعبہ

قانون ساز کونسل کی ذمہ داری یہ ہے کہ معاشرہ کے انتظام اور لوگوں کی صحیح و مناسب روش و رفتار کے لئے مختلف حالات کے مطابق ایسےقوانین کو تصویت کرے تاکہ عدل وانصاف برقرار ہو، معاشرے پر نظم و نسق کی حکمرانی رہے، دوسروں کے حقوق پامال نہ ہوں اور پورا معاشرہ ترقی اور کامیابی کی طرف قدم بڑھائے. قوہ مجریہ کا فریضہ ہے کہ منظور شدہ قوانین کو بروئے کار لائے اور عصر حاضر میں حکومت کی کابینہ یہ کام کرتی ہے، قوہ عدلیہ کا کام یہ ہے کہ کلی قوانین کو جزئی امور پر منطبق کرے اور جب موضوع معلوم ہوجائے تو اس کے حکم کے تحت فیصلہ صادر کرے اور لوگوں کے درمیان اٹھنے والے اختلافات اور جھگڑوں کو حل کرے۔

مذکورہ تقسیم بندی کے تحت جو فرائض تینوں حکومتی قوتوں کے شمار کرائے گئے ہیں ان کو سامنے رکھ کر اب یہ دیکھنا ہے کہ اُن کے بارے میں اسلام و قرآن کی نظر کیا ہے؟! شرعی لحاظ سے ان کی حیثیت کیا ہے اور کیا ان تینوں دائرہ میں قرآن اور اسلام نے مخصوص قوانین ودستورات بیان کئے ہیں؟ البتہ توجہ رہے کہ قوانین سے ہماری مراد اجتماعی قوانین ہیں نہ کہ انفرادی احکام کہ جن کا وجود دین میں ہونا سب کے نزدیک مسلم ہے۔

اجتماعی قوانین میں شہری قوانین، جزا و سزا کے قوانین، تجارتی قوانین، حکومت اور عوام کے روابط نیز بین الاقوامی قوانین شامل ہیں، اگر ہم صحیح معنوں میں قرآن پر ایک نظر ڈالیں تو ہمیں وہ تمام قوانین اس میں مل جائیں گے جو دنیا میں معاشرتی نظام حتی بین الاقوامی تعلقات کے حوالے سے پائے جاتے ہیں قرآن مجید میں شہری قوانین، نکاح وطلاق کے احکام، تجارت، معاملات، قرض اور رہن

کے مسائل کے علاوہ (جو اس چیز کی حکایت کرتے ہیں کہ اسلام نے ملک چلانے کے یہ احکامات پیش کئے ہیں) قرآن مجید میں حضرت رسول اکرم ﷺ کے لئے خاص طور سے یہ حق محفوظ ہے کہ کچھ خاص موارد میں بدلتے ہوئے زمان ومکان کے اعتبار سے کچھ احکام و قوانین بنا سکتے ہیں اور مومنین کو بھی حکم ہوا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے احکام کی اطاعت وپیروی کریں، ارشاد ہوتا ہے:

(وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ[۱]۔) ''کسی بھی صاحب ایمان مرد،صاحب ایمان عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب خدا اور اس کا رسول کسی کام کا اسے حکم دیں تو اسے اس میں (حکم خدا کے سامنے) اختیار حاصل ہو''۔

اس آیۂ کریمہ میں مومنین سے خدا اور اس کے رسول کا فیصلہ نہ ماننے کا اختیار سلب کرلیا گیا ہے، معلوم ہوا کہ خدا کے مسلمہ احکام و قوانین کے علاوہ اسلامی حکومت میں زندگی بسر کرنے والوں کے لئے پیغمبر اسلامؐ کے بنائے ہوئے قوانین بھی لازم الاجراء ہیں، یعنی رسول اکرمؐ کے بنائے ہوئے قوانین پر عمل کرنا ضروری ہے، کسی کو بھی یہ حق نہیں کہ آنحضرت ﷺ کی نافرمانی کرے، کیونکہ جو شخص اُن قوانین کی مخالفت کرتا ہے دو حالتوں سے خالی نہیں ہوسکتا:

۱۔ یا تو وہ پیغمبرؐ کو خدا کا رسول نہیں مانتا، ایسے شخص سے ہم کو کچھ نہیں کہنا ہے، اِس وقت ہماری گفتگو ان لوگوں سے ہے جو آنحضرتؐ کو خدا کا رسول مانتے ہیں اور اس بات کے بھی قائل ہیں کہ آنحضرت کو خدا کی طرف سے قانون بنانے کا حق دیا گیا ہے، اسی وجہ سے خدا نے یہ نہیں فرمایا (وَمَا كَانَ لِكَافِرٍ وَلَا كَافِرَةٍ)بلکہ خداوند عالم کا ارشاد ہے (وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ)

[۱] سورۂ احزاب آیت ۳۶۔

۲۔یا یہ کہ آنحضرتؐ کی نبوت پر اعتقاد رکھنے کے باوجود رسول اسلامؐ کے لئے اس طرح کے کسی حق کے بارے میں بحث کرتا ہے؛ ایسے شخص کے لئے ہم قرآن مجید سے دلیل پیش کرتے ہیں کہ جس طرح اسلامی حکومت میں رہنے والا اور رسول اکرمؐ کی نبوت کا عقیدہ رکھنے والا ہر مومن انسان خدا کے احکامات کو لازم الاطاعت جانتا ہے بالکل اسی طرح اس پر رسول اسلامؐ کے بنائے ہوئے قوانین کو بھی لازم الاطاعت ماننا ضروری ہے اور تمام مومنین پر خدا کی اطاعت اور نبیؐ کی ولایت قرآنی آیات سے ثابت ہے جیسا کہ ا۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:(اَلنَّبِیُّ أَوْلیٰ بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ أَنْفُسِھِمْ [1]) ''نبی مومنین کے نفوس پر خود ان سے زیادہ حق رکھتا ہے''۔

پس قرآن کی نظر سے رسول اسلام کے لئے قانون کے بنانے اور اس کے نافذ کرنے کا اعلیٰ ترین منصب اسلام نے منظور کیا ہے لیکن یہ سوال کہ کیا اس طرح کا حق اور اختیار رسول اسلامؐ کے بعد دوسروں کے لئے بھی ثابت ہے یا نہیں، اس موضوع پر کسی دوسری جگہ پر بحث ہوگی اس وقت ہماری بحث خود اسلام کے بارے میں ہے کہ آیا اسلام سیاست سے متعلق کوئی نظر رکھتا ہے یا نہیں؟

۳۔عدالتی احکام قرآن کی نگاہ میںیہاں تک انصاف کا مسئلہ اور خدا کے کلی احکام کا لوگوں کے درمیان پیش آنے والے اختلاف اور جھگڑے وغیرہ پر منطبق کرنے کا سوال ہے، اس سلسلے میں خدا وند عالم فرماتا ہے:(فَلاٰ وَرَبِّکَ لاٰ یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَھُمْ ثُمَّ لاٰیَجِدُوْا فِیْ أَنْفُسِھِمْ حَرَجاً مِمَّا قَضَیْتَ وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْماً [2]) ''

پس (اے رسول) آپ کے پروردگار کی قسم یہ لوگ سچے مومن نہیں ہوں گے مگر یہ کہ اپنے باہمی جھگڑوں میں آپ کو اپنا حکم بنائیں اور پھر آپ کے فیصلہ پر کسی طرح دل تنگ بھی نہ ہوں خوشی خوشی ان کو مان لیں''۔

---

[1] سورہ احزاب آیت۶۔
[2] نساء آیت ۶۵۔

آیۂ مذکورہ میں نہ صرف یہ کہ رسول اکرمؐ کے لئے حکم اور قاضی ہونا ثابت ہے بلکہ آنحضرتؐ کے فیصلے اور داوری کو قبول کرلینا بھی شرط ایمان میں قرار دیا گیا ہے، کیونکہ آیت کے شروع میں قسم کھائی گئی ہے اور اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ مومنین کا فرض ہے کہ اپنے اختلافی مسائل میں آپ کو قاضی بنائیں اور آپؐ کے فیصلے اور حکم کو دل وجان سے قبول کرلیں، آپ کے کسی فیصلہ پر ناراض نہ ہوں، اور اگر کسی نے آنحضرتؐ کے فیصلہ پر شک یا اعتراض کیا اور اس کو دل وجان سے قبول نہ کیا تو پھر وہ حقیقی مومن نہیں ہے۔

جی ہاں حقیقی مومن وہی ہے جو اسلامی عدالت کے فیصلے کو چاہے اس کے خلاف کیوں نہ ہو تو کھلے دل سے قبول کرے اگرچہ اس کے خیال میں اس کا حق ضایع ہوا ہو کیونکہ قاضی آئینی بنیادوں پر ظاہری شواہد کی روشنی میں فیصلہ کرتا ہے جیسا کہ رسول اکرم ﷺ نے بھی فرمایا ہے'' :انما اقضی بینکم بالبینات والایمان[1]'' میں تمہارے درمیان قسم اور ثبوت و شواہد کی بنا پر فیصلہ کرتا ہوں، ممکن ہے کہ کوئی گواہ بہ ظاہر عادل اور قابل اعتماد ہو اور اس کی گواہی قبول کرلی جائے گی مگر اس نے جھوٹی گواہی دی ہو یا گواہی میں بھول چوک ہوگئی ہو، اب اگر یہ طے پاجائے کہ قاضی کے فیصلہ کو قبول نہیں کریں گے، اگرچہ اس کا فیصلہ غلط ہی کیوں نہ ہو تو پھر بہت سی مشکلات پیدا ہوجائیں گی اور نظام میں خلل پیدا ہوجائے گا۔

قرآن سے جو نتائج نکلتے ہیں اور دیت قصاص، حدود کی سزا مانند عدالتی احکام کے دائرے میں بیان شدہ قرآنی نصوص اس بات پر گواہ ہیں کہ اسلام سیاست و حکومت، ملک و معاشرہ کے انتظامی امور میں اعلیٰ ترین سطح پر مداخلت رکھتا ہے، یہاں تک کہ اسلام نے مجرم اور بدعنوان افراد کے لئے بعض جرائم کی صورت میں ''حد'' (جسمانی سزا) معین کی ہے اور قاضی کو اجازت دی ہے وہ مفسدوں، فتنہ انگیزوں اور مجرموں پر حد جاری کرے اگرچہ کوئی مدعی اور شاکی موجود نہ ہو، دراصل ایسی صورت میں الٰہی حدود اور حقوق کو پامال کیا گیا ہے۔

[1] وسائل الشیعہ ج۲۷ص۲۳۲۔

بعض مقامات پر تو اسلام نے بہت ہی سخت سزا معین کی ہے کہ جس کا عصر حاضر میں بعض لوگوں کے لئے برداشت کرنا مشکل ہوجاتا ہے، مثلاً قرآن مجید کا حکم ہے کہ اگر اسلامی معاشرے میں مسلمان مرد و عورت نے زنا کیا اور قاضی کے نزدیک چار عادل گواہوں کی گواہی سے جرم ثابت ہوگیا ہے تو زانی اور زانیہ دونوں کو سو سو تازیانے لگائے جائیں، اور قرآن نے اس سلسلہ میں خصوصی تاکید کی ہے تاکہ قاضی جذبات سے متأثر نہ ہو، اور ان کے ساتھ ہرگز محبت سے پیش نہ آئے، ارشاد ہوتا ہے: (اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ وَلَا تَأْخُذْكُم بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللَّهِ[1]) ''زنا کرنے والی عورت اور مرد دونوں کو سو سو کوڑے مارو اور اُن کی جھوٹی محبت حکم خدا کے نافذ کرنے میں تمہارے آڑے نہ آنے پائے''۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر اس طرح کی ''حد'' جاری کی گئی تو ایک دو فرد کی عزت وآبرو ختم ہوجائے گی لیکن معاشرہ اور سماج محفوظ اور برائیوں سے پاک رہے گا، اسی طرح قرآن حکیم چوری کے بارے میں ارشاد فرماتا ہے: (وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا جَزَاءً بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللَّهِ، وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ[2]) ''چور مرد اور چور عورت کے ہاتھ ان کے کئے کے بدلے الٰہی سزا کے عنوان سے کاٹ دو، یہ (ان کی سزا) خدا کی طرف سے ہے اور خدا تو بڑا زبردست اور حکمت والا ہے''۔

نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن مجید نے رسولؐ خدا کے لئے جج اور قاضی کے منصب کے ساتھ ساتھ قوم ومعاشرے کی فلاح و بہبودی کے لئے قانون سازی اور سزائیں اور حدود جاری کرنے کا حق بھی معین فرمایا ہے، اب اگر کوئی شخص واقعاً انصاف پسند ہو اور قرآن اور معصومینؑ کی معتبر روایات پر ایمان رکھتا ہے اس کے لئے یہ بات بالکل واضح وروشن ہوجاتی ہے کہ اسلام سیاسی واجتماعی مسائل میں دخل و عمل رکھتا ہے، لیکن اگر کوئی بغض وعناد کی وجہ سے ان حقائق سے چشم پوشی اور ان کا انکار کرے تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی چمکتے ہوئے سورج کا منکر ہو۔

---

[1] سورۂ نور آیت ۲۔
[2] سورۂ مائدہ آیت ۳۸۔

سلام کی ہمہ گیری اور اسلامی حکمراں کی حیثیت

قرآن مجید نے بڑے بڑے سیاسی مسائل، نظام مملکت، قانون سازی اور مختلف امور میں ان کے منطبق اور نافذ کرنے کی وضاحت کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے جزئی مسائل کے بارے میں بھی وضاحت کی ہے مثلاً سال کے مہینوں کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے: (إِنَ عِدَۃَ الشُّھُورِ عِندَ اللّٰہِ إثنَا عَشَرَ شَھراً فِی کِتَابِ اللّٰہِ یَومَ خَلَقَ السَّمٰوَاتِ وَالأَرضَ مِنھَا أَربَعَۃٌ حُرُمٌ ذٰلِکَ الدِّینُ القَیِّمُ [1]) ''اس میں تو شک ہی نہیں کہ خدا نے جس دن سے آسمان وزمین کو پیدا کیا خدا کے نزدیک کتاب الٰہی میں مہینوں کی تعداد بارہ ہے ان میں چار مہینے محترم ہیں (اور ان میں جنگ کرنا منع ہے) یہی دین کی ثابت اور اٹل سیدھی راہ ہے''۔

آیت میں سال کے بارہ مہینوں کی تقسیم ایک تکوینی امر اور نظام خلقت کے ساتھ منطبق بتایا گیا ہے، اور اس طرح کے مطالب کا دین میں ذکر دین کے صحیح اور مستحکم ہونے کی نشانی ہے، اسی طرح قرآن مجید میں چاند دیکھنے کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے: (یَسْئَلُونَکَ عَنِ الأَھِلَّۃِ قُلْ ہِیَ مَوَاقِیتُ لِلنَّاسِ وَالحَجِّ [2]) ''(اے ہمارے رسولؐ) آپ سے لوگ کے چاند کے بارے میں پوچھتے ہیں آپ کہہ دیں کہ اس سے لوگوں کے اوقات (زندگی کے امور کے لئے جنتری کے نظام اور حج کے اوقات کا تعین ہوتا ہے''۔

چونکہ بہت سے اجتماعی وعبادی احکام تکوینی نظام پر قائم ہوتے ہیں بہت سے حقوقی احکام کے علاوہ ماہ رمضان کا آغاز، حج کا زمانہ اور دوسرے تمام عبادی احکام چاند دیکھنے کے ساتھ ارتباط رکھتے ہیں اور اس کی بنیاد یہ ہے کہ قرآن مجید نے دین کو فطرت اور نظام خلقت سے ہم آہنگ اور منطبق بتایا ہے: (فَأَقِمْ وَجھَکَ لِلدِّینِ حَنِیفاً فِطرَۃَ اللّٰہِ الَّتِی فَطَرَ النَّاسَ عَلَیھَا لَاتَبدِیلَ لِخَلقِ اللّٰہِ [3]) ''پوری طرح اپنا رخ پروردگار کے دین وآئین کی طرف کئے رہو، یہی وہ فطرت ہے جس پر اللہ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے خدا کی تخلیق وآفرینش میں (تغیر و) تبدل نہیں ہوسکتا''۔

---

[1] سورۂ توبہ آیت ۳۶۔
[2] سورۂ بقرہ آیت ۱۸۹۔
[3] سورۂ روم آیت ۳۰۔

اور جب یہ طے ہوگیا کہ دین اور الٰہی قوانین فطرت الٰہی کی بنیاد پر بنائے گئے ہیں تو دین اور اس کے قوانین ہمیشہ ایک ہی رہیں گے ان میں تبدیلی نہیں آسکتی، البتہ خیال رہے کہ کچھ قابل تغیر احکام و قوانین بھی ہیں جو مخصوص زمان و مکان کے لحاظ سے تبدیل ہو سکتے ہیں لیکن موضوع کو تشخیص دینااور قانون بنانا حاکم شرع کی ذمہ داری ہے کیونکہ اس کو حکومت کا جواز اور اقتدار خدا کی طرف سے ملا ہے، قرآن مجید نے یہ اعلیٰ منصب اور امتیاز رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سپرد کیا ہے اور شیعی عقائد کے مطابق ائمہ معصومین علیہم السلام بھی خدا کی طرف سے یہ منصب رکھتے ہیں جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد موجود ہے، اور ان کے بعد یہ مقام ولی فقیہ کے لئے معین ہوا ہے، جس کے بارے میں مناسب مقام پر تفصیل سے ہم سے بحث کریں گے، انشاء اللہ۔

لہٰذا یہ تصور کہ دین کا معاشرتی مسائل اور دنیوی امور سے کوئی مطلب نہیں، دین صرف آخرت کے امور سے مربوط ہے اور صرف خدا کے ساتھ انسانی رابطہ کو بیان کرتا ہے یہ مطلب سرے سے باطل ہے اور دین کے بارے میں اس طرح کا تصور اسلام کے ساتھ میل نہیں کھاتا، البتہ اس دنیا میں ممکن ہے کوئی ایسا دین بھی پایا جاتا ہو جس کے بارے میں مذکورہ تصور صحیح ہو، لیکن ہماری بحث کسی ایسے دین سے نہیں ہے ،بلکہ ہماری گفتگو اس دین کے بارے میں ہے جس میں سال کے مہینوں تک کا بیان موجود ہے جس نے معاملات اور مالی لین دین کے بارے میں اس بات کی بہت زیادہ تاکید کی ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کو قرض دے تو اس سے کوئی نوشتہ یا تحریر لکھوالے یا دو گواہوں کے سامنے قرض دے، اور اگر لکھنا یا گواہ مہیا کرنا ممکن نہ ہو تو کوئی چیز گروی رکھوا لے، قرآن مجید میں رہن کی تفصیل بیان ہوئی ہے وہ ایسے ہی مقامات کے لئے ہے کہ کوئی شخص کسی کو قرض دے رہا ہے اور اس سے کوئی تحریر یا سند لکھوانا ممکن نہیں ہے تو اس سے کوئی قیمتی چیز بعنوان گروی لے کر رکھ لے اور پھر اس کو قرض دے ۔)

لہٰذا ہم معتقد ہیں کہ دین اسلام سیاست، نظام مملکت اور لوگوں کی مادی اور معنوی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے پروگرام رکھتا ہے۔

ہم نے گذشتہ تقریر میں اس تصور کو ردّ کرتے ہوئے کہ دین فقط انسان اور خدا کے رابطہ میں منحصر ہے، ضمنی طور پر حقیقی دین کی طرف اشارہ کیا تھا اور عرض کیا تھا کہ دین صحیح معنی میں انسانی زندگی پر الٰہی جلوہ نمائی کو کہتے ہیں جو انسان کو کمال و ارتقاء کی راہ دکھاتا ہے اور اس کو مبدأ و معاد کی طرف متوجہ کرتا ہے اور خدا و آخرت کی جانب صحیح راستہ اختیار کرنے میں رہنمائی کرتا ہے، اور بلاشبہ ایک ایسا دین زندگی اور عمل و رفتار کے کسی ایک حصہ مثلاً صرف عبادت یا عبادی مسائل میں منحصر نہیں ہوسکتا، بلکہ پوری حیات اور انسانی زندگی کے تمام وجودی پہلوؤں پر محیط ہے کیونکہ انسان کی تخلیق ہی اسی لئے ہوئی ہے کہ انسان اپنی زندگی اس طرح منظم کرے کہ ابدی سعادت حاصل کر سکے۔

اس کے لئے اپنی زندگی کے تمام پہلوؤں کو الٰہی احکامات سے ہم آہنگ کرنا ضروری ہے، لہٰذا خدا کی خالص عبادت و پرستش اور مروجہ عبادتیں دینی فرائض محض ایک حصہ ہیں، ہماری زندگی کے دوسرے تمام فکری و عملی میدانوں کو بھی خدا کی رضا کے مطابق ہونا چاہئے تاکہ ہمارے دوسرے تمام امور بھی مرضی معبود کے مطابق ہونے کے سبب ایک طرح سے عبادت بن جائیں اور انسان اپنی تخلیق کے بلند ترین مرتبہ پر پہونچ جائے: (وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ[1]) (۱) ''اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اسی غرض سے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں''۔

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ انسان خدا کی عبادت و پرستش کے ذریعہ ہی کمال کی منزل تک پہونچ سکتا ہے لہٰذا نسان کے تمام اعمال و رفتار اسی قاعدے اور قانون کے دائرے میں انجام پانا چاہئے، یہاں تک کہ اس کا سانس لینا بھی اسی قاعدہ کے تحت ہونا چاہئے اور اگر انسانی زندگی نے اس الٰہی رنگ کو اپنا لیا اور اپنے کو اس الٰہی سانچہ میں ڈھال لیا، تو انسان حقیقی معنی میں دیندار ہے اور اگرانسان نے خدا کی عبادت اور پرستش کے دائرے سے اپنے کو الگ کر لیا تو وہ شخص بے دین اور مرتد ہے، ان دونوں سرحدوں یعنی حقیقی دینداری اور ارتداد کے درمیان وہ لوگ آتے ہیں کہ جن کی زندگی کا ایک حصہ رضائے الٰہی سے مطابقت نہیں

---

[1] سورہ الذاریات آیت ۵۶۔

ہوتا نیز دائرہ عبادت میں قرار نہیں پاتا ان لوگوں کا دین ناقص ہے، کیونکہ دین کے ناقص ہونے کے پیش نظر ہم کو یہ یاد رکھنا چاہئے کہ جو حضرات واقعاً دیندار ہیں اور زندگی کے تمام پہلوؤں میں احکامات الٰہی کی رعایت کرتے ہیں، اور وہ لوگ جو زندگی کے صرف بعض حصوں میں احکام الٰہی کی رعایت کرتے ہیں دونوں کے مرتبہ برابر نہیں ہیں، چنانچہ جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ ایمان اور دینداری کے بھی بنیادی طور پر مختلف درجات ہیں اور انسان ان میں ترقی و کمال حاصل کرسکتا ہے، جیسا کہ خداوندعالم ارشاد فرماتا ہے: (وَالَّذِیْنَ اہْتَدَوْا زَادَہُمْ ہُدیً وَآتَاہُمْ تَقْوَاہُمْ[1]) ''اور جو لوگ ہدایت یافتہ ہیں ان کی رہنمائی میں خدا اضافہ کردیتا ہے اور ان کو پرہیزگار بنا دیتا ہے''۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے: (إِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ إِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتْ قُلُوْبُہُمْ وَإِذَا تُلِیَتْ عَلَیْہِمْ آیَاتُہُ زَادَتْہُمْ إِیْمَاناً[2]) ''ایماندار تو بس وہی لوگ ہیں کہ جب (ان کے سامنے) خدا کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل ہل جاتے ہیں اور جب ان کے سامنے آیات الٰہی کی تلاوت کی جاتی ہے تو ان کے ایمان میں اور زیادہ اضافہ ہو جاتا ہے''۔

جی ہاں ایسے حضرات ہیں جن کے ایمان میں ہمیشہ اضافہ ہوتا رہتا ہے اور وہ ہمیشہ کمال کی طرف بڑھتے رہتے ہیں یہاں تک کہ ایمان کی بلند ترین منزلوں تک پہونچ جاتے ہیں اور اولیاء الٰہی سے قریب ہوجاتے ہیں کہ خود وہ اولیاء میں شمار ہونے لگتے ہیں، ان کے مقابلہ میں وہ لوگ بھی ہیں جو پستی کی طرف بڑھتے رہتے ہیں اور دینداری کے میدان میں پیچھے ہٹتے چلے جاتے ہیں، بہت ممکن ہے کہ معاشرے کی ثقافتی فضاؤں میں غیروں یا اغیار پرستوں کے ذریعہ پراگندہ کئے جانے والے شکوک و شبہات کو سن کر یا اُن کے آلۂ کار بن کر وہ دین جو ماں باپ سے ملا ہے یا کسی استاد سے سیکھا ہے اس کو کھو بیٹھیں، کیونکہ جن لوگوں میں اتنی صلاحیت نہیں ہے کہ مسائل کی تحقیق اور چھان بین کرسکیں اگر وہ شکوک و شبہات میں الجھتے ہیں تو خواہ مخواہ منحرف ہونے کا خطرہ پیدا ہوجاتا ہے،

[1] سورہ محمد آیت ١٧۔
[2] سورہ انفال آیت٢۔

قرآن مجید اس سلسلے میں فرماتا ہے: (وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتَابِ أَنْ إِذَا سَمِعْتُمْ آيَاتِ اللَّهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَأُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوا مَعَهُمْ حَتَّىٰ يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِ إِنَّكُمْ إِذًا مِّثْلُهُمْ[1]) ''اور خدا نے تم پر اپنی کتاب قرآن میں یہ حکم نازل کردیا ہے کہ جب بھی تم سنو کہ کچھ لوگ خدا کی آیتوں کا انکار کررہے ہیں یا اس کا مذاق اڑارہے ہیں تو تم ان کے ساتھ مت بیٹھو یہاں تک کہ وہ کوئی دوسری بات کرنے لگیں (ورنہ) تم بھی ان کے مثل ہوجاؤ گے''۔

انسان کو چاہئے کہ پہلے اپنے علم اور عقلی وفکری بنیادوں میں اضافہ کرے اوراعتراضوں کے جوابات اور ان کے تجزیہ و تحقیق کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کرے، اس کے بعد کسی کے ایجاد کردہ شکوک وشبہات پر کان دھرے، ورنہ جو دوسروں کے اعتراض کو سن کر اس کے جواب کی قوت نہیں رکھتے وہ خود کو انحرافات کے خطرے میں نہ ڈالیں۔

اسلام یہ نہیں کہتا کہ کشتی نہ لڑو، بلکہ اسلام کی نظریہ ہے کہ پہلے کشتی کے فن سے واقف ہوجاؤ بعد میں کشتی لڑو، اور اگر چاہو کہ کسی قوی ہیکل پہلوان سے کشتی لڑو تو پہلے اپنا وزن بڑھاؤ اور مشق میں اضافہ کرو اسی طرح اسلام یہ نہیں کہتا کہ دوسروں کے اعتراضات نہ سنو بلکہ جس قدر تجزیہ و تحقیق اور تشخیص کی صلاحیت رکھتے ہو اسی قدر الجھو، یعنی پہلے معارف الٰہی سے واقفیت حاصل کرو اور شکوک و شبہات کے جواب کا سلیقہ سیکھو اس کے بعد دوسروں سے بحث و مناظرہ کرو تاکہ دشمن تم کو بے دست و پا نہ کردے، اور حسب خواہش اپنے عقائد تم سے نہ منوالے۔

مذکورہ بحث کا خلاصہ ہماری بحث وگفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام، تمام سیاسی پہلوؤں پر محیط ہے لہٰذا ہماری پوری زندگی دین کے مطابق ہونا چاہئے، انسانی زندگی کا کوئی بھی گوشہ دین سے خارج نہیں ہے، چاہے وہ انفرادی زندگی ہو یا اجتماعی زندگی، خاندانی زندگی ہو یا ازدواجی زندگی، ماں باپ کے ساتھ اولاد کے روابط ہوں یا امام کے ساتھ امت کی وابستگی، یہاں تک کہ دوسرے مذاہب اور اقوام سے رابطہ کیسا ہونا چاہئے کن افراد سے رابطہ رکھنا صحیح ہے اور کن لوگوں سے رابطہ رکھنا صحیح نہیں ہے۔

---

[1] سورۂ نساء آیت ۱۴۰۔

یہ سب اس میں شامل ہے اور اگر ہم صرف قرآنِ مجید کی آیات پر ایک نظر ڈالیں (روایات کی طرف رجوع نہ بھی کریں) تو جو شخص تھوڑا بھی انصاف رکھتا ہے اس کے لئے واضح وروشن ہوجائے گا کہ سیاست اسلام کے اصلی متن میں شامل ہے اور ہم بغیر سیاست کا اسلام نہیں رکھتے، اگر کوئی اسلام کو سیاست سے جدا تصور کرے تو گویا اس نے کوئی اور دین اپنا رکھا ہے کہ جس کو اسلام کا نام دے دیا ہے بیشک وہ اسلام کہ جس کا سر چشمہ قرآن وسنت ہے اس کا سیاست سے جدا ہونا ممکن نہیں ہے۔

چوتھی تقریر

دین میں سیاست کا مقام

گذشتہ مطالب پر ایک نظرگذشتہ تقریروں میں عرض کیا جا چکا ہے کہ ایران میں اسلامی انقلاب کی کا میابی اور اسلامی حکومت قائم ہونے کے بعد ،اسلام دشمن طاقتیں اپنی پوری جد جہد اور تحقیق کے بعد اس نتیجہ پر پہونچیں کہ اس اسلامی حکومت سے مقابلہ کے لئے انقلاب کے بنیادی اور مرکزی پہلو یعنی ''ولی فقیہ'' کی ولایت کا مطالعہ ضروری ہے، اور انھوں نے اس کو اپنے تیز و تند پروپیگنڈوں کا نشانہ بنایا، چنانچہ آج ہم دیکھتے چلے آرہے ہیں کہ زمانۂ گذشتہ اور عصر حاضر میں بھی اسلامی حکومت اور ولایت فقیہ پر دنیا کے مختلف گوشہ و کنارے سے اعتراض ہوتے رہے ہیں حتی دشمن کے آلہ کار بعض افراد ایران میں بھی اس میدان میں قلم فرسائی اور دوسری سرگرمیوں میں مشغول ہیں، یہی وجہ ہے اگرچہ ہماری قوم اسلامی نظام پر بھرپور اعتماد اور ایمان رکھتی ہے ۔

اور اس کی پورے وجود سے حمایت کرتی ہے، ضروری معلوم ہوتا ہے ہے کہ مذکورہ مسائل کے بارے میں وقتاً فوقتاً بحث کی جائے تاکہ اس نظام کی نظری اور فکری بنیادیں بالخصوص جوان نسل کے لئے واضح وروشن ہوجائیں۔

جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ اس سلسلے میں تین طرح کے شبہات پیدا کئے گئے ہیں:پہلی بات تو یہ ہے کہ بنیادی طور پر دین کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ایک سیاسی نظام دینی نظام نہیں ہو سکتا ،گذشتہ تقریر میں ہم نے اس کا جواب دیا تھا کہ اگرکوئی شخص یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ اسلام ایک دین اورمذہب ہونے کے اعتبار سے کسی سیاست سے منسلک ہے یا نہیں ؟تو اس کے لئے قرآن مجید اور اس میں بیان کئے گئے احکام وقوانین کا ایک سرسری مطالعہ کافی ہے، حقیقت یہ ہے کہ ایک شخص جو مسلمان ہے اور قرآن پر اعتقاد رکھتا ہے اور اسی طرح وہ شخص بھی جو مسلمان نہیں ہے۔

لیکن اسلام کی شناخت اور معرفت حاصل کرنا چاہتا ہے اگر قرآن مجید کی طرف رجوع کرے، اس پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ دین اور سیاست کا ایک دوسرے سے جدا کرنا ناممکن ہے ظاہر سی بات ہے کہ اسلام اور اس کے پیغام کی پہچان کا صحیح طریقہ قرآن مجید کا مطالعہ کرنا ہے، جس طرح کہ خود ہم کسی موضوع کے بارے میں اگر عیسائیت کا نظریہ معلوم کرنا چاہیں تو اس کے لئے ہمیں انجیل کا مطالعہ کرنا پڑے گا ،البتہ ہم نے جو کچھ بیان کیا یہ ان لوگوں کے لئے ہے جو مسائل کو سمجھنے کے لئے صحیح اور منطقی طریقہ اپناتے ہیں چاہے بحث وگفتگو ہو چاہے مطالعۂ تحقیق کی منزل ہو، صحیح طریقے کا انتخاب کرتے ہیں ۔

لیکن دشمن کو بحث و گفتگو کے صحیح اور منطقی طریقوں سے کیا مطلب، ان کا مقصد تو صرف دینداروں کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کرنا ہوتاہے، تاکہ ان کے ایمان کو متزلزل کردیں، چنانچہ ان کی بحث و گفتگو اگرچہ منطقی نہیں ہوتی پھر بھی ہم اپنا فریضہ سمجھتے ہیں کہ ان کے ایجاد کردہ شکوک اور شبہات کا منطقی بنیادوں پر مبنی جواب دیں۔

کیا دایک آزاد نقطۂ نگاہ سے دین سیاست سے جدا ہے؟ جن لوگوں نے دین کو سیاست اور حکومت سے الگ ثابت کرنے کے لئے دین سے آزاد نقطۂ نگاہ کا انتخاب کیا ہے ،وہ کہتے ہیں: ہم کو قرآن سے مطلب نہیں ہے ہم تو مذہب سے آزاد ہوکر اسلام پر نگاہ کرتے ہیں ،اس سے پہلے کہ ہم اسلامی منابع وماخذ کا جائزہ لیں یا یہ دیکھیں کہ قرآن سیاست سے متعلق کیا کہتا ہے یہ سوال کرتے ہیں کہ بنیادی طور پر انسان کو دین کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اور کن مسائل میں اس کو دین کی رہنمائی کی ضرورت ہے ؟

انھوں نے اس مسئلہ سے متعلق اپنے خیال میں دو باتیں فرض کرلی ہیں: ایک تو یہ کہ انسان تمام چیزوں اور زندگی کے تمام امور میں دین کی ضرورت رکھتا ہے، مثلاًکس طریقہ سے آذوقہ فراہم کیا جائے اور کس طرح سے اس کا مصرف کیا جائے؟ یا کس طرح مکان بنائیں؟ شادی بیاہ کے طریقے کیا ہوں؟ اسی طرح حکومت اور معاشرہ کی تشکیل کے مسائل جیسے امور کو زمرے میں رکھ کر اس طرح کہتے ہیں: کیا دین کے لئے ضروری ہے کہ ان تمام مسائل کو حل کرے ۔

اور انسان کو علمی تحقیقات کے چکر میں پڑنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے ہم اپنی زیادہ سے زیادہ توقعات دین سے وابستہ رکھیں اور ہر چیز کی وضاحت دین ہی سے طلب کریں. مطلب یہ ہے کہ اگر ہم لباس بنانا چاہیں تو پہلے یہ معلوم کریں اسلام کا نظریہ کیا ہے، اگر کھانا کھانا چاہیں تو دیکھیں کہ اسلام نے کن کھانوں کی اجازت دی ہے ،اور اگر بیمار ہوجائیں اور ڈاکٹر کے پاس جانا پڑے تو دیکھیں کہ اسلام نے اس سلسلے میں کیا کہا ہے؟ اس طرح دیکھنا چاہئے کہ اسلام نے حکومت اور سیاست کے بارے میں کیا نظریہ پیش کیا ہے۔

دوسرا مفروضہ یہ ہے کہ دین فقط بعض چیزوں میں مداخلت رکھتا ہے اور دین سے ہم کو کم سے کم توقعات رکھنی چاہئے ظاہر سی بات ہے کہ دین انسان کی تمام ضروریات کے بارے میں نظر نہیں رکھتا اور کسی بھی دین نے یہ دعویٰ نہیں کیا ہے کہ وہ انسان کی تمام ضروریات کو پورا کر سکتا ہے۔

اور جب ہم نے یہ مشاہدہ کرلیا کہ دین نے ہم کو کھانا پکانے علاج کرنے ہوائی اور بحری جہاز وغیرہ تیار کرنے سے متعلق کوئی خاص حکم نہیں دیا ہے تو یہ دیکھنا ہوگا کہ وہ مسائل جن کا بیان کرنا مذہب نے اپنے ذمہ لیا ہے دوسرے تمام مسائل سے کیا فرق رکھتے ہیں اور بنیادی طور پر دین کس میدان میں وارد ہوا ہے اور کس میدان میں مداخلت نہیں کی ہے؟!

یہ لوگ اپنے خیال میں اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ایک دوسری قسم اپنائیں اور وہ یہ کہ دین فقط ان امور میں دخیل ہے جو آخرت سے تعلق رکھتے ہیں، اس کا دنیوی امور سے کوئی تعلق نہیں ہے، دین سے ہماری توقعات کم سے کم ہونی چاہئے اور ہم کو دین کے ذریعہ فقط ان باتوں اور طریقوں کو سمجھنا چاہئے کہ جن کے ذریعہ آخرت میں کامیابی مل سکے،جنت میں جاسکیں اور دوزخ سے نجات حاصل کی جاسکے، یعنی نماز پڑھنا ،روزہ رکھنا،حج انجام دینا اور اسی طرح کے دوسرے تمام اُخروی امور دین سے حاصل کرنا چاہئے۔

ان لوگوں نے اپنے خیال میں دین و سیاست کے روابط میں پائی جانے والی مشکل کو دین اور سیاست میں حد بندیاں قائم کرکے حل کرنے کی کوشش کی ہے اور دین کی حکمرانی کے دائرے کو سیاست کے دائرے سے الگ کرتے ہوئے کہا ہے کہ سیاست کا دائرہ دنیوی امور میں محدود ہے، اور دین کا دائرہ آخرت سے مربوط ہے، نہ دین کو سیاست میں مداخلت کرنی چاہئیے اور نہ ہی سیاست کو دین میں مداخلت کرنی چاہئے ۔

اس مفروضہ کے تحت چونکہ سیاست دنیا اور علم کے دائرے میں محدود ہے لہٰذا سیاست کو فقط علم اور انسانی ترقی کے دائرے میں مداخلت کا حق ہے، چنانچہ فزیکس کیمسٹری، بائیلوجی، طب، نفسیات اور سماجیات کی مانند علوم سائنسی علوم میں شمار ہوتے ہیں ان میں دین کی کوئی مداخلت نہیں ہے اور دین صرف اُخروی مسائل میں دخیل ہے ۔

اس نظریہ پردازی کی تاریخ ابھی چند صدی پہلے مغربی ممالک کی طرف پلٹتی ہے کہ جب ایک طرف تو کلیسا کے ذمہ داروں اور دوسری طرف علمی و سیاسی شخصیتوں کے درمیان اختلاف اور رسہ کشی پیدا ہوئی ،اور آپس میں مدتوں تک اسی سلسلے میں جنگ و جدال ہوتی رہی ،اور آخر میں ان کی یہ جنگ وجدال ایک بے لکھی صلح پر تمام ہوئی، اور عملی طور پر طے کرلیا گیا کہ دین صرف آخرت سے تعلق رکھنے والے امور انسان اور خدا کے رابطہ میں مداخلت کا حق رکھتا ہے دنیوی کاموں میں اظہار نظر کا دائرہ اہل سیاست اور اہل علم کے سپرد کیا گیا ۔

یہ تمام کام مغربی دنیا میں انجام پایا، لیکن جو لوگ ان کے نسخوں پر چل رہے ہیں ان کا کہنا ہے کہ ہمارے اسلامی ممالک میں بھی کام اسی طرح تقسیم ہونا چاہئے کہ دین کی باگ ڈور فقط دینی علماء کے ہاتھوں میں ہو اور وہ صرف اُخروی امور میں عمل دخل دیں، دین یا دینی علماء دنیاوی کاموں میں بالکل دخل نہ دیں، لہٰذا سیاست اہل اور سیاسی دانشوروں کے حوالے کردی جائے، مذہبی علماء فقہاء سیاست میں دخل نہ دیں، اور اس سلسلے میں بہت سی تقریریں ہوئیں، مقالات لکھے گئے ،اور اپنے اس نظریہ کی تائید کے لئے ہر ممکن کوشش کی گئی کہ

ہمارے جوانوں کے ذہنوں میں یہ بات بٹھال دیں اور اس نظریہ کو تقویت پہونچائیں کہ دین کا دائرہ سیاست سے جدا ہے۔ افسوس، کہ بعض وہ افراد جو ثقافتی امور میں مشغول ہیں انجانے طور پر اسی طرز فکر سے متاثر ہوکر مغرب کی ثقافتی موجوں میں بہہ گئے ہیں ،اور آہستہ آہستہ یہ نظریہ لوگوں کے ذہن میں اپنا مقام بناتا جارہا ہے، کہ دین ،دنیا کے خلاف ہے یعنی دین انسانی زندگی کے کچھ ہی مسائل حل کر سکتا ہے، دنیوی امور کا دین سے کوئی ربط نہیں ہے، اور اس طرح کے شکوک و شبہات ہمارے پڑھے لکھے مولفین اور مقررین اور ثقافتی شخصیتوں کے ذریعہ پیش کی جاتی ہیں جو ہماری ملت اور ہمارے معاشرہ کے لئے ایک بہت بڑا خطرہ بنی ہوئی ہیں۔

دنیا اور آخرت میں چولی دامن کا رشتہ ہے حقیقت یہ ہے کہ اگر چہ ہماری یہ زندگی دو حصوں میں تقسیم ہے دنیوی زندگی اور اُخروی زندگی، یعنی ہماری زندگی کا ایک دور، روز پیدائش سے شروع ہوتا اور موت پر ختم ہوجاتا ہے اور اس کے بعد دوسری زندگی عالم برزخ سے عالم قیامت تک پھیلی ہوئی ہے ،البتہ اس کے علاوہ بھی ایک اور زندگی دنیا میں آنے سے پہلے کی فرض کی جا سکتی ہے اور وہ ہے ''عالم جنین ،، لیکن زندگی کی اس تقسیم کا لازمہ یہ نہیں ہے کہ ہماری زندگی کی راہ و روش بھی دو حصوں میں تقسیم ہوجائے اور دو نگاہوں سے دیکھی جائے ،بہرحال اس وقت ہم دنیا میں رہ رہے ہیں اور اس دنیا میں بہت سے امور انجام دیتے رہتے ہیں دین اسی لئے آیا ہے کہ ہمارے طور طریقے کو درست کرے، اور اپنے شرعی دستورو احکام اور حکومتی نظام کے ذریعہ ہماری رہنمائی کرے، نہ یہ کہ دینی احکام و قوانین صرف مرنے کے بعد کے لئے ہیں۔

ایسا نہیں ہے کہ ہماری ۵۰، ۶۰ سال کی عمر کا کچھ حصہ آخرت سے مربوط ہو اور عمر کا بقیہ حصہ دنیا سے تعلق رکھتا ہو، در اصل دنیا کی کوئی بھی چیز ایسی نہیں ہے جو آخرت سے بے تعلق ہو، ہمارے تمام دنیوی طور طریقے ایک طرح کی اُخروی شکل اختیار کر سکتے ہیں یعنی وہ اعمال اس طرح سے انجام پائیں کہ آخرت میں مفید ثابت ہوں، یا یہی اعمال اس طرح کے ہوں کہ ہماری آخرت کے لئے مضراور نقصان دہ ثابت ہوں، بہر حال گفتگو یہ ہے کہ ہمارے اعمال وافعال ہماری آخرت میں موثر ہیں اور بنیادی طور پر اسلامی نظریہ بھی یہی

ہے کہ آخرت کی زندگی کو اسی دنیا میں سنوارا جاتا ہے''الیوم عمل ولاحساب وغداً حساب ولا عمل[1] ''آج عمل کرنے کا دن ہے حساب کا نہیں اور کل قیامت میں حساب ہوگا ،عمل کی گنجائش نہیں ہوگی۔ ''الدنیا مزرعۃ الا خرۃ[2] ''دنیا آخرت کی کھیتی ہے (جیسا یہاں بوؤگے ویسا ہی وہاں کاٹو گے)''۔

لہٰذا جو کام ہم دنیا میں کریں گے آخرت میں اسی طرح کا بدلا ملے گا،ایسا نہیں ہے کہ ہماری دنیوی زندگی اخروی زندگی سے بے تعلق ہو، اور ہماری زندگی کا ایک حصہ دنیا سے اور ایک حصہ آخرت سے متعلق ہو،یعنی ہماری دنیا و آخرت کے الگ الگ دائرے نہیں ہیں، بلکہ اس دنیا میں ہمارے تمام کام مثلاً ہمارا اٹھنا بیٹھنا، سانس لینا، دیکھنا، سننا، گفتگو کرنا، کھانا پینا، معاشرت، میاں بیوی کے تعلقات، افراد اور معاشرے اور اسی طرح عوام اور حکومت کے درمیان روابط اس طرح ہو سکتے ہیں کہ ہماری آخرت سنور جائے ،اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہمارے یہی کام آخرت میں مضر اور نقصان دہ ثابت ہوں،یہ صحیح ہے کہ کھانا پکانا اور کھانا کھانا دنیا سے مربوط ہے لیکن ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ کھانا کھانے کا یہی طریقہ وہ ہو جو جنت میں جانے کا باعث بن جائے اور ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ہم کو جہنم تک پہنچا دے: (اِن الَّذِیْنَ یاکُلُونَ أَمْوَالَ الْیَتَامیٰ ظُلْماً اِنَّمَا یاکُلُونَ فِی بُطُونِهِمْ نَاراً وَسَیَصْلَوْنَ سَعِیراً[3]) ''بے شک جولوگ یتیموں کا مال ظالمانہ طور پر چٹ کر جاتے ہیں دراصل وہ اپنے پیٹ میں انگارے بھرتے ہیں اور عنقریب واصل جہنم ہوں گے''۔

جو شخص اپنے پیٹ کو یتیموں کے مال سے بھرتا ہے اگر چہ وہ کھانا کھاتا ہے اور اس سے لذت بھی اٹھاتا ہے لیکن یہی کھانا جو کھارہا ہے اس کے لئے جہنم کا عذاب بن جائے گا ،چنانچہ اگرایک انسان خدا کی عبادت کے لئے کھانا کھاتا ہے تو اسکا یہی کھانا آخرت میں ثواب واجر کا باعث ہے اسی طرح اگر انسان خدا کی خوشنودی کے لئے گفتگو کرتا ہے تو جنت میں اس کے لئے ایک درخت لگایا جاتا ہے ۔ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحاب سے فرمایا ہے: جو شخص بھی تسبیحات اربعہ پڑھے ، خداوندعالم اس کے

---

[1] بحارالانوار ج ٣٢ص ٣٥۴۔
[2] بحارالانوار ج ٧٠ ص ٢٢۵۔
[3] سوہ نساء آیت ١٠۔

لئے جنت میں ایک درخت اگاتا ہے (یہ سننے کے بعد) بعض لوگوں نے کہا: تب تو ہمارے لئے جنت میں بہت سے درخت ہوں گے، کیونکہ ہم کثرت سے تسبیحات اربعہ کو پڑھتے رہتے ہیں،اس وقت حضرت رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: شرط یہ ہے اس کو خاکستر کرنے کے لئے وہاں آگ نہ بھیجنا۔

معلوم ہوا ہمارے اعمال وکردار جب خدا کی خوشنودی کے لئے ہوں آخرت کی سعادت وکامیابی کا سبب ہوتے ہیں، اور جب ہمارے یہی اعمال خدا کی مرضی کے خلاف ہوں تو آخرت کی بد بختی اور عذاب جہنم کے باعث بنتے ہیں، ایسا نہیں ہے کہ ہماری یہ زندگی دو الگ الگ مستقل حصوں پر مشتمل ہے ایک حصہ آخرت سے مربوط ہے اور مسجد وعبادتگاہوں میں گذارا جائے اور دوسرا حصہ خود ہم اور ہماری دنیا سے مربوط ہے کہ جس کا آخرت سے کوئی سروکار نہیں ہے۔

اور جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ یہ نظریہ کہ دین کے دائرے میں صرف انفرادی اور عبادی مسائل اور عبادت گاہیں آتی ہیں جس کے آثار آخرت میں ظاہر ہوں گے، دوسرے تمام مسائل دین کے دائرے سے خارج ہیں، ادھر چند صدیوں کے درمیان مغرب میں بعض ادیان کے ماننے والوں نے اس بات کو فروغ دیا ہے جس نے بہت سے لوگوں کے ذہن کو مشغول کر رکھا ہے ورنہ صرف اسلام میں ہی نہیں بلکہ کسی بھی حقیقی آسمانی دین میں یہ بات نہیں کہی گئی ہے، سبھی دین برحق کا یہی کہنا ہے کہ انسان کی تخلیق اسی لئے ہوئی ہے کہ وہ اپنے لئے اچھی یا بری سرنوشت فراہم کرے، انسان کو ہمیشگی کی سعادت یا ہمیشگی کی سختیاں اسی دنیوی زندگی کے زیر سایہ حاصل ہوتی ہیں، یعنی اگر انسان کی رفتار وگفتار الٰہی قوانین کے تحت ہو تو ہمیشگی کی سعادت اس کے شامل حال ہوگی، اور اگر انسان کے کارنامے خدا کی مرضی کے خلاف ہوں تو ہمیشگی کی سختی وبد بختی دامن گیر ہوجائے گی۔

یہ جو بعض لوگ دین سے اپنی توقعات کے جواب میں کم سے کم کے قائل ہوگئے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم کو مذہب سے اپنی توقعات کم سے کم رکھنی چاہئے اور اسی بنیاد پر انھوں نے انسانی رفتار وگفتار کو دو حصوں میں تقسیم کردیا ہے ایک حصہ جو دین کے دائرے میں

آتا ہے آخرت سے متعلق ہے، اس کا دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہے اور دوسرا حصہ جو دنیا سے متعلق ہے وہ دین سے الگ ہے، چنانچہ سیاسی اور اجتماعی مسائل ان ہی کا حصہ ہیں، یہ تصور اسی غلط فکر اور کج فہمی کا نتیجہ ہے جس میں وہ گرفتار ہیں انھوں نے اپنے نزدیک خیال کرلیا کہ اگر دین سے ہم زیادہ سے زیادہ توقعات رکھیں گے تو پھر ہمارے تمام امور یہاں تک کہ کھانے پینے اور مکان بنانے وغیرہ کا بیان بھی دین میں ہونا چاہئے اور چونکہ انھوں نے یہ سوچا اس طرح کی توقع صحیح ہے اور نہ ہی دین ان تمام چیزوں کا جواب دہ ہے، لہٰذا یہ لوگ دین سے کم سے کم توقعات کے قائل ہوگئے۔

ان کو یہ غلط فہمی اس وجہ سے ہوئی کہ انھوں نے اس مسئلہ کو صرف دو قسموں پر منحصر کردیا جب کہ ایک تیسری قسم بھی موجود ہے اور یہی تیسری قسم صحیح ہے، اور وہ یہ کہ ہم دین سے یہ توقع نہیں رکھتے کہ وہ تمام چیزیں یہاں تک کہ کھانے پینے اور کپڑے پہننے اور مکان بنانے کے طریقے بھی ہم کو بتائے، کوئی بھی اس طرح کا دعویٰ نہیں کرتا، لیکن باوجویکہ دین نے بہت سے مسائل کی توضیح و تشریح غیر مذہبی دنیوی علوم پر چھوڑ دی ہے، پھر بھی یہ مسائل کسی نہ کسی اعتبار سے دین کے دائرے میں آتے ہیں، اور یہ اس وقت ہے جب یہ مسائل دینی اقدار و معیار کا رنگ اختیار کرلیں۔

ان کے اندر وہ پہلو بھی کار فرما ہو جو دین سے متعلق ہیں مثلاً کھانا، کھانا دینی مسئلہ نہیں ہے لیکن اگر کوئی مررہا ہے، بھوکا ہے تو اس کے لئے کھانا، کھانا واجب ہے، تو اس صورت میں یہ مسئلہ دینی ہوجائے گا۔

دنیوی اعمال و کردار میں دین کا رنگ

جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہماری دنیوی زندگی اُخری زندگی سے بندھی ہوئی ہے اور ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ تمام انسانی اعمال و کردار اس کے کمال یا زوال میں اہم کردار ادا کرتے ہیں، اور ہمارا عمل ابدی سعادت و کمال میں موثر ہوسکتا ہے تو پھر یہی افعال کردار معیاری رنگ اختیار کرلیتے ہیں اور ہم دین کو یہ اختیار دیدیتے ہیں کہ ہمارے افعال و کردار کے بارے میں فیصلہ کرے، یا آسان لفظوں میں یہ

کہا جائے کہ دین ہمارے افعال کے حلال و حرام کو بیان کرتا ہے، دین ان کے انجام دینے کی کیفیت بیان نہیں کرتا، دین کہتا ہے کہ بعض چیزوں کا کھانا حرام اور گناہ ہے، مثلاً سور کا گوشت کھانا اور نشہ آور مشروب پینا حرام ہے اب یہ شراب کیسے بنائی جاتی ہے اور سور کیسے پالا جاتا ہے بیان کرنا دین کا کام نہیں ہے، البتہ اسلام نے سور کے گوشت کو حرام اس لئے کیا ہے کہ یہ دینی کمال و ارتقاء میں مفید نہیں ہے اور بنیادی طور پر احکام چاہے ان کے کرنے کی اجازت ہو یا ممانعت، سبھی احکام اُن کے اُن مثبت یا منفی اثرات کی بنا پر دئے گئے ہیں جن احکام کے متعلقات انسان کی سعادت او رآخرت پر استوار ہیں اور جن سے افعال و کردار کی اہمیت اور معیاری رنگ کا پتہ چلتا ہے۔

بہ الفاظ دیگر اس طرح عرض کیا جائے کہ انسانی ترقی و کمال کی راہ ایک نقطہ سے لامتناہی ذات کی طرف شروع ہوتی ہے اب اس راہ میں جو چیزیں کمال و ارتقاء کے لئے مفید ہوں اور جن کا رخ خدا کی طرف ہو، اعلیٰ اور بلند ہوں اور انسان کی معنوی بلندی کے لئے راہ ہموار کریں درجات کے اعتبار سے یا واجب ہیں یا مستحب آخری حد مباح کی ہے اور جو چیزیں انسان کو زوال اور پستی کی طرف لے جانے والی ہیں اور انسان کو راہ کمال اور خداوندعالم سے دور کرتی ہیں ان کا تعلق حرام سے ہے اور اس سے ادنیٰ سطح پر مکروہات ہیں۔

معلوم ہوا کہ دین یہ نہیں کہتا کہ کون سا کھانا کھائیں؟ کس طرح کھانا تیار کریں؟ کس طرح مکان بنائیں؟ لیکن دین اس بات کی تاکید کرتا ہے کہ مکان غصبی جگہ پر نہ بنایا جائے یا مکان اس طرح نہ بنائیں کہ جس سے دوسروں کے گھروں کی بے پردگی ہو، دین یہ کہتا ہے کہ حلال کے پیسہ سے مکان بنائیں سود کے پیسہ سے مکان نہ بنائیں، درحقیت دین نے مکان بنانے کے اصول اور معیار بیان کر دیئے ہیں اسی طرح دین یہ کہتا ہے کہ ہم وہ کھانا کھائیں جو ہمارے انسانی کمال اور معنوی ترقی میں موثر ہو اور وہ غذائیں جو حرام ہیں یا نشہ آور مشروبات اور منشیات سے پرہیز کریں جو خود ہمارے لئے ضرررساں اورنقصان دہ ہیں ۔قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

(یا أیُّہا الذین ءامنُوا إنّما الخمرُ والمیسرُ والأنصابُ والأزلامُ رجسٌ من عمل الشّیطان فاجتنبوہ لعلّکم تفلحون. إنّما یرید الشّیطان أن یوقع بینکم العداوۃ والبغضاء فی الخمر والمیسر ویصدّکم عن ذکر اللّٰہ [1])

''اے ایمان دارو! شراب اور جوا اور طرح طرح کے بت اور (قیمت آزمائی کے) پانسے تو بس گندے اور شیطانی کام ہیں، تم لوگ اس سے اجتناب کروتا کہ فلاح پاسکو، شیطان تو بس یہی چاہتا ہے کہ شراب اور جوے کے ذریعہ تم میں باہم عداوت ودشمنی کا بیج ڈل دے اور تم کو خدا کی یاد سے باز رکھے''۔

نتیجہ یہ نکلا کہ دین کی حلال اور حرام کردہ چیزیں انسانی عمل و رفتار کے معیاری رنگ و رخ کو بیان کرتی ہیں کہ آیا وہ چیزیں مثبت پہلو رکھتی ہیں یا منفی، اور آیا وہ چیزیں ہماری سعادت اور کامیابی میں موثر ہیں اور خدا تک پہونچنے کی راہ ہموار کرتی ہیں؟ یا یہ چیزیں انسان کو بدبختی اور ہلاکت کی وادی میں پہونچادیتی ہیں؟ مختصر یہ کہ دین، عمل و رفتار کے دنیوی کردار سے ماوراء اس کے کردار کے اس رخ بھی پر توجہ دیتا ہے کہ جس کے ذریعہ انسان جنتی یا جہنمی بنتا ہے۔

عمل و رفتار کی عظمت سمجھنے میں قوت عقلیہ کا کردار ہمارے افعال وکردار کا معیار کسی عمل کی اجازت یا مخالفت کے لحاظ سے یا افعال و رفتار کے معیاری یا غیر معیاری ہونے کے لحاظ سے کبھی اتنا واضح و روشن ہے کہ اس کو عقل انسانی بخوبی سمجھ لیتی ہے اور ایک واجب العمل حکم کی صورت میں بیان کی ضرورت نہیں ہوتی، عقل خود ہی خداوندعالم کے حکم کو مشخص کرلیتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ فقہائے کرام مستقلات عقلیہ کے بارے میں فرماتے ہیں: بعض مسائل میں عقل مستقل طور پر فیصلہ کرسکتی ہے اور افعال کے حُسن وقبح (اچھائی اور برائی) کو سمجھ لیتی ہے اور ہم عقل کے ذریعہ سمجھ لیتے ہیں کہ خداوندعالم کیا چاہتا ہے، کام کیا جائے یا ترک کردیا جائے، خود عقل کے ذریعہ ہم یہ پتہ لگا لیتے ہیں کہ خداوندعالم اس کام سے راضی ہے یا نہیں، چنانچہ ہم سبھی کی عقل اس

---

[1] سورۂ مائدہ آیت ۹۰،۹۱۔

بات کو سمجھتی ہے کہ کسی یتیم کا مال کھانا ایک برا کام ہے،اور اس سلسلے میں شارع مقدس کی طرف سے حکم بیان ہونا ضروری نہیں ہے، اگرچہ عقل کے فیصلے کے بعد بھی قرآن وحدیث میں اس طرح کے مسائل شرعی حکم کی صورت میں بیان ہوئے ہیں جو دراصل حکم عقل کی مزید تاکید کے لئے ہیں لیکن بہت سے مقامات پر ہماری عقل اعمال و رفتار کے معیار کو سمجھنے اور ہماری سعادت و بدبختی میں اُن کی تاثیر کی شدت کو بیان کرنے کی قوت نہیں رکھتی، اس طرح سے کہ ہم اپنے اعمال کے وجوب وحرمت اور استحباب وکراہت کو عقل کے ذریعہ معین کرسکیں، لہٰذا ایسے مقامات پر دین کو دخل دینے کا حق ہے کہ وہ عمل و رفتار کے احکام بیان کرے۔

دین کا دائرہ عمل جیسا کہ معلوم ہوا کہ وہ چیزیں جو ہماری ہمیشگی کی سعادت یا بدبختی میں مؤثر ہیں صرف ان مسائل میں منحصر نہیں ہیں جو براہ راست خداوندعالم سے مربوط ہیں، بلکہ دین، عبادی مسائل کے علاوہ دنیوی امور میں بھی دخل کا حق رکھتا ہے اسی وجہ سے دین نے بعض کھانے پینے کی چیزوں کے بارے میں اس کے حلال یا حرام ہونے کا حکم بھی بیان کیا ہے۔

دوسری طرف جب ہم دینی احکامات کو ملاحظہ کرتے ہیں تو اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ دین کا دائرہ انفرادی مسائل تک محدود نہیں ہے بلکہ گھریلو مسائل، شادی بیاہ کے امور اور تجارت وغیرہ جیسے اجتماعی مسائل بھی شامل ہیں اور دین نے ان مسائل کے حلال و حرام ہونے کے دائرے اور معیارات کو بیان کیا ہے، درحقیقت مذہب نے ان امور کی معیاری شکل بیان کرکے اس پر عمل پیرا ہونے کی جہت معین کردی ہے اور بتایا ہے کہ ان کی کون سی شکل خداوندعالم کی سمت لے جاتی ہے۔

اور کون سی شکل شیطان کی طرف میلان کے اسباب فراہم کردیتی ہے، یہ وہ چیز ہے کہ علم جس کے بیان سے عاجز ہے علم صرف یہ بیان کرتا ہے کہ کس چیز کو بنانے کے لئے کن چیزوں کی کس مقدار میں ضرورت ہے، اور اُن کے طبیعی اور کیمیائی خصوصیات کیا کیا ہیں، لیکن یہ بیان نہیں کرتا کہ چیزوں کا کس طرح استعمال کیا جائے کہ انسان اپنے حقیقی اور واقعی کمال اور ارتقاء تک پہونچ سکے،

ایسے مقامات پر دین فیصلہ کرتا ہے لہٰذا جس طرح ہمارے شخصی اعمال ہماری سعادت وبدبختی میں مؤثر ہوتے ہیں اسی طرح سیاسی واجتماعی امور میں ہمارے اعمال بھی ہماری سعادت یا بدبختی میں مؤثر ہیں، بلکہ اس حصے میں وہ اور زیادہ موثر ہوتے ہیں۔

اب رہا ہماری گفتگو کا اصلی محور یعنی معاشرہ کا انتظام اور نظم و نسق تو کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ معاشرہ کے نظم و نسق کا طریقہ ہماری اُخروی سعادت یا بدبختی سے کوئی تعلق نہیں رکھتا؟ اور اس معاشرہ کے افراد جو طریقہ و روش بھی چاہیں معاشرہ کے انتظام کے لئے انتخاب کریں، پوری طرح مختار ہیں اور ان مسائل میں دین کوئی دخالت نہیں رکھتا؟ کون ہے جو نہیں جانتا کہ معاشرہ میں عدل و انصاف کی برقراری انسان کی سعادت اور کامیابی کی ضامن ہے۔

اور عدل و انصاف ایک بہت ہی اہم اور قوی معیار ہے جو مثبت پہلو رکھتا ہے اس سلسلہ میں اگر کوئی آیت یا حدیث نہ ہوتی تب بھی ہماری عقل اس بات کو سمجھتی ہے کہ عدل وانصاف کی رعایت انسانی کمال اور ترقی و سرفرازی میں بہت زیادہ مؤثر ہے، اگر کچھ حضرات اس بارے میں معیاری مسائل کو سمجھنے میں عقل کو ناکافی سمجھتے ہوں تو بھی وہ قرآن واحادیث کی طرف رجوع کریں، البتہ ہمارا خیال تو یہ ہے کہ سیاسی واجتماعی امور میں بہت سے مسائل کے اقدار کو عقل سمجھ سکتی ہے، لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جو کچھ عقل سمجھ لے وہ دین کے دائرے سے خارج ہوجاتا ہے۔

جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ اصلی مرضی خدا کا جاننا ہے اور جو چیز خدا کی حکمت اور اس کے ارادہ کو بیان کرتی ہے اور ہم کو آگاہ کرتی ہے کہ خدا کی مرضی کیا ہے وہ اہم ہے، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اس امر کو کس راہ کے ذریعہ کشف کریں، بلکہ اہم یہ ہے کہ ہم خداوندعالم کے ارادۂ تشریعی کو کشف کریں، چاہے یہ استنباط قرآن وسنت کے ذریعہ ہو یا عقل کے ذریعہ، کیونکہ یہ تینوں ہی خدا کے احکام اور دینی قوانین کے جاننے کی دلیلیں ہیں اسی وجہ سے عقل کو احکام الٰہی کے سرچشموں میں شمار کیا گیا ہے اور فقہائے کرام نے عقل کو چونکہ احکام شرعی کے اثبات کی دلیلوں میں شمار کیا ہے، شرعی مسائل کو ثابت کرنے کے لئے عقل سے بھی تمسک کیا

ہے، لہٰذا ایسا نہیں ہے کہ عقل ا ور شرع کے درمیان کوئی حد بندی قائم ہو کہ کچھ چیزیں عقل سے مربوط ہوں اور کچھ چیزیں شرع سے تعلق رکھتی ہوں، بلکہ عقل بھی وہ چراغ ہے جس کی روشنی میں خدا کی مرضی اور اس کے ارادہ کو معلوم کیا جاسکتا ہے، جو چیز اس سلسلے میں عقل کے ذریعہ کشف ہوتی ہے دین کا حکم ہے ۔

دین اور حکومت میں رابطہ

سماجی اور سیاسی مسائل میں دین کی مداخلت کے سلسلہ میں ہم نے جو کچھ عرض کیا اس کو اور مختلف قسم کی اُن حکومتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے جواب تک دنیا میں تشکیل پا چکی ہیں خصوصاً وہ حکومتیں جو اسلام کے نام سے یا اسلامی دور حکومت میں دوسرے ناموں سے وجود میں آئی ہیں، یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اسلام ان حکومتوں کی نوعیت کے بارے میں مثبت یا منفی کوئی نظریہ نہیں رکھتا؟ اگر ہم معاویہ اور یزید کی فاسق و فاجر اور ظالمانہ حکومت کا حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کی عدالت پرور اسلامی حکومت سے موازنہ کریں تو کیا یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ اسلام دونوں طرح کی حکومتوں کو ایک ہی نگاہ سے دیکھتا ہے اور حضرت علی علیہ السلام اور معاویہ کی حکومت میں کوئی فرق نہیں ہے؟

کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہر انسان آزاد ہے وہ اپنی مرضی کے مطابق حکومت کا جو بھی طور و طریقہ چاہے اپنا سکتا ہے؟! اس میں دین کا کوئی دخل نہیں ہے اور انسانی اعمال اس کی سعادت یا بدبختی میں کوئی دخل نہیں رکھتے، نہ حضرت علی علیہ السلام کا طرز حکومت انسان کی آخرت کے حوالے سے مؤثر ہے اور نہ ہی معاویہ کا طریقۂ حکومت انسان کی آخرت میں کوئی اثر رکھتا ہے؟! کیونکہ حکومت کا طریقہ، دنیا اور سیاست سے تعلق رکھتا ہے، اس کا دین سے کوئی رابطہ نہیں ہے! کیا کوئی عقلمند اس بات کو قبول کرسکتا ہے؟ کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ دین کی نظر میں دونوں حکومتیں ایک جیسی اور برابر ہیں؟ اور دین ان میں سے کسی ایک کی بھی پاکیزگی کی تعریف یا برے ہونے کی مذمت نہیں کرتا؟ حقیقت یہ ہے کہ معاشرتی اور حکومتی مسائل وہ نمایاں ترین میدان ہیں جن میں دین کی مداخلت ضروری ہے، دین کا فریضہ ہے کہ حکومت کے لئے کوئی مناسب ڈھانچہ پیش کرے ، دین کو بیان کرنا چاہئے کہ حاکم کو اپنی حکومت

کے اولین روز سے معاشرے کے محروم اور بے سہارا غریب لوگوں کی فکر کرنی چاہئے یا اپنی حکومت کو مضبوط کرنے کے چکر میں پڑا رہنا چاہئے؟ !

معلوم ہوا کہ مذہبی مسائل بالخصوص دین اسلام میں سیاسی و معاشرتی مسائل کی بڑی اہمیت ہے اور ان کو دین کے دائرہ سے خارج نہیں کیا جاسکتا، اور یہ خیال بھی صحیح نہیں ہے کہ سیاسی اور معاشرتی مسائل انسان کی فلاح و بدبختی میں مؤثر نہیں ہیں اگر انسان بنیادی طور پر آخرت، حساب وکتاب اور ثواب وعذاب پر یقین رکھتا ہے۔

تو کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ معاویہ اور یزید اور ان دونوں جیسے افراد کی حکومت ان تمام اُخروی مسائل پر اثر نہیں ڈالتی! اگرچہ بعض برادران اہل سنت، معاویہ کے مسئلہ کو ابھی تک حل نہیں کر سکے ہیں، لیکن تاریخ میں ایسے بہت سے ظالم وجابر افراد گذرے ہیں جنھوں نے تاریخ کو سیاہ کر رکھا ہے، کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان ظالم وجابر حکمرانوں کی حکومت اور عدل پرور افراد کی حکومت ایک جیسی ہے؟ اسی زمانہ کو لے لیجئے جس میں ہم زندگی گذار رہے ہیں، کیا وہ لوگ جو عورتوں اور بچوں کو جنھیں ہر مذہب وملت میں بے گناہ مانا جاتا ہے قتل کیا کرتے ہیں، سروں پر بم گراتے ہیں ان کو زندہ درگور کردیتے ہیں.

ان لوگوں کے برابر ہوسکتے ہیں جن کی تمام تر کوشش محروم اور مظلوم لوگوں کی نجات اور خدمت پر مرکوز ہوتی ہے؟ اور کیا یہ دونوں جنت میں برابر سے رہیں گے؟ لہٰذا کس طرح سیاسی و معاشرتی مسائل کو دین سے الگ سمجھا جاسکتا ہے؟ اگر یہ طے ہے کہ دین اسلام حلال وحرام، ثواب وعذاب اور دینی اقدار و معیارات میں اپنی مخصوص نظر رکھتا ہے توبدرجہ اولیٰ سیاسی اور معاشرتی مسائل وہ واضح ترین مسائل ہیں کہ جن میں دین کا نظر دینا ضروری ہے۔

پس وہ نظریہ جس میں دینی مسائل کو دنیوی مسائل سے الگ سمجھا جاتا ہے اور دینی مسائل صرف خدا اورآخرت سے مخصوص قرار دئیے جاتے ہیں اور ان کو دنیوی مسائل کے دائرہ سے خارج مانا جاتا ہے، (گویا انسان کے بعض امور دانشوروں اور سیاستدانوں پر

چھوڑ دئیے گئے ہیں اور بعض امور دین کے ذمہ داروں پر چھوڑ دئیجاتے ہیں؛ بالکل غلط اور باطل ہے اوریہ طرز عمل کسی بھی طرح اسلامی نظریہ سے میل نہیں کھاتا، اسلام انسان سے جس زندگی کا طالب ہے وہ آفاقی تصور جو اسلام نے پیش کیا ہے اور ہمیں جس کی طرف دعوت دی ہے اس نظریہ سے ہم آہنگ نہیں ہے۔

اس سے قطع نظر کہ جو لوگ اس طرح کا نظریہ رکھتے ہیں نہ خدا پر اعتقاد رکھتے اور نہ قیامت پر، ان کی یہ باتیں صرف اس لئے ہیں کہ دینداروں کو میدان سے ہٹا دیں، لیکن ہم کو ان کے ذاتی عقیدہ سے کوئی مطلب نہیں ہماری گذارش تو صرف یہ ہے کہ دنیوی مسائل کو دینی مسائل سے جدا کرنے کی منصوبہ بندی اور دنیوی مسائل کو دینی دائرے سے خارج کردینا بالآخر اسلام کے انکار کا سبب بنتا ہے کوئی اور نتیجہ نہیں رکھتا، اور جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ کوئی بھی عمل ایسا نہیں ہے جو ہماری سعادت یا بدبختی میں موثر نہ ہو، لہٰذا ہمیں قبول کرنا چاہئے کہ ہماری زندگی کے تمام مسائل میں دین کا اپنا ایک نظریہ ہے.

اور مذہب نے اس معیارات کو بیان کئے ہیں جیسا کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے ''ما من شئ یقربکم الی الجنة ویباعدکم عن النار الاّ وقد امرتکم بہ و ما من شئ یقربکم من النار ویباعدکم من الجنة الاّ وقد نہیتکم عنہ[1]'' ''نہیں ہے کوئی ایسی چیز جو تمہیں جنت سے قریب اور جہنم سے دور کرے مگر یہ کہ میں نے تم کو اس کے کرنے کا حکم دیدیا ہے اور نہیں ہے کوئی ایسی چیز جو تمہیں جہنم سے قریب اور جنت سے دور کرے مگر یہ کہ میں نے تم کو اس سے منع کردیا ہے''۔

اسلامی زاویۂ نظر کے مطابق ''جنتی ہونے'' کا مطلب فلاح و سعادت کے مفہوم کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے، اسی طرح بد بختی کا مطلب ''جہنمی ہونے'' کے علاوہ کچھ اور نہیں ہے: (فَأَمَّا الَّذِينَ شَقُوا فَفِي النَّارِ. وَأَمَّا الَّذِينَ سُعِدُوا فَفِي الْجَنَّةِ[2]) ''پس جو لوگ بد بخت ہیں وہ دوزخ میں ہوں گے.اور جو لوگ نجات یافتہ ہیں وہ بہشت میں ہوں گے''۔

---

[1] بحارالانوار ج ۷۰ص۹۶۔
[2] سورۂ ہود آیت ۱۰۸،۱۰۶۔

دین کی ہمہ گیری پیغمبر اکرمؐ کے فرمان کے مطابق دوسرا مفروضہ بھی باطل ہوجاتا ہے، وہ یہ ہے کہ اگر کوئی کہے: ٹھیک ہے دین کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ روش و رفتار کے معیارات معین کرے اور بتائے کہ حلال و حرام کیا ہے لیکن زندگی کے بعض امور خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیان کردئے ہیں اور بعض امور لوگوں پر چھوڑدئے ہیں، یعنی وہ چیزیں جو آنحضرتؐ کے زمانے سے متعلق تھیں وہ خود بیان کردیں اور باقی چیزوں کو لوگوں پر چھوڑدیا تاکہ زمانے اور مقام کے لحاظ سے خود طے کرلیں کہ کون سی چیزیں حلال ہیں اور کون سی چیزیں حرام۔

اس مفروضہ کا مطلب یہ ہوگا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فلاح و سعادت کے لئے لازم چیزوں کو بیان نہیں فرمایا ہے، جبکہ پیغمبر اسلام کا ارشاد ہے: ''یہ نہیں ہے کوئی ایسی چیز جو تمہاری سعادت کی ضامن ہو مگر یہ کہ میں نے اس کو بیان کردیا ہے''

، البتہ آنحضرتؐ کے قول کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپؐ نے تمام چیزوں کی جزئیات بھی بیان کردی ہیں ، بلکہ آپؐ نے تمام بنیادی باتیں بیان کردی ہیں تاکہ آپ کے بعد ہر زمانہ میں جو لوگ ایسی صلاحیت رکھتے ہیں مصادیق اور موضوعات کے مطابق مسائل کو بنیادی احکام پر منطبق اور مرتب کرکے ان کے حلال و حرام اور جزئی احکام کو معلوم کرلیں،

اور ان کو ''عناوین اولیہ'' یا ''عناوین ثانویہ'' یا حکومتی احکام کے عنوان سے لوگوں کے سامنے پیش کریں، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ مصادیق کا تعین اور جزئی احکام جنھیں عام زبان میں فتویٰ کہتے ہیں ان ہی بنیادی اصولوں پر منطبق ہیں جو قرآن، رسول اسلامؐ کی سنت اور ائمہ معصومین علیہم السلام کی احادیث میں ذکر ہوئے ہیں۔

پانچویں تقریر

اسلام میں آزادی

پہلا حصہ:

گذشتہ مطالب، ایک نظر میں اس سے قبل اسلام میں سیاست کی اہمیت اور اس بات کی وضاحت کے بعد کہ حکومتی اور سیاسی مسائل ،اسلامی معارف کا ایک حصہ ہیں، بطور اشارہ ہم عرض کر چکے ہیں کہ بعض لوگوں نے معاشرہ میں انحراف اور گمراہی پھیلانے نیز لوگوں کے ذہنوں کو الجھانے کے لئے اسلامی حکومت کے سلسلہ میں بہت سے شکوک پیدا کئے ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ دین کا دائرہ دنیا کے دائرہ سے الگ ہے اور دین کا دنیوی مسائل میں کوئی دخل نہیں ہے، حتی کہ دنیوی امور میں دخل دینا دین کے شایان شان بھی نہیں ہے دین کا کام صرف ان امور سے وابستہ ہے جو آخرت اور معنویات اور خدا سے انسان کے رابطہ کو منظم اور استوار کرتے ہیں، ایک جملہ میں مطلب یہ ہے کہ ہم دین سے کم سے کم توقعات رکھیں، چنانچہ اس سے پہلے جلسے میں ہم نے اس شبہ کا جواب عرض کیا تھا کہ ''دین سے ہماری توقعات'' کم سے کم ہونا چاہئے یا ''زیادہ سے زیادہ'' اور اس سلسلہ میں جو مغالطہ ایجاد کیا گیا ہے مفصل طور پر اس کی وضاحت کی تھی۔

جواب کا نچوڑ یہ ہے کہ انسانی زندگی کا دائرہ اور اس سے متعلق دنیوی حقائق کے دو رخ ہیں: ایک رخ یہ کہ سبب اور مسبب، علت اور معلول کے درمیان موجود رابطہ کے مانند ہے، چنانچہ اس طرح کے تعلقات خود تمام موجودات میں بھی پائے جاتے ہیں مثلاً کون کون سی چیزیں آپس میں ملائی جائیں کہ فلاں کیمیائی عمل کے ذریعہ وہ چیز وجود میں آئے اور ایک زندہ وجود کن حالات میں پرورش پاتا ہے اور یہ انسان جو ایک زندہ وجود ہے کس طرح زندگی گزارتا ہے اور کس طرح اپنی صحت و سلامتی کی حفاظت کرتا ہے، اور یہ کہ

جب وہ مریض ہوجاتا ہے تو کس طرح اپنا علاج کرتا ہے لیکن دوسرا رخ اس دنیا کی اُن تمام حقیقتوں سے تعلق رکھتا ہے جو وہ انسان کی روح، معنوی کمالات اور اقدار و معیارات کے ساتھ وابستہ ہے۔

علم اور دین کے اپنے اپنے حدود

شراب کس طرح اور کن چیزوں کے ذریعہ بنائی جاتی ہے آج کتنے طرح کی شراب پائی جاتی ہے یہ ایک علمی بحث ہے اور اس طرح کی چیزوں کی تحقیق اور چھان بین کرنا دین کی ذمہ داری نہیں ہے دین کا کام یہ ہے کہ بیان کرے کہ شراب پینی چاہئے یا نہیں؟ اور اس کا پینا انسان کی روح اور معنوی زندگی کے لئے نقصان دہ ہے یا نہیں،

دوسرے الفاظ میں یوں کہا جائے کہ دین بتاتا ہے کہ شراب کا استعمال حلال ہے یا حرام؟ اس طرح دین دوسری تمام چیزوں کے سلسلے میں اپنا حکم اور اپنا معیار بیان کرتا ہے، علمی پہلو بیان نہیں کرتا دین موجودات کے درمیان موجود تعلقات سے بحث نہیں کرتا بلکہ موجودات کے ساتھ انسانی روح کے ذریعے اور اس کے فوائد اور بھلائی کا جائزہ لیتا ہے کسی کارخانہ یا تجارتی مرکز کے انتظام اور دیکھ بھال کے سلسلہ میں ناظم الامور کے لئے کون سی روش اپنانا صحیح ہے، اُن کے بروئے کار لائے جانے کے مراحل اور ان کی مدت کیا ہو، تاکہ اچھے نتائج برآمد ہوسکیں، یہ سب ناظم الامور کی ذمہ داریاں ہیں، ان کا جواب ''علم'' کے پاس ہے، لیکن ان کارخانوں میں کون سی چیز بنانا جائز ہے اور کون سی چیز تیار کرنا حرام ہے یہ سب حلال و حرام اور جو باتیں انسانی روح سے مربوط ہیں ان کا بیان کرنا دین کا کام ہے۔

دینی حاکمیت آزادی کے منافی ہے

یہ ایک غلط فہمی ہے لوگوں کو گمراہ کرنے کے لئے ایک غلط فہمی جو مختلف طریقوں سے پھیلائی جاتی ہے اور صرف ایک مغالطہ کے سوا کچھ نہیں ہے، یہ ہے کہ اگر دین انسان کے سیاسی اور معاشرتی کاموں میں مداخلت کرتا ہے اور لوگوں کے لئے کسی خاص طریقہ پر

چلنا یا کسی کی اطاعت کرنا لازم قرار دیتا ہے تو یہ انسان کی آزادی کے خلاف ہے اور انسان چونکہ ایک آزاد اور خود مختار مخلوق ہے جو چاہے کرے جو چاہے نہ کرے،اور اس کو کسی کام پر مجبور کرنے کا کسی کو کوئی حق نہیں ہے، چنانچہ مذہب کا انسان کے لئے فرائض معین کرنا،اور اس کو کسی کی اطاعت کا حکم دینا ہے اور وہ بھی اطاعت کامل، یہ چیز آزادی کے ساتھ میل نہیں کھاتی۔

مذکورہ غلط فہمی دینی پیرائے میں مذکورہ غلط فہمی کو مختلف شکلوں میں بیان کیا جاتا ہے ان میں اس طرح کی باتیں کرنے والے کچھ وہ ہیں جو اپنی دینداری کا ڈنکا بجاتے اور خود کو قرآن کا ماننے والا کہتے ہیں اور اپنی غلط بات کو مومن و دیندار افراد میں کارگر بنانے کے لئے ایک قرآنی اور دینی محل اس کے لئے بناتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اسلام،انسان کی آزادی کے احترام کا قائل ہے اور قرآن کریم نے دوسروں پر تسلط اور جارحیت کی نفی کی ہے یہاں تک کہ خود پیغمبر اسلامؐ نے کسی پر جارحانہ تسلط نہیں پسند کیا،اور کسی کو مجبور کرنا بھی نہیں چاہئے، لہٰذا قرآنی آیات کی بنیاد پر ہمیں قبول کرنا چاہئے کہ انسان آزاد ہے اور کسی کی اطاعت پر مجبور نہیں ہے۔

ان تمام شکوک و شبہات اور مغالطوں کا مقصد چونکہ ولایت فقیہ کے نظریہ کو ضعیف اور کمزور کرنا ہے،اور اسی مقصد کے لئے یہ غلط فہمی پھیلائی گئی ہے تاکہ ولی فقیہ کی اطاعت واجب ہونے کو انسانی آزادی کے خلاف قرار دیا جا سکے، اور باور کرایا جائے کہ یہ اسلامی روح کے خلاف ہے، جس میں انسان کو اشرف المخلوقات اور زمین پر خدا کا خلیفہ مانا گیا ہے، یہاں پر ان آیات کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن کو شبہ پیدا کرنے والوں نے اپنا مدرک بنایا ہے۔

خداوند عالم پیغمبر اکرم سے خطاب فرماتا ہے : ا۔ (فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنْتَ مُذَكِّرٌ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ)(۱) ''پس خبردار کرو، کیونکہ تم تو بس نصیحت کرنے والے ہو،ان پر داروغہ تو ہو نہیں [کہ ان کو ایمان پر مجبور کرو]''۔

[1] سورہ غاشیہ آیت۲۱، ۲۲۔

اس آیت کے پیش نظر، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی جو سب سے بلند مقام رکھتے ہیں لوگوں پر تسلط نہیں رکھتے،لوگ آزاد ہیں ان پر پیغمبرؐ کی اطاعت لازم نہیں ہے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لوگوں کی زندگی کے بارے میں اظہار خیال کا حق بالکل نہیں دیا گیا ہے۔

۲۔ (وَما جَعَلْنٰاکَ عَلَیْھِمْ حَفِیْظاً وَمَا أَنْتَ عَلَیْھِمْ بِوَکِیْلٍ[1]۔) ''اور ہم نے تم کو ان کا نگہبان تو بنایا نہیں ہے اور نہ تم ان کے اعمال کے ذمہ دار ہو''۔

۳۔ (مَا عَلَی الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلَاغُ[2]۔) ''رسول پر پیغام پہونچا دینے کے سوا کوئی ذمہ داری نہیں''۔

۴۔ (إِنّٰا ھَدَیْنٰاہُ السَّبِیْلَ إِمّٰا شَاکِراً وَإِمّٰا کَفُوراً[3]۔) ''ہم نے (انسان) کو راستہ دکھادیا، (اب وہ) خواہ شکر گذار رہے، خواہ ناشکرا بن جائے''۔

۵۔(وَقُلِ الْحَقُّ مِن رَبِّکُمْ فَمَن شَاءَ فَلْیُؤمِن وَ مَن شَاءَ فَلْیَکْفُرْ[4]۔) ''اور کہہ دیجئے کہ سچی بات (پیغام اسلام) تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے، بس جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر اختیار کرے''۔

مذکورہ غلط فہمی کا جواب جواب یہ ہے کہ جن آیات کے ذریعہ رسولؐ خدا کے تسلط اور حکمرانی کی نفی کرتے ہوئے آنحضرت کی اطاعت واجب نہ ہونے کی غلط فہمی ایجاد کی گئی ہے، ان کے مقابل ایسی آیات بھی قرآن میں موجود ہیں جو مذکورہ غلط فہمی پھیلانے والوں کے غلط نتیجہ نکالنے والی مذکورہ آیات کے ساتھ تناقض رکھتی ہیں، ہم یہاں ان میں سے کچھ آیات پیش کرتے ہیں، ملاحظہ فرمائیں :ا۔ (وَمَا کَانَ لِمُؤمِنٍ وَلَا مُؤمِنَةٍ إِذَا قَضَی اللّٰہُ وَرَسُولُہُ أَمْراً أَن یَکُونَ لَھُمُ الْخِیَرَةُ مِنْ أَمْرِھِمْ.[5]) ''کسی بھی ایماندار مرد اور کسی بھی

---

[1] سورہ انعام آیت ۱۰۷۔۔
[2] سورہ مائدہ آیت ۹۹۔
[3] سورہ انسان آیت ۷۶۔
[4] سورہ کہف آیت ۲۸۔
[5] سورہ احزاب آیت ۳۶۔

ایماندار عورت کو حق نہیں ہے کہ جب خدا اور اس کا رسول کسی کام کا اسے حکم دیں تو ان کے حکم کے سامنے اپنے اختیار کو بروئے کار لائے''۔

مذکورہ آیت واضح طور پر خدا ؤ رسول کی اطاعت کا لازم اور ضروری ہونے کوبیان کرتے ہوئے خبردار کررہی ہے کہ مومنین کو رسول خدا کی اطاعت سے گریز اور انکار کا کوئی حق نہیں ہے۔

۲۔ (اِنّمَا وَلیّکُمُ اللّٰہ وَ رَسُولُہٗ وَالذِین آمنوا الذین یُقیمُون الصَّلاۃَ وَ یُؤتُون الزَّکاۃَ وَہُمْ رَاکِعُون[۱]۔) ''(اے ایماندارو) تمہارا مالک و سرپرست توبس خدا اوراس کا رسول اور وہ مومنین ہیں جوپابندی سے نماز قائم کرتے ہیں اور حالت رکوع میں زکوٰۃ دیتے ہیں ''

۳۔ (النَّبیُ أَوْلیٰ بِا لْمُؤمنین مِن أَنْفُسِہِمْ[۲]۔) ''نبی مومنین پر خود ان سے بھی بڑھ کر حق رکھتے ہیں ''۔اب یہ اولیت کہ جس کا آیت میں ذکر ہے ولایت کے معنی میں قبول کریں یا سزاوار ہونے کے معنی میں، آیت سے دونوں صورتوں میں لوگوں کے بارے میں پیغمبر اکرمؐ کی رائے خود ان کی اپنی رائے پر مقدم ہے، اس آیت کے سلسلہ میں تمام مفسرین قرآن اس بات پر متفق ہیں، لہٰذا مسلمانوں کو چاہیئے کہ پیغمبرؐ کی رائے کو اپنی رائے پر مقدم قرار دیں کیونکہ وہ پیغمبرؐ کی رائے کی مخالفت کا حق نہیں رکھتے۔

البتہ مذکورہ آیت میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اصل ولایت کوبیان کیا گیا ہے، یہ بیان کرنا مقصود نہیں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولایت کا دائرہ کس قدر وسیع ہے آیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولایت، اور آپ کی رائے کا لوگوں کی رائے پر مقدم ہونا صرف اجتماعی امور میں سے ہے یا اجتماعی امور کے علاوہ شخصی امور کو بھی شامل ہے، اس میں کوئی

شک نہیں کہ شبہہ ایجاد کرنے والوں کہ جنھوں نے ابتدائی آیات کو بنیاد بنا کر خدا کے رسولؐ اور ان کے جانشینوں کی ولایت کی نفی کی ہے، یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ ان دو طرح کی آیات کے ظاہری تناقض (ٹکراؤ) کا کوئی جواب دیں گے اور بہت ممکن ہے وہ دوسری

---

[۱] سورہ مائدہ آیت ۵۵۔
[۲] سورہ احزاب آیت ۶۔

طرح کی طرح آیات سے بالکل غافل ہوں یا ان آیات کے مطالب کو قبول نہ کرتے ہوں، لیکن ہم چونکہ قرآن کریم کی آیات میں تناقض اور تعارض کے منکر ہیں، اپنا فریضہ سمجھتے ہیں کہ ان آیات کے ظاہری تناقض کو حل کریں اس کام کے لئے ضروری ہے کہ ہم دونوں طرح کی آیات کے روش و اسلوب کو قبل و بعد کی آیتوں کے ساتھ ملا کر رکھیں نیز آیات کے لحن اور ان کے مخاطبین کو ملاحظہ کریں تاکہ آیات کے حقیقی مطلب کو سمجھ سکیں ۔

قرآن کے انداز بیان میں فرق کی وجہ

جس وقت ہم آیات کے پہلے اور دوسرے حصے پر غور کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ دونوں طرح کی آیات کا لحن و بیان ایک دوسرے سے مختلف ہے:آیات کا پہلا حصہ ان لوگوں کے بارے میں ہے کہ جنہوں نے ابھی تک اسلام قبول نہیں کیا ہے اسی لئے خدا وندعالم ان لوگوں کو حقیقت اسلام کی طرف رہنمائی کرنا چاہتا ہے اور اپنی اطاعت کے فوائد کو گنا رہا ہے

اور جب اپنے پیغمبر کو، جو الٰہی رحمت و مہربانی کے مظہر ہیں لوگوں کے اسلام قبول نہ کرنے کے سبب فکر مند و پریشان پاتا ہے کہ خدا کی اطاعت سے روگردانی اختیار کرنے کے نتیجہ میںیہ لوگ دوزخ کا راستہ اپنے لئے ہموار کررہے ہیں تو خدا وندعالم اپنے رسول کی دلجوئی کرتا ہے کہ اے میرے حبیب ان لوگوں کے ایمان نہ لانے سے آپ کیوں غمگین ہوتے ہیں اور اپنی جان کو کیوں ہلکان کررہے ہیں ہم نے اسلام اس لئے نازل کیا ہے کہ لوگ اپنی مرضی اور اپنے اختیار سے اسے قبول کریں وگرنہ اگر ہم چاہتے تو تمام لوگوں کی ہدایت کردیتے اور اس کی قدرت بھی ہم میں ہے: (وَلَوْ شَاءَ رَبُّکَ لَآمَنَ مَنْ فِی الْأَرْضِ کُلُّهُمْ جَمِیعاً أَفَأَنْتَ تُکْرِهُ النَّاسَ حَتَّیٰ یَکُونُوا مُؤْمِنِینَ[1])۔ ''(اے پیغمبر) اگر آپ کا پروردگار چاہتا تو جتنے لوگ روئے زمین پر ہیں سب کے سب (جھک مارکر) ایمان لے آتے کیا آپ لوگوں سے زبردستی چاہتے ہیں کہ وہ سب کے سب ایمان لے آئیں، (زبردستی کے ایمان کا کیا فائدہ ہوگا)''۔

---

[1] سورہ یونس آیت ۹۹۔

خدا وند عالم نے انبیاءؑ کو اس لئے بھیجا کہ لوگ حق کو پہچانتے ہوئے اپنے لئے سعادت کا راستہ انتخاب کریں اور اپنے اختیار سے دین حق کو قبول کریں خدا وند عالم ان کو ایمان لانے پر مجبور کرنا نہیں چاہتا وہ ایمان جو جبر و اکراہ سے حاصل ہو اس کی کوئی قیمت نہیں ہے، یہ انسانی تربیت کے ساتھ میل نہیں کھاتی، انسانی تربیت یہ ہے کہ انسان علم و آگہی کے ساتھ حقیقت کو پہچانیں اور قبول کریں نہ یہ کہ زبردستی سر جھکادیں، اسی لئے خداوند عالم نے فرمایا: (لَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَفْسَکَ أَلَّا یَکُونُوا مُؤمِنِینَ . إِن نَشَأْ نُنَزِّلْ عَلَیْهِمْ مِنَ السَّمَاءِ آیَةً فَظَلَّتْ أَعْنَاقُهُمْ لَهَا خَاضِعِینَ[۱]) ''گویا آپ غم و اندوہ کی شدت سے اپنی جان دینا چاہتے ہیں کہ وہ لوگ کیوں ایمان نہیں لاتے! اگر ہم چاہیں تو آسمان سے اُن کے اوپر وہ نشانیاں نازل کردیں کہ ان سب کی گردنیں اس کے سامنے جھک جائیں''۔

معلوم ہوا اسلام و ایمان کی قوت قلبی اعتقاد پر ہے اور اس طرح کا اعتقاد خود اپنے ارادہ و اختیار کے تحت محکم اور قابل یقین دلیلوں کے ساتھ علم و آگہی کے بعد ہی میسر آتا ہے، اس میں زور زبردستی کا کوئی دخل نہیں ہے اسی لئے خداوند عالم نے پیغمبرؐ سے فرمایا کہ آپ نے اپنا فریضہ انجام دیدیا ہے آپ کا کام لوگوں تک ہماری آیات اور ہمارے پیغام کو پہونچانا تھا وہ آپ نے کردیا.

اب آپ ان مشرکین کے ایمان نہ لانے کی وجہ سے پریشان نہ ہوں، یہ نہ سوچئے کہ آپ نے اپنی رسالت کی ذمہ داری پر عمل نہیں کیا، آپ کی رسالت یہ نہیں ہے کہ لوگوں کو جبر و اکراہ کے ذریعہ مسلمان کریں، کیونکہ ہم نے آپ کو کفار پر داروغہ نہیں بنایا ہے کہ آپ طاقت کے سہارے ان کو مسلمان بنائیں آیات کے پہلے حصہ کے مقابلے میں آیات کا دوسرا حصہ ان لوگوں کے بارے میں ہے کہ جنھوں نے معرفت و شناخت کے ساتھ اپنے اختیار سے اسلام کو قبول کرلیا ہے۔

اب ان آیات میں ان افراد کو پیغام دیا جارہاہے کہ اسلامی احکام پر عمل کریں اور اس پیغمبر کی اطاعت کریں کہ جس کے بارے ان کا عقیدہ ہے کہ وہ خدا کا پیغمبر ہے اور اس کے تمام احکام و دستورات خدا کی طرف سے ہیں اور اس کے فیصلوں کے سامنے سر

---

[۱] سورہ شعراء، آیت ۳ تا۴۔

تسلیم کریں وہ آنحضرت کے فرمان کے سامنے اپنے اختیار اور انتخاب کرنے کا حق بھی نہیں رکھتے۔ اسلام قبول کرنے سے پہلے انسان کو حق انتخاب حاصل ہے۔

لیکن ایمان لانے کے بعد تمام شرعی احکامات کو تسلیم کرنا ہوگا اسی بنا پر وہ لوگ جو خدا کے صرف بعض احکام پر ایمان رکھتے ہیں خدا وند عالم ان کی سخت مذمت کرتا ہے: (اِن الذّین یکفُرون باللہ وَرُسلِہِ وَیُریدُون اَن یفرّقُوا بَین اللہِ وَرُسلِہِ وَیقُولُون نُؤمن ببَعضٍ وَ نکفُرُ ببَعضٍ وَ یُریدُون أن یتّخذُوا بَین ذلِک سَبِیلا ،أُولٰئِکَ ہُمُ الکافِرُون حقا۔)(۱) ''بے شک جو لوگ خدا اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور خدا اور اس کے رسولوں میں فرق کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض پر ایمان لائے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ دونوں کے درمیان ایک الگ راہ اپنے لئے نکالیں، یہی لوگ حقیقتاً کافر ہیں''۔

بعض احکام کو قبول کرنا اور بقیہ تمام احکام کا انکار کر دینا بعض قوانین کو قبول کرنا اور دوسرے تمام قوانین کو مسترد کر دینا در اصل خود دین کا انکار ہے، کیونکہ اگر دین کو قبول کرنے کا ملاک اور معیار خداوند عالم کا حکم ہے تو احکام الٰہی کے محور پر عمل کرنا چاہئے اور خدا کا حکم تمام احکام و قوانین کو قبول کرنے کے سلسلے میں ہے یہاں تک کہ اگر دین قبول کرنے کا معیار اس کے مصالح اور مفاسد ہوں کہ جس کو خدا بہتر جانتا ہے اور اس نے اپنے احکامات میں ان کو پیش نظر رکھا ہے

اور اس میں کوئی شک نہیں کہ خدا وند عالم تمام مصالح و مفاسد نیز اس کی بھلائی اور برائی کو جانتا ہے، پھر کیوں صرف بعض احکام کو قبول کرتے ہیں؟ نتیجہ یہ نکلا کہ وہی شخص خدا پر ایمان رکھتا ہے جو پیغمبرؐ کا بھی معتقد ہو اور آنحضرتؐ کے فیصلے اور ان کے حکم و فرمان کو بھی قبول کرے اور دل سے اس پر راضی رہے حتی ناراضگی کا احساس بھی نہ ہونے دے۔ فلاَ وَ رَبّکَ لاَیُؤمنُون حتّٰی یحکّمُوکَ فِیمَا شَجَرَ بَینَھُم ثُمّ لاَ یجِدُوا فِیۤ أَنفُسِہِم حرَجاً مِمّا قَضَیتَ وَ یُسلّمُوا تَسلِیمًا ۔(۲) ''پس (اے رسولؐ) آپ کے پروردگار کی قسم یہ لوگ سچے مومن نہ ہوں

---

۱ سورہ نساء آیت ۱۵۰و۱۵۱۔
۲ سورہ نساء آیت۶۵

گے تاوقتیکہ اپنے باہمی جھگڑوں میں آپ کو اپنا حاکم (نہ) بنائیں (یہی نہیں بلکہ) آپ کے فیصلے پر کسی طرح کی دل تنگی بھی محسوس نہ کریں، سر جھکا کر اُس کو مان لیں''۔

یہ کہ ایک سچا مومن، رسول خدا کے فیصلے کو دل سے قبول کرتا ہے اور اپنی ناراضگی کا احساس بھی ہونے نہیں دیتا اس لئے ہے کہ اس کو پورا یقین ہے کہ یہ خدا کے نبی ہیں ان کا حکم خدا کا حکم ہے اور اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتے: (إِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللّهُ[1]) '' (اے رسولؐ) ہم نے آپ پر حق کے ساتھ یہ کتاب اس لئے نازل کی کہ جو کچھ خدا نے آپ کو تعلیم دی ہے اس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کریں''۔

اب اگر کوئی اسلام قبول کرنے کے بعد کہے: میں اسلامی احکام پر عمل کرنے میں آزاد ہوں اگر چاہوں عمل کروں اور اگر نہ چاہوں عمل نہ کروں، تو یہ ویسے ہی ہے کہ کسی ملک میں جمہوری نظام اور آزاد حکومت ہو، لوگ اپنی مرضی سے رفرنڈم اور حکومت کے انتخابات میں شرکت کریں لیکن جب یہی حکومت کوئی قانون بنائے تو اس پر عمل کرنے سے انکار کردیں...؟

اور جب یہ حکومت لوگوں سے ٹیکس کا مطالبہ کرے تو کہیں کہ ہم نہیں دیں گے، اصل حکومت کی منظوری اور اس کے حق میں ووٹ دینے میں ہم آزاد تھے، لیکن کیا تشکیل حکومت کے بعد بھی آزاد ہیں کہ حکومت کے قوانین و دستور پر عمل کریں یا نہ کریں، یا حکومت کی کوئی ذمہ داری قبول کریں یا نہ کریں، یقیناً یہ طرز عمل کوئی بھی عقلمند قبول نہیں کرسکتا۔

جی ہاں: اصل اسلام کو قبول کرنے میں ابتدائی طورر پر کسی کو مجبور نہیں کیا جاسکتا کیونکہ بنیادی طور پر اسلام کا استحکام قلبی اعتقاد و ایمان پر قائم ہے اور طاقت کے زور پر کوئی اسلام نہیں قبول کرتا، نہ ہی خدا و قیامت پر ایمان لاتا ہے، لیکن جب اسلام قبول کرلیا تو اس وقت اس سے کہا جائے گا کہ نماز پڑھو، اب اگر وہ کہے کہ میں نماز نہیں پڑھوں گا یا اگر اس سے کہا جائے کہ زکوٰۃ دو، لیکن زکوٰۃ دینے

---

[1] سورہ نساء آیت ۱۰۵۔

سے انکار کرے، تو کوئی بھی عاقل اس کی بات قبول نہیں کرسکتا. جس نے اسلام قبول کیا ہے، اس کے تمام احکام کو بھی قبول کرنا پڑے گا بھلا یہ ہوسکتا ہے کہ اسلام تو قبول کرلے لیکن اس کے احکامات کو قبول نہ کرے، اور اپنی مرضی کے مطابق اعمال انجام دے؟

چنانچہ کوئی بھی حکومت اس بات کو قبول نہیں کرسکتی کہ انسان اس کے حق میں ووٹ دے لیکن عملی میدان میں اس حکومت کے قوانین کو قبول نہ کرے، اجتماعی زندگی میں بنیادی ترین اصول اپنے فرائض اور عہد وپیمان کا پابند ہونا ہے، اگر کوئی اپنے قول و قرار کا پابند اور عہد کا وفادار نہ ہو تو اجتماعی زندگی وجود نہیں پاسکتی۔

لہٰذا اگر کوئی یہ کہے کہ میں اسلام کو مانتا ہوں اور پیغمبر کی نبوت پر ایمان رکھتا ہوں لیکن ان کے احکامات پر عمل نہیں کرتا اور ان کی حاکمیت اور ولایت کو قبول نہیں کرتا تو اس کے اسلام کا کوئی فائدہ نہیں ہے، کیونکہ اسلام اور پیغمبر کو قبول کرنے اور ان کی اطاعت وپیروی نہ کرنے میں ایک نمایاں تناقض پایا جاتا ہے۔

ہماری گفتگو سے یہ واضح و روشن ہوچکا ہے کہ اگر کوئی انصاف کی نظر سے قرآنی آیات کو ملاحظہ کرے اور ذکر شدہ دونوں قسموں کی آیات کی دلالت، لحن اور قبل و بعد کی گفتگو کو غور سے دیکھے تو قرآن کریم میں کوئی تناقض نہیں ملے گا اور وہ شبہ جو اطاعت و فرمانبرداری اور انسان کی اصل آزادی میں کہ جس کو قرآن نے بھی صحیح و بجا قرار دیا ہے، تناقض کی شکل میں نظر آرہا تھا، بالکل ختم ہوجائے گا۔

لیکن جن کے دل مریض ہیں وہ قرآن کریم کو صداقت اور انصاف کی نظر سے نہیں دیکھتے اگر یہ لوگ قرآن کا مطالعہ بھی کرتے ہیں تو اس وجہ سے کہ اپنی کج فکری پر مبنی منحرف نظریات کی تائید میں کچھ مل جائے، اور اسی وجہ سے وہ قرآن کی آیات کے جائزے میں انتخاب سے کام لیتے ہیں اور آیات کے سیاق و سباق اور دلالت وغیرہ کو نہیں دیکھتے اور خود قرآن کے کہنے کے مطابق محکمات

قرآن کو چھوڑ دیتے ہیں اور متشابہات کی پیروی کرتے نظر آتے ہیں: (فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ[۱])

ا۔ ''پس جن لوگوں کے دل میں کجی ہے وہ انھیں آیتوں کے پیچھے پڑے رہتے ہیں جو متشابہ ہیں تاکہ فتنے برپا کریں (اور عوام الناس کو گمراہ کریں) اور اس خیال سے کہ انھیں اپنے مطلب پر ڈھال لیں غلط تاویل کرتے ہیں، حالانکہ ان کی تاویل سوائے خدا اور ان لوگوں کے جو علم میں بڑے راسخ ہیں، کوئی نہیں جانتا''۔

متشابہات کی پیروی کے علاوہ آیات کو ٹکڑے ٹکڑے کردیتے ہیں اور آیت کے ایک جملہ کو لے لیتے ہیں اور قبل و بعد کو چھوڑ دیتے ہیں جس کے نتیجہ میں ان کو قرآن مجید میں تناقض نظر آتا ہے جیسا کہ مذکورہ شبہ ایجاد کرنے میں ان لوگوں نے آیات کے قبل و بعد اور مخاطب کو نظر انداز کرکییہ دعویٰ کیا ہے کہ پیغمبر اور الٰہی حکمراں کی ولایت اصل آزادی کی مخالف ہے۔

جبکہ وہ آیات کہ جن میں رسول اسلامؐ کے لئے عوام کی نسبت سے داروغہ نہ ہونے کی بات کہی گئی ہے ان میں ان کفار کا ذکر ہے جنھوں نے ابھی اسلام قبول نہیں کیا تھا، جن میں کہا گیا ہے کہ اے رسول آپ ان کو طاقت کے زور پر اسلام کی دعوت نہ دیں، یعنی وہ کفار کے داروغہ نہیں، در حقیقت ان آیات کے مطابق احکام الٰہی کی پیروی کا اختیار اور عمل کی آزادی اسلام لانے سے پہلے ہے ورنہ اسلام قبول کرنے بعد ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ پیغمبر اور دوسرے اسلامی حکام کی پیروی کرے اور اُن کو اولیٰ بالتصرف مانے۔

اس کا فریضہ ہے کہ تمام اسلامی اقدار کی رعایت کرے، اگرچہ اسلامی حکومت افراد کی ذاتی اور خصوصی زندگی میں جو مسائل تنہائی میں انجام پاتے ہیں مداخلت نہیں کرتی، لیکن معاشرتی زندگی، دوسروں کے ساتھ معاملات اور لین دین میں ہر ایک پر فریضہ عائد کرتی

[۱] سورہ آل عمران آیت ۷۔

ہے کہ وہ الٰہی حد بندیوں کا خیال رکھیں اور اسلامی اقدار اور الٰہی قوانین کی توہین، مذہبی مقدسات کی بے حرمتی،کھلے عام گناہ اور فعل حرام کے مرتکب ہونے والوں کا شدت سے مقابلہ کرتی ہے اور یہ در حقیقت معاشرہ پر اسلامی حکام کی ولایت کی نشانی ہے جو ان پر فرض کرتی ہے کہ ایمان اور اسلام کے تمام لوازمات کی پابندی کریں، وہ اسلام جو خود انھوں نے اپنی مرضی سے قبول کیا ہے ۔

مذہب سے آزاد رہ کر مذکورہ غلط فہمی کی ترویج اب تک ہم نے ایک غلط فہمی اور اس کے جواب میں جو قرآنی اور مذہبی دائرے میں پیش کیا جو ایک ایسے شخص کی زبان سے تھا جو خود کو مسلمان اور دیندار کہتا ہے اور آیات قرآنی کو دلیل بنا کر یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ اسلام کو لازم و واجب فرمان صادر کرکے لوگوں کی زندگی میں مداخلت نہیں کرنا چاہئے، کیونکہ یہ مداخلت خود اسلام کی قبول کردہ آزادی کے خلاف ہے ۔

اب ہم اسی طرح کے اعتراض کا جائزہ لیں گے کہ جو مذہب سے آزاد ہو کر غیر مذہبی دائرہ میں کیا جاتا ہے غلط فہمی پیدا کرنے والوں کی کوشش ہے کہ اسلام کے لازمی احکام اور ان کی اطاعت و پیروی کو خود جوہر انسانیت کے خلاف اور منافی قرار دیں، چنانچہ یہ شبہ کئی طریقوں سے بیان کیا گیا ہے، ہم یہاں پر بعض طریقوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں: منطق کی اصطلاح میں ''انسان کا مختار ہونا اس کی فصلِ مقوم ہے اور انسان کی تمیز ہے''، اور اسی سے جوہر انسانیت وجود پاتا ہے۔

اب اگر ہم انسان سے اس کا اختیار اور اس کی آزادی سلب کرلیں اور اس کو مجبور بنادیں تو گویا ہم اس سے انسانیت کو سلب کررہے ہیں اور بلا تشبیہ اس کو ایک ایسے جانور کی مانند قرار دے رہے ہیں کہ جس کی گردن میں رسّی ڈال کر ادھر اُدھر کھینچتے ہیں، لہٰذا انسان کا احترام اور انسانیت کا تحفظ ہم سے اس چیز کا تقاضا کرتا ہے کہ اس کو ''حق انتخاب'' دیں، اور اسکا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دین میں لازمی اور واجبی احکام نہ ہوں، اور اس کو پیغمبر، ائمہ اوران کے نائبین کی اطاعت پر مجبور نہ کریں تو ورنہ اس صورت میں انسانیت کا احترام ختم ہوجائے گا، پتہ چلے گا کہ اس کو حیوان کی طرح قرار دیکر ادھر اُدھر کھینچا جا رہا ہے۔

''ہیوم''**کی غلط فہمی** اور مذکورہ تصور کا پہلا جواب ہم مذکورہ غلط فہمی کے دو جوابات پیش کریں گے، پہلا جواب ہیوم کی ایجاد کردہ غلط فہمی سے متعلق ہے کہ جس کو اتفاق سے شبہ پیدا کرنے والوں نے قبول کیا ہے، ہیوم کا کہنا یہ ہے کہ ''ہے'' اور ''ہیں'' کودرک کرنے والی عقل نظری ہے اور ہوناچاہئے یا نہیں ہونا چاہئے'' کو درک کرنے والی عقل عملی ہے اور چونکہ عقل نظری، عقل عملی سے بیگانہ ہے اور اس سے کوئی ربط نہیں رکھتی، لہٰذا عقل عملی کے فیصلے ''چاہئے یا نہیں چاہئے'' کو عقل نظری کی بنیاد پر نہیں کرنا چاہئے۔

ہیوم کی یہ غلط فہمی مغربی فلاسفہ کی توجہ کا مرکز قرار پائی اور انھوں نے اس کو اپنی بہت سے عملی باتوں اور علمی نظریوں کے لئے بنیاد قرار دیا، چنانچہ ایران کے اسلامی انقلاب کے بعد بعض روشن خیالوں نے اپنی بحثوں میں اس غلط فہمی کا اعادہ کیا کہ ہم کبھی بھی ''ہے''اور ''ہیں'' کے ذریعہ ''ہونی چاہئے'' کا فیصلہ نہیں کر سکتے۔

اگر کوئی شخص ایک مخصوص صفات رکھتا ہے تو اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ اسی طرح کا ہونا چاہئے یا نہیں ہونا چاہئے، کیونکہ ''ہے''اور ''ہیں'' کو درک کرنے والی عقل نظری ہے اور ''ہونا چاہئے'' کو درک کرنے والی عقل عملی ہے اور ان دونوں میں باہم کوئی ربط نہیں ہے۔

جن لوگوں نے ہیوم کی اس شبہکو قبول کیا وہ یہ کہتے ہیں کہ لوگوں کو کسی کام پر مجبور کرنا اس کی انسانیت کے ساتھ میل نہیں کھاتا، دین کونہیں چاہیے کہ وہ لوگوں کے لئے لازمی احکامات صادر کرے، کیونکہ لوگ مختار اور آزاد ہیں، پہلے کہتے ہیں کہ انسان مختار ہے پھر نتیجہ نکالتے ہیں کہ اس کو آزاد چھوڑ دینا چاہئے، اور اس پر کوئی حکم لازم نہیں کیا جانا چاہئے، معلوم ہوا کہ انسان کے مختار ہونے سے جس کا ''ہے''اور ''ہیں'' میں شمار ہوتا ہے، اور جس کو عقل نظری قبول کرتی ہے، ''چاہئے اور نہیں چاہئے'' کے ذریعہ فیصلہ نہیں کرتے ہیں کہ جس کو عقل عملی درک کرتی ہے، اور یہ خود ان کی بنیاد کے خلاف ہے کیونکہ وہ خود قبول نہیں کرتے کہ ''ہے''اور ''ہیں'' کے ذریعہ ''چاہئے'' کا نتیجہ نکالا جائے۔

البتہ ہمارا خیال یہ ہے کہ جہاں ''ہے''اور ''ہیں''کسی وجود کی علت تامہ ہو اس کا نتیجہ ''چاہئے''نکالا جاسکتا ہے لیکن اس طرح کا نتیجہ ہماری بحث میں نہیں نکالا جاسکتا، کیونکہ انسان کا مختار ہونا، اس پر فریضہ عائد ہونے کی علت تامہ نہیں ہے، بلکہ ''مختار ہونا'' فرائض کے لئے زمین ہموار کرتا ہے، اور کسی کام کا فرض اور لازمی ہونا یا کسی کام سے روکنا اُس کی بھلائی یا برائی کی وجہ سے ہوتا ہے، جو اس کام کے کرنے یا نہ کرنے میں مضر ہے، لہٰذا کسی کام کا لازم و واجب ہونا اس کی مصلحت کی وجہ سے ہے جو اس میں چھپی ہوتی ہے اور کسی کام سے روکنا اس ضرر اور نقصان کے سبب ہے جو اس میں پوشید ہوتا ہے۔

دوسرا جواب: آزادی مطلق اور لامحدود نہیں ہےاگر ہم اس شبہ کو مان لیں اور کہیں کہ چونکہ انسان مختار ہے لہذا اس پر کوئی کام لازم نہیں کیا جاسکتا اور کوئی بھی حکومت انسانوں کے لئے لازمی احکام نافذ نہیں کرسکتی کیوں کہ لوگ آزاد ہیں جس طرح چاہیں عمل کریں، قانون کی پابندی کا مطلب آزادی کا سلب کرنا ہے اور آزادی کا سلب کرنا گویا انسانیت کا سلب کرنا ہے لہٰذا کوئی بھی قانون قابل اعتبار نہیں ہوگا، ہم جنگلی راج اور افراتفری کا نظام قبول کرلیں۔

بنیادی طور رپر لازم و ضروری ہونا ہی قانون کے استحکام کا باعث ہے، ایک قانون اسی وقت قانون ہوگا کہ جب اس کے لازم ہونے کی ضمانت پائی جاتی ہو، کوئی بھی نظام اور ڈھانچا ہو جب کوئی اس کے قوانین اور دستورالعمل کو قبول کرتا ہے تو اس پر ہر حال میں عمل کرنا پڑے گا، یہ نہیں ہوسکتا کہ قانون تو قبول کرلے لیکن اگر اس قانون پر عمل درآمد اپنے نقصان میں ہو تو اس پر عمل نہ کرے اور اپنے نفع و نقصان کے بارے میں سوچنے لگے، اس طرح تو نظام درہم و برہم ہوکر رہ جائے گا جب ایک قانون، قانون بنانے والے کی نظر میں معتبر اور سرکاری حیثیت رکھتا ہے تو ہر ایک پر فرض ہے کہ اس کی اطاعت کرے، یہاں تک کہ اگر اس قانون میں کوئی خامی ہو تو بھی اس کی تلافی کرنا قانون دانوں کی ذمہ داری ہے، دوسروں کو قانون میں خامی کا بہانہ بناکر اس پر عمل کرنے سے فرار کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

کیا قانون کی حکمرانی، انسان کے خلیفۂ خدا ہونے سے معارض ہے؟ایک اور غلط فہمی یہ پھیلائی جاتی ہے کہ انسان قرآن کے مطابق خلیفۃ اللہ ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان روئے زمین پر خدا کا جانشین ہے اور خدا کی طرح عمل کرتا ہے جس طرح خدا نے اس دنیا کو خلق فرمایا ہے اسی طرح انسان کا بھی کام ہے کہ چیزوں کو پیدا کرے اور جس طرح خدا وند عالم اپنی مرضی کے مطابق نظام چلاتا ہے تو انسان کو بھی زمین پر جو اس کے اختیار میں ہے اپنی مرضی کے مطابق عمل کرنا چاہئے۔

جواب اس غلط فہمی کا جواب یہ ہے کہ پہلے خلیفۂ خدا ہونے کے معنی صحیح طرح سے سمجھ لئے جائیں اور توجہ رہے کہ خلیفۂ خدا کا خطاب جو قرآن میں حضرت آدم علیہ السلام کے لئے ذکر ہوا ہے[1]۔ تمام اولاد آدم کے لئے نہیں ہے کیوں کہ قرآن نے بعض اولاد آدم کو شیاطین میں قرار دیا ہے ارشاد ہوتا ہے: (وَکَذٰلِکَ جَعَلْنَا لِکُلِّ نَبِیٍّ عَدُوّاً شَیَاطِیْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ.[2]) ''اور (اے رسول) اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لئے شریر آدمیوں اور جنوں کے درمیان سے کچھ شیاطین کو دشمن بنایا''۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان نما شیطان خلیفۂ خدا نہیں ہو سکتے کہ جن کے سامنے ملائکہ سجدہ کرتے ہیں، اس موقع پر جب خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے: (وَاِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلآءِکَةِ اِنِّیْ خَالِقٌ بَشَراً مِنْ صَلْصَالٍ مِنْ حَمَاءٍ مَسْنُوْنٍ فَاِذَا سَوَّیْتُهُ وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُوْحِیْ فَقَعُوْا لَهُ سَاجِدِیْنَ.[3]) ''اور (اے رسول اس وقت یاد کرو) جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ جب میں ایک آدمی خمیر دی ہوئی کھنکھناتی مٹی سے ہر طرح سے درست کردوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو سب کے سب اس کے سامنے سجدہ میں گر پڑنا، تو تمام فرشتوں نے بلا کسی استثناء کے سجدہ کیا''۔ خلیفۃ اللہ ہونا بہت ہی عظیم خصوصیت اور شرائط رکھتا ہے جن میں سے کچھ شرائط مندرجہ ذیل ہیں۔

---

[1] اسماء کا علم

[2] سورہ انعام ؛آیت ۱۱۲۔

[3] سورہ حجرآیات ۲۹و ۳۰۔

۱۔خدا وند عالم اس سلسلہ میں ارشاد فرماتا ہے:(وَاِذْقَالَ رَبُّکَ لِلْمَلاٰئِکَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً قَالُوا أَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِکُ الدِّمَاءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِکَ وَنُقَدِّسُ لَکَ قَالَ اِنِّی أَعْلَمُ مَالاَتَعْلَمُوْنَ) (سورہ بقرہ آیت ۳۰)۔''(یاد کیجئے)اس وقت کو جب آپ کے پروردگار نے ملائکہ سے کہا میں روئے زمین پر ایک جانشین (نمائندہ) بنانے والا ہوں (تو اس وقت) فرشتوں نے کہا کیا تو ایسے کو خلیفہ اور جانشین بنائے گا جو زمین پر خونریزی و فساد برپا کرے ہم تیری تسبیح و تہلیل کرتے ہیں،اور تجھ کو مقدس و محترم مانتے ہیں، اس وقت خدا وند عالم نے فرمایا: میں وہ حقائق جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ''۔

(وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ کُلَّهَا[1]) ''اور (آدم کی حقیقت ظاہر کرنے کی غرض سے) آدم کو سب چیزوں کے نام سکھادیئے''۔

۲۔اللہ کا خلیفہ روئے زمین پر عدل و انصاف قائم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو لہذا وہ شیطان صفت انسان جس کی عادت قتل و غارت اور خونریزی ہو اور کوئی بھی ظلم کرنے سے نہ گھبراتا ہو وہ خلیفۃ اللہ نہیں ہوسکتا،کیا خدا وند عالم ظالم ہے (معاذاللہ) کہ اس کا خلیفہ اور جانشین بھی ظالم ہو؟اللہ کا خلیفہ وہ ہے جو اپنی شخصی اور اجتماعی زندگی میں خدائی صفات کا مظہر ہو نہ ہر وہ شخص جو دو پیروں سے انسانی شکل میں چلتا ہو۔

لہذا وہ افراد جو لوگوں کو گمراہ کرنے اور حکومت اسلامی کو ختم کرنے میں لگے ہیں نہ صرف یہ کہ اشرف المخلوقات نہیں ہیں بلکہ انسانی شکل میں وہی شیطان ہیں جن کو خدا وند عالم نے حیوانوں سے بھی بدتر کہا ہے ان ہی لوگوں کے بارے میں ارشاد ہوا ہے:(اِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِنْدَ اللّٰہِ الصُّمُّ الْبُکْمُ الَّذِیْنَ لاَیَعْقِلُوْنَ[2]) ''اس میں شک نہیں کہ زمین پر چلنے والوں میں سب سے بدتر خدا کے نزدیک وہ بہرے گونگے (کفار) ہیں جو کچھ نہیں سمجھتے''۔

[1] سورہ بقرہ آیت ۳۱۔
[2] سورہ انفال آیت ۲۲۔

یہ کہنا کہ انسان کی عظمت و بزرگی اس کی آزادی میں ہے اور جو چیز انسان کی آزادی کو محدود کرے مذموم اور ناقابل قبول ہے یہ وہ پُر فریب نعرہ ہے جو مغرب زمین نے لگایا ہے اور دوسرے ملکوں میں بھی بعض نے اس کے لوازمات اور اثرات پر توجہ کئے بغیر قبول کرلیا ہے اور اس پر اصرار کرتے ہیں، بے شک اس نعرہ کے مضمرات اور اغراض و مقاصد کے جائزہ کے لئے ایک تفصیلی بحث کی ضرورت ہے اور انشاء اللہ بعد میں اس سلسلہ میں بحث کی جائے گی لیکن اس وقت اجمالی طور پر ہم صرف یہ سوال کرنا چاہتے ہیں کہ آیا انسان کے مطلق طور پر آزاد ہونے اور اس پر کوئی پابندی لگائے جانے سے آپ کی مراد کیا ہے ؟ کیا آپ کا مقصد یہ ہے کہ انسان کے لئے کوئی بھی لازم العمل قانون بنانا درست نہیں ہے؟

تو اس کو کوئی بھی عاقل انسان قبول نہیں کرسکتا کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہر انسان ہر کام میں آزاد ہے اور ہر کام میں آزاد ہونے کا مطلب یہ ہوگا وہ کسی کا قتل بھی کرسکتا ہے ناموس کی عزت بھی لوٹ سکتا ہے معاشرہ میں نا امنی بھی پھیلا سکتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ سب سے پہلے اس کا نقصان یا ضرر خود اس طرح کی نظریہ رکھنے والے کو پہنچے گا اور کیا اس طرح کی آزادی رکھنے والوں کے درمیان بنیادی طور پر زندگی بسر کی جاسکتی ہے ؟ لہٰذا معلوم یہ ہوا مسلمہ طور پر انسان کی آزادی لا محدود نہیں ہے اور انسان اس قدر آزاد نہیں ہے کہ جو بھی چاہے انجام دے اور جب یہ روشن ہوگیا کہ آزادی محدود اور مشروط ہے، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آزادی کے حدود کو کون معین کرے ؟ اور آزادی کے حدود کیا ہیں؟

اور اگر یہ طے ہو جائے کہ ہر انسان آزادی کی حد خود ہی معین کرے تو اس کا نتیجہ بھی وہی ہو گا کہ ہر انسان جو کچھ بھی دل چاہے گا اپنی مرضی سے عمل کرے گا، اور یہاں پر بھی وہی مشکل پیش آئے گی جو مطلق آزادی کی صورت میں بیان ہوئی ہے، لہٰذا ہمارے سامنے آزادی کی حد و حدود معین کرنے کے لئے ایک قانونی سرچشمہ قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے، اب اگر کوئی قبول کرتا ہے کہ انسان کے نفع و نقصان کو خود اس سے بہتر سمجھنے والا ایک خدا موجود ہے جس کا انسان کی زندگی سے اس کا اپنا کوئی فائدہ نہیں ہے

وہ صرف اپنے بندوں کی بھلائی چاہتا ہے تو ایسے شخص کے لئے آزادی کی حد کو بیان کرنے کے لئے خدا سے زیادہ کوئی اور سزاوار ہوسکتا ہے۔

نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کے اعتقادی اور فکری مسائل میں کوئی تناقض نہیں ہے کیونکہ مسلمان اس خدا کو مانتے ہیں جو انسان کے نفع ونقصان کو خود اس سے بہتر جانتا ہے اور بہتر طور پر واقف ہے کہ انسان کی بھلائی کس چیز میں ہے لہذا اس نے اس کی آزادی کی حدیں بیان کردی ہیں لیکن اگر کوئی خدا پر ایمان نہ رکھتا ہو یا بالفرض خدا کی توحید کا قائل ہو لیکن اس کے لئے آزادی کی حدیں معین کرنے کا حق قبول نہ کرے اور یہ کہے کہ عوام خود آزادی کی حد کو معین کرسکتے ہیں تو ایسی صورت میں ہم ہزاروں مصیبتوں میں مبتلا ہوجائیں گے کیونکہ تمام انسان کبھی بھی ایک نظریہ پر متفق نہیں ہوپائیں گے۔

اور اگر کسی اکثریت نے متفق ہوکر آزادی کی حدیں معین کردیں تو وہ اقلیت کہ جس نے اس کو قبول نہیں کیا ہے وہ کس طرح اپنے حقوق حاصل کرے گی، لہذا ماننا پڑے گا کہ اگرچہ آزادی ایک دلکش و خوبصورت لفظ ہے لیکن مطلق اور لا محدود نہیں ہے اور کوئی بھی مطلق آزادی کو قبول نہیں کرسکتا۔

چھٹی تقریر

اسلام میں آزادی کا تصور

ایک شبہ

تاریخی تغیرات کی دین ایک غلط فہمی یا شبہ انسانی تہذیب و تمدن کی تاریخ میں رونما ہونے والے تغیرات سماجی نظام میں آنے والی تبدیلیوں کی بنا پر پیدا ہوگیا ہے، یہ ایک طے شدہ بات ہے کہ انسان کی سماجی زندگی تاریخ میں مختلف مرحلوں سے گزری ہے، ایک زمانہ میں رسم ''غلامی'' کو رواج حاصل تھا اور انسانی تہذیب کی ترقی اور بقاء اسی میں سمجھی جاتی تھی کہ کمزور اور ناتواں لوگ دوسروں کی غلامی کریں اور ان کے ذریعہ ممکنہ خدمت لی جائے، ظاہر سی بات ہے اس زمانے کے مطابق انسان اور خدا کا تعلق غلام اور آقا کے تعلق کی شکل میں ہوا کرتا تھا، کیونکہ اس زمانے میں یہ رواج تھا کہ بعض لوگ مولا اور آقا اور بعض لوگ ان کے بندے اور غلام بن کر رہیں۔

اور انسانوں کے تعلقات کے اندازے بھی غلام اور آقا کے دائرے میں لگائے جاتے تھے جس طرح غریب اور کمزور لوگ امیروں اور سرمایہ داروں کے عبد اور بندے سمجھے جاتے تھے، اسی طرح تمام لوگ خدا کے عبد اور بندے سمجھے جاتے تھے، اور خداوندعالم ان کا مولا و آقا تھا، لیکن آج جبکہ بردگی اور غلامی کا دور ختم ہو چکا ہے، اس وقت کے معیارات کو پیش نظر نہیں رکھنا چاہئے۔

آج انسان کسی کی محکومیت اور زور زبردستی کو قبول نہیں کرتا، اپنے آپ کو آقا سمجھتا ہے، نہ کہ غلام، لہٰذا ہمیں یہ نہیں کہنا چاہئے کہ ہم بندہ ہیں اور خدا مالک ہے، آج ہمیں خود کو اللہ کا خلیفہ اور جانشین سمجھنا چاہئے جوخدا کا جانشین ہے بندگی کا احساس نہیں رکھتا گویا خداوندعالم کی خدائی ختم ہوچکی ہے اور یہ حضرت اس کی مسند پر بیٹھے ہوئے ہیں، جو کام چاہیں کریں جس طرح کوئی حاکم کسی کو اپنا قائم

مقام بنالے تو وہ اس کے تمام اختیارات کا مالک بن جاتا ہے، اور اُس کے کام اِس کے کام ہوتے ہیں، وہ اسے اپنے دستخط کا حق دیتا ہے اور ان کے درمیان حاکم و فرمانبردار کا رشتہ نہیں ہوتا ہے، اور قائم مقام کے کاموں کی اس کے دائرہ کار میں کوئی جواب طلبی نہیں ہونی چاہئے۔

اب نیا اور ماڈرن زمانہ ہے، دنیائے بشریت پر جدید تمدن کی حکمرانی ہے، اور ہماری زندگی علم و ترقی کے بلند مرتبہ پر پہونچ چکی ہے لہذا ہم دور غلامی کی مانند لازم الاطاعت احکام اور فرمانبرداری کو قبول نہیں کر سکتے، اگر قرآن میں فرائض اور واجبات وغیرہ بیان ہوئے ہیں تو وہ غلامی کے زمانے کی چیزیں ہیں، کیونکہ جس وقت رسول اکرمؐ مبعوث ہوئے تھے، غلامی کا زمانہ تھا، اور اسلام کا ابتدائی ڈھانچہ خداو رسول کے ساتھ لوگوں کے تعلقات اسی زمانے کے لئے مناسب تھے۔

کبھی کہا جاتا ہے کہ آج کا انسان فرائض کا خواہاں نہیں ہے، حقوق کا طلبگار ہے اور اس کے ذہن میں کبھی یہ خیال نہیں آتا کہ اس پر کوئی فریضہ اور ذمہ داری ہے،کہ جسے انجام دینا واجب ہے، انسان کو اپنے حقوق کی فکر کرنی چاہئے کہ وہ خدا سے اور دوسرے لوگوں سے اپنے حقوق حاصل کرے۔

مختصر یہ کہ جو لوگ دین کی باتیں اور پیغمبر، ائمہ معصومین اور ان کے جانشینوں کی اطاعت کی باتیں کرتے ہیں یہ چودہ سو سال پہلے کی معاشرتی زندگی کے لئے تومناسب تھی، لیکن آج کی معاشرتی زندگی بالکل بدل چکی ہے، تحکمانہ نظام اور غلامانہ فرائض اور ذمہ داری کی باتیں کوئی نہیں کرتا بلکہ آج تو انسانی حقوق کی باتیں ہوتی ہیں ایک انسان کو یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ تمہارا یہ حق ہے کہ جس طرح بھی چاہو زندگی کرو، تمہیں اپنی مرضی کے مطابق کپڑے پہننے کا حق ہے، معاشرہ میں جس طرح بھی چاہو رہو سہو اور اجتماعی زندگی کی راہ و روش اپناؤ۔

ہمارا جواب ہم اس غلط فہمی کا جواب ''تخلیقی''اور ''تشریعی'' دونوں زاویوں سے پیش کرتے ہیں، کیونکہ ہمارے سامنے دو حیثیتیں ہیں: تخلیقی حیثیت اور شرعی حیثیت، دوسرے لفظوں میں ایک وہ حیثیت جو وجود کے ساتھ ہے، اور دوسرے وہ مقام جو اقدار و معیارات کے تحت ہونا چاہئے، یعنی واقعیات کی دنیا اور معیارات کی دنیا، (اگرچہ مذکورہ تعبیریں ایک ہی رنگ و مفہوم رکھتی ہیں لیکن مختلف لوگوں کو سمجھانے کے لئے مختلف الفاظ استعمال ہوئے ہیں) اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ تخلیقی لحاظ سے خدا سے ہمارا کیا تعلق ہے؟ کیونکہ اگر کوئی سرے سے خدا پر ایمان نہ رکھتا ہو، اس کے نظر میں خدا سے نسبت فرض کرنا فضول سی بات ہوگی۔

لیکن جو شخص خدا پر اعتقاد رکھتا ہے یا کم سے کم یہ قبول کرتا ہے کہ وہ اس کا پیدا کرنے والا ہے، وہ خدا کی خالقیت کو قبول کرتا ہے (جو خدا کو ماننے کا ادنی ترین درجہ ہے) اور خود کو خدا کی مخلوق جانتا ہے، (البتہ اسلام میں تنہا خدا کی خالقیت پر اعتقاد رکھنا انسان کے موحد ہونے کے لئے کافی نہیں ہے بلکہ خدا کی تکوینی اور تشریعی ربوبیت کا قائل ہونا بھی ضروری ہے)خالقیت در توحید کی بنا پر کسی کا یہ کہنا کہ وہ خدا کا بندہ اور اس کا مملوک نہیں ہے خود خداوند عالم کی خالقیت کے اعتقاد کے خلاف ہے، توحید کا پہلا قدم اپنے کو خدا کی مخلوق تسلیم کرنا ہے کہ ہمارا وجود خدا کا عطا کردہ ہے، اور یہ وہی عبودیت ہے، عبد یعنی مملوک، دوسری کی ملکیت ہونا، لہٰذا اگر کوئی اپنے کو مسلمان اور خدا کا معتقد کہتا ہے، لیکن خدا کی عبودیت اور مملوکیت کو نہیں مانتا تو گویا اس کی گفتگو میں صاف تضاد و تناقض پایا جاتا ہے، کیونکہ خدا پر اعتقاد کا لازمہ یہ ہے کہ ہم خود کو اس کی مخلوق، عبد اور مملوک سمجھیں، اسی وجہ سے تمام مسلمان اپنی بہترین عبادت یعنی نماز میں کہتے ہیں ''اشھد ان محمدا عبدہ و رسولہ''دراصل انسان کے لئے سب سے عظیم اور پُر افتخار مقام خدا کا بندہ ہونا ہے، اس وجہ سے خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے :(سُبْحَانَ الَّذِی أَسْرَیٰ بِعَبْدِہِ لَیلًا مِنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْأَقْصَیٰ)[1] ''وہ خدا (ہر عیب سے) پاک ومنزہ ہے جس نے اپنے بندے کو راتوں رات مسجد حرام (خانہ کعبہ) سے مسجد اقصیٰ تک کی سیر کرائی''۔

---

[1] سورہ اسراء آیت۱۔

جی ہاں! خدا کی بندگی اور اس کی عبدیت کی اہمیت کے پیش نظر قرآن میں اس خوبصورت لفظ '' عبد '' اور اس کے دوسرے مشتقات کا بار بار استعمال ہوا ہے۔

اور کمال عبدیت کو انسان کے لئے بہترین کمال و ارتقاء کا بلند ترین درجہ شمار کیا گیا ہے: (یا أَیَّتُھا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّۃُ اِرْجِعی اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَرْضِیَّۃً فَادْخُلی فی عِبادِی[1]) '' اے نفس مطمئنہ اپنے پروردگار کی طرف پلٹ آ (اس حال میں کہ) تو اس سے راضی ہے وہ تجھ سے راضی ہے، پس تو میرے خاص بندوں میں شامل ہوجا ''۔

تشریعی لحاظ سے دوسرا جوابشرع و قانون کے لحاظ سے یہ کہنا کہ انسان کی آزادی، قانون کی پابندی اور کسی طرح کی ذمہ داری قبول کرنے کے ساتھ میل نہیں کھاتی، اس کا نتیجہ بہیمت و بربریت اور بدنظمی کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا، یہ تصور کہ انسان چونکہ آزاد ہے وہ جس طرح چاہے عمل کر سکتا ہے، حتیٰ اس نے جس قانون کے حق میں ووٹ دیا ہے چاہے تو اس پر عمل کرنے سے انکار کردے، ایسا تو جنگلی نظام میں بھی نہیں ہوتا کیونکہ وہاں بھی حیوانوں کے لئے مخصوص قوانین ہوتے ہیں۔

لہٰذا ہم جو مہذب اور شہری ہونے کا دم بھرتے ہیں یہ قبول کرنا چاہئے کہ تہذیب کا سب سے پہلا رکن یہ ہے کہ انسان قوانین پر عمل اور ذمہ داری کو قبول کرے ورنہ ذمہ داری اور قانونی پابندی قبول نہ کرنے کے ساتھ نہ صرف یہ کہ اسے تمدن جدید کا مدعینہیں کہا جا سکتا، بلکہ اپنے کو وحشی گری کی سب سے رکیک و پست ترین ذہنیت کا مرتکب کہنا پڑے گا۔

دوسرے الفاظ میں یوں بیان کیا جائے کہ انسان کی سب سے بڑی پہچان اور فسل مقوم عقل ہے،ار عقل کا حکم یہ ہے کہ انسان ذمہ داریوں کو قبول کرے ،بعض امور انجام دینے کا خود کو مکلف سمجھے اور بعض چیزوں سے پرہیز کرے ،اب اگر کوئی شخص کوچہ و بازار میں اپنی مرضی کے الٹے سیدھے کپڑے پہن کر لوگوں کے سامنے نکل آئے یا برہنہ ہو کر گھومنے لگے اور جو بھی منہ میں آئے وہ بکتا

[1] سورہ فجر آیت۲۷،۲۹۔

پھرے ، تو کیا اس صورت میں لوگ اس کو عاقل تصور کریں گے؟ یا اس کو وحشی اور دیوانہ کہا جائے گا؟ ایسے میں اگر کوئی اس سے سوال کرے کہ تم اس طرح کے کام کیوں کرتے ہو؟ اور وہ جواب میں کہے کہ چونکہ میں آزاد ہوں اور آزادی انسان کا حق ہے، لہٰذا میں اپنی مرضی کے مطابق جو چاہوں کروں، تو کیا کوئی انسان اس کی باتوں کو قبول کر سکتا ہے؟

معلوم ہوا بنی نوع انسان کی پہچان یا اسی کی فصل مقوم عقل ہے، اور اس بات کے قائل ہونے کا لازمہ یہ ہے کہ وہ اپنی ذمہ داری کو سمجھے اور قانون پر عمل کرے، کیونکہ اگر قانون نہ ہو تو مدنیت نہیں ہو سکتی، اور اگر مسؤلیت اور ذمہ داری نہ ہو تو انسانیت بھی محقق نہیں ہو سکتی، انسان کے آزاد ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انسان تخلیقی طور پر انتخاب کی قدرت رکھتا ہے، نہ کہ وہ شرعی طور پر قانون، احکام، واجبی فرائض اور معاشرتی زندگی کی ذمہ داریوں کو قبول نہ کرے، اور اپنی اجتماعی زندگی کی پابندیوں کا قائل نہ ہو، پس نتیجہ یہ نکلا کہ انسان کو یہ نہیں سوچنا چاہئے کہ دین کی طرف سے عائد کردہ ولایت انسان کی آزادی کی مخالف ہے کیونکہ انسان کی فصل مقوم آزادی اور اس کا خلیفۃ اللہ ہونا ہے اور خدا کے جانشین ہونے کا لازمہ یہ ہے کہ انسان آزاد ہو۔

اس غلط فہمی کا ایک اور رُخ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ انسانی زندگی کے مختلف شعبوں میں رونما ہونے والی ترقی اور کمال، نیز جدید انسانی تمدن اور فکر و نظر کے نئے تقاضوں اور نئے تصورات و ضروریات کے پیش نظر، عصر حاضر کے دین کو چاہئے کہ صرف انسانی حقوق کی باتیں کرے، نہ یہ کہ دین فرائض اور واجب العمل احکامات بیان کرے، گزشتہ زمانہ کے لوگ چونکہ رسم غلامی، بردگی اور نظام ظلم و جور کے عادی تھے، جو بھی ذمہ داری اور فریضہ ان کو سونپا جاتا تھا اس کو قبول کر لیتے تھے، لیکن آج وہ بردگی و بندگی کا زمانہ گزر گیا، آج ہر انسان خود کو آقا اور خلیفۃ اللہ سمجھتا ہے، آج کا انسان فرائض قبول کرنے پر تیار نہیں ہے، بلکہ حقوق حاصل کرنے کی فکر میں رہتا ہے۔

در حقیقت آج کے ماڈرن زمانہ نے ہمارے اور گذشتہ دور کے (غلامی اور بردگی زندگی بسر کرنے والے) لوگوں میں ایک بہت اونچی دیوار کھڑی کر دی ہے، یہی وجہ ہے کہ آج کے ماڈرن انسان نے گذشتہ زمانے کی طرح ذمہ داری قبول کرنا بند کر دیا ہے، اور صرف حقوق کا مطالبہ کرتا رہتا ہے، آج فرائض اور ذمہ داری کی باتیں کرنا عصر جدید سے منہ موڑکر ماضی کی طرف پلٹنے کیمترادف ہے، آج کے اس زمانے میں جبکہ حقوق بشر کا نعرہ لگایا جارہا ہے، ڈیموکریسی کی برکت نے انسان کو استحصال اور غلامی کی قید و بند سے آزاد کر دیا ہے، وہ وقت آگیا ہے کہ قدیم مذاہب جو دور غلامی سے مناسبت رکھتے ہیں اور ذمہ داری کی باتیں کرتے ہیں ان کو بالائے طاق رکھ دیا جائے، اور حقوق بشر کی بات کرنے والا نیا دین اختیار کیا جائے۔

اس طرح کا شک و شبہ ایجاد کرنے والے اپنے ہدف اور مقصد تک پہونچنے نیز سماج بالخصوص جوانوں کو اپنے طرف جذب کرنے کیلئے مختلف طریقوں کا سہارا لیتے ہیں اور اپنی باتوں کو خوبصورت و دلنشیں بنانے کے لئے ادبی اور شاعرانہ پیرائے میں مٹھاس اور جاشنی لگا کر پیش کرتے ہیں، لیکن ہم کسی شور و ہنگامے کی پروا کئے بغیر جوان کی عادت ہے اور وہ گھٹن کا ماحول جو حق و حقیقت کا دفاع کرنے والوں کی زبان بندی کے لئے ایجاد کئے جاتے ہیں، ان باتوں کا بالکل منطقی اور صحیح انداز میں جواب پیش کرتے ہیں۔

جواب مطلق طور پر یہ کہنا کہ آج کا انسان صرف اپنے حقوق کی فکر میں رہتا ہے، فرائض قبول کرنا نہیں چاہتا، یہ ایک فضول اور باطل تصور ہے، جیسا کہ فلاسفۂ حقوق بھی کہتے ہیں کہ کسی انسان کا اس وقت تک کوئی حق ثابت نہیں ہوتا جب تک اس کے مقابل دوسروں پر کوئی فریضہ عائد نہ ہو، مثال کے طورپر اگر ایک شہری کے لئے صاف و سالم ہوا میں رہنے کا حق ثابت ہے تو دوسرے تمام شہریوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ ہوا کو آلودہ اور خراب نہ کریں۔

ورنہ اگر ہر ایک کو فضا کثیف کرنے کا حق حاصل ہو جائے تو صحیح و سالم آب و ہوا سے استفادہ کا حق لایعنی ہو کر رہ جائے گا، اسی طرح اگر کسی کو اپنے مال میں تصرف کا حق ہے تو دوسروں کی ذمہ داری ہے کہ اس کے مال میں دست درازی نہ کریں، ورنہ عملی

طور پر اپنے مال سے کوئی بھی بہرہ مند نہیں ہو سکے گا، علاوہ ازیں جس کسی کیلئے بھی کوئی حق ثابت ہوتا ہے لازمی طور پر اس کے بدلے میں دوسروں کے تئیں کوئی نہ کوئی فریضہ عائد ہوتا ہے، اگر کسی کو یہ حق ہے کہ وہ سماج کی مہیا کردہ سہولیات کو استعمال کرے تو اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ بھی جواب میں سماج کی خدمت کرے، اور کسی فریضے اور ذمہ داری کو قبول کرے۔

اور دوسروں پر بار نہ بنے،بنا برایں حق اور فریضہ دو معنوں میں ایک دوسرے کے لازم وملزوم ہیں، اور یہ کہنا کہ تمام انسان صرف حقوق کے خواہاں ہیں، اور فرایض کو قبول نہیں کرتے قابل قبول نہیں ہے۔

اس حقیقت کے پیش نظر کہ الٰہی اور غیر الٰہی تمام دانشوروں اور فلاسفۂ حقوق مجموعی طور پر ذمہ داری اور فریضہ کے منکر نہیں ہیں، بلکہ عہد وپیمان اور ذمہ داری پر یقین رکھتے ہیں، اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان لوگوں کی نظر میں فریضہ سے مراد الٰہی فریضہ ہے، ان کی تمام باتوں کا نچوڑ یہ ہے کہ خداوند عالم کو ہم پر کوئی فریضہ اور ذمہ داری نہیں عائد کرنا چاہیے، ورنہ خود ان کی نظر میں بھی معاشرتی حقوق کے مقابلہ میں فرائض سے گریز نا ممکن ہے کیونکہ یہ فرائض تمام عقلاء اور دانشوروں نے قبول کئے ہیں ہماری بات کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ خود انھوں نے صاف صاف کہا ہے کہ بندے اور خدا کے درمیان رابطہ اور شارع کی طرف سے حکم صادر ہونا اور اس کی اطاعت کا ضروری ہونا غلامی اور بردگی کے کلچر اور تہذیب کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے۔

خدا کی نافرمانی کی تاریخ

آج کا ماڈرن انسان ہی نہیں بلکہ خدا کی اطاعت اور الٰہی فرائض سے فرار کی تاریخ بہت پرانی ہے بہت سے ایسے لوگ ہیں جنھوں نے شیطانی وسوسوں میں پڑ کر خدا کی نافرمانی اور قانون شکنی کی ہے، یہ کہنا کہ: انسان حقوق کا طالب ہے فرائض کا نہیں، یہ کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ شروع ہی میں حضرت آدمؑ کے باغی فرزند قابیل نے خدا کی معصیت کی اور کھلے عام اپنے فریضہ اور الٰہی قوانین کی مخالفت کی، اور قانون شکنی کرتے ہوئے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کرڈالا۔

(واتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ ابْنَيْ آدَمَ بِالْحَقِّ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِن اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْأٰخَرِ قَالَ لَأَقْتُلَنَّكَ قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ.[1])

''(اے رسول)آپ ان لوگوں سے آدمؑ کے دو بیٹوں (ہابیل وقابیل) کا سچا واقعہ بیان کردیں کہ جب ان دونوں نے توبہ کے لئے خدا کی بارگاہ میں قربانی پیش کی تو ان میں سے ایک (ہابیل) کی (قربانی) قبول ہوگئی اور دوسرے (قابیل) کی (قربانی) قبول نہیں ہوئی تو (قابیل مارے حسد کے ہابیل سے) کہنے لگا خدا کی قسم میں تجھے ضرور مار ڈالوں گا، ہابیل نے جواب دیا کہ (بھائی اس میں میری کیا خطا ہے) خدا تو صرف پرہیزگاروں کی (قربانی) قبول کرتا ہے''

قرآن مجید میں پیغمبروں کے واقعات اس بات کی حکایت کرتے ہیں کہ اکثر لوگوں نے اپنے زمانے کے نبی کو جھٹلایا، اور نہ صرف یہ کہ ان کی بات پر لبیک نہیں کہتے بلکہ ان پر تہمت و بہتان لگاتے تھے اور ان کا مذاق اڑاتے تھے، یہاں تک کہ ان کو قتل بھی کردیتے تھے، یا ان کو شہر بدر کر دیتے تھے اگر کوئی نبی ان کے فائدہ کی باتیں بھی کرتا تھا، مثلاً قرآن کے مطابق لوگوں کو کم تولنے سے روکتا تھا: (لَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ.[2]) ''اور لوگوں کے لئےچیزیں کم نہ تولا کرو'' ان کے جواب میں کہتے تھے: (قَالُوا يَا شُعَيْبُ أَصَلَاتُكَ تَأْمُرُكَ اَن نَتْرُكَ مَا يَعْبُدُ ءابَآؤُنَا اَوْ اَن نَفْعَلَ فِيْ أَمْوَالِنَا مَانَشَآؤُا[3]...) ''وہ لوگ کہنے لگے اے شعیب کیا تمہاری نماز (جو تم پڑھا کرتے ہو) تمھیں یہ سکھاتی ہے کہ جن (بتوں) کی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے آئے ہیں انھیں ہم چھوڑدیں،یا یہ کہ ہم اپنے مالوں میں جو چاہیں انجام دیں''؟یہاں ممکن ہے کوئی کہے کہ تاریخ میں انبیأ اور اولیائے الٰہی کی مخالفت کی وجہ بت پرستی و شرک اور شیطان کی پیروی رہی ہے

اور ہمارا کہنا بھی یہی ہے کہ انسان کو چاہئے کہ کسی بھی معبود کی اطاعت کے طوق کو اپنی گردن سے نکال پھینکے، اور بتوں اور شیطان کی پیروی سے گریز کرے، لیکن یہ کہنا وحی کی حقیقی تعلیم اور الٰہی نقطۂ نظر سے باطل اور مردود ہے،کیونکہ وحی الٰہی کے مطابق انسان کے

---

[1] سورہ مائدہ آیت۲۷۔
[2] سورہ ہود آیت ۸۵۔
[3] سورہ ہودآیت۸۷۔

سامنے صرف دو راستے ہیںیا خدا کی اطاعت کرے یا طاغوت (شیطان) کی اطاعت کرے، کسی کی بھی اطاعت نہ کرنا محال ہے اگر کوئی یہ نعرہ لگائے کہ میں کسی کا بندہ اور غلام نہیں ہوں تو در حقیقت یہ شخص طاغوت اور اپنی نفسانی خواہشات کا غلام ہے اسی وجہ سے قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:(اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ ءامَنُوا یُخْرِجُھُمْ مِنَ الظُّلُمٰاتِ اِلَی النُّورِ وَالَّذِینَ کَفَرُوا أَوْلِیاؤُھُمُ الطَّاغُوتُ یُخْرِجُونَھُمْ مِنَ النُّورِ اِلَی الظُّلُمٰاتِ[۱]) ''خدا ان لوگوں کا سرپرست ہے جو ایمان لاچکے ہیں وہ ان کو (گمراہی کی) تاریکیوں سے نکال کر (ہدایت کی) روشنی میں لاتا ہے اور جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ان کا سرپرست شیطان ہے جو ان کو (ایمان کی) روشنی سے نکال کر (کفر کی) تاریکیوں میں ڈال دیتا ہے '' دوسری جگہ خداوند عالم ارشاد فرماتاہے:(أَلَمْ أَعْھَدْ اِلَیْکُمْ یا بَنِی آدَمَ اَن لاَ تَعْبُدُوا الشَّیْطَانَ اِنَّہٗ لَکُمْ عَدُوٌّ مُبِیْنٌ، وَاَنِ اعْبُدُونِی ھٰذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِیْمٌ[۲]). ''اے آدم کے فرزندو!ہم نے تم سے یہ عہد نہیں لیا تھا کہ (خبردار) شیطان کی پرستش نہ کرنا کیونکہ وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے اور یہ کہ (دیکھو) صرف میری عبادت کرنا کیونکہ یہی (نجات کی) سیدھی راہ ہے

'' اس آیت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ شیطان کی عبادت چھوڑنے کے بعد پھر کسی دوسرے کی عبادت اور اطاعت کی ضرورت نہیں ہے،بلکہ اس پر فرض ہے کہ وہ خدا کی عبادت کرے،جیسا کہ کلمۂ توحید میں ''لاالٰہ'' کے بعد ''الااللہ'' آیا ہے۔

بنا برایں جو لوگ وحی کی روشنی میں خواب غفلت سے بیدار ہوئے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس خدا کی عبادت کرنی چاہئے جو ان کا خالق اور حقیقی مالک ہے، اور جس کے ہاتھ میں ان کی زندگی، موت، جوانی، بڑھاپا،اور صحت وبیماری ہے،ان کی نظر میں اس کی بندگی کمال افتخار ہے، اس کی طرف سے عائد فرائض اس کی لازوال حکمت و رحمت کے تحت ہیں،اور ان پر عمل کرنا انسان کیلئے کمال اور سعادت کا باعث ہے۔

[۱] سورہ بقرہ آیت۲۵۷۔
[۲] سورہ یٰس آیت۶۱،۶۰۔

معلوم ہوا کہ فرائض اور ذمہ داری قبول نہ کرنا حیوانیت بد تہذیبی اور شیطان کی پیروری کی وجہ سے ہے، جو ہمیشہ سے تاریخ میں موجود ہے اور یہ صرف آج کے ماڈرن زمانے ہی سے مخصوص نہیں ہے۔

در حقیقت اس ماڈرن انسان نے تہذیب سے کنارہ کشی اختیار کر لی ہے، اور جاہلیت و وحشت گری کے زمانے کی طرف پلٹ گیا ہے، اور رجعت پرستی کا شکار ہے، ورنہ مکتب انبیاءؑ کے تربیت شدہ افراد نے حیوانیت اور وحشی گری سے کنارہ کش رہتے ہوئے لا قانونیت سے نکل کر قانون، فرائض اور ذمہ داری کو قبول کر کے صحیح معنوں میں تہذیب اور مدنیت کو قبول اور انتخاب کیا ہے۔

کیونکہ تہذیب و تمدن ، حیوانیت و بہیمیت کے مقابلے میں ہے اور اس کا بنیادی لازمہ قانون کی پابندی قبول کرنا ہے ۔ پس کچھ لوگ کیسے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ماڈرن زمانہ اس بات کا متقاضی ہے کہ انسان کسی بھی ذمہ داری کو قبول نہ کرے! آیا یہ تمدن ہے یا وحشی گری؟ تمدن بنیادی طور پر پابندی قبول کرنے ،قانون پر عمل کرنے اور ذمہ داری پوری، کرنے میں ہے ورنہ تہذیب اور لا ابالی میں کوئی فرق نہ رہے گا۔

لہٰذا جو لوگ قانون کی پابندی فرائض، اور ذمہ داری کی ادائیگی کا انکار کرتے ہیں وہ لوگ بربریت اور وحشی گری کے قدیم زمانے کی طرف پلٹنا چاہتے ہیں اور یہ طے ہے کہ کوئی شخص اس نظریہ کے تحت، محترم اور خلیفۃ اللہ نہیں ہوسکتا، کہ وہ ہمارے لئے نمونۂ عمل قرار پا سکے، (اس نکتہ کی طرف اشارہ کردینا ضروری ہے کہ مدنیت اور قانونیت کی طرف میلان کہ جس کا آج ہمارے سماج میں شور وغوغا ہے ،مدنیت اور قانونیت کے نقطۂ کمال تک پہنچنے کے معنی میں ہے تاکہ کسی بھی جگہ قانون کی خلاف ورزی نہ ہو،ایسا نہیں ہے کہ یہ کوئی نیا نعرہ ہے یعنی ایسا نہیں ہے انقلاب کے بعد ۱۹ سال تک ہم وحشی گری کا شکار تھے اور آج ہمارا معاشرہ مدنیت کی طرف مائل ہوا ہے، بلکہ ہمارا یہ انقلاب شروع سے ہی مدنیت اور قدیم اسلامی تمدن پر استوار ہے، اور انقلاب کے اصل اہداف میں سے ہے کہ تمام میدانوں میں الٰہی قوانین کی پابندی کی جائے)۔

۶۔ خدا کی اطاعت اور آزادی

انبیاء علیہم السلام لوگوں کو خدا کی اطاعت اور پرستش کی دعوت دیتے تھے اور طاغوت کی پیروی سے روکتے تھے اس سلسلے میں خداوند عالم فرماتا ہے: (وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِی کُلِّ اُمَّۃٍ رَسُولاً أنِ اعْبُدُوا اللّٰہَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ...[۱]).

''اور ہم نے تو ہر امت میں ایک (نہ ایک) رسول اس بات کے لئے ضرور بھیجا (اور کہاکہ اے لوگو! خدا کی عبادت کرو اور بتوں (کی عبادت) سے بچے رہو'' ایسی صورت میں یہ بات قبول نہیں کی جا سکتی کہ اسلام نے اپنے علاوہ یہاں تک کہ خدا کی اطاعت سے بھی منع کیا ہے۔

بلکہ بنیادی طور پر جو مذہب ہم کو خدا کی اطاعت کی دعوت نہ دے وہ باطل ہے اور جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا انبیاء علیہم السلام کی دعوت اور تبلیغ کا مقصد ہی خدا کی مطلق طورپر اطاعت ہے، کیونکہ ہماری موت و حیات اسی سے وابستہ ہے اور وہی ہمارا حقیقی مالک ہے (اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن.[۲]) ''ہم خدا ہی کے لئے ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں'' اب جبکہ ہم نے سمجھ لیا کہ خداوند عالم ہی ہمارا مالک حقیقی ہے پھر کس طرح یہ بات قبول کی جا سکتی ہے کہ خدا کو ہمیں حکم دینے اور فرمان صادر کرنے کا کوئی حق نہیں ہے، کیا مالکیت اس کے علاوہ کچھ اور ہے کہ مالک جس طرح بھی چاہے اپنی چیز میں تصرف کرے؟ لہٰذا یہ بات قابل قبول نہیں ہے کہ کوئی یہ کہے کہ ہم نے اسلام تو قبول کر لیا ہے لیکن ہم خدا کی بندگی اور اس کے حکم سے آزاد ہیں، کیونکہ اس طرح کی مطلق آزادی نہ صرف یہ کہ اسلام قبول نہیں کرتا، بلکہ اس کو تو عقل بھی قبول نہیں کرتی ہے۔

مذہب اور اسلام نے آزادی کا نعرہ لگایا ہے لیکن غیر خدا اور طاغوت کی عبادت و اطاعت سے آزادی و رہائی کا نعرہ لگایا ہے، خداوند عالم کی اطاعت سے آزادی کا نعرہ نہیں لگایاہے، اگرچہ انسان آزاد و مختار پیدا کیا گیا ہے، لیکن شرعی و قانونی طورپر خدا کی

---

[۱] سورہ نحل آیت۳۶۔
[۲] سورہ بقرہ آیت۱۵۶.

اطاعت اس پر فرض ہے یعنی اپنے ارادہ و اختیار کی آزادی کے ساتھ خدا کی اطاعت کرے؛ بنیادی طور پر خلقت کے ساتھ ہر مخلوق کی سرشت میں بندگی اور عبودیت کی مہر لگی ہوئی ہے، تکوینی طور پر کسی بھی مخلوق کو خدا کی بندگی کا لیبل لگے بغیر وجود نہیں ملا ہے اور ہر موجود کی ہستی اس کی عین بندگی ہے: (تُسَبِّحُ لَهُ السَّمَاوَاتُ السَّبْعُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ وَلَٰكِنْ لَا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ[1]) ''ساتوں آسمان اور زمین اور جو لوگ ان میں ہے (سب) اس کی تسبیح کرتے ہیں اور (سارے جہان) میں کوئی وجود ایسا نہیں جو اس کی (حمد وثنا) اور تسبیح نہ کرتا ہو مگر تم لوگ ان کی تسبیح نہیں سمجھتے''

اسی طرح خداوند عالم دوسرے موجودات کی عبادت اور بندگی کے بارے میں فرماتا ہے: (أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يُسَبِّحُ لَهُ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالطَّيْرُ صَافَّاتٍ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ وَتَسْبِيحَهُ[2]). ''(اے شخص) کیا تو نے نہیں دیکھا کہ جتنی مخلوقات تمام آسمانوں اور زمین میں ہیں اور پرندے جو آسمانی فضاؤں میں پر پھیلائے ہیں سب اپنی نماز اور اپنی تسبیح کا طریقہ خوب جانتے ہیں''

لیکن چونکہ انسان صاحبِ عقل و خرد ہے، مختار و آزاد خلق کیا گیا ہے، اگرچہ خداوند عالم نے ہدایت و گمراہی کے راستے اس کو بتا دئیے ہیں لیکن اپنے بڑھنے کے لئے راستہ کے انتخاب میں آزاد ہے جیسا کہ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے: (إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا[3]). ''ہم نے اس کی رہنمائی کر دی ہے خواہ شکر گذار ہو خواہ ناشکرا'' اس کے باوجود انسان کو اپنے ہدفِ خلقت کو مدنظر رکھنا چاہئے اور سمجھ لینا چاہئے کہ خدا کی اطاعت و بندگی اس کا فریضہ ہے،

اور خداوند عالم کی شریعت اور قانون میں اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ وہ شیطان کی پیروی اور غیر خدا کی بندگی کی راہ میں قدم بڑھائے، بلکہ انسان پر خدا کی اطاعت اور الٰہی فرائض انجام دینا فرض ہے، کیونکہ خداوند عالم نے اسی مقصد کے تحت اس کو پیدا کیا ہے: (وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ[4]). ''اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اسی لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں''

---

[1] سورہ اسراء آیت۴۴۔
[2] سورہ نور آیت۴۱۔
[3] سورہ انسان آیت۳۔
[4] سورہ ذاریات آیت۵۶۔

اب چونکہ خداوند عالم کی عبادت نظام خلقت و ہستی سے ہم آہنگ ہے اور خداوند عالم کے احکام کو انجام دینا اور الٰہی فریضہ اور ذمہ داری پر عمل کرنا، اپنے اس مہربان خالق کا شکر ادا کرنا ہے کہ جس نے ہم کو حیات و زندگی عطا کی ہے اور اپنی عنایت اور لطف و کرم سے ہم کو صحت و سلامتی اور دوسری بہت سی نعمتیں بخشی جیسا کہ خداوند عالم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبانی فرمایا ہے: (اَلَّذِی خَلَقَنِی فَهُوَ یَهدِینِ، وَالَّذِی هُوَ یُطعِمُنِی وَیَسقِینِ، وَاِذَا مَرِضتُ فَهُوَ یَشفِینِ، وَالَّذِی یُمِیتُنِی ثُمَّ یُحیِینِ[1])۔ 'وہی جس نے مجھے پیدا کیا پھر وہی ہمیشہ میری ہدایت کرتا اور وہی جو مجھے (کھانا) کھلاتا اور پانی پلاتا ہے اور جب بیمار پڑتا ہوں تو وہی مجھے شفا عنایت فرماتا ہے اور وہی جو مجھے مارتا ہے اور اس کے بعد (پھر) مجھے زندہ کرتا ہے''

(ان حالات میں) کس طرح میں اس کی اطاعت سے انکار کر سکتا ہوں، اور کیا یہ حق و انصاف سے بعید نہیں ہے کہ ہم کہیں کہ آج کا ماڈرن انسان اب الٰہی فرایض اور ذمہ داری کا تابع نہیں ہے، صرف اپنے حقوق کا طالب ہے؟کیا اسلام اس فلسفہ کو قبول کر سکتا ہے؟ واقعاً ایسے نظریہ کا اسلامی ہونا تو دور کی بات،یہ تو عقل اور انسانیت سے بھی خالی ہے۔

[1] سورہ شعراء آیت۷۸۔۸۱۔

ساتویں تقریر

آزادی کا دائرہ

اسلام کا سیاسی نظریہ اور آزادی پر پابندی کا غلط تصور

چونکہ ہمارا اسلامی نظام معاشرت ،اسلامی احکام وقوانین اور ان متغیر قوانین پر ہے جو اسلامی اقدار ومعیارات کے دائرے میں مرتب کئے جاتے ہیں، اس کے مطابق ہماری حکومت بھی اسلامی قوانین کے مطابق ہونی چاہیے، قانون نافذ کرنے والوں کو بھی اسلامی احکام وضوابط کے دائرے سے خارج نہیں ہونا چاہیے اور لوگوں کا بھی فریضہ ہے کہ اسلامی قوانین پر عمل کریں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس طرح کا نظریہ انسان کی آزادی سے ہم آہنگ بھی ہے یا نہیں؟ انسان کو اپنی زندگی کے اصول وضوابط اور ان پر عمل درآمد کے سلسلہ میں آزاد ہونا چاہئے، اگر ہم یہ کہیں کہ تمہیں اس دائرے میں چلنا ہی ہے اور تمہارے لئے ان قوانین کی رعایت کرنا ضروری ہے تو کیا یہ انسان کی اصل آزادی سے جو انسان کے مسلمہ حقوق میں سے ہے منافات، نہیں رکھتا ہے؟ ہم مندرجہ بالا سوال کی وضاحت اور غلط فہمی رفع کرنے سے پہلے مقدمہ کے طور پر ایک نکتہ کی طرف اشارہ کردینا ضروری سمجھتے ہیں۔

یہ نکتہ بعد کی گفتگو میں بھی مفید واقع ہوسکتا ہے، اس لئے پوری توجہ سے ملاحظہ فرمائیں: جس وقت نظر آنے والے قابل مشاہدہ مفاہیم سے ہمارا واسطہ پڑتا ہے، تو ان کو سمجھانا مشکل نہیں ہوتا مثال کے طور پر جب ہم سائنسی علوم میں نظر آنے والی چیزوں جیسے پانی، بجلی اور حرکت کی بات کرتے ہیں، یا اسی طرح طبی امور میں آنکھ، کان، ہاتھ، پیر، معدہ، دل اور جگر سے متعلق مسائل پر گفتگو کرتے ہیں، تو سمجھنا آسان ہوتا ہے کیونکہ سبھی لوگ جانتے ہیں کہ ان الفاظ کے کیا معنی ہیں؟

ہاں کبھی ممکن ہے شاذ ونادر ایسے مسائل بھی پیش آئیں کہ جن کا سمجھنا مشکل ہو جیسے اگر پانی میں مٹی گھلی ہوئی ہو تو بھی وہ پانی ہے یا نہیں؟ یا کچھ اور ہے؟! اس کا سمجھنا مبہم ہے لیکن ایسے مواقع کم ہی پیش آتے ہیں ۔

عام طور پر قابل مشاہدہ چیزوں کو سمجھنے میں کوئی خاص مشکل نہیں ہوتی، لیکن اگر فلسفہ اور سوشل سائنس سے تعلق رکھنے والے یا اکتسابی مطالب ہوں مثلاً علوم نفسیات، سماجیات، حقوق و قوانین اور سیاست وغیرہ سے متعلق مفاہیم تو ان کا سمجھنا مشکل ہوتا ہے، اور کبھی کبھی ایک ہی لفظ کے مختلف معنی ہوتے ہیں اور ایک دوسرے سے الگ متعدد تعریفیں اس لفظ کی، جاتی ہیں اس کو سمجھنے میں مشکل ہوتی ہے زیادہ تر ایسے الفاظ اور اصطلاحوں کے بارے میں جو بحثیں ہوتی ہیں لوگ کسی یقینی نتیجہ پر نہیں پہونچ پاتے ۔

مثال کے طور پر ہم سبھی افراد لفظ، تہذیب یا ثقافت سے پوری طرح آشنا ہیں اور یہ لفظیں اسکول، کالج اور یونیورسٹیوں کی سطحوں پر کثرت سے استعمال ہوتی ہیں، اسی طرح اشعار، ادبیات اور روز مرہ کی گفتگو میں بھی ان کا استعمال ہے، اس کے بعد بھی اگر کسی سے سوال کیا جائے کہ تہذیب کے کیا معنی ہیں؟ ثقافت کسے کہتے ہیں؟ تو شاید ہزاروں میں ایک بھی ایسا شخص نہ ملے جو صحیح معنی بیان کر سکے حتی جن ماہرین نے تہذیب و تمدن کے معنی بیان کئے ہیں لفظ ثقافت کے معنی کرتے وقت اس لفظ کے ۵۰ سے ۵۰۰ تک معنی بتائے ہیں! اور ظاہر ہے کہ جب اس قدر مشہور اصطلاح کے مفہوم میں اتنا ابہام پایا جاتا ہے تو اس ابہام اور طرز تفکر کے اختلاف کی وجہ سے بہت سے اجتماعی مسائل بھی تحت تاثیر قرار پائیں گے، یہی وجہ ہے جب ثقافتی فروغ کی بات ہوتی ہے ۔

تو سوال اٹھتا ہے ثقافتی فروغ یعنی کیا ؟ اس کے مصادیق کیا ہیں؟ کس صورت میں اور کس طرح ثقافت کو فروغ دیا جاتا ہے ؟ جس وقت پارلیمنٹ میں ثقافت کے فروغ کیلئے بجٹ پاس ہوتا ہے اگر اس کو خرچ کرنے کی جگہیں اور مصارف معین نہ ہوں تو تمام وزارتوں میں اس جامع لفظ کے معنی اپنے اپنے انداز میں بیان کئے جاتے ہیں اور مخصوص مصادیق و موارد ملحوظ نظر رکھے جاتے ہیں اور مفاد پرستوں کو اس سے غلط فائدہ اٹھانے کا موقعہ مل جاتا ہے ۔

آزادی کے بارے میں مختلف طرز فکر

ہم نے انتزاعی الفاظ کے بارے میں جو کچھ عرض کیا کہ جس کے مصادیق معین نہیں ہیں اور ان کی تعریف بھی مشکل ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم متوجہ ہیں لفظ آزادی سے بحث کرتے وقت ایک انتزاعی مفہوم سے روبرو ہوتے ہیں جب ہم کہتے ہیں ''آزادی'' تو سننے والے کو بھلا محسوس ہوتا ہے، اور آزادی کے بارے میں تقریباً تمام مذاہب و ملت خاص احترام اور تقدس کے قائل ہیں، کیونکہ انسان فطری طور پر آزادی چاہتا ہے، اور ہمیشہ آزادی کی تلاش میں رہتا ہے۔

اگر سوال کیا جائے کہ انسان کا آزاد رہنا اچھا ہیا غلام؟ لا محالہ سبھی ترجیح دیں گے: کہ آزاد رہیں، کوئی بھی شخص کسی کا غلام بن کر رہنا پسند نہیں کریگا، لیکن چونکہ آزادی کی کوئی واضح تعریف نہیں ہے، بعض وقت آزادی کا نعرہ لگانے والے بھی اختلافات کا شکار ہوجاتے ہیں کہیں کچھ معنی کرتے ہیں تو کہیں کچھ اور معنی مراد لیتے ہیں، ایک شخص آزادی کا ایک مطلب بیان کرتا ہے تو دوسرا کہتا ہے ہماری نظر میں آزادی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جیسے آپ نے بیان کیا ہے، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں چنانچہ اس کی نفی کرتے ہوئے جواب میں دوسرا شخص بھی یہی کہتا نظر آتا ہے کہ اس بارے میں جو کچھ آپ نے ہماری طرف نسبت دی ہے غلط ہے، ہماری مراد کچھ اور ہے۔

اگر ہم آزادی کے بارے لکھی گئی کتابوں، مقالوں اور رسالوں کا مطالعہ کریں خصوصاً وہ کتابیں جو آخری سالوں میں لکھی گئی ہیں تو ہمیں اندازہ ہو جائے گا کہ مولفین اور صاحب نظر حضرات کے درمیان آزادی کا کوئی مشخص و معین، مشترک معنی نہیں ہے، ایک شخص آزادی کی کچھ تعریف کرتا ہے اور اس کا دفاع کرتا ہے، تو دوسرا شخص اس پر تنقید کرتا ہوا ایک دوسری تعریف کرتا ہے، ظاہر سی بات ہے کہ طرز تفکر میں اس قدر اختلاف کی موجودگی میں کوئی سمجھوتا نہیں ہوسکتا۔

تفاہم اور سمجھوتے کیلئے آزادی کی ایک مشترک تعریف کی جانا ضروری ہے، تاکہ بحث کسی نتیجہ تک پہونچ سکے یعنی اگر ہم سے کوئی سوال کرے کہ آزادی اسلام کے ساتھ میل کھاتی ہے یا نہیں تو ہم اس کے جواب میں عرض کریں گے کہ پہلے آپ ہمیں یہ بتائیے کہ آزادی سے آپ کی مراد کیا ہے؟آزادی کے کون سے معنی آپ کے پیش نظر ہیں؟ایک ایسا لفظ کہ جس کے متعدد معنی بیان ہوئے ہوں یہاں تک کہ مغربی مولفین نے اپنی کتابوں میں،آزادی کے بارے میں تقریباً دو سو تعریفیں بیان کی ہیں اگرچہ ان میں سے بہت سی تعریفیں ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں،صرف ایک یا دو الفاظ کا اختلاف پایا جاتا ہے۔

لیکن بعض امور میں یہ تعریفیں ایک دوسرے کی مخالف بھی ہیں تو اس طرح کی صورت میں کس طرح یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ آزادی اسلام کے ساتھ سازگار ہے یا نہیں؟لفظ آزادی ہی سے ملتا جلتا ''ڈیموکریسی'' یا ''جمہوریت'' کا لفظ بھی ہے یہ ایک مغربی اصطلاح ہے جس کو کبھی عوام کی بالادستی کبھی عوامی، حکومت اور جمہوری حکومت کے لئے بولتے ہیں، لیکن اس کے بھی کوئی مخصوص اور معین معنی بیان نہیں ہوئے ہیں، آیا جمہوریت اور ڈیموکریسی کوئی طرز حکومت ہے یا اجتماعی زندگی کا کوئی طریقہ ہے؟ آیا اس کا تعلق حکومتی اور سیاسی مسائل سے ہے ؟یا سماجیات اور انتظام اور مینجمنٹ سے اس کا ربط ہے؟یہ مشخص و معین نہیں ہے، اس سلسلے میں بہت بحثیں ہوئی ہیں،علاوہ ازیں اس طرح کی اصطلاحات کا دوسری زبانوں میں ترجمہ اور بھی مشکل میں اضافہ کردیتا ہے۔

اس طرح لفظ ''لبرلزم'' بھی ہے جس کا ترجمہ پہلے ''حریت پسندی'' ہوتا تھا اور حریت پسندی کو اس آزادی کے لفظ نے بہت ہی پر کشش و محترم اور خاص اہمیت کا حامل بنا دیا تھا اور اسی بنیاد پر ایران میں پہلوی حکومت کی آخری دہائیوں میں سیاسی پارٹیاں حریت پسند یا حریت نواز پارٹی کے نام سے وجود میں آئیں۔

لہٰذا چونکہ اس طرح کے انتزاعی مفاہیم اور اس طرح کی اصطلاحیں پوری طرح واضح نہیں ہوتیں، بحث مشکل ہوجاتی ہے، کیونکہ شبہات کی بنا پر مطالب پھسلنے لگتے ہیں،اور قطعی طور پر ان کے معنی طے کرنا مشکل ہوتا ہے اس طرح کے الفاظ کی حد بندی نہیں کی جا سکتی،

کبھی ان الفاظ کے معانی محدود اور کبھی پھیل کر وسیع ہوجاتے ہیں اور ظاہر سی بات ہے کہ ان مشکلات کی وجہ سے بحث بھی پیچیدہ ہوجاتی ہے۔اب لفظِ آزادی کے بارے میں بھی اس طرح کی مشکلات، ابہامات اور طرح طرح کے نظریات کے پیش نظر (جیسا کہ اس کی ۲۰۰سے زائد تعریفیں بیان کی گئی ہیں) اگر ہم اسلام کی نظر میں لفظ آزادی کو سمجھنے کی کوشش کریں اور الگ الگ تمام تعریفوں کے ساتھ اسلام نظریۂ آزادی کا تقابل کریں تو خالص علمی ماحول میں بھی یہ ایک مشکل وپیچیدہ کام ہوگا، چہ جائیکہ عام لوگوں کے سامنے جہاں مختلف طبقوں کے لوگ موجود ہوں اس بحث کو چھیڑا جائے ۔

لہٰذا ضروری ہے کہ بحث کو عام فہم تقابلی انداز میں آگے بڑھائیں اور دیکھیں کہ آزادی کے طرفدار حضرات آزادی سے کون سے معنی مراد لیتے ہیں؟اور آزادی سے کیا چاہتے ہیں؟اور پھر دیکھیں کہ جو کچھ وہ لوگ چاہتے ہیں وہ اسلام سے میل کھاتا ہے یا نہیں؟وہ لوگ جس آزادی کے طلبگار ہیں اور جس کے طرفداراور مدعی ہیں کہ ہمارے اس ملک میں آزادی نہیں ہے،اس آزادی سے ان کی مرادکیا ہے؟کیا میڈیا آزاد نہیں ہے؟کیا لوگ انفرادی آزادی نہیں رکھتے؟یا سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی لحاظ سے آزاد نہیں ہیں؟ بنیادی طور پر دیکھنا ہوگا کہ آزادی کا نعرہ لگانے والے، لوگوں کو کس حال اور کس صورت میں آزاد سمجھتے ہیں؟اگر مصادیق کے بارے میں مختصر سی بحث ہو جائے تو کسی واضح نتیجہ پر پہونچنا ممکن ہے، کیونکہ کم ازکم ہمیں معلوم ہوگا کہ مد مقابل کیا کہتا ہے اور کیا چاہتا ہے،اس صورت میں گفتگو کا موضوع اور اس کا دائرہ تاریک اور مبہم نہیں رہے گاکہ کوئی اس سے غلط استفادہ کر سکے۔

آزادی نہ مطلق ہے،نہ دین پر مقدم

معمولاً خود غرض قسم کے چالاک افراد ''آزادی'' کی مانند وسیع اور متعدد مفاہیم کے حامل الفاظ سے اپنے مفادات کی تکمیل کے لئے غلط استفادہ کرتے ہیں،اس کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ سننے والے کچھ اور سمجھتے ہیں جبکہ ان افراد کے کہنے کا مقصد کچھ اور ہی ہوتا ہے، وہ مغالطہ آمیزانداز میں دلکش و پُر فریب الفاظ کے ذریعہ لوگوں کو فریب دیتے ہیں، مثال کے طور پر بعض اخبار ورسائل اپنی بحثوں تقریروں اور مقالوں کے ذیل مبہم سوال اٹھاتے ہیں کہ آیا دین آزادی پر مقدم ہے یا آزادی دین پر مقدم ہے؟آیا اصل،

آزادی ہے اور دین آزادی کے تابع ہے یا اصل دین ہے اور آزادی اس دین کے تابع ہے؟بلا شبہ معلوم ہوتا ہے یہ سوال ایک علمی اور دقیق سوال ہے اور یہ سمجھنا کہ واقعاً آزادی اصل ہے یا دین اصل ہے یہ بہت ہی دلچسپ ہے، لیکن جب ہم مقام بحث میں کہتے ہیں کہ دین اصل ہے تو کہتے ہیں کہ جب تک کوئی آزاد نہ ہو تو کیسے کسی دین کا انتخاب کر سکتا ہے؟ کیونکہ انسان کو دین قبول کرنے میں آزاد ہونا چاہئے'' پس نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آزادی دین پر مقدم ہے اور پھر یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ دین آزادی کو محدود نہیں کر سکتا، کیونکہ آزادی دین سے بالاتر ہے اور دین پر مقدم ہے۔

قارئین کرام جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا یہ مغالطہ آمیز استدلال بہ ظاہر مدلّل نظر آتا ہے، کیونکہ اگر کوئی انسان آزاد نہ ہو تو کس طرح اسلام کا انتخاب کر سکتا ہے، انسان کو آزاد ہونا چاہیے، کہ آزادی سے اسلام کو قبول کر سکے، لہذا معلوم ہوتا ہے کہ آزادی دین پر مقدم ہے، اور یہی اصل ہے یہی دین کو معتبر بناتی ہے، اور بنیادی طور پر دین کا وجود آزادی پر انحصار کرتا ہے اس صورت میں آزادی خوداپنی پیدا کی ہوئی چیز کے ذریعہ ختم یا محدود نہیں کی جاسکتی،اورآخر میں یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ جہاں کہیں بھی دینی ماحول ہو ہر شخص کو بالکل آزادی حاصل ہوگی۔

بعض دوسرے افراد یہ استدلال کرتے ہیں کہ جب انسان پیدا ہوتا ہے تو کسی کا غلام نہیں ہوتا آزاد ہوتا ہے، لہذا زندگی میں بھی اس کو آزاد ہونا چاہئےاسی طرح یہ بھی استدلال کرتے ہیں کہ مختار و آزاد ہونا خود ایک بہت ہیگراں قیمت چیز ہے،اس بنیاد پر اگر انسان اس دنیا میں آئے اور اس کے ہاتھ پیر مفلوج ہوں اور زبان سے گونگا ہو تو اس کی کیا قیمت ہوگی؟ انسان کی قدر و قیمت اس وقت ہے جب وہ آزاد ہو جہاں چاہے جائے جو کرنا چاہے اپنے ہاتھ سے انجام دے سکے،

جو کہنا چاہے اپنی زبان سے کہہ سکے اب چونکہ انسان تخلیقی طورپر آزاد خلق ہوا ہے تو پھر قانونی طور پر بھی انسان کو آزاد ہونا چاہئے یہ وہی فطرت پرستی کا مغالطہ ہے کہ جس میں ''ہے'' سے ''ہونا'' کا غلط نتیجہ نکالا جاتا ہے، اگر ہم چاہیں کہ ان تمام مسائل پر سنجیدہ طریقہ سے بحث کریں تو ہم کو فلسفہ کی باریک علمی بحثوں کی ضرورت پیش آئے گی، اور بہت آسانی سے کسی نتیجہ پر نہیں پہونچ سکیں گے۔

جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں اگر ہم آزادی کی تعریف کے بارے میں بحث کریں تو دسیوں تعریفوں کا تحقیقی جائزہ لینا ہوگا، اس لئے مصادیق کے سلسلے میں ہی بحث مناسب ہوگی، آیئے آزادی کا نعرہ لگانے والے افراد سے پوچھیں کہ: اگر کوئی شخص آپ کے منہ پر ایک زور دار تھپڑ لگا کر کہے کہ میں آزاد ہوں؟! تو کیا یہ صحیح ہوگا؟ ظاہر سی بات ہے، جواب منفی ہوگا اور اس کو کوئی قبول نہیں کرے گا،جواب ملے گا کہ آزادی سے ہماری مراد یہ نہیں ہے، کیونکہ یہ تو دوسروں پر ظلم ہے لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ آزادی اسی حد تک مناسب ہے کہ دوسروں پر ظلم وزیادتی نہ ہو، یعنی آزادی مطلق نہیں ہے۔

اور اگر یہ پوچھیں کہ کوئی شخص آپ کے خاندان اور ناموس کے بارے میں جو کچھ چاہے کہے، آپ اس کی اجازت دیں گے؟ وہ کوئی مار نہیں رہا ہے، بلکہ آپ کی بے حرمتی کر رہا ہے اور آپ کے یا آپ کے اہل خانہ کے بارے میں نازیبا الفاظ کہہ رہا ہے، تو کیا یہ صحیح ہے؟ ظاہر ہے کوئی بھی اس بات کی اجازت نہیں دے گا، کیونکہ یہ بھی دوسروں کے حقوق کی پامالی ہے، اور ناموس کی عزت بھی معاشرے میں محترم ہے، پس معلوم ہوا کہ عزت وناموس پر حملہ وزیادتی صرف جسمانی اذیت تک منحصر نہیں ہے۔

اب اگر کوئی کسی اخبار میں ایک شخص کے خلاف کچھ لکھے اور اپنی تحریر اور مقالہ کے ذریعہ کسی کی شخصیت اور آبرو کو داغدار کرے، تو اس صورت میں جب کہ کوئی جسمانی مار پیٹ اور ہاتھا پائی نہیں ہو رہی ہے، اور زبان کے ذریعہ بھی توہین وبے عزتی نہیں ہوئی ہے تو کیا کوئی اس کی اجازت دیدے گا؟ یقیناً کوئی شخص اس بات کو قبول نہیں کر سکتا، اور اس کو بھی دوسروں کے حقوق کی پامالی اور حیثیت وناموس کی بے عزتی سمجھے گا، اور اجازت نہیں دے گا کہ کوئی شخص اس کی آبرو ریزی کرے،

اور اس کے حقوق کو پامال کرے، معلوم ہوا کہ آزادی کیلئے اب تک تین بنیادی شرطیں سب قبول کرتے ہیں اور اگر ان شرطوں کی رعایت نہ کی جائے تو اس کا مطلب ہے دوسروں کے حقوق کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔

ہر معاشرے کے اقدار، معیارات اور مقدسات کی رعایت

ایک اور نکتہ کہ جس کے بارے میں بحث ضروری ہے یہ ہے کہ معاشروں کے مقدسات اور اقدار و معیارات الگ الگ ہیں، اور اسی اعتبار سے ان کا خیال رکھا جاتا ہے مثال کے طور پر بعض معاشروں میں کسی کی بہن یا بیٹی اگر وہ ایک دوسرے سے راضی ہیں آزادانہ رابطہ معیوب نہیں سمجھا جاتا، جیسا کہ یورپی اور امریکی ممالک میں اگر کوئی شخص کسی بھی لڑکی یا عورت سے بلا استثناء دوستی قائم کرے اور یہ دوستی کسی بھی منزل تک پہنچ جائے کوئی حرج نہیں ہے.

کیونکہ دونوں کی مرضی شامل ہے لیکن اگر کوئی مدعی عدالت میں جا کر دوسرے کے خلاف مقدمہ دائر کردے کہ میری عصمت دری ہوئی ہے اور میں راضی نہیں تھی، تو عدالت اس کی شکایت کی تحقیق کرتی ہے لیکن صرف یہ کہ مرد و عورت کے دوستانہ تعلقات باہمی مرضی سے ہوں تو کوئی عیب نہیں ہے!

لہٰذا اگر کوئی شخص کسی سے کہے میری اور تمہاری بہن کی دوستی ہے اور کل رات ہم نے فلاں جگہ گزاری تو یورپی تہذیب و کلچر میں اس کو برا نہیں سمجھا جاتا، اور عجب نہیں کہ کوئی اس بات پر خوشی کا اظہار بھی کرے لیکن ہمارے معاشرے میں یہی بات بری اور گالی سمجھی جاتی ہے کسی کو ایسی باتیں کرنے کا حق نہیں ہے، یہاں سے ایک نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ ہر معاشرے میں کچھ اس کے مخصوص معیارات ہیں جن کو وہ محترم اور مقدس سمجھتے ہیں جب کہ ممکن ہے وہی چیزیں دوسرے معاشرے میں مقدس نہ ہوں اور ان کا ان کا اقدار میں شمار نہ ہوتا ہو،

اب یہ دیکھنا ہے کہ ان اقدار ومقدسات کی بنیاد کیا ہے؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر معاشرے کے مقدسات کی بنیاد اس معاشرے کے اعتقادات ،اس کی ثقافت اور اجتماعی ماحول پر استوار ہوتی ہیں،اور ظاہر سی بات ہے کہ یہ معیارات ہر شخص اور ہر ملک کے معاشرے، ثقافت اور سماجی ماحول کی بنیاد پر تعریف کئے جاتے ہیں لہٰذا اگر کسی معاشرے میں وہاں کے لوگوں کی مخصوص ثقافت کے وجہ سے کچھ چیزیں مقدس اور قابل احترام ہوں، تو ان کے ساتھ زیادتی نہیں کرنی چاہئے اور ان کی بے احترامی نہیں ہونی چاہئے، اور کسی بھی معاشرے میں کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ جو چاہے کہے،بلکہ اس طرح باتیں کرنا چاہئے کہ ان کے مقدسات کی بے احترامی نہ ہو۔

نتیجہ یہ نکلا کہ آزادی کیلئے قید و شرط ہے خاص طور پر کسی بھی معاشرہ میں اس معاشرے کے اقدار ومعیارات اور مقدسات کا پاس و لحاظ ضروری ہے اور آزادی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان جو چاہے کہے، اور جس طرح چاہے رہے،ہاں جس ماحول میں کوئی بات کہنا بے احترامی نہ سمجھا جاتا ہو،اس کا کہنا صحیح ہے لیکن جس معاشرے میں وہ بات کہنا یا کرنا وہاں کے معاشرے اور مذہب کے مقدسات کی توہین سمجھی جاتی ہے کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ مقدسات یا اقدار ومعیارات پر توجہ دئے بغیر جو چاہے کہے اور جو کام چاہے انجام دے؛ کوئی بھی اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا،

اگرچہ ہم نے جو کچھ بیان کیا ان میں بعض مسائل مغربی ممالک میں اہم اور محترم نہیں سمجھے جاتے اور ہر شخص اپنی گفتار و کردار میں آزاد ہے،لیکن اس کے بر خلاف ہمارے معاشرے میں چونکہ اسلامی اقدار ومقدسات کی تہذیب حاکم ہے لہذا ہمارا معاشرہ مغربی ممالک سیجدا ہے آزادی کا دائرہ اس قدر وسیع نہیں ہے کہ جو چاہے لوگوں کی عزت سے کھیلے اور جس بات کی جس کی طرف چاہے نسبت دیدے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری ثقافت اور ماحول میں یہ چیزیں بڑی اہمیت رکھتی ہیں اور ہر قوم و ملت کے مقدسات اورا قدار کا احترام ضروری ہے اور آزادی کے نام پر ان کی پامالی اور خلاف ورزی صحیح نہیں ہے۔

معلوم ہوا کہ آزادی کا وہ وسیع دائرہ کہ جو بعض نے تصور کرلیا ہے کوئی بھی عقلمند انسان قبول نہیں کرتا، لہٰذا آزادی کی ایسی تعریف کرنی چاہیئے کہ اس میں معاشرہ کی توہین اور اس کے مقدسات کی پامالی شامل نہ ہو۔اس بنیاد پر معاشرہ میں جن باتوں کو لوگوں کے مقدسات کی توہین سمجھا جاتا ہو ان باتوں کا کرنا ممنوع اور غلط ہے چنانچہ اسلامی معاشرہ میں آزادی کے نام پر لوگوں کی نگاہیں، اقدار ومعیارات خاص طور سے جان سے زیادہ عزیز اسلامی مقدسات کی توہین کرنے کا کسی کو حق نہیں ہے۔

ہماری قوم نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ اسلام کی بقاء کے لئے اپنے عزیزوں کی لاکھوں جانیں قربان کردینے کو تیار ہیں، اب اگر مغربی تہذیب میں کسی بھی طریقہ سے کسی کی توہین کی جائے (مثلاً یہ کہا جائے کہ آپ کی ناک بہت لمبی ہے یا آپ بڑے بد شکل ہیں) تو اس کو عدالت میں جانے اور مقدمہ دائر کرنے کا حق ہے،توہمارے معاشرے میں بھی اگر کوئی شخص کسی ایسی چیز کی توہین کرے، جو لوگوں کو اپنی عزت ماں، باپ، بیوی بچوں حتی خود اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہوتو ظاہر ہے لوگوں کو یہ اعتراض کرنے کا حق ہے کہ آزادی کا بہانہ بنا کر ہمارے مقدسات کی توہین کیوں کررہے ہو؟!

آزادی کا نعرہ، ناجائز مقاصد

جو لوگ آزادی کا دم بھرتے ہیں اور آزادی کا رونا روتے ہیں اور ایران میں آزادی نہ ہونے کا مرثیہ پڑھتے ہیں! آخر وہ کیا کہنا چاہتے ہیں؟ ان میں بعض نے مغربی ممالک کے حالات دیکھے ہیں یا ان کے بارے میں سنا ہے یا وہاں کی فلموں کو دیکھا ہے، اور اسی طرح کی زندگی بسر کرنے کی ہوس رکھتے ہیں، لیکن ایران میں ان کو اس طرح کی زندگی بسر کرنے کی اجازت نہیں ہے سوال یہ ہے کہ آخر اسلامی حکومت میں کس کا حکم چلتا ہے؟ کیا اسلامی حکومت اسلام اور خدا اور رسول سے حکم حاصل نہیں کرتی؟ یہ لوگ الٰہی احکام قبول کرنا نہیں چاہتے، ولی فقیہ کے لئے بہانے اور اعتراض تراشتے ہیں اور دل میں ان کے متعلق کینہ رکھتے ہیں جبکہ ولی فقیہ اپنی طرف سے کچھ بھی نہیں کہتا: (فَإِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُونَكَ وَلَٰكِنَّ الظَّالِمِينَ بِآيَاتِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ[1])

---

[1] سورہ انعام آیت ۳۳۔

''کافرین در اصل آپ کو نہیں جھٹلاتے بلکہ (یہ) ظالم (حقیقتاً) خدا کی آیتوں سے انکار کرتے ہیں''

کیا مرجع تقلید اور فقیہ مجتہد اپنی طرف سے کچھ کہتا ہے؟ وہ جو کچھ بھی کہتا ہے خدا و رسول کے کلام قرآن و احادیث سے اخذ کرتا ہے لیکن وہ اس کو قبول نہیں کرنا چاہتے، امریکہ کی معتبر یونیورسٹیوں میں کھلے عام بہت سے ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں کہ لڑکے، لڑکیاں ایک دوسرے کے سامنے ایسے کام کرتے ہیں کہ جن کا نام لینے سے بھی شرم آتی ہے، پھر ایسے معاشروں میں معلوم ہے وہاں کے عشرت کدوں میں کیا کیا نہ ہوتا گا؟ تصور کریں اگر وہاں کے عشرت کدوں کی تیار ہونے والی فلمیں اس ملک و ملت کے جوانوں کے اختیار میں دیدی جائیں تو ان پر اس کا کیا اثر ہوگا؟! ظاہر ہے جس جوان نے ایسی فلمیں دیکھی ہوں جب صبح اٹھ کر یونیورسٹی جائے گا، سکون سے نہیں رہ سکے گا، کیونکہ وہ رات بھر سو نہیں سکا ہے، ایک طرف نفسیاتی خواہشات دوسری طرف اس طرح کی فلمیں شہوانی جذبوں کو بڑھاتی ہیں، اور اس کا چین و سکون غائب ہو جاتا ہے،

اب اگر ایسا جوان نعرہ لگائے کہ یہاں آزادی نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ میں کرنا چاہتا ہوں، مجھ کو کرنے نہیں دیا جاتا پراگندہ شکل میں جو بحثیں آزادی اور اسلام کے موضوع پر ہوتی ہیں اور اسلام کے مقابلہ میں آزادی کو لایا جاتا ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ آزادی مقدم ہے یا اسلام؟ اس کا مطلب یہی جنسی خواہشات کو پورا کرنے کی آزادی ہے، لہٰذا شروع ہی سے کیوں نہیں کہہ دیتے کہ آزادی سے تم کیا چاہتے ہو؟! اگر خواہش ہے کہ ہر وہ چیز جو کچھ کفر و الحاد کے ماحول میں جائز ہوتی ہے اور انجام پاتی ہے اسلامی معاشرے میں بھی جائز ہو جائے تو یاد رکھو کہ ایسا ہرگز نہیں ہوگا، کیونکہ لوگوں نے اپنے عزیزوں کی جانیں اسی لئے قربان کی ہیں کہ اسلامی اقدار و معیارات رواج پائیں، نہ کہ مغربی فساد اور بیہودگی رائج ہو۔

ممکن ہے کہ کچھ لوگ کہیں کہ ہم واقعاً مسلمان ہیں اور ہم نے اس نظام کے حق میں ووٹ دیا ہے امام خمینیؒ اور رہبر معظم کو بھی مانتے ہیں اور جس طرح کی آزادی مغربی ممالک میں رائج ہے ہم نہیں چاہتے، مگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ جو کچھ بھی ہم لکھنا چاہیں صاف صاف

بغیر کسی روک ٹوک اور جھجک کے بغیر لکھ سکیں، ہم آزادی بیان و قلم اور آزادی عمل کے خواہاں ہیں ،ہم کویہ آزادی دیجئے اور اپنی بات کہنے دیجئےیہ بات اور ان کا مطالبہ بہ ظاہر ٹھیک ہے اور انسانی حقوق کے منشور میں بھی ایک حق جو تمام قوانین سے بالاتر حق کے عنوان سے تمام لوگوں کودیا گیا ہے یہی آزادی بیان اور پریس کی آزادی کا حق ہے اور یہ آزادیاں ڈیمو کریسی کے ایک اصول کے طور پر جانی جاتی ہیں، ان سے کہا جاتا ہے کہ آپ آزادی میں اپنی رائے کا شوق سے اظہار کریں قوانین پر عمل در آمد کرانے والوں کے بارے میں لکھئے اور جو کچھ کہنا ہے کہئے لیکن کیا ان ہی مسائل پر آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں ؟یعنی کیا آپ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ فلاں شہر کا فلاں قاضی صحیح کام کرتا ہے یا نہیں؟ یا فلاں شہر کے میئر نے ٹھیک کام کیا ہے یا نہیں؟ فلاں دفتر کے ملازم کا رویہ صحیح ہے یا نہیں؟ یا درحقیقت آپ چاہتے ہیں اصل اسلام اور اسلامی اقدار کے بارے میں لکھیں اور تمام چیزوں کی نفی کردیں؟ یعنی اسلامی مقدسات کی توہین کرنا چاہتے ہیں؟ اظہار خیال کی آزادی کا دائرہ اگر آزادی سے آپ کی مراد یہ ہے کہ جس کام کا کرنا غیر قانونی ہے اس کے بارے میں لکھنے اور بولنے کی آزادی ہو،

جیسا کہ ہم نے مثال میں عرض کیا کس طرح ایک شخص کو حق آپ کے بارے میں، کوئی توہین آمیز لفظ منہ سے نکالنے کا حق ہے،اسے اس بات کی آزادی نہیں ہے لیکن جب اسلامی اقدارومقدسات کی بات آتی ہے تو آپ فرماتے ہیں کہ اظہار خیال کی آزادی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم جو چاہیں لکھیں ہم جو چاہیں کہیں !آپ کیسے کسی کو اپنے بارے میں کسی طرح کے توہین آمیز کلمے کو زبان پر جاری کرنے کی اجازت نہیں دیتے ؟اور اگر کوئی ایسا کرے تو آپ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں اور مقدمہ دائر کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں،آپ اجازت نہیں دیتے کہ آپ کے ذاتی مسائل اخبار میں چھپیںیہ کہتے ہیں کسی کو حق نہیں کہ میرے اسرار برملا کرے اور اخباروں میں لکھے تو پھر آپ کو ایک ملت کے راز فاش کرنے کا حق کہاں سے حاصل ہوگیا؟

کس طرح آپ کی نظر میں ایک شخص کے راز کا فاش کرنا جائز نہیں ہے، لیکن ایک ملت کے راز کو فاش کرنا جائز ہوگیا ؟!یعنی آپ کی نظر میں جب ایک شخص ۶۰ کروڑ افراد میں تبدیل ہو جاتا ہے ،توکیا اس کے خفیہ اسرار کو فاش کرنا جائز ہو جاتاہے؟! کیا ایک

معاشرے کی نسبت سے آپ کو اپنی گفتگو اور تحریروں میں کسی محدودیت کا پاس و لحاظ ضروری نہیں ہے؟لہذا ہر بات کا لکھنا اور کہنا درست نہیں ہے، معاشرے کے بھی کچھ حقوق ہیں،معاشرے کے بھی مقدسات اورا قدار ہیں اور ان کا احترام باقی رہنا چاہیے ؛ مقدسات کو مجروح نہیں کیا جا سکتا ۔

جس طرح آپ اپنی ذاتی توہین برداشت کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں،اور آپ اپنی ناموس یا آپ کے گھریلو اسرار کے بارے میں حد سے تجاوز کرنے کی اجازت نہیں دیتے، آپ کس طرح خود کواجازت دیتے ہیں کہ ٦۰ کروڑ افراد پر مشتمل ایک معاشرے کی کہ جس نے لاکھوں کی شہادت قبول کی ہے توہین کریں؟!

کیا آپ کی نظر میں کوئی پابندی نہیں ہونی چاہیے، ؟آیا آزادی کا بہانہ بنا کر کسی طرح کی قانونی حد بندی نہیں ہونا چاہیے؟ کیا مطلق آزادی صحیح ہے؟ اگر مطلق آزادی صحیح ہے تومجھے کسی کے بارے میں کچھ بھی کہنے کا حق ہونا چاہئے یہ کیا بات ہوئی کہ جب ٦۰کروڑ افراد پر مشتمل ملت کے مقدسات پامال کئے جائیں اور کوئی آپ پر اعتراض کرے تو آپ جواب میں کہیں: اظہار نظر کی آزادی ہے! اس سے بڑا مغالطہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ کسی شخص کے ذاتی احترام کو مجروح کرنا جائز نہیں ہے

لیکن ٦۰کروڑ کی ایک قوم کے مقدسات کو پامال کرنا بلکہ ایک ارب مسلمان برادری کے مقدسات کو مجروح کرنا جائز ہے! یہ کونسی منطق اور فلسفہ ہے؟ آیا صرف اس وجہ سے کہ انسانی حقوق کے منشور میں کہا گیا ہے کہ اخبارات اور اظہار خیال کی آزادی ہے مقدسات کی توہین کرنا بھی آزاد ہوجائے گا ؟!آزادی کا ایک مبہم لفظ استعمال کرتے ہیں اور ہر شخص اپنے لحاظ سے اس کی تفسیر کر کے غلط فائدہ اٹھاتا ہے ۔

اصطلاحات کے مفہوم اور مصادیق واضح ہونا چاہئےہم یہاں آپ کو مشورہ دیتے ہیں کہ وسیع مفاہیم رکھنے والے مبہم الفاظ اور اصطلاحیں استعمال کرنے کے بجائے صاف صاف مصادیق کے اوپر بات کیجئے اور کہئے کہ یہ کام جائز ہے یا نہیں؟ مثلاً یہ کہنے کے

بجائے کہ اسلام جمہوریت کا حامی ہے یا نہیں؟ کہئے کہ آپ کیا چاہتے ہیں اور کون سا عمل انجام دینا چاہتے ہیں؟ آیا آپ خدا اور اس کے احکام کو نظر انداز کرنا چاہتے ہیں تو اس کی اسلام اجازت نہیں دیتا، اگر ڈیموکریسی کا یہ مطلب ہے کہ انسان جس طرح کے قوانین بنانا چاہیں بنا سکتے ہیں چاہے خدا کے قوانین کے خلاف کیوں نہ ہوں، تو چاہے پوری دنیا جمع ہو جائے ہم ہرگز ایسی ڈیموکریسی کو قبول نہیں کر سکتے لیکن اگر ڈیموکریسی کے یہ معنی کئے جائیں کہ لوگ اپنی سرنوشت اور زندگی ساز فیصلوں میں موثر کردار کے مالک ہوں، کوئی اپنا فیصلہ ان پر مسلط نہ کرے، لوگ اسلامی اصول و قوانین اور اسلامی اقدار و معیارات کے دائرے میں آگے بڑھیں، تو یہ وہ چیز ہے جس پر شروع انقلاب سے ہمارے ملک میں عمل ہو رہا ہے،

اور اگر ہم یہ دعویٰ کریں کہ ایران کی طرح دنیا کے کسی بھی ملک میں لوگوں کی رائے کا احترام نہیں کیا جاتا، تو شاید یہ دعویٰ بے جا نہ ہوگا، شاید اس لئے کہ میرے پاس اس کے ثبوت میں بطور کافی دستاویز نہیں ہیں، پھر بھی میری نظریہ ہے کہ دنیا میں کہیں بھی اس طرح کی آزادی نہیں پائی جاتی، لہٰذا لفظ ڈیموکریسی پر بحث و مباحثہ کرنے کے بجائے کہ اسلام ڈیموکریسی کا موافق ہے یا مخالف ہے؟ بہتر ہوگا کہ پہلے اس کے مصادیق کو معین کر لیجئے، مثلاً یہ سوال کہ آیا اسلام لواط اور عورتوں کے درمیان ہم جنسی کے آزاد اور قانونی ہونے کی اجازت دیتا ہے؟ چاہے تمام لوگ اس کے حق میں ووٹ دیں؟!

تو ظاہر ہے اسلام اس چیز کی اجازت نہیں دیتا چاہے سو فی صدی اس کے موافق کیوں نہ ہوں اور اس کے ضد میں ووٹ کیوں نہ دیں، اب اگر ڈیموکریسی اس حد تک آزاد اور بے لگام ہے تو پھر ہم اس کو نہیں مانتے، لیکن اگر ڈیموکریسی سے آپ کی مراد یہ ہو کہ افراد انتخابات میں آزادی سے حصہ لیں پارلیمنٹ کے ممبران کا آزادانہ طور پر انتخاب کریں، اپنے صدر کا انتخاب آزادانہ طریقہ پر کریں اور ان کو حق حاصل ہو کہ وہ ممبران پارلیمنٹ یا حکومت کے دوسرے ذمہ دار افراد سے وضاحت طلب کر سکیں[1]

[1] پارلیمنٹ میں اعتماد کا ووٹ حاصل کرنے کی مہم کی طرف اشارہ ہے ۔

تو یقیناً یہ آزادی ہونا چاہیے کہ الحمد للہ ہمارے یہاں لوگوں کو یہ آزادی حاصل ہے، اور ہم بھی سو فیصد ی اس کی حمایت کرتے ہیں، لہٰذا اصطلاحات کے استعمال اور اس طرح کی لفظی بحثوں میں الجھنے کے بجائے بہتر یہ ہوگا کہ ان کے مصادیق کے بارے میں بحث کی جائے، کھل کر بات کریں کہ آپ کیا چاہتے ہیں تاکہ اس کا جواب بھی واضح طور پر سن سکیں۔

اگر وسیع مفہوم کے حامل الفاظ مبہم اور نا مشخص انداز میں استعمال کئے جائیں گے تو ظاہر ہے ان کے جوابات بھی معین اندا میں تمہیں دیئے جائیں گے، آزادی، ڈیموکریسی، لبرلزم، تہذیب یافتہ معاشرہ ، تمدن اور تہذیب و ثقافت کی مانند الفاظ بہت ہی وسیع اور مبہم ہیں کہ جن کی مختلف تفسیریں کی جا سکتی ہیں لہٰذا ان کے بارے میں بحث و مباحثہ کرنا کبھی بھی عقلمندی نہیں کہی جا سکتی، صاف صاف کہئے کہ کیا چاہتے ہیں تاکہ ہم اس کا جواب دیں کہ آیا اسلام سے ہم آہنگ ہے یا نہیں؟

آٹھویں تقریر

حکومت کا ڈھانچا

عنصری اور مصداقی تعریف کی اہمیت

اس تقریر میں ہماری گفتگو اسلامی حکومت کے ڈھانچے اور شکل وصورت کے بارے میں ہے اور اس سلسلے میں ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اسلامی انقلاب کے مؤسس حضرت امام خمینیؒ کا ایک یادگاری واقعہ بیان کردیں :انقلاب کے ابتدائی دور میں غیر ملکی نامہ نگاروں نے حضرت امام خمینیؒ سے سوال کیا کہ آپ شہنشاہی حکومت سرنگوں کرنے کے بعد کس طرح کی حکومت تشکیل دیں گے؟ توآپ نے فرمایا : ہم حکومت امیر المومنینؑ کی طرح کی ایک حکومت بنائیں گے، ظاہر ہے غیر ملکی نامہ نگاروں کے سامنے کہ جن کا اپنا ایک مخصوص معاشرتی ڈھانچہ اور تہذیب ہے۔

اور اس میدان میں وہ ہمارے ساتھ بنیادی اختلاف رکھتے ہیں. اسلامی حکومت کی تعریف و وضاحت کرنا ایک مشکل کام تھا وہ اسلامی ثقافت کو سمجھنے سے قاصر تھے،اور اس کو سمجھانے کے لئے گھنٹوں وقت درکار ہوتے؛لہٰذا حضرت امام خمینیؒ نے ایک جملہ میں جامع وکامل قانع کنندہ جواب دیدیا، کیونکہ حضرت علی علیہ السلام کی حکومت کے خصوصیات کو دشمن اور دوست سبھی جانتے ہیں اور اس کے لئے زیادہ مطالعہ اور تحقیق کی ضرورت نہیں تھی،ساتھ ہی ساتھ ہماری حکومت کے معیار اور نمونے کی بھی شناخت ہوگئی۔

اس قسم کی تعریف ووضاحت ؛جسے مصداقی تعریف کہتے ہیں، کسی چیز کی حقیقت و ماہیت عوام الناس کو سمجھانے کے لئے بہت ہی آسان اور بہتر طریقہ ہے، کیونکہ خالص علمی مطالب عوام الناس کو سمجھانے کے لئے مشکل پیش آتی ہے،ان کا زیادہ تر ظاہری مصداق سے سروکار ہوتا ہے، لہٰذا نظر آنے والے مصادیق اور نمونہ پیش کرکے کسی علمی حقیقت کو سمجھانے میں آسانی ہوجاتی ہے،

مثال کے طور پر اگر کوئی یہ سوال کرے کہ بجلی کیا چیز ہے ؟ تو جلتے ہوئے بلب کی طرف اشارہ کرکے یا کسی دوسرے الیکٹرانک سامان کی طرف اشارہ کرکے اس کو سمجھایا جاسکتا ہے، کہ بجلی کیا چیز ہے اس کی سمجھ میں بجلی کا مفہوم آجائے گا۔ ظاہر ہے اس طرح کی تعریف میں ذاتیات، عوارض اور اصل خصوصیات کے ذکر سے اجتناب کیا جاتا ہے، لیکن علمی اور اکیڈمیک حلقے میں اگر کسی چیز کی تعریف کی جاتی ہے تو اس کی ذاتی یا عرضی خصوصیات کو بیان کیا جاتا ہے جیساکہ علم منطق کی اصطلاح میں جنس وفصل کی تعریف کی جاتی ہے، اس طرح کی تعریف میں پہلے ایک عمومی او روسیع مفہوم پیش کیا جاتا ہے اور اس کے بعد ایک مخصوص مفہوم ذکر کیا جاتا ہے جو دوسری تمام قسموں کو اس سے الگ کردیتا ہے۔

کسی چیز کی پہچان او رتعریف کا ایک اور طریقہ یہ بھی ہے کہ اس ایک چیز کے مختلف عناصر کو شمار کیا جاتا ہے؛ یعنی کسی شے کے لوازم اور خصوصیات کیا کیا ہیں ان کا جائزہ لے کر اُن سب کا اس چیز کی تعریف میں ذکر کردیا جاتا ہے، ایک شخص اس کے تمام عناصر، اس کے لوازمات و خصوصیات کو دیکھ کر فیصلہ کرلیتا ہے اور جو چیز ا نخصوصیات کی حامل ہوتی ہے وہ اس سے اس شئ کی حقیقت کو سمجھ لیتا ہے۔

اسلام اور قوتوں کی تقسیم

حکومت کے اہم دھانچے ان بنیادی خصوصیات کی تعریف کے لئے جو اسلام کے پیش نظر ہے، یا سیاست کے بارے میں اسلام کا نظریہ ایک جملہ میں بیان کرنے کے لئے کہا جاسکتا ہے: سیاست سے متعلق اسلام کا نظریہ ہے کہ سیاست اور حکومت کے تمام امور الٰہی اور وحی کے مطابق ہونے چاہئے ، اوریہی چیز حکومت اور نظام کے لئے اسلامی ہونے کی ضمانت ہے. اسلامی حکومت کی مزید وضاحت اور ایک جامع شکل پیش کرنے کے لئے ضروری ہے کہ فلسفۂ حقوق میں بیان شدہ قوتوں کی تقسیم کے نظریہ پر ایک نظر ڈالی جائے، آخری چند صدیوں کے دوران مغربی فلاسفہ کے درمیان اس موضوع پر کافی بحث و کشمکش رہی ہے کہ آیا حکومت کا اقتدار ایک جگہ مرکوز ہونا چاہئے یا قوتوں کو الگ الگ ہاتھوں میں تقسیم کردینا چاہئے ۔

اور ہر شخص یا ہر گروہ حکومت کی صرف ایک قوت کا مالک ہو، اور آخر کار یورپ میں بیداری کی تحریک ''ریسانس'' بالخصوص ''مانٹسکیو'' کے زمانے کے بعد، (جس نے اس سلسلہ میں ایکضخیم کتاب ''روح القوانین'' لکھی اور اس میں طاقتوں کی تقسیم پر بہت زیادہ زور دیا ہے)، حقوق کے فلاسفہ نے اس بات پر اجماع واتفاق کرلیا کہ حکومتی قوتوں کو جدا جدا ہاتھوں میں تقسیم ہونا چاہئے اور ایک عوامی اور ڈیموکرٹیک حکومت کی بنیادی خصوصیات میں سے ہے کہ وہ تین اہم قوتو یعنی:

۱۔ ''قوہ مقننہ'' (قانون ساز اسمبلی)

۲۔ ''قوہ مجریہ'' (حکومتی کابینہ)

۳۔اور ''قوہ قضائیہ'' (عدلیہ) میں تقسیم ہو، (۱) اور ان تینوں طاقتوں کے لئے الگ الگ دائرہ کار معین کر دیا جائے، اس طرح کہ ایک طاقت دوسری طاقت کے امور میں مداخلت نہ کر سکے، اور ہر ایک کو قانونی خود مختاری حاصل ہو، تمام قوتوں کو الگ الگ کرنے کے بعد ہر ایک کی تعریف بھی کی گئی ہے، کہ جن کو ہم یہاں پر مختصر طور پر بیان کرتے ہیں:

الف۔ قوۂ مقننہ: (قانون ساز اسمبلی) حکومت کا ایک اہم ترین رکن قوہ مقننہ ہے چنانچہ انسان کی معاشرتی زندگی میں مسلسل رونما ہونے والے تغیر وتبدل اور حالات زمانہ کے مطابق، قوانین کی ضرورت کے پیش نظر ایک گروہ یا ایک جماعت کی مختلف جہتوں سے تبادلہ خیال اور بحث و مباحثہ کرکے معاشرہ کا نظام چلانے کے لئے قانون وضع کرتے ہیں، اور قوہ مقننہ کی قانونی حیثیت کے سبب اس کے بنائے گئے قوانین سرکاری طور پر معتبر اور واجب الاجراء ہوتے ہیں۔

۱۔عام اصطلاح میں کبھی تو لفظ ''حکومت'' کا تینوں طاقتوں کے لئے استعمال ہوتا ہے، اور کبھی لفظ حکومت کا صرف ''قوۃ مجریہ'' پر اطلاق ہوتا ہے، البتہ یہ معنی خاص مواقع پر استعمال ہوتے ہیں اور اکثر اوقات حکومت سے مراد وہی عام معنی ہوتے ہیں جو تینوں طاقتوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

ب۔ قوہ عدلیہ: قوانین کی تشکیل اور سرکاری حیثیت کو علم ہوجانے کے بعد اس بات کی ضرورت ہے کہ کوئی ایسا ادارہ اور قوت ہو جو ان کلی قوانین کی معاشرہ میں پیش آنے والے واقعات کے ساتھ مطابقت اور لوگوں کے حقوق اور ذمہ داریوں کو واضح کرے. اور لوگوں کے اختلافات اور جھگڑوں کو حل کرنے کے لئے بھی قوہ قضائیہ کا ہونا ضروری ہے،

یعنی قانون کے بننے اور مرتب ہونے کے بعد شہریوں یا اداروں اور جماعتوں کے درمیان یا عوام الناس اور حکومت کے درمیان رونما ہونے والے اختلاف کو حل کرنے اور لوگوں کے حقوق کو پامال ہونے سے بچانے کے لئے صحیح اور موقع و محل کے مطابق فیصلے اور جانچ پڑتال کرنے کے لئے قوہ قضائیہ کا ہونا ضروری ہے، ورنہ صرف پارلیمنٹ میں قوانین پاس ہونے سے مشکل حل نہیں ہوتی، کیونکہ اختلاف کی صورت میں ہر ایک شخص اپنے ہی کو حق پر سمجھتا ہے اور اپنے حق میں قانون کی تشریح کرتا ہے۔

ج۔ قوۂ مجریہ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک معاشرہ اپنے اہداف ومقاصد تک پہنچنے کے لئے قانون کا محتاج ہے، لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ تمام لوگ قوانین کی رعایت کریں؛ کیونکہ افراد مختلف جذبوں کے تحت قانون کی خلاف ورزی کر بیٹھتے ہیں، لہذا قانون کے لئے ضروری ہے کہ اس پر عمل درآمد کے لئے ایک اور قوت بھی موجود ہو،اور یہ عمل درآمد کی ضمانت قوۂ مجریہ کی تشکیل کے ذریعہ ہی ممکن ہے ،(جس کے پاس قوانین جاری کرنے کے لئے کافی وسائل ہوتے ہیں)، لہذا قوہ مجریہ (حکومتی کابینہ) کی ذمہ داری یہ ہے کہ ملک کے مرتب شدہ قوانین پر عمل کرائے اور خلاف ورزی کی روک تھام کرے، اسی طرح قوت مجریہ کی ایک ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ عدلیہ کے ان احکامات کو بھی نافذ کرے کہ جن کی عدالتی کارروائیاں پوری ہو چکی ہوں، اور اس سلسلہ میں قوانین پر عمل درآمداور خلاف ورزی کی روک تھام اور مجرموں کو سزا دینے کے لئے اگر طاقت کی ضرورت ہوتوپولیس وغیرہ سے بھی فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

ہم نے مختصر طور پر جمہوری اور عوامی نظاموں میں طاقتوں کی تقسیم کے نظریہ کو بیان کر دیا،اور اگرچہ ہم اس منزل میں قوتوں کی تقسیم سے متعلق اسلام کا نظریہ بیان کرنے کے درپے نہیں ہیں، لیکن اس نکتہ کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ اسلامی جمہوریۂ ایران کے آئین میں بھی بنیادی طور پر طاقتوں کی تقسیم کے نظریہ کو قبول کیا گیا ہے،لیکن اس کے ساتھ ہی تینوں طاقتیں ولایت فقیہ کے اصول اور محور پر اورایک دوسرے سے جڑی ہوئی نظر آتی ہیں اسی وجہ سے یہ نظام اسلامی نظام کہلاتا ہے، کیونکہ اسلامی نظام میں تینوں طاقتوں کی قانونی حیثیت اس چیز سے وابستہ ہے کہ یہ تینوں قوتیں الٰہی اور اسلامی اصولوں پر استوار ہوں اور کسی نہ کسی طریقہ سے ان کا رابطہ خداوند عالم سے قائم ہوجائے اور ''ولایت فقیہ'' وہ رشتۂ اتصال ہے جو نظام کو نظام الٰہی بناتا ہے نظام کے اسلامی اور قانونی ہونے کا ملاک ومعیار بھی یہی ''ولایت فقیہ''ہے۔

جس وقت ہم اسلام کے قوانین وضع اور جاری کرنے کی باتیں کرتے ہیں اور ہم یہ دعوی کرتے ہیں کہ تمام قوانین اور قاعدے الٰہی اور اسلامی ہونے چاہئے، تو ہم اس بات کو مسلم اور طے شدہ مان لیتے ہیں کہ اسلام صرف نماز وروزہ او رچند عبادتوں میں محدود نہیں ہے؛بلکہ اسلام ایک ایسے کامل مجموعہ کا نام ہے کہ جس میں تمام اجتماعی قوانین بھی شامل ہیں۔

یعنی اجتماعی قوانین کے تمام شعبے مالی مسائل، شہریت، تجارت، ملکی اور بین الاقوامی ہر طرح کے حقوق کہ جن کی معاشرہ کو ضرورت پڑتی ہے،اس میں شامل ہیں لہٰذا ہم بنیادی طورپریہ نظریہ رکھتے ہیں کہ اسلام کے پاس اجتماعی قوانین موجودہیں اور حکومت پر ذمہ داری ہے کہ اس کے قوانین کو معتبر سمجھے اور ان کو عملی جامہ پہنائے، اور اگر کوئی حکومت اسلام کے قوانین کو معتبر نہ جانے اور ان پر عمل درآمد کی فکر میں نہ رہے، تو اسلام کی نظر میں اس حکومت کا کوئی اعتبار ا ور قانونی حیثیت نہیں ہے۔

اسلام کے اندر معاشرہ کو چلانے کی صلاحیت نہیں ہے یہ ایک غلط فہمی ہےیہاں ایک غلط فہمی جوپھیلائی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ انسان کی زندگی جوترقی کی طرف گامزن ہے اس کو چلانے کے لئے بڑے پیمانے پرنئے نئے قوانین کیضرورت ہوتی ہے۔

اوربلا شبہ قرآن کریم ، سنت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم او رکلام ائمہ معصومین علیہم السلام میں وہ تمام قوانین جو انسان کے روز مرہ کی ضرورتوں کو پورا کریں نہیں پائے جاتے ہیں،آج انسان کواس طرح کے بہت سے قوانین کی ضرورت ہے کہ جو صدر اسلام میں موضوعیت نہیں رکھتے تھیلہذا ان کا حکم کہاں سے بیان ہوتا؟مثال کے طور پر ممالک کی فضا اور ہوائی حدود سے متعلق قوانین کو لے لیجئے کہ آیاایک ہوائی جہاز کسی ملک کی فضا میں اس ملک کی اجازت کے بغیر داخل ہوسکتا ہے ؟یا نہیں،اس ملک کی اجازت ضروری ہے یا نہیں؟ ظاہر ہے اس طرح کے قوانین قرآن،سنت رسول یا کلام ائمہ معصومین علیہم السلام میں موجود نہیں ہیں کیونکہ اس زمانے میں سرے سے ہوائی جہاز کا وجودہی نہیں تھا کہ یہ مسئلہ زیر بحث آتا کہ ایک جہاز دوسرے ملک کی فضا سے گذر سکتا ہے یا نہیں؟ اسی طرح ٹریفک اور ڈرائیونگ کے قوانین وغیرہ،اس وقت ظاہر ہے موٹر وغیرہ کا وجود ہی نہیں تھا کہ اس سے متعلق قوانین بنائے جاتے،اسی طرح بہت سے دوسرے قوانین کہ جن کی آج انسان کو ضرورت پیش آتی ہے مثلاً سمندر ،اور بین الاقوامی سطح کے قوانین،اور اس طرح کے دوسرے موضوعات کہ جن کے بارے میں ابھی تک واضح و روشن قوانین نہیں بنائے جا سکے ہیں اورضرورت اس بات کی ہے کہ قانون داں حضرات اس سلسلہ میں غور وفکر سے کام لیں اوران کے لئے قوانین بنائیں۔

اب ان حقائق کے پیش نظر کہ قرآن اور حدیث میں،مذکورہ قوانین کی مانندانسان کی ضرورتوں کو پوراکرنے والے تمام قوانین موجود نہیں ہیں،تو پھر کس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ معاشرہ میں الٰہی و اسلامی قوانین نافذ ہونا چاہئے جبکہ بہت سے موضوعات کے بارے میں اسلام کے اندر کوئی قانون ہی نہیں ہے!

لہٰذا یہ دیکھتے ہوئے کہ ایک طرف تو انسان کواس طرح کے قوانین کی واضح طور پر ضرورت ہے اور دوسری طرف اسلامی ماخذ میں ایسے قوانین موجود نہیں ہیں،سوال یہ ہے کہ اس مشکل کو کیسے حل کیاجائے؟او رایسے میں کس طرح خود کو صرف اسلامی قوانین کا پابند بنایا جائے،ان ہی سب باتوں کو بنیاد بنا کر بعض نے جو سرے سے اسلام کو نہیں مانتے تھے یہ غلط فہمی پھیلائی ہے کہ اسلامی قوانین معاشرہ کو چلانے کیلئے کافی نہیں ہیں؛

ان کے بجائے خود بشریت کے بنائے ہوئے قوانین کی طرف رجوع کرنا چاہئے،ان لوگوں نے موضوع کو اور زیادہ مشکل اور پیچیدہ بنانے کے لئے اس مشکل کو مختلف طریقوں سے پیش کیا ہے حتی بعض نے اپنے مخصوص مقاصد کی بنا پر اس سلسلہ میں مختلف بیان دیئے ہیں۔

لیکن ان سب کا ہدف او رمقصد اسلامی حکومت کو کمزور اور متزلزل کرنے کے ساتھ ہی یہ باور کرانا ہے کہ اسلام معاشرہ کو چلانے کی صلاحیت نہیں رکھتا،اور اسلامی انقلاب اور اسلامی حکومت کی باتیں کرنا اور ان پر اصرار اور تاکید کرنا بے فائدہ ہے، لہٰذا حکومت کے اسلامی ہونے کے خیال کو اپنے ذہن سے نکال دینا چاہئے کیونکہ یہ کام ہونے والا نہیں ہے،افسوس کی بات تو یہ ہے کہ بعض اسلامی انقلاب کے طرفدار اور اسلام کے معتقد افراد بھی اس شبہ سے متاثر ہوتے جارہے ہیں،

اسی لئے ضروری معلوم ہوتاہے کہ اس غلط فہمی کا مناسب اور محکم جواب پیش کردیا جائے تاکہ یہ لوگ ایک طرف اسلام کے قوانین پر پابند رہیں اور دوسری طرف جن مسائل میں معاشرہ کو قانون کی ضرورت ہولیکن اسلام کی بنیادی کتابوں میں وہ نہ ملیں تو اس مشکل کے حل کی راہ بھی معلوم ہو جائے ۔

قوانین کی مختلف اقسام اور قابل تغیر قوانین بنانے کی ضرورت

مذکورہ غلط فہمی کے جواب میں اس نکتہ کی طرف اشارہ ضروری ہے کہ ''قانون'' ایک وسیع اور عام مفہوم رکھتا ہےحتی کہ ''تکوینی'' قوانین بھی اس میں شامل ہیں؛ مثلاًطبیعیات و ریاضیات کے قوانین اور قانون لاوازیہ،نیوٹن کا جاذبہ زمین کا قانون یا اسٹائن کا نسبت سے متعلق قانون، یااس طرح کے اور دوسرے قوانین (جو عالم تکوین میں موجود ہیں اور ایک اٹل واقعیت بھی رکھتے ہیں) یہ سائنسدانوں کے ذریعہ دریافت ہوتے ہیں ان کو بنایا نہیں جا سکتا،

اور یہ سائنس اور نیچر کے ثابت واٹل قوانین طبیعی و واقعی چیزوں سے مربوط ہیں، حقوق و قوانین اور سیاست و معاشرت کے مسائل سے ان کا کوئی ربط نہیں ہے، اسی طرح منطقی اور فلسفی قوانین اور میتھ میٹکس کے مسائل سے بھی ہماری بحث نہیں ہے، بلکہ اس منزل میں ہماری بحث ان قوانین سے ہے جو قابل وضع ہیں جن کو اصطلاح میں ''اعتباری یا سرکاری قوانین'' کہا جاتا ہے، ان قوانین کا اعتبار ونفاذ صرف اس صورت میں صحیح ہے جب کوئی معتبر ادارہ ان کو وضع کرے، اور ان کی تین قسمیں ہیں:

الف۔ **آئین آئین عام** طورپر ان قوانین پر مشتمل ہوتا ہے جو نسبتاً ثابت اور غیر متغیر ہوتے ہیں اور ایک معاشرہ کی ثقافت اور رسم و دستور سے مناسبت رکھتے ہیں اور ملک کے باصلاحیت افراد بناتے ہیں، یہ قوانین نسبتاً ناقابل تبدیل اور ایک طولانی مدت تک جاری رہتے ہیں، ان کوآئے دن تبدیل نہیں کیا جا سکتا یہ معاشرہ کے نظم و نسق کی اساس اور بنیاد سمجھے جاتے ہیں،یہ قوانین ثابت اور بار بار کی تبدیلی سے محفوظ ہونے کی وجہ سے کلّی مسائل کے حامل اور محدود ہوتے ہیں؛ اسی وجہ سے ایک ملک کاآئین چند اہم اور بنیادی اصولوں پر مشتمل ہوتا ہے۔

لہٰذا ایسے جزئی اور وقتی قوانین کہ جن کی وقتاً فوقتاً ضرورت بھی زیادہ پیش آتی ہے لیکن زمانہ کے حالات کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں،ملک کے آئین اساسی میں نہیں جگہ پا سکتے، آئین اساسی میں صرف اصولی اور نا قابل تغییر قوانین کی گنجائش ہے اس میں جزئی قوانین سے پرہیز کرنا چاہئے، مگر وہ جزئی اور محدود قوانین جو اہم او رخصوصی حیثیت کے حامل ہیں اس میں ان کا بھی ذکر ہونا ضروری ہے۔

ب۔**پارلیمانی بل** قوانین کی دوسری قسم وہ ہے کہ جو پارلیمنٹ بل کی صورت میں پاس کرتی ہے، اگرچہ بعض ملکوں میں پارلیمنٹ کے علاوہ ''مجلس سنا'' یا کسی اور نام سے یا ایک ایوان بالا کے نام سے ہوتی ہے، اور اس کے منظور کردہ قوانین بھی پارلیمانی بل کی طرح معتبر مانے جاتے ہیں، ہمارے ملک میں بھی عوامی پارلیمنٹ کے علاوہ ''شورائے نگہبان'' کے نام سے ایک سپریم کونس ہے جو دوسرے ممالک کی مجلس سنا یا آئینی کورٹ کی طرح ہے اور فقہاء اور حقوق داں حضرات پر مشتمل شورائے نگہبان اسلامی پارلیمنٹ کی

منظور کردہ بلوں کی ملک کے آئین اور شرعی قوانین سے تطبیق دیتے ہیں، اور اگر وہ بل آئین اور شرعی قانون سے مطابقت نہ رکھتے تو ان کو پارلیمنٹ میں دوبارہ لوٹا دیا جاتا ہے تاکہ وہ ان پر نظرثانی کریں۔

ج۔ **کابینہ کے منظور کردہ بل** پارلیمنٹ کے منظور شدہ قوانین کے علاوہ تقریباً سبھی ملکوں میں دوسرے مرکزوں کے ذریعہ بھی قوانین و دستور بنائے جاتے ہیں اور وہ بھی لازم الاجراء ہوتے ہیں، جس کا سب سے واضح نمونہ حکومت کی (کابینہ) کے بنائے ہوئے قوانین ہیں، آئین میں اس بات کی اجازت دی گئی ہے کہ حکومتی کابینہ کچھ خاص امور میں قانون بنا سکتی ہے، اسی طرح صدر مملکت بھی خاص امور میں شخصی طور پر فیصلے کر سکتا ہے، اور یہ حکومتی کابینہ اور صدر مملکت کے بنائے ہوئے قوانین پارلیمنٹ میں منظوری کے لئے نہیں جاتے بلکہ خود قانونی حیثیت سے لازم الاجراء ہوتے ہیں

،اور اسی طرح وہ قانونی دستاویز اور دستور العمل جو کسی وزارت خانہ وغیرہ میں منظوری کے بعد سرکاری اداروں اوردوسرے مرکزوں کو بھیجے جاتے ہیں وہ ایکقسم کے قوانین ہوتے ہیں اور حکوتپر اس کے نفاذ کی ذمہ دار ہوتی ہے، لہٰذا ہمارے ملک اور اسی طرح بعض دوسرے ملکوں میں بھی تین طریقہ کے قانون پائے جاتے ہیں:

ا۔آئین.

٢۔پارلیمنٹ کے منظور کردہ قانونی بل.

٣۔حکومتی کابینہ یا صدر مملکت کے بنائے ہوئے دستور وضوابط او راسی طرح ان مراکز کے دستوری قواعد جن کو قانونی اجازت حاصل ہو.

اور ظاہر ہے دنیا کے کسی بھی گوشہ میں کسی بھی زمانہ اور کسی بھی معاشرہ میں ممکن نہیں ہو سکا ہے کہ تمام قوانین و دستور کو ایک جگہ اور ایک ہی زمانہ میں بنالئے جائیں، چونکہ وضع شدہ قوانین اور ان کے نفاذ کے طریقے اور دستور العمل زمانہ بدلنے کے لحاظ سے ضرورت

کے مطابق قابل تبدیل یا قابل تجدید نظر ہیں، مثلا پارلیمنٹ آج کوئی قانون بناتی ہے لیکن ہوسکتا ہے کہ کل حالات بدل جائیں اور اس قانون کو بدلنے اور ان پر تجدید نظر کرنے کی ضرورت پیش آجائے، اسی طرح حکومت کے قوانین نافذ وجاری کرنے کے طریقے بھی حالات کے لحاظ سے تبدیل ہو سکتے ہیں اوران پر نظر ثانی کی ضرورت پیش آسکتی ہےاسی طرح جب کوئی نئی حکومت بر سر اقتدار آتی ہے تو ایک محدود دائرۂ اختیار میں رہ کر قوانین کو بدل سکتی ہے، البتہ وہ لوگ جو معاشرہ کی ترقی وبہبودی چاہتے ہیں ان کی ہمیشہ کوشش یہی ہوتی ہے کہ قوانین اس طرح دقت اور غور وفکر کے بعد بنائے جائیں کہ معاشرہ کے لئے پوری طرح مناسب ہوں او راس میں کم سے کم خامیاں پائی جائیں،

ظاہر ہے ہم بھی جب یہ کہتے ہیں کہ قوانین کو اسلامی ہونا چاہئے تو اس سے ہماری مراد یہ نہیں ہوتی کہ تمام قوانین ملک کے آئین سے لے کر پارلیمنٹ کے منظورکردہ قوانین اور ان کے نفاذ کے دستور و ضوابط تک، سب کے سب قرآن مجید میں موجودہوں۔

قوانین کے اسلامی ہونے کا مطلب

قوانین و مقررات کے اسلامی ہونے کے مفہوم کی وضاحت کرتے وقت، عام طور پر قوانین بننے کے طریقوں پر ایک نظر ڈالنا فائدہ سے خالی نہیں ہے،نمونہ کے طور پر قوہ مجریہ یا حکومتی کابینہ اپنے اس دائرے میں رہ کر دستور و قوانین بنا سکتی ہے کہ جس حدتک پارلیمنٹ نے اجازت دی ہو،یعنی ان کا دائرۂ کار وسیع نہیں ہے،

دوسرے الفاظ میںوں عرض کیا جائے کہ ان کے اختیارات کی حدیں،آئین اور پارلیمانی دستور وضوابط کے دائرے میں محدود ہوتی ہیں،او رنفاذ کے طریقے بھی اسی کے تحت ہونے چاہیں،یعنی یہ بھی ان ہی کلیات کے مصادیق قرار پائیں جوآئین اور پارلیمانی بلوں میں منظور ہوچکے ہوں،لہٰذا تمام کلیات پہلے آئین اور پارلیمانی بلوں کے ذریعہ منظور قوانین میں مجسم ہوتے ہیں،،اس کے بعد وزراء کی کابینہ یا دوسرے حکام مخصوص امور میں ان کلیات کے مصادیق کو دستور و ضوابط کی شکل میں تنظیم کرتے ہیں ۔

وہ کسی قید و شرط کے بغیر حسب دل خواہ عمل نہیں کر سکتے بلکہ ملک کے آئین اور پارلیمانی بلوں کے دائرے میں رہ کر وہ دستور وضوابط بنا سکتے ہیں،اور پارلیمنٹ بل بھی شورائے نگہبان سے تائید شدہ ہوں یعنی پارلیمنٹ کو بھی آئین کے دائرے میں کام کرنا چاہئے اسی صورت میں وہ قانون معتبر ہوتے ہیں اور ان کو نفاذ کی ضمانت فراہم ہوتی ہے، لہٰذا سرکاری قوانین و ضوابط کا معتبر اور لازم الاجراء ہونا اس چیز پر موقوف ہے کہ وہ پارلیمنٹ کے بلوں کے مطابق ہوں، اور پارلیمانی بلوں کے معتبر ہونے کا معیار یہ ہے کہ وہ ملک کے آئین کے دائرے میں ہوں،اور ملک کے آئین کے معتبر ہونے کا معیار یہ ہے کہ وہ خداوندعالم کے تشریعی فیصلے یعنی فقہی احکام کے تابع ہوں،اس طرح تمام قوانین وضوابط طول میں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں

اور ان کا معتبر ہونا اس بات پر منحصر ہے کہ یہ تمام قوانین ایک سلسلے سے جاکر اسلام اور خداوندعالم کے شرعی فیصلے پر ختم ہوتے ہوں؛ نہ یہ کہ تمام قوانین ملک کے آئین سے لے کر دستور وضوابط اور آئین نامے اور پارلیمانی بل وغیرہ تک سب کے سب قرآن مجید اور احادیث شریف میں موجود ہوں۔

اگر خدا وندعالم نے پیغمبر اکرم (ص) کو یہ اختیار عنایت فرمایا کہ وہ مخصوص امور میں مخصوص قانون بنا سکتے ہیں، چونکہ یہ قانون و ضوابط خداوندعالم کی اجازت اور اس کے فیصلے کی بنیاد پر ہیں لہٰذا معتبر اور لازم الاجراء ہیں، رسول اکرم (ص) کی اطاعت اور ان کے احکام و دستورات کی پیروی خدا وندعالم کے حکم سے واجب ہے اور اسی حکم خدا کے زیر سایہ پیغمبر اکرمؐ کا بنایا ہوا قانون بھی معتبر ہے، اور ہم مسلمانوں پر ان کی اطاعت اور پیروی واجب ہے؛ ورنہ اگر ہم خدا کے حکم سے صرف نظر کرلیں تو پیغمبر کے احکام ودستورات خود اپنی جگہ واجب نہیں ہوتے۔

لہٰذا وہ قوانین جو براہ راست خداوندعالم کی طرف سے آئے ہیں اور قرآن مجید میں صاف صاف بیان ہوئے ہیں ان کواولویت حاصل ہے اور وہ درجہ اولیٰ میں قرار پاتے ہیں اور اپنی جگہ خود معتبر ہیں، اس کے بعد مخصوص امور میں خدا کے حکم سے رسول

اکرمؐ کے بنائے ہوئے قوانین ہیں جو دوسرے درجہ میں قرار پاتے ہیں،او رآپ کے بیان کردہ قوانین خدا کے حکم کی بنیادپر معتبر ہیں، اسی طرح ائمہ معصومین علیہم السلام کے بیان کردہ قوانین واحکامات خدا و رسول کے حکم کی بنیاد پر معتبر ہیں؛کیونکہ خود خدا او راس کے پیغمبرؐ نے ائمہؑ کی اطاعت واجب کی ہے ۔

اب فرض کیجئے اگر ہم حضرت امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے زمانہ میں کسی اسلامی علاقہ میں زندگی بسر کرتے ہوتے توبے شک آپ کی اطاعت اپنے اوپر واجب جانتے،اور اگر آپ جناب مالک اشتر کی مانند کسی کو اس شہر کا حاکم بناکر بھیجتے او ریہ فرماتے کہ ان کے احکامات کی پابندی کرنا اور ان کی نافرمانی نہ کرنا،جس نے ان کی اطاعت کی میری اطاعت کی ؛تو اگرچہ مالک اشتر کے احکامات اپنی جگہ خود کوئی اعتبار نہیں رکھتے تھےاور وہ بھی اس مسئلے میں دوسروں کی طرح تھے،

لیکن چونکہ امام کا حکم تھالہٰذا اس صورت میں ان کی اطاعت واجب اور ان کے احکامات لازم الاجراء ہوگئے،کیونکہ وہ ایک ایسے امام معصوم کی طرف سے مقام ولایت پر فائز ہوئے ہیں جو خدا اور پیغمبرؐ کی طرف سے منصوب ہے اور جس کی اطاعت واجب سمجھی جاتی ہے،یقیناً امام معصومؑ کی طرف سے منصوب والی و حاکم کے دستور او رفرمان تیسرے درجہ کے قوانین میں شمار ہوتے ہیں، مثال کے طور پر اگر اسلامی پارلیمنٹ ،کسی صاحب منصب کو کچھ اختیارات دیدے اور وہ اسی کی بنیاد پر کچھ قوانین اور دستور العمل بنائے جائیں،تواس کوجو اختیار دیا گیا ہے اسی کے تحت اس کے بنائے ہوئے قوانین لازم الاجراء ہوں گے،پارلیمنٹ کوبھی ملک کے آئین کی وجہ سے اعتبار ملا ہے اور اس کے بنائے ہوئے قوانین بھی اس آئین کی وجہ سے معتبر ہوتے ہیں۔

اگر چہ دوسرے تمام ممالک میں آئین کا اعتبار لوگوں کے ووٹ اور رائے پر ہوتا ہے، ہمارے نزدیک ملک کے آئین کا مقام و مرتبہ اس سے کہیں زیادہ ہے اس کا سر چشمہ خدا کی ذات ہے چنانچہ ہم یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ آئین کا اعتبار خدا کی اجازت پر منحصر ہے اور پیغمبر یا امام معصومؑ یا کوئی مالک اشتر کی طرح کا شخص اس آئین کی تائید کرے،

بنا بر این قانون کا اعتبار علی المراتب خدا ، رسول اور ائمہ علیہم السلام کے کلام کی وجہ سے ہے پھر اس کے بعد اس شخص سے ملتا ہے جو امام معصوم کی طرف سے معین ہے،اور یہی اسلام کا فلسفہ اور تھیوری ہے، امام معصوم کی غیبت کے زمانہ میں چونکہ ولی فقیہ ایک عمومی حکم کے تحت، امام علیہ السلام کی طرف سے منصوب ہے، اس کی ولایت وحکمرانی امام معصوم کی طرف سے تائید شدہ اور معتبر ہے،لہٰذا ولی فقیہ کی تائید ملک کے آئین کو اعتبار عطا کردے گی، ورنہ اپنے آپ آئین کا معتبر ہونا مشکل ہے، اس پر سوالیہ نشان باقی رہے گا کہ اس کا اعتبار کہاں تک ممکن ہے، کس حد تک یہ معتبر ہے، اور کن لوگوں کو آئین میں تبدیلی کا حق ہے وہ اقلیت جس نے آئین کے حق میں ووٹ نہیں دیا ہے کس بنیاد پر اس آئین کی پیروی کرے گی اور اسی طرح کے دوسرے بہت سے سوالات، لیکن جب ہمارا نظریہ یہ ہوگا کہ اس آئین کی ایسے شخص نے تائید کی ہے جو امام معصوم کی طرف سے منصوب ہے، تو پھر کسی سوال کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

اسلامی حکومت میں قانون سازی

اب یہ بات صاف ہوگئی کہ قانون بنانے کے مرحلہ میں اسلامی حکومت کی تھیوری، یہ ہے کہ قانون کا اصلی اعتبار خداوندعالم کی ذات سے وابستہ ہے جس کو بھی خداوندعالم معتبر قرار دیدے، مثلاً پیغمبر اسلام کا قول معتبر ہے، اسی طرح پیغمبرؐ جس کو منصوب کردیں وہ ہمارے لئے معتبر ہے جیسے حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کو خدا کے رسول نے منصوب فرمایاہے لہٰذا ان کا قول ہمارے لئے معتبر ہے؛ اسی طرح امام معصوم جب کسی کو عمومی یا خصوصی طور پر منصوب کردے تو اس کا قول بھی ہمارے لئے معتبر ہے،چنانچہ وہ قوانین و احکامات کہ جو مذکورہ سلسلۂ اعتبار سے جاری ہوئے ہوں وہ الٰہی اور اسلامی ہیں کیونکہ خداوندعالم کی طرف سے ان کو تائید حاصل ہے،

البتہ جیسا کہ ہم نے عرض کیا اسلامی حکومت میں کبھی یہ تائید کئی واسطوں کے ذریعہ انجام پاتی ہے، ولی فقیہ کی تائید امام معصوم کی تائید و توثیق کے تحت ہے اور امام معصوم علیہ السلام کے فیصلے اور اختیارات کی تائید پیغمبر اکرمؐ کی تائید وتعین سے ہے اور آخری مرحلہ

میں پیغمبر اکرم کے اقوال وارشاد کا اعتبار قرآن کریم کی صاف اور صریح نص سے ثابت ہوتا ہے، خداوندعالم ارشاد فرماتا ہے: (یا أیّھا الّذین أمنُوا أطیعُوا اللّٰہ وَأطیعُوا الرّسُولَ وَ أولِی الأمرِ منکُم [1]) ''اے ایمان والو! خدا کی اطاعت کرواور رسول کی اور جو تم میں صاحبان امر ہیں ان کی اطاعت کرو''اسی طرح قرآن کہتا ہے: (اَلنّبِیُّ أولیٰ بالمُؤمنینَ من أنفُسِھِم [2]) ''نبی تو مومنین پر خود ان کی جانوں سے بھی بڑھ کر حق رکھتے ہیں''

بے شک مذکورہ رابطہ اسلام کے وضع شدہ اصول کے دائرے میں ان لوگوں کے لئے مکمل طورپر عقل ومنطق کے مطابق ہے جو خدا، پیغمبر اور امام معصوم ایمان و اعتقاد رکھتے ہیں، اور جیسا کہ ہم نے عرض کیا ہم نے اس مسئلہ کو آسان زبان میں ان ہی لوگوں کے لئے بیان کیا ہے اب جولوگ خدا کو نہیں مانتے اور اس کے رسول ،اور امام معصوم کی حقانیت میں شک رکھتے ہیں، ان کے لئے ایک دوسرے طریقہ سے بحث کرنا ہوگی: ان کے لئے پہلے اسلام کے بنیادی اصول اوراس کے ڈھانچے کو بیان کرنا ہوگااور جب وہ ثابت ہو جائے تو اس کے بعد دوسرے تمام مسائل منجملہ حکومت وسیاست کے مسائل پر بحث ہوگی، البتہ اس بحث کا آزادانہ نقطۂ نگاہ سے بھی جائزہ لیاجاسکتا ہے کہ آیا قانون بنانے کا یہ طریقہ بہتر اور معاشرہ کے لئے زیادہ مفید ہے یا قانون سازی کے اور دوسرے طریقے جوآج کل رائج ہیں۔؟

اسلامی حکومت میں قانون کا نفاذ کرنے والوں کو منصوب ہونا اسلام کی سیاسی تھیوری میں اس سے قطع نظر کہ قانون بنانے کا حق صرف اور صرف خداکو حاصل ہے ،اورا س کے ولائی نظام میں جو قوانین اوردستوروضوابط خدا، رسول خدا، امام معصوم اور ان کے خاص یا عام جانشینوں کی تائید و توثیق سے ہی معتبر سمجھے جاتے ہیں،اس کے قوانین کانفاذ کرنے والا بھی خدا وندعالم کی طرف سے معین ہونا چاہئے، (البتہ عدلیہ کو بھی قوہ مجریہ کے دائرے میں رکھا جا سکتا ہے

[1] سورہ نساء آیت ۵۹۔
[2] سورہ احزاب آیت۶۔

، لیکن اس کی مخصوص اہمیت کی خاطراور اس وجہ سے بھی کہ اختلاف اور جھگڑے وغیرہ کو حل کرنے میں اس کا ایک محترم و مقدس کردار ہے ،اور قوانین پر عمل در آمد سے پہلے ان کے مصادیق کا انطباق ضروری ہے، اس کے لئے ایک مستقلحیثیت اورایک مخصوص حالات پیش نظر ہوتی ہے)

جس وقت پیغمبرؐیا امام معصوم موجود ہوں یا وہ خود قانون پر عمل درآمد کے نگراں ہوں یا انھوں نے کسی کو اپنی طرف سے منصوب کیا ہواور قانون پر عمل در آمد کا ذمہ دار بنا دیا ہو؛ جیسا کہ حضرت علی علیہ السلام نے جناب مالک اشتر کو مصر کا گورنر بنا دیا تھا کہ وہاں جاکر قوانین کا نفاذ کریں، لیکن امام علیہ السلام کی غیبت کے زمانہ میں چونکہ عوام الناس اپنے امام معصوم تک پہونچ نہیں سکتے ہیں لہذا قانون کے نفاذ کی ذمہ داری اس پر ہے جس کو امام معصوم نے ایک عمومی حکم کے تحت منصوب کیا ہو،اور یہ وہی ولایت فقیہ کی تھیوری ہے جس کے بارے میں ہم بعد میں گفتگو کریں گے ۔ (انشاءاللہ)

واضح ہوگیا کہ اسلام کی سیاسی تھیوری اور اسلام کے حکومتی ڈھانچے میں جس طرح قانون کی خدا کی طرف نسبت ضروری ہے (یعنی قانون یاتو خود قرآن مجید میں موجود ہو جو خدا کا کلام ہے یا احادیث پیغمبر میں بیان ہوا ہو کہ جس کا اعتبار بھی خدا کی طرف سے ہے یا امام معصوم کی طرف سے ہو جس کا اعتبار پیغمبر اکرمؐ کی طرف سے ہے، یا کسی ایسے شخص نے بیان کیا ہو کہ جس کو خدا یا رسول یا امام نے قانون بنانے کی اجازت دی ہے؛ یعنی اسی طرح قانون نافذ کرنے والا بھی خدا وند عالم کی طرف سے منسوب ہونا چاہئے چاہے یہ نسبت نبی و امام کی طرح خاص ہو یا حکم عام کے تحت خدا نے معین کیا ہو۔

اسی طرح عدلیہ کے لئے بھی خداوند عالم سے اتصال ہونا چاہئے یعنی قاضی کویا تو براہ راست خداوندعالم نے معین کیا ہو یا غیر مستقیم طور پر خدا کا معین کردہ ہو ،بہر صورت اگر قاضی کو کسی بھی طرح کی خداوندعالم سے نسبت نہ ہو تو اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے ۔

قرآن مجید میں حضرت داؤد علیہ السلام کا قاضی کی حیثیت سے براہ راست من جانب اللہ منسوب ہونا بیان ہوا ہے ارشاد ہوتا ہے:

(یا دَاوُدُ إنّا جَعَلْنَاکَ خَلِیفَۃً فِیْ الْأَرْضِ فَاحْکُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ[1]) ''اے داؤد! ہم نے تم کو زمین پر (اپنا) نائب قرار دیا پس تم لوگوں کے درمیان بالکل ٹھیک فیصلہ کیا کرو''

اور پیغمبر اکرم کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے: (۔۔۔ لِتَحْکُمَ بَیْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاکَ اللّٰہُ[2]) ''جس طرح خدا نے تمہاری ہدایت کی ہے اور(فَلَا وَرَبِّکَ لَایُؤْمِنُونَ حَتّیٰ یُحَکِّمُوکَ فِیمَا شَجَرَ بَیْنَہُمْ۔[3]) ''پس (اے رسول) تمہارے پروردگار کی قسم اس وقت تک یہ لوگ سچے مومن نہیں ہوں گے جب تک اپنے باہمی جھگڑوں میں تم کو اپنا حاکم (نہ) بنائیں''نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام کی سیاسی تھیوری میں حکومت، سیاست اور معاشرہ کا انتظام تمام پہلوؤں کے ساتھ خداوند عالم کے تشریعی فیصلے پر ہی ختم ہوتے ہیں۔

---

[1] سورہ ص آیت ۲۶۔
[2] سورہ نساء آیت ۱۰۵۔
[3] سورہ نساء آیت ۶۵۔

نویں تقریر

دینی نظام میں قوانین کی حیثیت

اسلامی سیاسی نظریہ کے اصول

اسلامی سیاسی نظریہ اور فلسفہ سے متعلق بحث کے وقت خیال رہے کہ اس نظریہ کے بھی کچھ اصول ہیں چنانچہ بعض افراد ان سب کو قبول کرتے ہیں اور کچھ صرف بعض کو قبول کرتے ہیں اور چند ایسے بھی ہیں جو ان میں سے کسی کو قبول نہیں کرتے، لیکن اس نظریہ کو ثابت اور بیان کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ان اصولوں کو بیان کر دیا جائے اور اس بات کے پیش نظر کہ ان میں سے کچھ کی بہت زیادہ تفصیلات بیان ہوئی ہیں ان کے بارے میں صرف ایک اشارہ اور مختصر توضیح پر اکتفا کیا جائے گا اور واضح بحثوں کے ذکر سے اجتناب کیا جائے گا جیسا کہ علمی تحقیقات میں تمام بحثوں کے چھیڑنے کا دستور نہیں ہے، صرف ان اصولی بحثوں پر زیادہ تر توجہ دی جائے گی جو بحث و تحقیق کے لئے زیادہ سزا وار ہے۔

الف۔ قانون

ہماری مفروضہ بحث اور بنیادی اصول میں جیسا کہ بیان ہوا، ہر معاشرہ، قانون کا محتاج ہے اور یہ بات بھی بیان کی جا چکی ہے کہ اسلام کے سیاسی نظریہ کی ایک اور بنیاد یہ ہے کہ قانون خدا کی طرف سے ہونا چاہئے اور جیسا کہا جا چکا ہے کہ اس کا نفاذ بھی خدا ہی کی اجازت سے ہونا چاہئے، الٰہی قانون سے مراد یہ ہے کہ یا تو خود خدا اس نے قانون کو وضع کیا ہو اور قرآن میں نازل کیا ہو یا اپنے پیغمبر اکرمؐ اور معصوم اماموںؑ کو اس نے قانون بنانے کی اجازت دی ہو، یا وہ لوگ قانون بنائیں کہ جنھیں بدلتے ہوئے حالات میں ضرورت کے اعتبار سے اصول و ضوابط وضع کرنے کی اجازت حاصل ہو، بنا بر این الٰہی قوانین کی تین قسمیں ہوئیں :

۱۔ وہ قانون جو خود خدا نے بنایا ہے اور پیغمبر یا امامؑ کا اس کے بنانے میں کوئی کردار نہیں ۔

۲۔وہ قانون جوکسی معصومؑ نے خدا کی عطا کردہ اجازت سے بنایا ہے ۔

۳۔وہ متغیر اصول وقوانین جوکچھ مخصوص افراد معصومؑ کی دی گئی اجازت سے بناتے ہیں۔

یہ قوانین اسلامی معاشرے کے لئے معتبر قرار دئے گئے ہیں ،اس لئے کہ آخر کا ر ان کی بازگشت خدا کے حکم اور اس کی اجازت پر موقوف ہے ،معلوم ہوا خداوند عالم نے براہ راست خود قانونوضع کئے ہیں اور خدا کے قوانین قرآن کی صورت میں نازل ہوئے ہیں لیکن نفاذ کے مرحلے میں قانون کا نافذ کرنے والا خود خدا نہیں ہے ،قانون کا نفاذ کرنے والا وہ ہونا چاہئے جو معاشرے میں خود موجود ہواور لوگ اس کواپنی آنکھوں سے دیکھتے ہوں، وہ لوگوں کو امر و نہی کرے اور قوانین کو ان کے درمیان نافذ کرے ،اور یہ کام پہلے مرحلے میں خدا کے پیغمبرؐ اور امام معصومؑ کا ہے اور دوسرے درجے میں ان افراد کا ہے کہ جن کو پیغمبرؐیاامام معصومؑ کی طرف سے نفاذِقانون کی اجازت ملی ہو ،اسی بناپر کچھ حضرات پیغمبراکرمؐ یاامام معصومؑ کے زمانے میں اسلامی سر زمیوں سے ملحق ہو ،ہیں صوبوں کے گورنر، حاکم اور کارندہ کے عنوان سے قوانین پر عمل درآمد کے لئے بھیجے جاتے رہے ہیں اور غیبت امامؑ کے زمانہ میں وہ فقہاء ہیں جو حکم عام کے تحت قوانین اسلام کے نفاذ کے ذمہ دار ہیں ۔

اب تک جوکچھ بیان ہو اوہ حکومت اسلامی کے اہم ترین پہلو ستون تھے کہ جس کو درحصول یعنی قانون بنانے اور قوانین کا نفاذ کرنے کے عنوان سے ذکر کیا گیا، اوراس کے ذیل میں ہم نے عرض کیا کہ عدلیہ بھی در حقیقت حکومت کا ہی ایک جزہے، اور اس کی ایک خاص اہمیتکے پیش نظر اس کے لئے الگ سے ایک مستقل باب قرار دیا گیا ہے ۔

طبیعی اور حکومتی قوانین کی حیثیت

یہ بات بیان کی جاچکی ہے کہ ہماری مفروضہ بحث ان بنیادی اصول اور مسلمات میں سے ایک ہے کہ معاشرہ کیلئے قانون کاوجود ضروری ہے،اور دوسری بنیادی بات یہ ہے کہ ہماری نظر میں وہی قانون معتبر ہے جس کا بنانے والا براہ راست یابالواسطہ

خدا ہو،اس نظریہ کے مقابلہ میں کچھ لوگ کہتے ہیں کہ معاشرہ کو کسی طرح کے قانون کی ضرورت نہیں ہے خواہ وہ قانون خدا نے بنائے ہوں، خواہ کسی دوسرے افراد نے، البتہ موجودہ دور میں اس نظریہ کے طرفدار موجود نہیں ہیں،

کیونکہ جن حالات میں ہم زندگی بسر کرہے ہیں قانون کی ضرورت کا احساس سب کو ہے اور کوئی بھی ایسا نہیں ہے جومعاشرہ کے لئے قانون کی ضرورت کا منکر ہو،آج کے دور میں حتی ایک چھوٹے سے دیہات کے رہنے والے بھی اس ضرورت کو محوس کرتے ہیں اور مانتے ہیں کہ ایسے قوانین اور دستورات ہونے چاہئیے کہ جن کی وہ پیروی کریں۔

لیکن گذشتہ زمانے میں جب کہ زندگی بہت آسان تھی کچھ لوگ اس بات کے قائل تھے کہ ہمیں سماجی قوانین بنانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے ،ان کی نگاہ میں فطری حقوق و فطری قوانین کے ہوتے ہوئے کہ جس کو عقلخود بخود درک کرتی ہے اس کے بعد اس بات کی ضرورت نہیں رہتی کہ کوئی قانون بنائے گویا قدیم زمانہ میں فطری حقوق اور فطری قوانین کانظریہ انسانی معاشرہ میں کار فرما تھا چنانچہ جب لوگ یہ سوال کرتے تھے کہ ہم کس قانون پر عمل کریں ؟

تو جواب میں کہتے تھے کہ خود اپنے اندر جھانک کر دیکھو یا اس دنیا پر نظر ڈالو تو تمہیں پتہ چل جائے گا کہ کون سا حکم اور قانون اس جہاں میں حکم فرما ہے وہی قانون تمہارے معاشرے میں بھی جاری ہو گا جیساکہ آپ نے ملاحظہ فرمایا حتی فطری قانون کے نظریہ کی بنیادپر بھی قانون کی ضرورت ایک مسلمہ بات ہے اور یقینی طور پر تاریخ کے طویل دور میں کسی ایسے مفکر کا وجود نہیں ملتا جس نے یہ دعوی کیا ہو کہ انسان کوکسی طرح کے قانون، یہاں تک کہ قانون فطرت کی بھی ضرورت نہیں ہے اور اس سلسلے میں فلسفیوں کے درمیان جو بھی بحث ہوتی رہی ہے وہ یہ ہے کہ کیا وہ ، فطری اور الٰہی قوانین یعنی وہی قوانین جن کو تمام انسان اپنی عقل سے درک کرتے ہیں، معاشرے کے لئے کافی ہیں یا مخصوص حکومتی قوانین بنانے کی ضرورت ہے؟

اور جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں گذشتہ زمانہ میں فطری یا عقلی قوانین یا مستقلات عقلیہ، اپنی مختلف تفسیروں اور تعبیروں کے ساتھ کہ جن کے بیان کرنے کا یہاں موقع نہیں ہے،اگر معاشرہ کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے کافی رہے ہوں ،تو بھی کسی شک وشبہ کے بغیر اس وقت ہمارے زمانے کے حالات کے پیش نظر،یہ فرض قابل قبول ،حتی ذکر کے لائق بھی نہیں ہے۔

آج ہر شخص اپنے گردو پیش کا جائزہ لینے کے بعد یہ سمجھ سکتا ہے کہ ہر روز ملکی و غیر ملکی اور بین الاقوامی تعلقات کے دائرے میں سیکڑوں معاشرتی اور بین الاقوامی قوانین کی ضرورت پیش آتی ہے ایک ملک کے ان ہی معاشرتی قوانین اور دستورات میں ٹریفک اور ٹرنسپورٹ سے متعلق قوانین بھی ہیں ۔

سچ بتایئے کہ اگر اس سلسلے میں کوئی قانون نہ ہو تو کسی بھی شہر اور علاقہ کے ٹرانسپورٹ اور ٹریفک کا حشر کیا ہوگا ؟اگر گاڑیوں کی رفتار ، اور ان کے چلنے کی سمت (دائیں سے چلیں یا بائیں سے)یا ٹریفک کے دوسرے تمام قوانین نہ ہوں تو کیا حادثات رونما ہوں گے؟ دنیا کے کس حصہ میں کوئی ایسا گروہ مل سکتا ہے جو ایک ساتھ ایک جگہ زندگی گزاررہا ہو ،اور ان قوانین کی پابندی کے بغیر زندگی کے خطرات اور حادثات سے محفوظ ہو ،یہ بات صحیح ہے کہ تمام ممالک میں ٹریفک کے قانون یکساں نہیں ہیں مثال کے طور پر کچھ ممالک جیسے انگلینڈ،ہندوستان اورجاپان وغیرہ میں سواریاں بائیں سمت سے چلتی ہیں اور کچھ ممالک (جن میں سے ایک ایران بھی ہے)سواریاں دائیں سمت چلتی ہیں، لیکن قانون بہر حال بنایا جاتا ہے ،اور ڈرائیوراپنی ذمہ داریوں سے آگاہ ہوتے ہیں وہ یہ جانتے ہیں کہ کس سمت سے چلنا چاہئے،مذکورہ مثال معاشرہ میں قانون کی ضرورت کا محض ایک نمونہ ہے،اور یہ ضرورت بلاشبہ دوسرے بہت سے مسائل منجملہ خاندانی اور بین الاقوامی حقوق کے دائرے میں بھی پڑتی ہے اور اس کا احساس ہوتا ہے۔

بین الاقوامی قانون بنانے کی ضرورت کا ایک اورنمونہ دریائے خزر سے متعلق مسائل ہیں اور اس وقت اس کے ساحل پر واقع ممالک کے درمیان اس کے ذخائر سے فائدہ اٹھانے کے سلسلہ میں اختلاف نظر پایا جاتا ہے،ظاہر ہے یہ قبول نہیں کیا جا سکتا کہ ہر

ایک جس طرح بھی چاہے اپنی مرضی کے مطابق اس سمندر کی تہوں میں موجود تیل اوردوسرے سمندری ذخائر سے فائدہ اٹھائے اور تیل،گیس اور دوسری چیزوں کے نکالنے کے لئے کوئی قانون اور ضابطہ نہ ہو بلکہ ایسے قوانین بنائے جانے کی ضرورت ہے جو یہ معین کردے کہ فلاں ملک کس حد تک سمندر کی فضا، زمینی ذخائر اور دوسرے وسیلوں سے فائدہ اٹھا سکتا ہے،کوئی معین و مشخص قانون نہ ہونے کے سبب جو مشکلات اس وقت پڑوسی ممالک کے سامنے کھڑی ہیں اس نے تمام لوگوں میں دریائے خزر کے ذخائر کی عادلانہ تقسیم کے لئے قوانین اور دستورات کی ضرورت کا احساس پیدا کر دیا ہے لہٰذابشر کی ضرورت کے پرتو میں قوانین و دستورات کی ضرورت کا احساس موجود ہے،چنانچہ مختلف کنونشن،معاہدے اور سمندروں،فضاؤں اور ارتفاعات سے متعلق قوانین وغیرہ چند صدی قبل موجود نہیں تھے،کیونکہ بشر کو ان کی ضرورت ہی نہیں تھی، پھر افراد،گروہوں،قوموں اور ملکوں کے درمیان ٹکراؤ اور اختلاف کی وجہ سے اس طرح کے قوانین کی ضرورت محسوس ہوئی۔

اس بات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کہ قانون ہر شخص اورہر معاشرہ کے حقوق کے دائرے معین کرتا ہے،قرآن مجید نے اس اصول کی طرف کہ معاشرتی زندگی قانون کی محتاج ہوتی ہے خاص توجہ دی ہے، البتہ بات قابل ذکر ہے کہ قانون اپنے عام معنی میں سماجی زندگی سے مخصوص نہیں ہے بلکہ اگر ایک اکیلا شخص بھی انسانی زندگی گذارنا چاہتا ہے تو وہ منزل کمال تک پہونچنے کے لئے قانون کا محتاج ہے، البتہ انفرادی زندگی کے لئے اخلاقی قوانین ،کافی ہوتے ہیں لیکن جس وقت اجتماعی مسائل میں لوگوں کے حقوق میں ٹکراؤکے نتیجہ میں اختلافات پیدا ہوتے ہیں اور کبھی کبھی دیکھنے میں آتاہے کہ اگر کسی نے اپنے حق سے زیادہ نہر کا پانی استعمال کر لیاتوآپس میں لڑائی جھگڑے ہوجاتے ہیں توایسی صورت میں سماجی قوانین کی ضرورت بالکل واضح ہوجاتی ہے۔

لہٰذا،یہ بات مسلمات میں سے ہے کہ معاشرہ قانون کا محتاج ہے،اور عقل رکھنے والا ہر انسان جانتاہے کہ قانون کے بغیر اجتماعی زندگی،انسان کا آرام وسکون اوراس سے بڑھ کر معنوی سعادت خطرے میں پڑجاتی ہے اور جو مثالیں ہم نے عرض کی ہیں ان سے یہ

بات واضح ہوجاتی ہے کہ قوانین فطرت اس طرح کے مقامات کے لئے کافی نہیں ہیں،اور ہم حکومتی قوانین کے محتاج ہیں اس لئے کہ عقل ،عدل وانصاف کے پاس ولحاظ کا حکم دیتی ہے،

لیکن ایسی حکمت عملی جو عدل وانصاف قائم کر سکے ہم ایک اور قانون کے محتاج ہیں مثال کے طور پر عقل یہ کہتی ہے کہدریائے خزر کے ذخائر اس کے پڑوسی ممالک کے درمیان عادلانہ طور پر تقسیم ہونا چاہئے ،اس وقت یہ مسئلہ پیش آتا ہے کہ وہ عادلانہ تقسیم کیسے ہو؟کیا عادلانہ تقسیم کا مطلب یہ ہے کہ جس ملک کا رقبہ زیادہ ہو وہ زیادہ ذخائر سے فائدہ اٹھائے یا جس ملک کے پاس ساحلی علاقہ زیادہ ہو یا جس کے ساحل نشینوں کی تعدادزیادہ ہو وہ دریائےخزر سے زیادہ فائدہ اٹھائے.قانون سازی کرنے والوں کا فریضہ ہے کہ اس طرح کے سوالات کا جواب دیں ،اسکے علاوہ اوردوسرے تمام مقامات کے لئے بھی قانون بنانے والا کا ہونا ضروری ہے، اب دیکھنایہ ہے کہ قانون سازی کون کرے؟

ب ـ قوانین کے لئے الٰہی اورمذہبی سرچشمہ

ضروری ہےاسلام کا دعویٰ ہے کہ کچھ قوانین خدانے بنائے اور پیغمبر اکرمؐ کے ذریعہ لوگوں تک پہونچائے گئے ہیں لہٰذا پہلی بنیادی بات قبول کرنے کے بعد کہ قانون کی بہر حال ضرورت ہے دوسری بنیادی بات یہ ماننے کی ہے کہ دین قانون سازی کا اصل سرچشمہ ہے،اس مرحلہ میں حتی کہ اسلامی ملک میں ایسے لوگوں کا ہونا ممکن ہے جو دین اسلام کو نہ مانتے ہوں اسی طرح ایک غیر اسلامی ملک میں ایک ایسے شخص کا ہونا بھی ممکن ہے جو مذہب اسلام کو قبول کرتا ہو ،اگر کوئی یہ کہے کہ مجھے خدا کے وجود میں شک ہے۔

لہٰذامیں دین اور اس کے قوانین کوبھی قبول نہیں کرتا تو پہلے مرحلہ میں آپ اس کے لئے یہ نہیں ثابت کر سکتے کہ قانون بنانے کا حق صرف خداکو حاصل ہے ؛بنیادی طور پر جو شخص خدا کو نہیں مانتا اس کے لئے قانون کا الٰہی ہونا بھی کوئی معنی نہیں رکھتا، پہلے فلسفی اور کلامی بحثوں سے خدا کے وجود کو ثابت کرنا ہوگا، پھر علم کلام کی روشنی میں یہ بات ثابت کرنی ہوگی کہ پیغمبرؐاور دین کا بھی

وجود ہے .اور پھر ان ابتدائی مراحل کے بعد،دوسرے مراحل منجملہ یہ بات بیان کی جائے گی کہ وہی قانون معتبر ہے جو خدا نے خود بنایا ہو یا خدا کے کسی نمائندہ کے ذریعہ بنا ہو،

اس سے پہلے ہم نے اس بات کی طرف اشارہ کیا تھا کہ ممکن ہے کوئی خدا، دین اور نبوت کو قبول کرتا ہو لیکن وہ اس بات کا معتقد نہ ہو کہ سماجی قوانین بھی خدا کو بنانا چاہئے،اس کی نظر میں ممکن ہے انسان کا خدا کی حمدوثنا، عبادت اور اس سے رازنیاز کرنا اور مسجدوں اور عبادت گاہوں میں آمد ورفت رکھنا کافی ہو، لیکن اس کا خیال ہو کہ انسان کی سماجی زندگی خدا سے تعلق نہیں رکھتی کہ وہ اس کے لئے قانون بنائے اوراس سے قبل کی بحثوں میں ہم نے عرض کیا تھا کہ اس طرح کا نظریہ اسلام کی نظر میں صحیح نہیں ہے دین اسلام اس بات کو تسلیم نہیں کرتا کہ کوئی کہے ہم اصل دین یعنی قرآن، احادیث پیغمبر اسلامؐ، متواتر روایات اور پیغمبرؐ اسلام اور ائمہ علیہم السلام کی سیرت کو تو تسلیم کرتے ہیں لیکن ایک مسلمان ہونے کے باوجود اسلام کے سماجی قوانین سے ہمارا کوئی سروکار نہیں ہے ؟ دین کے مسلمات کو ماننا لازم ہے عقائد ونظریات کے ہر مجموعہ میں کچھ ناقابل تغییر ، مسلمہ اجزاء ہوتے ہیں جن کو اصطلاح میں ''ضروریات''یا ''مسلمات'' کہا جاتا ہے اور جو شخص بھی اس مجموعہ سے واقف ہے چاہے اس کو مانے یا نہ مانے، یہ جانتا ہے کہ وہ مجموعہ ان ارکان پر مشتمل ہے دوسرے لفظوں میں ممکن ہے ہر مجموعہ کے ارکان کی تعداد میں سیکڑوں کا اضافہ یا کمی ہوتی رہے، لیکن اس کے کچھ ارکان کا معیاری ہونا ضروری ہے تاکہ وہ دوسرے مجموعوں سے الگ ہو سکے،

اس بنا پر اگر کسی نے دین کو ایک مجموعہ کی حیثیت سے قبول کیا ہے تو اسے یہ قبول کرنا ہوگا،کہ یہ مجموعہ کچھ ایسے مستقل، دائمی اور مسلمہ ارکان کا حامل ہے جو اس کو دوسرے تمام مجموعوں سے الگ کرتے ہیں،اور ان کا ماننا ضروری ہے، لیکن افسوس کی بات ہے !کچھ افراد اسلام کو قبول کرتے ہیں لیکن یہ نہیں تسلیم کرتے کہ اسلام کچھ ناقابل تغییر مسلمہ اصول رکھتاہے ان کی نظر میں تمام اشیاء کی مختلف تفسیریں اور مختلف تعبیریں کی جا سکتی ہیں،

وہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم اسلام کے مخالف نہیں ہیں لیکن اسلام قبول کرنے کا لازمہ نہیں ہے کہ سب کے لئے نماز پڑھنا ضروری ہے ان کا عقیدہ ہے کہ نماز پرھی جاتی رہی ہے اور بعض افراد پڑھنے کے عادی ہیں لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ جو شخص مسلمان ہے وہ ضرور نماز پڑھے اور نماز کو اسلام کا اٹوٹ حصہ سمجھے! روزہ کے سلسلے میں اور اسی طرح دوسرے تمام اجتماعی احکام کے بارے میں معتقد ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ، ائمہ معصومین علیہم السلام اور تمام مسلمان اس پر عمل کرتے رہے ہیں لیکن یہ تسلیم نہیں کرتے کہ اسلام کا دار ومدار ان پر ہے،

اگر یہ نہ ہوں تو اسلام باقی نہیں رہے گا ،یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے پھر اسلام کی وہ کون سی بنیادیں ہیں کہ وہ اگر نہ ہوں تو اسلام باقی نہیں رہے گا ؟کیا آپ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اسلام میں توحید ایک اصل ہے اگر کوئی اس کو قبول نہ کرے تو مسلمان نہیں ہے ؟ جواب میں کہتے ہیں کہ ہم نے جو کچھ اسلام سے سمجھا ہے وہ مفہوم درست اور صحیح ہے لیکن ممکن ہے دوسرا شخص اسلام سے ایک دوسرا مفہوم سمجھتا ہو ،لہٰذا ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اسلام سے جو کچھ ہم نے سمجھا ہے صرف وہی صحیح ہے ممکن ہے ایک دوسرا شخص اسلام سے یہ سمجھے کہ خدا دو ہیں یا ہزاروں ہیں یا یہ کہ دین اسلام میں خدا کا وجود ہی نہیں ہے،

اور ہم ایسی کوئی دلیل پیش نہیں کر سکتے جو یہ ثابت کرے کہ ہم جو اسلام سے سمجھے ہیں وہ زیادہ صحیح ہے !اگر ہم یہ دعویٰ کریں کہ ہم نے جو کچھ سمجھا ہے وہ بالکل صحیح ہے یہ نہیں کہہ سکتے کہ اسلام کے بارے میں کسی کو دوسری تفسیر کرنے کا حق نہیں ہے، زیادہ سے زیادہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ خود ہماری نظر میں جو کچھ ہم نے سمجھا ہے بہتر ہے چنانچہ یہی بات دوسرں کے بارے میں بھی صحیح ہے۔

بے شک اس طرح کے افراد صرف دھوکے اور چال بازی سے کام لینا چاہتے ہیں ورنہ کسی علم اورشناخت کی دنیا میں کسی ایسے دو مجموعہ پرکہ جن کے اعضا مشترک ہوں ان کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا لیکن دو مجموعوں کو ایک دوسرے سے اس وقت جدا کیا جاسکتا ہے جب ان دونوں کے تمام ارکان مختلف ہوں یا کم سے کم ان میں کچھ کے درمیان فرق ہو ورنہ دونوں

مجموعوں میں سے کوئی بھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکے گا ، کسی بھی دو قسم کے مجموعہ میں کوئی فرق ہونا چاہئے جو ایک مجموعہ کو دوسرے سے جدا کر سکے،اگر کسی مجموعہ کے تمام ارکان دوسرے مجموعہ کے ارکان کی جگہ قرار دئے جا سکتے ہوں، مثلاایک مجموعہ میں ''الف'' دوسرے مجموعہ کے ''الف'' کی جگہ اور اسی طرح اس مجموعہ کا ''ب''دوسرے مجموعہ کے ''ب'' کی جگہ اور ''ج''، ''ج'' کی جگہ قرار دیا جائے تو ان کوایک دوسرے سے الگ اور مستقل سمجھنا درست نہ ہوگا ۔

اگر ایک مجموعہ ''دین اسلام'' کے عنوان سے پہچانا جاتا ہے تو اس میں دوسرے دین کے مقابلہ میں کوئی مخصوص امتیاز اور پہچان ہونا چاہئے تاکہ اس سے اس کو پہچانا جائے ،یعنی اس میں ایسے مسلمہ اور ناقابل تغیر اصول ہونے چاہئیں جن پر اسلام استوار ہو،اب اگر ہم اسلام کے لئے توحید،نبوت، معاد کے مانند اصول یا نماز وعبادت جیسے بنیادی ارکان کے معتقد ہوں اور اس کے ساتھ ہی ان سب کو قابل تبدیل سمجھیں اور ان کی مختلف تفسیریں کرنا قبول کرلیں تو ہم کسی بھی مسلمہ رکن کا اثبات اور یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ یہ اصول اسلام کے بنیادی اصولوں میں سے ایک ہے۔

اس بنیاد پر ہم کویہ کہنا ہوگا کہ اسلام کے نام سے کوئی معین مجموعہ وجود نہیں رکھتا!،توایسی شکل میں ہم کس چیز کا دفاع کریں گے؟بھلا کیسے ممکن ہوگا کہ ہم لوگوں کو اسلام کی طرف تو دعوت دیں، مگر ہم ان کو مسلمان ہونے کا کوئی طریقہ نہ بتائیں،ان سے کہہ دیں کہ اسلام کوجس انداز سے اور جس طرح آپ سمجھتے ہیں ویسے ہی اس پر عمل کریں اوراسلام سے اپنی فہم وعقل کے مطابق استفادہ کریں!چنانچہ اگرآپ اس نتیجہ پر پہونچے کہ نماز پڑھنا ضروری ہے، تو نماز پڑھیں ،اور اگرآپ اس نتیجہ تک پہونچے کہ نماز پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے توآپ نماز نہ پڑھیں،آپ آزاد ہیں،آپ اپنی سمجھ کے مطابق عمل کریں!،

اسلام کے بارے میں اس طرح کا تصور کرنے سے ہمارے اور عیسائیت یا دوسرے کسی بھی مذہب کے درمیان کیا فرق رہ جاتا ہے؟کیوں لوگوں کو اسلام کی طرف دعوت دیں!اگر یہ طے پا جائے کہ ہر شخص اپنی سمجھ کے مطابق اسلام پر عمل کرے اوراس کا کوئی

اصول،اور مسلمہ رکن وجود نہ رکھتا ہو توگویا ہم صرف لفظی طور پر لوگوں کو اسلام کی طرف دعوت دے رہے ہیں،اس طرزفکر کی بنا پر اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ہم لوگوں کو اسلام کی طرف دعوت دے رہے ہیںیا عیسائیت کی طرف یا سرے سے بے دینی کی طرف

اسلام اور مسلمہ اصول کی معرفت

کسی شخص کا یہ کہنا سراسر دھوکا اور نفاق ہے کہ میں اسلام کو قبول کرتا ہوں لیکن اسلام کے بارے میں کوئی مسلمہ مفہوم اور معنی کا تصور و یقین نہیں کرتا ،اس کے تمام اصول تغیرپذیر ہیں اور اس کی مختلف تفسیریں کی جا سکتی ہیں،ایسی صورت میں اسلام کے متعلق وہی تصور قائم کیا جا سکتا ہے جو عیسائیت کے متعلق ہے اور ان دونوں میں کوئی فرق باقی نہیں رہے گا اس طرح ایک مسلمان اور عیسائی میں کوئی فرق قائم نہیں رہ جائے گا پس ہم یہ نہیں کہہ سکیں گے کہ فلاں شخص مسلمان ہے یا نہیں ہے !ہر عمارت کے اندر ستون، دیوار اور چھت وغیرہ کے مانند کچھ بنیادی اجزاء ہوتے ہیں اورویرانی کے بعد بھی ان سے ان کی شناخت ہوتی ہے یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ ایک عمارت میں بنیادی اجزاء نہیں پائے جاتے ۔

اگرایک عمارت کی دیوار اور چھت اور اسس کے ستون ہیں تب بھی بلڈنگ ہے اور اگر یہ چیزیں نہیں ہیں تب بھی بلڈنگ ہے ،آپ یہ نہیں کہہ سکتے اسی طرح اگر زمین ہویادریا میں ہے تب بھی بلڈنگ ہے اس کے لئے کسی بھی طرح کے مخصوص اور مستحکم وثابت اجزاء کی ضرورت نہیں ہے،اسی طرح اسلام بھی کچھ مسلم و معین عناصر سے وجود میں آیا ہے اگر یہ بنیادی اور اساسی اصول نہیں پائے جاتے تو ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ مجموعہ اسلام ہےاور وہ مجموعہ اسلام نہیں ہے۔

بنا بر این اگر کوئی اسلام کو قبول کرے تو اسے کچھ بنیادی عناصر بھی اِس مجموعہ کے مسلمہ اجزاء کے عنوان سے قبول کرنا پڑیں گے البتہ ممکن ہے کہ ایک مجموعہ کے کچھ محتمل اور مشکوک ارکان بھی ہوں یاایک ایسا کھلاہوا ''مجموعہ'' ہوکہ جس کے کچھ اجزاء میں اضافہ

اور کمی ہو سکتی ہو، لیکن اس کا کوئی مطلب نہیں ہے کہ ایک مجموعہ میں مستقل اور مسلم اجزاء نہ پائے جاتے ہوں پھر بھی وہ ایک معین و مشخص مجموعہ کے عنوان سے باقی رہے ۔

اسلام کے بنیادی اور اصولی عناصر دوست و دشمن سب کو معلوم ہیں توحید، نبوت اور معاد کے علاوہ بھی اسلام میں کئی دوسرے اساسی امور ہیں جن کا سب کو علم ہے حتی منکرین خدا بھی ان سے واقف ہیں، نمونہ کے طور پر، نماز اور حج کو اسلام کے بنیادی عناصر میں سمجھا جاتا ہے اور دنیا کے تمام افراد یہ جانتے ہیں کہ مسلمان مخصوص دنوں میں حج کرتے ہیں، ایسی صورت میں کیا کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ اسلام جو میں نے سمجھا ہے اس میں حج نہیں ہے، سبھی جانتے ہیں کہ اسلام میں نماز واجب ہے اب اگر کوئی یہ کہے کہ میں اسلام کو قبول کرتا ہوں لیکن اسلام سے جو میں سمجھا ہوں اس کی بنیاد پر نماز، اسلام کا حصہ نہیں ہے تو ایسا شخص یا تو اسلام کو سمجھا نہیں ہے، یا جھوٹ موٹ ہی اپنے کو مسلمان کہتا ہے در اصل منافق اور دھوکہ باز ہے، اور ایسا وہ اس لئے کرتا ہے کہ اپنے کو مسلمان بتا کر مسلمان ہونے کی سہولیات سے خود کو محروم نہ کرے، اور اسے اسلامی معاشرہ سے نکالا نہ جائے، ورنہ نماز، روزہ اور حج اس مجموعہ کے مسلمہ ارکان اور ''ضروریات دین'' میں سے ہیں، اور تمام مسلمان ان امور کو دین کا حصہ مانتے ہیں ۔

اگر کوئی اسلام سے واقف ہو تو کیا وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ اسلام میں چوری سے روکنے کے لئے سزا کا قانون نہیں ہے جب کہ قرآن کے الفاظ (اَلسَّارِقُ وَالسَّارِقَۃُ[1]) اس آیت میں اس مسئلہ کی صراحت موجود ہے، اسی طرح وہ تمام دوسرے امور کہ جن کے بارے میں قرآن کے اندر صریحی نص موجود ہے ۔

لہٰذا اسلام کے ضروری احکام ثابت شدہ ہیں اور اب ہمارے لئے یہ ضروری نہیں کہ ہم پھر سے بیٹھیں اور ایک ایک کر کے ان کو ثابت کریں، اس بنا پر اگر یہ ثابت ہو گیا کہ اسلام جس کی بنیاد قرآن پر ہے خدا کی جانب سے آیا ہے اور حق ہے تو یہ قبول کرنا ہو گا کہ جو کچھ بھی قرآن میں ہے وہ حق ہے اور قرآن میں

---

[1] سورہ مائدہ آیت ۳۸۔

مسلم و قطعی، ضروری امور کا ایک سلسلہ موجود ہے ، البتہ کچھ آیتوں کی مختلف تفسیریں ہونا ممکن ہیں ،لیکن صرف ایک آیت کی دو مختلف تفسیروں کے وجود سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ قرآن سے کسی مسلمہ اور قطعی بات کا استنباط نہیں ہوتا ہر شخص اپنی سمجھ کے مطابق اس سے نتیجہ نکالنے میں مختار ہے۔

اگر کوئی شخص عربی زبان سے واقف ہے اور قرآن کا مطالعہ کرے تو اس کے مطالب کا ایک ایسا سلسلہ ہے جس کو وہ سمجھ سکتا ہے ان کا انسان کے مختلف ادراکات سے کوئی ربط نہیں ہے،اور نہ ہی وہ گذشتہ افکار وتصورات یا علوم کی بنیاد پر سمجھے گئے قوانین سے تعلق رکھتے ہیں مثلاًقرآن کی ایک آیت جس میں نماز کا حکم ہے یا ایک آیت جس میں چور کے ہاتھ کاٹنے کا حکم ہے وہ شخص بھی جوایک ایسے زمانے میں زندگی بسر کر رہا تھا کہ جب لوگ چار عناصر اور سات آسمانوں کے معتقد تھے وہی بات سمجھ رہا تھاجو آج'' انشٹائین'' کی نسبیت کی تھیوری سامنے آجانے کے بعد کا انسان سمجھ رہاہے اوراستنباط کر رہا ہے اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آج چونکہ'' انشٹائین'' کی نسبیت کی تھیوری آگئی ہے لہٰذاآیت کے معنی بدل گئے ہیں،ممکن ہے قرآن میں ایسی آیت ہوکہ جس کے الفاظ لغات میں تبدیلی اور دوسرے علمی مسائل کے تحت بیان ہوں، لیکن کچھ ایسے مطالب بھی ہیں جن کا سمجھنا مختلف علوم سے مربوط نہیں ہےاور ظاہر ہےان میں تبدیلی کا شبہ بھی نہیں پایا جاتا۔

قرآن کریم کے مسلمہ اور قطعی احکام ومعارف

ہم نے یہ عرض کیاکہ اسلام میں ضروری احکام کا ایک سلسلہ موجود ہے جو مسلمات میں سے ہے خواہ کوئی مسلمان جانتا ہو یانہ، جانتا ہو کہ یہ اسلام کے ضروری مسائل ہیں،اسی طرح کچھ قطعی مفاہیم قرآن سے استنباط ہوتے ہیں چاہے کوئی قرآن کو قبول کرے یانہ کرے، وہ قرآن کے ان مطالب کو درک کرتاہے اور ان مطالب کا سمجھنا صرف عربی سے واقفیت پر موقوف ہے،

اس کے لئے اس شخص کے مسلمان ہونے کی شرط نہیں ہے،البتہ یہاں ہماری گفتگوان چیزوں کے بارے میں ہے جو کسی بھی صورت میں قابل تغییر نہیں ہیں نظریات اور فہم و ادراک کے اختلاف کے باوجود اس کے معنی اور مفہوم اپنی جگہ پر مسلم اور قطعی اورنا قابل انکار ہیں مثلاًجملہ (أقیموُا الصلاۃ...) نماز واجب ہونے کے معنی میں ہے اور جملۂ(کُتِبَ علَیکُمُ الصِّیاَمُ[1]...) روزہ واجب ہونے کے معنی میں ہے ،چاہے جیسی بھی علمی تھیوریاں آجائیں اور ان میں تجدید نظر ہوتی رہے ان جملوں کے فہم و ادراک میں تبدیلی نہیں آئےگی قرآن کے یہ احکام اپنی جگہ پر مسلّم ہیں، جس وقت ہم دین کی ضروری مسائل کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں ان کو یقینی، مسلم اور ناقابل تبدیل سمجھتے ہیں کیونکہ ان کو اسلام کے اصلی اور قطعی منابع یعنی قرآن اور تواتر کے ساتھ بیان شدہ اُن احادیث سے حاصل کیاگیا ہے جو دلالت کے لحاظ سے بالکل واضح ہیں اور جو لوگ ضروریات دین کے منکر ہیں اوراس طرح کی باتیں کرتے ہیں کہ اسلام سے کوئی مسلّم اور یقینی آخری بات نہیں کہی جاسکتی،توایسی صورت ہییا تووہ مسئلہ کے سمجھنے میں شبہ کے شکار ہوئے ہیں اور جاہل ہیں یا دشمنی و خود غرضی میں مبتلا ہیں اوراسلام پر ایمان نہیں رکھتے،بلکہ مسلمانوں سے کھیل رہے ہیں ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام کی سیاسی حکمت عملی میں مسلمہ اصول اور ضروریات دین میں سے ایک یہ بھی ہے کہ قانون خدا کی طرف سے ہے اور جو لوگ قانون الٰہی کے منکر ہیں در اصل وہ ضروریات دین کے منکرہیں جس طریقہ سے قرآن کریم سے نمازکا واجب ہونا سمجھا جاتاہے،زناکار مرد اورزناکار عورت کا حکم بھی سمجھا جاتاہے اور جتنی صراحت کے ساتھ قرآن میں نمازو روزہ کا حکم ثابت و مسلم ہے اتنی ہی صراحت کے ساتھ پیغمبرؐکی اطاعت بھی واجب کی گئی ہے اور شریعت اسلام میں پیغمبرکی حیثیت ''مفترض الطاعۃ''یعنی ''واجب الاطاعت ''کے عنوان سے بیان ہوئی ہے ۔

---

[1] سوره بقره آیت ۴۳.

خداوند عالم اس بارے میں فرماتا ہے: (یَاأَیُّھَا الَّذِیْنَ ءامَنُوٓا أَطِیْعُوْا اللّٰہَ وَأَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَأُوْلِی الْأَمْرِ مِنْکُمْ.[1]) ''اے صاحبان ایمان! خدا کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی اور جو تم میں سے اولی الامر ہوں ان کی اطاعت کرو ''

اسی طرح ارشاد ہوتا ہے: (وَمَا آتَاکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَہَاکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا[2])

''اور جو کچھ تمہیں رسولؐ دیں اسے لے لیا کرو اور جس سے منع کریں اس سے باز رہو''، مطلب یہ ہے کہ جو کچھ رسول خدا تمہارے لئے لائے ہیں اسے لیلو اور بروئے کار لاؤ اور جس کام سے روکیں اس کے قریب نہ جاؤ یہ نہیں ہو سکتا کہ اسلام کو مانیں لیکن قرآنی آیات کے مطالب کہ جن میں اسلام کے ضروری احکام بیان ہوئے ہیں نہ مانیں اور اگر ایسا کیا گیا تو ہم انسانوں کا ان ہی لوگوں میں شمار ہوگا کہ جن کے قول کی خداوند عالم یوں حکایت کر رہا ہے: (وَیَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَکْفُرُ بِبَعْضٍ[3]) ''اور (خداؤ رسول کے منکرین) کہتے ہیں کہ ہم بعض پر ایمان لائے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں''اور اس کے بعد خدا ان لوگوں کے بارے میں یہ بھی فرماتا ہے: (أُوْلٰٓءِکَ ھُمُ الْکَافِرُوْنَ حَقًّا[4].) ''یہی لوگ حقیقتاً کافر ہیں''

لہٰذا جو شخص اسلام کا معتقد ہے اس کو اس کے تمام قوانین اور احکام کے مجموعہ کو پورے طور سے ماننا پڑے گا ،اور اسے یہ عقیدہ رکھنا ہوگا کہ اسلام کے ضروری احکام علمی تبدیلیوں کے تابع نہیں ہیں علمی نظریات کی تبدیلی یا نئی علمی تھیوریوں کے انکشافات کی وجہ سے ان میں تبدیلی رونما ہو سکتی ایسی صورت میں جو شخص نماز سے مربوط آیت کو حق سمجھتا ہے، چوری سے متعلق آیت کو بھی حق جانتا ہے اور اگر چہ اسے قرآن میں متشابہ اور محتمل آیات، اسلام کے متغیر قانون کی حیثیت سے ملتی ہیں، لیکن وہ یقین رکھتا ہے کہ قرآن اور اسلام میں کچھ مسلم اور یقینی اصول ضروری ہیں تاکہ ان کے ذریعہ اسلام کو دوسرے تمام مجموعوں سے الگ کیا جا سکے۔

---

[1] سورہ نساء آیت ٥٩۔
[2] سورہ حشر آیت ٧۔
[3] سورہ نساء آیت ١٥٠۔
[4] سورہ نساء آیت ١٥١۔

اسلام کی مختلف و متضاد تفسیریں ممکن ہیں(ایک شبہ اور اس کا ازالہ)اب یہ بات واضح ہے کہ کچھ آیات سے اگر مختلف مطالب نکالے جاتے ہیں اوران کی مختلف تفسیریں کی جاتی ہیں اور اسلام کے کچھ احکام میں اختلاف نظرپایا جاتاہے تواس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسلام کے سارے قوانین مشتبہ اور اختلافی ہیں،

اسلام میں ایسے ہزاروں قطعی احکام موجود ہیں جن کے بارے میں تمام اسلامی فرقوں میں اتفاق نظرپایا جاتاہے اور بہت سے اختلافات جو شیعہ اور سنی حضرات کے درمیان پائے جاتے ہیں،وہ مسائل کی جزئیات کے بارے میں ہیں اوروہ اسلامی احکام کا محض ایک چھوٹا سا حصہ ہیں، فقہ کے ایک بڑے حصہ میں فریقین کے یہاں اختلاف نظر نہیں پایاجاتا اسی طرح سے شیعہ فرقے میں فقہاء کے فتوؤں میں اختلاف کاہونا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ تمام احکام میں اختلاف پایا جاتاہے،جس طرح ایک ہی بیمار کے بارے میں دو ڈاکٹروں کی تجویز اور دونوں کے نسخوں کا الگ الگ ہونا اورفائدہ بھی ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ علمِ طب اور ڈاکٹری میں کوئی پائیدار اور مشخص ومعین اصول اور ضابطہ نہیں پائے جاتے ہیں ۔

معلوم ہوا کہ اسلام میں کچھ مسلمات اور ضروری ویقینی احکام موجود ہیں جن کے بارے میں کسی طرح کا اختلاف اورشک وشبہ نہیں پایاجاتا ،اور بعض امور میں اختلاف نظرکے سبب ہمیں یہ نہیں تصور کر لینا چاہئے کہ اسلام میں مسلّم احکام نہیں پائے جاتےاور اس بہانہ سے ہم اسلام کو کنارے لگادیں ،اس کے باوجود آج جب اسلام کے بارے میں گفتگو ہوتی ہے تو قلبی مریض اور قرآن کے ارشادکے مطابق: (اَلَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِهِمۡ زَیۡغٌ)[1] ''جن لوگوں کے دل میں کجی ہے''

کہتے ہیں کہ کونسا اسلام ؟وہ اسلام جو شیعہ پیش کرتے ہیں یا وہ اسلام جس کو سنی بیان کرتے ہیں؟ وہ اسلام جو فقہاء بتاتے ہیں یا وہ اسلام جو دانشور حضرات بتاتے ہیں ؟اس کے باوجود کہ ہم اعتقادات، اخلاقیات ،انفرادی احکام ،اجتماعی ا حکام،تجارت کے قوانین اور

[1] سورہ آل عمران آیت ٧۔

بین الاقوامی قوانین کے دائروں میں بہت سے مسلمہ حقائق اور ہزاروں متفق علیہ قوانین رکھتے ہیں،آخر یہ لوگ کیوں بجائے اس کے کہ ان مسلمات پر توجہ دیں اختلافات اور افتراقات کے پیچھے لگے ہوئے ہیں ؟

اور جب یہ کہا جاتاہے ہماری یونیورسٹیوں کو اسلامی ہونا چاہئے توکیوں یہی بیمار اور کج فکر لوگ پوچھتے ہیں کہ کون سا اسلام ؟!اس کا جواب یہ ہے کہ وہی اسلام جو یہ کہتاہے کہ خدا ایک ہے ، وہی اسلام جو یہ کہتا ہے کہ نماز واجب ہے ، وہی اسلام جو یہ کہتا ہے کہ دوسروں کے حقوق کو پامال نہیں کرنا چاہئے ،اور معاشرے میں عدل وانصاف قائم کرنا چاہئےکیا ان چیزوں میں اختلاف پایا جاتا ہے ؟

آپ ان ہی مسلمات کو جن کے بارے میں فریقین میں کوئی اختلاف نہیں ہے یونیورسٹیوں میں رائج کیجئے لوگ پوری طرح راضی ہو جائیں گے،ظاہر سی بات ہے جب وہ لوگ نہیں چاہتے کہ اسلام کے مطابق عمل کریں تو بہانہ لاتے ہیں کہ کس نے کہا ہے فقہاء کا اسلام نافذکیا جاجانا چاہئے،روشن فکروں کا اسلام نافذ نہ ہو ؟

کیا اسلام انسان کی تمام ضرورتوں کو پورا کر سکتاہے؟ !اس بات کے ثابت ہوجانے کے بعد کہ اسلام میں اجتماعی قوانین و احکام موجود ہیں کچھ سوالات اور شکوک سر ابھارتے ہیں جن میں سے ایک سوال یہ بھی ہے کہ کیا یہ بات عقلاً ممکن ہے کہ انسان کی تمام ضروریات مختلف زمانوں کے لئے ایک مجموعہ میں بیان کردی گئی ہیں؟دوسری بات یہ کہ کیا وہ اسلام جس کا منبع قرآن اور معتبر روایات ہیں وہ تمام چیزیں کہ جن کی انسان کو مختلف زمانوں اور صدیوں میں ضرورت ہے اپنے اندر سمو سکتاہے،مذکورہ سوال کے ثبوت اور اثبات کے عنوان سے دو حصے ہیں اور دونوں جہتیں یعنی ثبوتی اور اثباتی قابلِ بحث و تحقیق ہیں ،البتہ خیال رہے کہ سوال قابلِ غور ہے ،اور پہلی نظر میں معقول نظر آتا ہے اوراس کا جواب بھی آسان نہیں ہے، لیکن ان توضیحات کے مدنظر جو اس سے قبل ہم نے دی ہے اس کا جواب دینا زیادہ دشوار نہیں ہے۔

الف :سوال کا ثبوتی پہلوسے جائزہ ثبوتی پہلوسے یہ سوال کہ بھلاکس طرح قوانین کا ایک مجموعہ ،انسان کی زندگی کے تمام مراحل میں اس کی تمام ضرورتوں کا جواب دے سکتا ہے ،اسی لئے کہنا پڑتا ہے کہ قطعی طورپر انسانوں کے اندر یہ صلاحیت نہیں پائی جاتی کہ وہ انسان کے لئے کئی صدیوں اور زمانوں پر محیط قانون کا ایک کامل مجموعہ بنا سکے ،اس لئے کہ آدمی اپنے محدود دماغ اور ناقص معلومات کے ذریعہ یہ صلاحیت ہی نہیں رکھتا ہے کہ وہ انسانی زندگی کے تمام گوشوں اور تمام حالتوں کا جائزہ لے کر ہر ایک کے لئے مناسب قانون بنائے۔

لیکن اس ذات کیلئے جس نے بشر کو پیدا کیا ہے اور تمام ''ماکان'' و ''مایکون'' سے واقف ہے جس کی نظر میں ماضی ،حال اور مستقبل سب یکساں ہیں ہزاروں سال قبل وبعد کی اشیاء کو واضح انداز میں دیکھتا ہے ایک ایسے قانون کے مجموعہ کی تشکیل و تدوین ممکن اور میسر ہے، لہٰذا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انسان کی اس طولانی تاریخ میں تمام انسانوں کے لئے قوانین کا ایک کامل مجموعہ بنانا جو انسان کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر مشتمل ہو ممکن نہیں ہے، کیونکہ جو گذشتہ اور آئندہ کی خبر رکھتا ہے اور تاریخ میں پھیلے ہوئے انسانی وجود کے تمام پہلوؤں سے آگاہ ہے، وہ اس طرح کے قوانین بنا سکتا ہے۔

ب:سوال کا اثباتی پہلو سے جائزہ‌اب رہا سوال کا اثباتی پہلو کہ جس چیز کی تم خدا کی طرف نسبت دے رہے ہو اور وہ قرآن اورروایات میں تواتر سے بیان ہوئی ہے ،خاص طور سے اگر ہم اس کے مسلمات اور یقینی احکام و قوانین کو سند بنائیں ،تو کس طرح اپنے محدودو معین حجم وبیان کے ساتھ وہ ہر دور اور زمانہ کے انسانوں کی تمام ضرورتوں کو پورا کر سکتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ اگرچہ ممکن نہیں ہے ہم ہر چیز کے بارے میں ایسے مخصوص قانون پیش کریں کہ جن میں الگ الگ ہر جگہ اور ہر زمانہ کے تمام حالات کا پاس و لحاظ رکھا گیا ہو،

اس لئے کہ قانون کے محتاج ونیازمند مسائل محدود نہیں کئے جا سکتے اور کبھی ختم نہ ہونے والے تغیرات کے تابع ہیں اور اس کے مقابلہ میں ہمارا ادراک ،فہم و شعور اور سمجھنے کی صلاحیت محدود ہے ، ہم تمام مسائل ایک مخصوص و معین شکل میں مکمل طورپر حاصل اور

بیان نہیں کر سکتے لیکن کہا جاسکتا ہے کہ یہ بے شمار مسائل بے شمار عنوانات نہیں رکھتے،اِن مسائل کا ہر مجموعہ ایک کلی عنوان رکھتا ہے اور اس عنوان کا ایک خاص حکم موجود ہے،لہٰذا ''کلی حکم ثابت اور محدود ہے اور اس کے مصادیق بے شمار اور قابل تغیّر وتبدّل ہیں''۔

ممکن ہے ایک زمانہ میں کوئی مصداق یا مسئلہ ایک حکم رکھتا ہو،دوسرے زمانہ یا دوسرے حالات میں وہی مسئلہ ایک دوسرے عنوان کے تحت قرار پائے اوراس کا حکم بدل جائے،لہٰذا موضوعات اوران میں رونما ہونے والی تبدیلیاں مختلف اور بے شمار ہو سکتی ہیں،لیکن کلی عناوین لا محدود نہیں ہیں ثابت رہتے ہیں، صحیح ہے کہ انسان کی زندگی مختلف پہلوؤں کی حامل ہے اور ان میں ہر روز اضافہ ہوتا رہتا ہے،زمانہ کی ترقی اور اجتماعی زندگی کے ساتھ ساتھ نئے مسائل بھی پیدا ہوتے رہتے ہیں اور ان سب کے لئے ایک مخصوص قانون کی ضرورت ہے تاکہ انسانی ضروریات پوری ہو سکیں،لیکن تمام متغیر قوانین ایک خاص معیار کے حامل ہو سکتے ہیں چنانچہ اگر انسان ان مسلمہ بیانات کے تحت سمجھ لے تو اس کی اجازت سے کہ جس نے کلی قوانین نازل کئے ہیں اورانھیں ان قوانین کے کلی معیارات کی شناخت کرائی ہے پھر کسی بھی مخصوص مقام کے لئے مخصوص قانون بنا سکتے ہیں ۔

ہم جو یہ کہتے ہیں کہ معاشرہ میں اسلام کے قوانین نافذ ہوں تو اس سے مراد صرف وہی قوانین نہیں ہیں جو قرآن میں براہ راست خدا کی طرف سے نازل ہوئے ہیں کیونکہ یہ قوانین تو قرآن میں مطلق طور پر کلیات کی صورت میں ذکر ہوئے ہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ پیغمبرؐ، امام معصومؑ،اور وہ حضرات جو ان قوانین کی حقیقت سے آگاہ ہیں وہ ان احکام کے معیارات پر دسترس رکھتے ہیں، قواعد کلیہ اوران میں ٹکراؤ کی صورت میں کس کو ترجیح حاصل ہے سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں ان کے مصادیق اور کلی قوانین کے اجراء اورطریقۂ نفاذ کو معین کر سکتے ہیں اور بلاشبہ یہ کام الٰہی قوانین میں بیان شدہ کلیات کی بنیاد پرہی انجام پاتا ہے۔

دسویں تقریر

قانون اور طرز فکر اور بنیادوں میں فرق

گذشتہ مطالب پر ایک نظر حکومت و سیاست سے متعلق اسلامی نظریہ پیش کرنے کے سلسلہ میں ہم نے گذشتہ تقریروں میں عرض کیا تھا کہ اسلام کی رو سے قانون بنانے اور نافذ کرنے والا دونوں ہی خدا کی جانب سے منصوب ہونا چاہئے؛ یعنی قانون یا تو خدا براہ راست وحی کے ذریعہ بیان کرے جیسا کہ اجتماعی قوانین سے متعلق آیات اس بات کی عکاسی کرتی ہیں، یہ قوانین پیغمبر اسلامؐ یا ائمہ معصومین علیہم السلام کے ارشادات میں آیات قرآن کی تفسیر کے عنوان سے بیان ہوئے ہیں جو سنت کا ایک حصہ ہیں، ان قوانین کا ایک حصہ مسلمات میں سے ہے اور ناقابل تبدیل ہے اور ایک حصہ تبدیل ہوتا رہتا ہے۔

اور زمان اور مکان کا تابع ہوتا ہے اور غیبت امام کے زمانے میں ان کے تعین کا اختیار ان افراد کو دیا گیا ہے کہ جو دینی معلومات تقویٰ و پرہیزگاری، عدالت اور معاشرہ کی مصلحتوں سے آگاہی کے اعتبار سے امام معصوم علیہ السلام سے زیادہ قریب ہوتے ہیں. اور نفاذ قانون کے سلسلے میں بھی ہم نے عرض کیا تھا کہ خود خداوند عالم آکر اس کا نفاذ کرتا بلکہ یہ کام اس شخص کے ذریعہ انجام پانا چاہئے جس کو اس نے نفاذ قانون کا ذمہ دار بنایا ہو، اور وہ ذات پہلے درجہ میں خود پیغمبر اسلام، پھر ائمہ معصومین علیہم السلام اور پھر ان افراد کی ہے جو پیغمبر یا امام علیہ السلام کی جانب سے خصوصی یا عمومی طور پر معین کئے گئے ہوں۔

جیسا کہ ہم نے اس پچھلی تقریر میں عرض کیا مذکورہ نظریہ کی بنیاد ایک دوسرے سے مربوط کئی موضوعہ اصولوں پر استوار ہے جن میں سے ایک اصول یہ ہے کہ معاشرہ کو قانون کی ضرورت ہے، اور دوسرا اصول یہ ہے کہ قانون خدا کی جانب سے ہونا چاہئے. ان دو مرحلوں کے بعد نفاذ قانون کرنے والوں کا مسئلہ بیان کیا جاتا ہے۔

جو حضرات ان اصولوں کے قائل ہیں یعنی مسلمان ہیں اور اسلام کے بنیادی اصولوں کے معتقد ہیں ان کے لئے مذہب کے درونی ڈھانچے میں بحث کے نظم ومراحل کا لحاظ کرتے ہوئے اس نظریہ کا ثابت کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے، لیکن جو افراد اسلام کے اصولوں پر اعتقاد نہیں رکھتے یا یہ کہ ان مسائل کے بارے میں مزید ذرا گہرائی سے جائزہ لینا چاہتے ہیں تاکہ مخالفین کے اعتراضات کا جواب دے سکیں ان کے لئے ہر ایک اصول کا پوری تفصیل سے بیان کرنا ضروری ہے۔

۲۔ دور حاضر میں قانون سے متعلق بحث کی ضرورت اس دور میں جب کہ سیاسی مسائل کے بارے میں طرح طرح کے نظریات ہمارے سامنے ہیں، اسلام کی نگاہ میں حکومت وسیاست کی نظریاتی بحثوں پر زیادہ توجہ کی ضرورت ہے تاکہ ہم مخالف نظریوں کے مقابلہ میں اسلامی نظریہ کو پورے استحکام اور یقین کے ساتھ پیش کر سکیں، خاص طور سے اس لئے بھی کہ عالمی استکبار حکومت کے بارے میں اسلامی نظریہ کو خراب کرنے کی مسلسل کوشش کررہا ہے علاوہ ازیں، اس وقت ہم انقلاب کے ایک ایسے زمانے میں زندگی بسر کررہے ہیں کہ نظام حکومت قائم ہو چکا ہے، اور اسلام کے نظریات کو پیش کرنے کے لئے علمی اور منطقی وسائل سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے۔

اور اس بات کے پیش نظر کہ ملک کے محترم حکام کی طرف سے قانون کی پابندی اور قانون پر عمل درآمد کا نعرہ لگایا جارہا ہے، لہٰذا عوام الناس کو زیادہ سے زیادہ قانون کے مسئلہ اس کی بنیاد، کے اعتبار اور دائرہکار، پر توجہ رکھنی چاہئے،او راس بات سے آگاہ رہیں کہ ہم کو کیوں اور کس حد تک قانون کی پیروی کرنی چاہئے ؟ یہ وہ اسباب ہیں جو اس زمانہ میں،اسلام کے سیاسی اور حکومتی مسائل کے بارے میں تحقیق کی ضرورت کو دوگنا کردیتے ہیں، لہٰذ ہمیں کسی حد تک ان تمام بحثوں کو علمی اور تحقیقی شکل میں پیش کرنا چاہئے۔

قوانین کے دائرے معین کرنے کے دو مختلف نظریے

آج کے انسانی معاشرہ کو طرح طرح کے بے شار وقوانین کا سامنا ہے، اور اگر ہم ان کتابوں پر نظر ڈالیں جوگذشتہ پچاس سال کے اندر لکھی گئی ہیں تو ہم دیکھیں گے کہ ان کتابوں کی تعداد میں بڑی تیزی سے تصاعدی شکل میں اضافہ ہوا ہے جتنے قوانین اس زمانے میں پائے جاتے تھے ان کی تعداد آج کے زمانہ میں موجود قوانین کی تعداد کی نسبت بہت کم تھے، علاوہ ازیں خاص طور سے آج کل مختلف وزارتوں کی طرف سے جاری کئے جانے والے دستور وضوابط، سرکاری احکامات اور دفتری اصول و مقررات کے سبب قوانین کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جارہا ہے، اور معاشرے کو نئے نئے قوانین کی ضرورت کا احساس بڑھتا جارہا ہے، اور ذمہ دار حکام بھی اس طرح کے قوانین بنانے اور نافذ کرنے میں اپنی پوری کوشش وقوت صرف کر رہے ہیں۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا قانون کی زیادتی معاشرہ کی ضرورت ہے؟اور اگر ضرورت نہیں ہے تو کیا یہ کام مفید ہے ؟یا یہ کہ قوانین کی تعداد محدود ہونا بہتر ہے؟ یہ سوال پہلی نظر میں آسان اور عامیانہ معلوم ہوتا ہے اور اس میں کوئی منطق نظر نہیں آتی اس لئے کہ ظاہر ہے معاشرہ کو ہر روز جدید مسائل کا سامنا ہے، اور ہر جدید چیز جدید قوانین کیضرورت ہے کہ نئے قوانین بنائے جائیں اور ان کا اجرا کیا جائے، لیکن دنیا کے علمی حلقوں میں یہ سوال بڑی سنجیدگی کے ساتھ اٹھایا جارہا ہے کہ کیا سماجی قوانین کے بنانے میں صرف ضروری اور کم سے کم قوانین پر اکتفاء کی جائے یا معاشرے کے قوانین ہر رخ سے ہمہ گیر ہوں اور عوام کی زندگی کے تمام امور کو شامل ہوں؟ یہ مسئلہ فلسفہ سیاست اور فلسفحقوق کے دائرے میں علمی حلقوں میں اعلیٰ پیمانہ پر بحث کا موضوع بنا ہوا ہے، اور اس سلسلہ میں دو مختلف اور متضاد نظریہ پائے جاتے ہیں۔

ایک گروہ کا خیال ہے کہ عوام کو اپنے کاموں میں آزاد ہونا چاہئے اور قانون ساز محکموں کو حتی الامکان کم سے کم قانون بنانا چاہئے وہ ضرورت سے زیادہ عوام کی فعالیت کو محدود نہ کریں،یہ وہی لبرلزم اور آزاد خیالی کا نظریہ ہے جس کی روح یہ ہے کہ معاشرہ کا ہر فرد جس طرح خود چاہے اپنی مرضی کے مطابق عمل کرنے میں آزاد ہو، اور صرف حسب ضرورت، وقت کے مطابق قانون بنائے جائیں،

تاکہ لوگوں کی کارکردگی صرف ضرورت بھر محدود ہو، نہ کہ اس سے زیادہ، اور قانون بنانے والے محکمہ اور حکومت کا ہر وقت عوام الناس کے امور اور طرزِ زندگی میں مداخلت کرنا صحیح نہیں ہے اور قدم قدم پر قانون نہیں بنانا چاہئے، مذکورہ نظریہ کے مقابلہ میں قانون کے ہمہ گیر ہونے کا نظریہ بھی پایا جاتا ہے جس کا خیال ہے کہ تمام چیزیں قانونی ہونا چاہئے ،انسان کے تمام امور خواہ وہ سماجی ہوں یا سیاسی،اقتصادی ہوں یا کچھ اور یہ سب کے لئے دقیق اور معین قوانین کی ضرورت ہے،اور حکومت کو بھی یہ قوانین ہر ممکن طریقہ سے نافذ کرنا چاہئےآپ نے دیکھاکہ مذکورہ سوال سیدھاسادہ ، عوامی قسم کا نہیں ہے بلکہ ایک بڑاہی باریک ایسا سوال ہے کہ قانون کے دائرے اورحدود کیا ہوں؟اور وہ یہ کہ قانون ساز محکمہ کس طرح کے قوانین کس مقدار میں،عوام الناس کی زندگی کے کن شعبوں کے لئے بنائے اورکس حد تک موثر؟جمہوری حکومت میں قانون کا سر چشمہ بنیادی طور پر یہ سوال جو قوانین کے حدود اور دائرہکار کے بارے میں ہے قانون سازی کے فلسفہ سے متعلق مختلف مکاتب فکر میں موجود ہے ان کے یہاں طرح طرح کے نظریات قانوبنانے کے حقوق او ران کے معیارات بیان کئے جاتے ہیں۔

اس سلسلہ میں پائے جانے والے نظریات، کہ کس کو قانون بنانے کا حق ہے اور اس کے معیارات کیا ہوں؟ایک مشہور نظریہ کہ جس کو آج کی دنیا میں قبول کیا جا رہاہے یہ ہے کہ وہی لوگ قانون بنانے کا حق رکھتے ہیں جو عوام کی طرف سے منتخب ہوئے ہوں،یعنی در حقیقت قانون بنانے کا حق خود عوام کو ہے،یہ عوام ہیں جو اپنے لئے قوانین بناتے ہیں اور وہ نظام سیاسی جو اس نظریہ کی بناپر وجود میں آتا ہے اس و ''ڈیموکریسی''یا ''جمہوریت'' کہتے ہیں ۔

جمہوری نظام اور اس بات کو قبول کرنے کے بعد کہ قانون سازی اور قانون کی منظوری کا حق عوام کے منتخب نمائندوں کے سپرد کیا گیاہے، یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عوامی نمائندوں کی اکثریت، (یعنی ۵۰ فیصدی میں ایک فیصدی) کے اضافے سے جس بات پر بھی موافقت یا منظوری ہو جائے کیا وہ قانون معتبر ہوجاتا ہے یا قانون کی منظوری کے لئے دوسرے اصول وضوابط بھی ہونے چاہئے، اور پہلے سے ہی کچھ ایسے قوانین بنائے جانے کی ضرورت ہے جوقانون کی منظوری کے میدان میں نمائندوں کے دائرہ عمل کو معین

کریں، جواب یہ ہے کہ قانون پاس کرنے والوں کے دائرے اور حقوق آئین میں معین ہیں یعنی ملک کا آئین دوسرے وضع شدہ قوانین وضوابط پر حاکم اور نگراں ہے اور قانون کو منظوری کے حدود کے بارے میں وہ فیصلہ کرتا ہے۔

یہاں ایک دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مختلف ممالک میں مختلف قسم کے آئین پائے جاتے ہیں اور کم وبیش اس میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے، کبھی کبھی حکومت اور نظام کے بدلنے کے ساتھ ملک کا آئین بھی بدل دیا جاتا ہے اور کبھی نظام کے بانیوں کی کونسل تشکیل پاتی ہے جو آئین کا تتمہ یا اصلاح و ترمیم کا بل منظور کرتی ہے، بہر حال سوال یہ ہے کہ آئین میں جو تبدیلیاں یا ترامیم انجام پاتی ہیں ان کے پیش نظر کیا کوئی ایسا محکمہ پایا جاتا ہے جو آئین سے بھی بالاتر ہو اور ملک کے آئین کے دائرے معین کرے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہاں، ملک کے آئین سے بالاتر وہ مسلمہ انسانی حقوق ہیں جن کو کبھی فطری قوانین اور کبھی فطری حقوق کے نام سے یاد کیا جاتا ہے،یہ ملک کے آئین پر حاکم ہوتے ہیں اور اس کے دائرے معین کرتے ہیں کیونکہ نظام کی کونسل ہر چیز کو اپنی مرضی کے مطابق قانون میں داخل نہیں کر سکتی۔

انسانی حقوق کا آئینی سرچشمہ

اب ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے کہ یہ قوانین جو آئین پر بھی حکمراں ہیں اور ملک کے آئین کے دائرے معین کرتے ہیں اور جن کی بنیاد پر آئین میں تبدیلی کی جا سکتی ہے ان کو کس نے بنایا ہے؟ اور وہ انسانی حقوق جو '' حقوق بشر '' کے عالمی منشور میں یا فلسفۂ حقوق کی کتابوں میں ذکر ہوئے ہیں کس کے ذریعہ تیار ہوئے ہیں اور ان کی آئینی حیثیت کیا ہے؟ جواب دیا جاتا ہے کہ مروجہ بین الاقوامی زبان میں اس کا اعتبار ان لوگوں کی دستخط سے ہے کہ جنھوں نے اس منشور پر دستخط کئے ہیں اور چونکہ اس منشور کو دنیا کی تمام حکومتوں کی منظوری حاصل ہے لہذا یہ معتبر سمجھا جاتا ہے۔

یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ جن ملکوں نے اس منشور پر دستخط نہیں کئے ہیں ان کے لئے یہ قوانین معتبر ہیں یا نہیں؟اور اگر معتبر نہیں ہیں تو ان کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ جن لوگوں نے اس منشور پر دستخط نہیں کئے ہیں اور اس پر عمل نہیں کرتے ہیں ان کی مذمت کریں اور کہیں کہ یہ لوگ حقوق بشر کا لحاظ نہیں کرتے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ انسانی حقوق کے منشور میں بیان کئے گئے قوانین و حقوق اس طرح کے قراردادی قوانین نہیں ہیں جو اتفاق رائے سے بنائے جانے کے بعد دستخط کے ذریعہ قابلِ اعتبار بن جاتے ہیں بلکہ وہ ایسے مسلمہ قوانین ہیں جن کو خود انسان کی عقل کہتی اور تسلیم کرتی ہے چاہے عوام الناس ان کو قبول کریں یا نہ کریں ،وہ قوانین معتبر ہوتے ہیں، البتہ اس زمانے میں کچھ افراد جن کی تعداد بہت کم ہے اس طرح کی نظر بھی رکھتے ہیں کہ انسانی حقوق غیر مسلمہ اور غیر معتبر ہیں لیکن یہ طئے ہے کہ زیادہ تر حقوق وسیاست کے فلاسفہ اس طرح کا نظریہ نہیں رکھتے، وہ اس بات کے قائل ہیں،کہ یہ قوانین کنونسنس (Convention) ،منشور اور بیانات کا اعتبار مختلف حکومتوں کے اراکین کے دستخط سے ہوا ہے اور چونکہ دنیا کی بہت سی حکومتوں کے نمائندوں نے اس پر دستخط کئے ہیں لہٰذا پوری دنیا میں معتبر سمجھے جاتے ہیں۔

اور پھر ایک سنجیدہ قسم کاآخری سوال یہ کیا جاتا ہے کہ کیا ضروری ہے تمام حکومتیں ان قوانین کو قبول ہی کرلیں؟ جن لوگوں نے ان قوانین پر دستخط نہیں کئے ہیں ان پر کس دلیل کے تحت یہ قوانین جاری کئے جا سکتے ہیں؟ بہر حال اس طرح کے سوال واعتراض کو بے بنیاد نہیں کہا جا سکتا، اسی لئے دنیا کے فلسفۂ قانون میں یہ بحث ہے کہ قوانین کے اعتبار کی اصل اوراس کا بنیادی سرچشمہ کیا ہے؟ لیکن ہمارے لئے جو دین، اسلام، خدا اور قرآن پر اعتقاد رکھتے ہیں اس کا جواب آسان ہے کیونکہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ قوانین حکم خدا کے مطابق ہونے چاہئے،تو پھر یہ بات ختم ہوجاتی ہے اور کسی سوال کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

ظاہر ہے جو لوگ اس راہ کو نہیں اپناتے اور چاہتے ہیں کہ تمام چیزوں کو قراردادوں کے ذریعہ بیان کریں،آخر میں وہ ایک جگہ پہنچ کر پھنس جاتے ہیں کیونکہ ہر قانون کے اعتبار کی اصل وبنیاد حقوقِ بشر کے منشور کو سمجھتے ہیں جس کے اعتبار کے لئے دلیل تلاش کرنے کی ضرورت ہے اس کے علاوہ یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے حقوق بشر کا منشور تقریباً ٣٠ شعبوں پر ہی کیوں مشتمل ہے اس کی شقیں اور جائے استعمال کم یا زیادہ کیوں نہیں ہیں؟یہ وہ اہم سوال ہے جو عالمی سطح پر قانون کے ماہرترین فلاسفہ کے سامنے درپیش ہے اور ابھی تک ان کی طرف سے اس کا کوئی اطمینان بخش جواب نہیں دیا گیا ہے۔

جو کچھ ذکر ہوا ہے وہ دنیا کے ممتازترین دانشوروں کی سطح پر علمی اور فنی دائرہ میں زیر بحث مسائل ہیں اور اگر ہمارا معاشرہ اپنی عوامی تہذیب وثقافت کی سطح بلند کرنا چاہتا ہے تو اسے چاہئے کہ کم وبیش ان مطالب اور مفاہیم سے آشنا ہو، جس وقت ہم یہ کہتے ہیں کہ ہم قانون کے علمبردار اور قانون کے پابند ہیں، تو ہم کو یہ بھی جاننا چاہئے کہ قانون کے اعتبار کا سرچشمہ کہا ہے اور ہمیں کیوں اور کس حد تک قانون کا پابند ہونا چاہئے؟

آج کل (ایران میں)اس سلسلے میں تقریروں، رسالوں اور اخباروں میں کافی بحثیں چل رہی ہیں،اور ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ خصوصاً یونیورسٹیوں میں جو لوگ آرٹس اور سوشل سائنس کے شعبوں میں تعلیم وتدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں علی الخصوص جو لوگ ''فلسفۂ قانون'' اور ''فلسفہ سیاست''میں صاحب نظر ہیں ان کو اس طرح کے سوالات کا سامنا ہے؛ لہٰذا ہم اپنے سماج کی تہذیبی سطح کو بلند کرنے کے لئے مجبور ہیں کہ اپنے امکان بھر ان تحقیقات کے نتائج آسان اور عام فہم انداز میں بیان کردیں، اس لئے کہ اگر ہم ان بحثوں کو دقیق انداز میں تفصیل کے ساتھ بیان کرنا چاہیں تو کم سے کم سوشل سائنس کے چار شعبوں یا فلسفہ کی چار شاخوں یعنی : فلسفہ سماجیات، فلسفۂ قانون، فلسفۂ اخلاق اور فلسفۂ سیاست سے مدد لینی ہوگی،

اور اگر ہم اس موضوع پر مزید کام کرنا چاہیں تو ہمیں کئی دوسرے فلسفوں پر بھی بحث کرنا ہوگی یہاں تک کہ ہم معرفت شناسی تک جو ان تمام فلسفوں کی بنیاد اور اصل ہے پہنچ جائیں، اور یہ بات بالکل واضح ہے کہ ان علوم سے حاصل شدہ نتائج اور ان بحثوں کے درمیان جو رابطے پائے جاتے ہیں ان کی طرف ایک اشارہ ، تعلیم یافتہ طبقہ اور انقلاب اور اس کی تہذیب وثقافت کے دامن میں پلی بڑھی سمجھ دار عوام کے لئے بہت مفید ہوگا۔

قوانین خلقت اور انسان کے اختیارات

یہاں یہ بات ذکر کردینا ضروری ہے کہ لفظ قانون دو مختلف اصطلاحوں کا حامل ہے، ایک اصطلاح ''دو دو چار'' کی مانند علوم تجربات و یارضیات کی مانند دقیق اور حساب شدہ ہے اور ان علوم میں قانون سے مراد موجودات کے درمیان پائے جانے والاواقعی رابطہ ہے مثال کے طور پر اشیاء کے درمیان موجود حقیقی قوانین بتاتے ہیں کہ پانی کس وقت بھاپ میں تبدیل ہوتا ہے، اور کتنے درجۂ حرارت پر پانی اُبلتا ہے او رکس وقت برف بن جاتا ہے، اور دھات کس نقطۂ حرارت پر پگھلتی ہے؟لہذا اس طرح کی باتیں کہ جب پانی کی حرارت صفر پر پہونچ جاتی ہے تو پانی برف بن جاتا ہے اور جب سو درجہ پر پہونچ جاتی ہے تو پانی اُبلنے لگتا ہے یہ وہ حقیقت ہے جو موجودات عالم میں پائی جاتی ہے اور انسان کو کوشش کرنا چاہئے کہ ان حقیقتوں اور قوانین کو جو کیمسٹری اور دوسرے تمام تجرباتی علوم میں موجود ہیں معلوم کرلے، ظاہر ہے کہ یہ قوانین پائیدار اور لامتناہی ہیں اور قابل شمار نہیں ہیں،اورانسان کی علمی ترقی کے ساتھ بہت سے قوانین معلوم ہو سکے ہیں،

اور کسی بھی علم میں ہر نئی دریافت معلومات کے ساتھ سیکڑوں سوال پیدا ہوئے ہیں۔اور اس طرح ضروری ہے کہ اتنی ہی تعداد میں نئے قوانین بھی دریافت ہوں تاکہ ان سوالوں کے جوابات دے سکیں، اس بنا پر ہر روز سوالوں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے، اور بشر ان سوالوں کے حل کرنے کیلئے متعلقہ قوانین دریافت کرنے میں لگا ہوا ہے، دوسرے لفظوں میں، ہم دنیا کے بے شمار قوانین کے

مجموعوں روبرو رہے ہیں،یہ قوانین جو عناصر فطرت سے مربوط ہیں زندہ موجودات،کیمیائی ترکیبات، فضائی اصول اور دستورات اوران تمام دوسری چیزوں سے تعلق رکھتے ہیں جن کو ابھی تک ہماری عقل سمجھنے سے قاصر رہی ہے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہم،اس دنیا میں اس طرح ایک دوسرے سے جڑے بے شمار قوانین کے تنگ دائرہ میں محصور ہیں تو پھر ہمارے انتخاب اور اختیار کی کیا اہمیت باقی رہ جاتی ہے؟ یہ سوال بہت ہی سنجیدہ قسم کا ہے اور اسی وجہ سے انسان شناسی کے فلسفہ میں یہ بات زیر بحث ہے کہ انسان کی حقیقت کیا ہے؟ کیا وہ سوفیصدی مجبور ہے یا مکمل طور پر مختار ہے یا محدود اور مشروط اختیارات رکھتا ہے؟ اور اگر اس کے اختیارات محدود اور مشروط ہیں تو ان کی حدیں کیا ہیں؟ اسی طرح عصر حاضر میں دنیا کے فلسفی حلقوں میں بھی قضاٗ وقدر ،جبر وتفویض اور اسی طرح کے دوسرے مسائل پر سنجیدگی سے توجہ دی جارہی ہے ،اور ان کے بارے میں اب بھی بحث جاری ہے، ان کے درمیان میں ایک گروہ بقائے ہستی کا نظریہ رکھتا ہے اور اس بات کا قائل ہے کہ انسان غیر محدود آزادی رکھتا ہے اور اپنی مرضی کے مطابق ہر کام کرسکتا ہے۔

چنانچہ ’’ جان پل سارٹر ‘‘ نے کہا تھا: اگر میں طئے کرلوں تو ویتنام کی جنگ تمام ہوجائے !یعنی بشر ایسی طاقت کا مالک ہے کہ اگر ایک شخص فیصلہ کرلے تو تباہ کن جنگ جس نے لاکھوں انسانوں کو نابود کردیا ہے روک دے،یقیناًیہ بات مبالغہ آمیز ہے، لیکن اس طرح کا نظریہ جو انسان کے لئے غیر محدود قدرت و اختیار کے قائل ہیں رکھتے ہیں۔

مذکورہ نظریہ کے مقابلہ میں ایک گروہ انسان کی آزادی کو خیال خام جانتا ہے اور معتقد ہے کہ انسان عالم جبر کے قوانین کے دائرہ میں زندگی بسر کررہا ہے اور خیال کرتا ہے کہ مختار ہے اور بالآخر ایک مذہبی طرز تفکر بھی ہے جو ان دونوں نظریات کے درمیان کا ہے اور انسان کے لئے اس اختیار کا قائل ہے جو دنیا پر حکمراں طرح طرح کے قوانین میں گھرا ہوا ہے، یعنی اگر ہم اُن تمام قوانین کے گرد جو اس کائنات پر حاکم میں ایک دائرہ کھینچیں، تو انسانوں کی آزادی، اسی دائرے کے اندر قابلِ عمل ہے نہ کہ اس سے باہر۔

پس اب جب کہ یہ بات واضح وروشن ہو چکی ہے کہ ہمارے گرد تخلیقی لحاظ سے قوانین فطرت کے ایک مجموعہ نے اپنا جال بچھا رکھا ہے، تو خود بخود یہ سوال ابھرتا ہے کہ کیا ہم ان قوانین کو توڑنے اور ان کی نافرمانی کرنے کی طاقت رکھتے ہیں؟ اور کیا ہم عالم طبیعت کو تسخیر کر سکتے ہیں اور اس کے قوانین اور دائرے کو توڑکر اس طرح کی زندگی بسر کر سکتے ہیں کہ ہمارے اوپر قدرت کے قوانین حاکم نہ ہوں؟

جواب یہ ہے کہ اس طرح کا تصور ایک بے عقلی کی خام خیالی ہے ،کیونکہ نظام قدرت کے تسخیر کرنے کا لازمہ یہ ہے کہ خود عالم فطرت کا ہی کوئی دوسرا قانون دریافت کیا جائے ، مثلاً اگر ہم ڈاکٹری کے میدان میں کسی بیماری پر قابو حاصل کر لیتے ہیں یا کسی بیماری کا پوری طرح خاتمہ کردیتے ہیں،تو یہ قدرت کے ایک اور قانون کے انکشاف اور اس کے صحیح استفادہ کے سبب کامیابی ملی ہے، درحقیقت ہم نے اپنے بنائے ہوئے کسی قانون کے ذریعے قدرت کو تسخیر نہیں کیا ہے بلکہ قدرت کے ہی ایک اور قانون کے کشف اور استعمال کے ذریعے کامیابی حاصل کی ہے۔ پس نتیجہ یہ نکلا کہ قدرتی قوانین کے دائرے سے نکلنا محال ہے، زندگی گزارنے کا مطلب یہی ہے کہ ہم قوانین فطرت کی شناخت حاصل کریں اور ان سے فائدہ اٹھائیں؛ وہی قوانین الٰہی کہ جن کو خداوندعالم نے عالم فطرت میں قرار دیا ہے،

اور جن سے خارج ہونا گویا انسان کا خدا کی فطری بندگی سے نکل جانے کے مترادف ہے۔ جی ہاں! جیسا کہ ہم نے عرض کیا انسان اس دائرے میں رہ کر جوقدرتی قوانین کے مجموعہ سے تشکیل پایاہے اپنی توانائیوں کا مظاہرہ کر سکتا ہے، اور مختلف علمی قوانین اور تخلیقی قوانین کے درمیان انسان کے انتخاب و اختیار کے اظہار کے لئے ایک حد تک وہ محدود فضائیں موجود ہیں کہ جس میں وہ قانون سے اپنے حق میں استفادہ کرے اور ایک اورقانون مقابلہ میں بنا سکے اور یہی محدود فضائیں انسانی اختیار کے دائرے معین کرتی ہیں۔

الٰہی شریعت ترقی اور فلاح وکمال کی ضمانت

آیاانسان اپنے انتخاب واختیارکی قدرت کے دائرے میں، اقدار ومعیارات کے لحاظ سے جس طرح بھی چاہے عمل و رفتارکر سکتا ہے؟یا اس کے لئے ایک حد اور دائرہ معین ہے کہ جس کا لحاظ ضروری ہے؟اور کیا اس دائرے میں بھی کچھ قوانین ہیں کہ جن پر عمل کرنا انسان کے لئے ضروری ہے؟ جواب یہ ہے کہ ہاں اس دائرے میں بھی قوانین پائے جاتے ہیں البتہ یہ قوانین فطرت کی قسم سے نہیں ہیں بلکہ یہ قوانین،شرعی اور اعتباری قوانین واقدار ہیں کہ اور یہ تعبیریں قدمانے ہزاروں سال پہلے مرتب کی ہیں.یہ قوانین عقل عملی کے دائرہ میں ، (ان قوانین کے مقابلے میں آتے ہیں کہ جو عقل نظری کے دائرے میں آتے ہیں) یعنی ہر وہ چیز جو انسان کے دائرۂ اختیار میں ہے عقل عملی اس کا فیصلہ کرتی ہے.بے شک شرعی قوانین جن پر عمل درآمد انسان کے اختیار میں دیا گیا ہے اپنے آخری ہدف ومقصد اور کمال تک پہنچنے کا باعث ہے،

اور ان کی مخالفت زوال کا سبب ہے.بلکہ انسان کو انسانیت سے گرادیتی ہے اور جانور سے بھی بدتر بنادیتی ہے، قرآن مجید میں بھی اس چیز کی طرف اشارہ ہے:(لَقَدْ خَلَقْنَا الإِنْسَانَ فِیْ أَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ .ثُمَّ رَدَدْنٰہُ أَسْفَلَ سَافِلِیْنَ. إِلَّا الَّذِیْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَھُمْ أَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ.[1]) ''ہم نے انسان کو بہترین صورت اور نظام کے ساتھ پیدا کیا پھر ہم نے اسے پست ترین حالت کی طرف پھیر دیا مگر جو لوگ ایمان لائے اور اچھے (اچھے) کام کرتے رہے ان کے لئے تو بے انتہا اجر وثواب ہے''

جی ہاں!انسان میں اتنی صلاحیت اور کمال موجود ہے کہ وہ اپنی بے شمار خدا داد صلاحیتوں کے ذریعہ خدا سے بہت قریب ہوسکتا ہے ،اوردوسری طرف خدا کی نافرمانی اور مخالفت و بغاوت کے ذریعہ اس حد تک گر سکتا ہے کہ کسی بھی جانور سے بدتر بن سکتا ہے. لہٰذا شرعی اوراعتباری قوانین اور اقدار ومعیارات کی پابندی اور مذہب کی زبان میں خدا کی اطاعت یا خدا کے احکام کی نافرمانی اور ان سے مقابلہ سب کچھ انسان کے دائرۂاختیار میں ہے،اگر انسان نے قوانین کو قبول کیااور خدا کی اطاعت کی، تووہ بلند درجات

[1] سورۂ والتین آیت ۴۔۶۔

پر پہونچ جائے گا،اور اس کو روحانی اور معنوی سکون حاصل ہو گا اور اگر اس نے نافرمانی کی تو تباہ و برباد ہوجائے گا،جیسا کہ حفظان صحت کے قوانین کی پابندی پر علم طب میں تاکید کی گئی ہے،کہ اگر ان کی رعایت کی تو ہم صحت وسلامتی کی نعمت سے مالا مال رہیں گے اور اگر ہم نے ان قوانین کی رعایت نہیں کی تو بیماریوں میں مبتلا ہوجائیں گے۔

اب انسان اپنے مختار ہونے کے پیش نظر بتائے کہ اس کوڈاکٹری کے اصول وقوانین کی رعایت کرنا چاہئے یا نہیں ؟اگر اسے اپنی صحت وسلامتی کی فکر ہے اور چاہتا ہے کہ اسی طرح صحیح وسالم خوش اور مطمئن باقی رہے تو اس کو ڈاکٹری کے اصولوں کی پابندی کرنی ہی ہوگی،او ر اگر صحت وسلامتی نہیں چاہتابیماری پر راضی ہے تو پھر ان قوانین پر عمل نہیں کرتا، لہٰذا حقیقت یہی ہے کہ صحت وسلامتی طبی قوانین کی رعایت کے بغیر ممکن نہیں ہے، اور یقینایہ باتیں کسی جبر اور زبردستی کی نہیں ہیں؛ کیونکہ دوسری طرف طبی قوانین کی رعایت اور صحت کی برقراری یا رعایت نہ کرنا سب کچھ انسان کے اپنے اختیار میں ہے،

اور وہ اپنے اختیار سے ان قوانین کی رعایت کرکے تندرست رہتا ہے یا ان کی رعایت نہ کرکے بیمار پڑجاتا ہے اور اپنی جان کو خطرہ میں ڈال دیتا ہےاب تک جو کچھ جسم اور بدن کے بارے میں کہا گیا ہے بالکل وہی سب کچھ انسان کی روح اورجان کے بارے میں بھی صحیح ہے؛ جس طرح انسان کے بدن کے لئے صحت وبیمار ہے اسی طرح انسان کی روح بھی صحت مند اور بیمار ہوتی ہے، روح کی صحت وسلامتی بھی روح سے متعلق قوانین کی رعایت پر موقوف ہے کہ اگر انسان ان قوانین اور معنوی اقدار کا لحاظ رکھتا ہے تواس کی روح کے لئے کمال اور سکونیز اس کیسلامتی کی ضمانت ہے ورنہ انسان کی روح بیمار ہوجاتی ہے،

خداوند عالم اس بارے میں ارشاد فرماتا ہے: (فِی قُلُوبِہِم مَرَض فَزَادَہُم اللّٰہ مَرَضاً[1]) ''ان کے دلوں میں مرض تھا پس خدا نے ان کے مرض کو اور بڑھا دیا''وہ انسان جو کسی ڈھلان پہ کھڑا ہو اور وہاں سے تیز دوڑنا چاہتا ہے تو ممکن ہے اپنے کو کنٹرول نہ کر سکے، گر پڑے اور اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

لیکن اگر وہ خود کو صحیح و سالم رکھنا چاہتا ہے تو اس کو احتیاط کے ساتھ چلنا ہوگا،اور اپنے آپ کو اس طرح کنٹرول میں رکھنا ہوگا کہ اگر بلندی سے نیچے کی طرف پھسل بھی جائے تو خطرے کے دہانے پر پہنچنے سے پہلے ہی رک جائے. معنوی مسائل میں بھی سچے روابط و ضبوابط پائے جاتے ہیں اور خدا کے احکام کی پابندی سے انسانی روح کو ابدی سلامتی اور سعادت مل جاتی ہے،اور یہ بات بھی طے ہے کہ ان قوانین پر عمل کئے بغیر ابدی سعادت تک نہیں پہونچا جا سکتا.

البتہ انسان آزاد و مختار ہے اور وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ میں سعادت اور کامیابی نہیں چاہتا میں جہنم میں جانا چاہتا ہوں تو کوئی بھی اس کو نہیں روک سکتا تکوینی آزادی نے انتخاب کا راستہ اس کے لئے ہموار کر دیا ہے. لیکن اگر وہ خدا کا قرب اور اخروی سعادت چاہتا ہے تو پھر اس کو خدا کے حکم کی پیروی کرنی ہوگی، اور اپنی مرضی نہیں چلے گی، کیونکہ اپنی مرضی کے مطابق عمل یا ہوائے نفس کی پیروی گمراہی اور حق سے انحراف کا سبب ہے:

(أ فَرءیتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلٰہَہُ ہَوَاہُ وَأَضَلَّہُ اللّٰہُ عَلیٰ عِلْمٍ وَخَتَمَ عَلٰی سَمْعِہِ وَقَلْبِہِ وَجَعَلَ عَلٰی بَصَرِہِ غِشَاوَۃً فَمَن یَہدِیہِ مِن بَعدِ اللّٰہِ أَفَلاَ تَذَکَّرُونَ[2]) ''بھلا تم نے اس شخص کو بھی دیکھا جس نے اپنی نفسانی خواہش کو معبود بنا رکھا ہے اور خدا نے اسے جان بوجھ کر گمراہی میں چھوڑ دیا اور اس کے کان اور دل پر مہر لگادی ہے اور اس کی آنکھ پر پردہ ڈال دیا ہے،ایسی حالت میں خدا کے سوا اس کی ہدایت کون کر سکتا ہے تو کیا تم لوگ (اتنی بھی) فکر نہیں کرتے''

[1] سورہ بقرہ آیت ١٠.
[2] سورۂ جاثیہ آیت٢٣.

جو کوئی اپنے نفس اور دل کا تابع ہوگیا گونگا اور بہرا ہوجاتا ہے، حقیقت وواقعیت کو نہیں سمجھ سکتا، اگرچہ اس نے بہت زیادہ علم حاصل کر لیا ہو، اس کی آنکھوں پر ایک پردہ پڑجاتا ہے جس کی وجہ سے حقیقتیں چھپ جاتی ہیں. اس سلسلہ میں ''بلعم باعورا[1]'' کا واقعہ ہم سب کے لئے سبق آموزاور باعث عبرت ہے کہ اس علمی مقام پر پہنچنے کے باوجود کہ اپنے زمانہ کے اعلیٰ ترین دانشمندوں میں اس کا شمار ہوتا تھا اور سر آمد روزگار سمجھا جاتا تھا لیکن ایسی پستی میں گرا کہ خداوند عالم اس کے لئے فرماتا ہے: (وَاتْلُ عَلَیْهِمْ نَبَأَ الَّذِیْ ءَ اتَیْنَاهُ ءَ ایَاتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَأَتْبَعَهُ الشَّیْطَانُ فَکَانَ مِنَ الْغَاوِیْنَ ۔۔۔ فَمَثَلُهُ کَمَثَلِ الْکَلْبِ إِنْ تَحْمِلْ عَلَیْهِ یَلْهَثْ أَوْ تَتْرُکْهُ یَلْهَثْ[2]۔۔)

''آپ ان لوگوں کو اس شخص کا حال سنادیں جسے ہم نے اپنی آیتیں عطا کی تھیں لیکن بالآخر وہ ان سے خالی ہوگیا اور شیطان نے اس کا پیچھا پکڑا اور وہ گمراہوں میں شامل ہوگیا اس کی مثل اس (خارش زدہ) کتے کی سی ہے کہ اگر اس کو دھتکاریں تو بھی زبان نکالے رہے گا اور اس کواس کے حال پر چھوڑ دیں تو بھی منہ سے زبان نکالے رہے گا.

''جی ہاں خدا کی عطا کردہ آزادی کے تحت انسان اس حد تک بھی گر سکتا ہے، لیکن اگر انسان سعادت وکامیابی چاہتا ہے تو اس کو الٰہی قوانین کی رعایت کرنی ہوگی، اوریہ قوانین ایک طرح کے نہیں ہیں بلکہ ان کے مختلف دائرے ہیں اور کئی قسموں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں. لہٰذا ضرورت ہے کہ اسلامی تہذیب سے آگاہ ثقافتی ارتقاء کے خواہشمند حضرات کو بتایا جائے کہ ہم کو اپنی زندگی میں کئی قسم کے قوانین کی ضرورت ہے۔

شہری قوانین اور اخلاقی قوانین میں فرق

قانون کے نام سے جو چیز ہمارے درمیان مشہور ہے وہ ''شہری قانون'' ہے ان قوانین سے مراد دستور و ضوابط کا وہ مجموعہ ہوتا ہے جو معتبر مراکز یا اداروں کی طرف سے بنتے ہیں اور ایک قوت جس کو قوہ مجریہ یا حکومتی کابینہ کہتے ہیں ان قوانین کے نفاذ کی ضامن ہے اور ضرورت کے وقت نظم و نسق کی ذمہ دار پولیس یا فوج کی مدد سے قوانین پر عمل درآمد کراتی ہے، اور جرائم کی روک

[1] بلعم باعورا کا واقعہ علامہ فرمان علی صاحب اعلی اللہ مقامہ نے اپنے ترجمہ میں درج ذیل آیت کے ضمن میں بیان کیا ہے۔(مترجم)
[2] سورہ اعراف آیت ۱۷۵، ۱۷۶۔

تھام کرتی ہے، شہری قوانین ،عام معنی میں، جرم و سزا کے قوانین کو بھی شامل ہیں جو علم قانون (Law) میں بیان کئے جاتے ہیں؛اس منزل میں اگر کوئی کہے کہ حکومت کی ذمہ داری صرف یہ ہے کہ عوام کو قانون سے آگاہ کرے،یعنی ان سے کہے کہ چوری نہ کریں، کسی کی عزت پر حملہ نہ کریں، لیکن وہ خلاف کرنے والوں کو کوئی سزا نہیں دے سکتی کیونکہ یہ کام انسان کی آزادی کے خلاف ہے تو یقیناً کوئی بھی اس بات کو تسلیم نہیں کرے گا، یہ بات کہ ''انسان چونکہ آزاد ہے اگر وہ شہری قوانین کی خلاف ورزی کرے تو کوئی اسے سزا نہ دے'' اس کا مطلب یہ ہوگا کہ قوانین کا ہونا یا نہ ہونا برابر ہے، جبکہ شہری قوانین کے ہونے کا فلسفہ یہی ہے کہ اس پر عمل درآمد کی ضمانت بھی پائی جاتی ہے اور شہری قوانین کا اخلاقی قوانین کے ساتھ بنیادی ترین فرق بھی یہی ہے ۔

اگرچہ دوسرے فرق بھی پائے جاتے ہیں مثلاً اخلاقی قوانین میں کہا جاتاہے کہ ''امانت کا خیال رکھیں اور اس میں کبھی خیانت نہ کریں'' یہ ایک اخلاقی حکم ہے ،اب اگر کوئی امانت میں خیانت کرے تو اس اخلاق شکنی پراسے سزا یا عدالت میں نہیں کھینچا جائے گا لیکن شہری قانون توڑنے کے جرم میں قانون کے مطابق عدالتی چارہ جوئی کی جائے گی، اور ایک دھوکا باز کے عنوان سے جرم و سزا کے قوانین کو سامنے رکھ کر اس کو مخصوص سزملے گی لہذا کوئی ایسا محکمہ ہونا چاہئے کہ جو قانون شکنی کرنے والوں کے خلاف اقدام کر سکے اور طاقت کی مدد سے ان پر قانون لاگو کر سکے، طاقت کا استعمال شہری قوانین کا لازمہ ہے کیونکہ طاقت کے بغیر شہری قوانین کوئی معنی نہیں رکھتے، لیکن اخلاقی قوانین کی یہ صورت نہیں ہے،اسے پولیس کے محکمہ کی ضرورت نہیں ہے، مگر یہ کہ وہ شہری قانون کا پہلو اختیار کر لیں، بے شک دین میں بہت سے ایسے احکام پائے جاتے ہیں جو انسان اور خدا کے درمیان رابطے سے تعلق رکھتے ہیں جیسے نماز، روزہ اور حج وغیرہ یہ احکام فقط ادیان الٰہی میں ذکر ہوئے ہیں۔

یہاں یہ سوال کرتے ہیں کہ شہری قوانین بھی کیا دین میں ممکن ہے یا دین صرف خدا اور بندے کے تعلق اور رابطہ کی وضاحت کے لئے ہے؟ یہ وہ شک پیدا کرنے والا سوال ہے جو آج وسیع پیمانہ پر یونیورسٹیوں میں اور مختلف اخبار رسائل میں اٹھایا جارہا ہے ،اور تمام حضرات چاہے وہ یونیورسٹیوں سے تعلق رکھتے ہوں کہ جن کا اس سے براہ راست تعلق ہے یا وہ معاشرے کے افراد والدین

اور رشتہ دار ہوں اس طرح کے اعتراض آمیز سوالوں کی طرف تومتوجہ ہونے کی ضرورت ہے، کیونکہ یہ باتیں آخر کار کالج کے بچوں اور دانشوروں کے ذریعہ معاشرے کے تمام افراد تک پہونچتی ہیں اور ہمارے عوام کی زندگی اور معاشرت پر اثر انداز ہوتی ہیں ظاہر ہے ایک دن یہی جوان طلبہ ماں باپ کی جگہ لیں گے اور ایک قوی و موثر ،نمایاں شخصیت کی حیثیت سے معاشرہ کے بنیادی ترین افراد میں قرار پائیں گے،اب اگر اس وسیع طبقہ کی تہذیب و معاشرت بدل جائے تو ایک نسل کے بعد معاشرے کا کلچر ہی پورے طور سے بدل جائے گا، لہٰذا ہمیں ہمیشہ اس بات کی طرف توجہ دینی ہوگی اور ہوشیار رہنا ہوگا کہ کون سی تہذیب اس وقت ہمارے معاشرے میں پنپ اور رواج پا رہی ہے۔

اسلام اور لبرلزم کے رجحان میں فرق

دور حاضر میں جو باتیں کہی جاتی ہیں ان میں سے ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ قانونی پابندیوں کو کم سے کم کرنا چاہئے، یہ ایک لبرلزم طرز فکر ہے جو موجودہ دنیا میں اٹھایا جاتا ہے اور اس سلسلہ میں کافی بحثیں ہوئی ہیں اور بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں، اسی نقطۂ نظر کی بنا پر کچھ افراد اس بات کے قائل ہیں کہ حکومت اور قانون سازوں کو انسان کی زندگی اور اس کے امور میں وسیع پیمانے پر مداخلت نہیں کرنی چاہئے، کیونکہ جس قدر حکومت کی مداخلت کم ہوگی معاشرہ اتنا ہی زیادہ ترقی کرے گا،یقیناً اس رجحان کے کچھ نتائج و لوازم بھی ہیں، جو معاشرے کے دوسرے تمام امور میں سرایت کریں گے ۔

مذکورہ نقطۂ نظریہ کی جڑیں سماجی آگہی میں پیوست ہیں جو سماجیات میں زیر بحث دو نظریوں میں سے ایک پر مبنی ہے:

پہلے نظریہ میں: معاشرہ کو اصل قرار دیا جاتا ہے، اور اس بنیاد پر قوانین کو اس قدر جامع او رہمہ گیر ہونا چاہئے، کہ انسانی زندگی کے تمام میدانوں پر مشتمل ہو، اور شخصی آزادی جتقدر کم ہو بہتر ہے۔

دوسرے نظریہ میں: شخصی زندگی کو اصل قرار دیا جاتا ہے اوراس کی بنیاد پر انسان کو مکمل طور سے آزاد ہونا چاہئے اور سماجی قوانین اس قدر کم ہوں کہ انسان کو کم سے کم پابند ہونا پڑے آج کل مغربی معاشرے میں یہی انفرادی اور شخصی زندگی کو محور قرار دینے کا رجحان کار فرما ہے چنانچہ لبرلزم کا نظریہ بھی اسی کی پیداوار ہے، یہ نظریہ اس بات کا قائل ہے کہ قوانین کم سے کم ہوں اور عوام کو جس قدر زیادہ ممکن ہو آزادی دی جائے تا کہ وہ جس طرح چاہیں عمل کریں.

اس سلسلہ میں اسلامی نظریہ پیش کرنے سے پہلے اس نکتہ کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ قانون سے کم سے کم یا زیادہ سے زیادہ استفادہ کا رجحان سوشل سائنس کے کئی شعبوں سے مربوط ہے جیسے فلسفہ سماجیات (جس میں معاشرہ یا افراد کے اصل محور ہونے پر بحث ہوتی ہے)اور فلسفۂ اخلاق جس میں اس بات پر گفتگو کرتے ہیں کہ قدروں کا معیار کیا ہے؟ کیا اخلاق و اقدار ،قانون پر حکمراں ہیں یا قدریں، قانون معین کرتا ہے، اسی طرح فلسفۂ حقوق اور پھر فلسفہ سیاست پر بھی بحثیں ہوتی ہیں،اسلامی نقطۂ نظر سے انسان کی زندگی کے تمام پہلو اس کی آخرت اور انجام سے تعلق رکھتے ہیں یعنی اس زندگی میں ہماری ہر طرح کی سعی وکوشش ابدی خوش بختی یا بد بختی پر اثر انداز ہوگی.

اسلامی تفکر سے مراد یہ ہے کہ ''الدنیا مزرعۃ الآخرۃ''یعنی جو کچھ انسان دنیا میں بوئے گا یا جو رفتار وکردار اپنائے گا آخرت میں اس کا نتیجہ ویسا ہی ظاہر ہوگا، اس کی سعادت کا سبب بنے گا یا اس کی تباہی وبد بختی کا باعث بنے گا، اگر ہم اس نظریہ کو اصل قرار دیں تو کیا انسان کی زندگی میں کوئی چیز باقی رہ جاتی ہے جو قانون کی محتاج نہ ہو؟ یہاں، قانون کے محتاج ہونے کا مطلب ہے قانون راہنمائی کرے کہ انسان کس راستہ اور کس طریقہ و روش کو اپنائے کہ اپنے مقصود تک پہونچ جائے یعنی اگر معاشرہ کو امن وسلامتی کی ضرورت ہے، تو کوئی کسی کی عزت اور مال ودولت کے ساتھ دست درازی نہ کرے ورنہ خود اس کی عزت اور مال و ثروت پر بھی حملہ ہوگا ۔

اور بقول شاعر

بہری مال مسلمان وچون مالت ببرند   داد وفریاد برآری کہ مسلمانی نیست

لوٹ کر مال مسلمان کا جب لوٹے گئے   چیختے پھرتے ہو یہ طرز مسلمان نہیں؟

''تم مسلمان کا مال اٹھالے گئے اور جب وہ تمہارے مال کولے گئے تو چیختے اور فریاد کرتے ہو کہ یہ مسلمان کا طریقہ نہیں ہے''

انسان کی طبیعت منفعت طلب ہے اور انسان صرف اپنے فائدہ کے بارے میں سوچتا ہے، اور اس راستہ میں کسی بھی طرح کی سعی وکوشش سے دریغ نہیں کرتا لیکن جس وقت اس کے مفادات کو خطرہ لاحق ہوتا ہے تو قانون کا سہارا لیتا ہے، لہٰذا جھگڑے اور اختلافات برطرف کرنے کے لئے اور معاشرے میں امن مفاہمت قائم کرنے کے لئے قانون کا ہونا ضروری ہے، جو دوسروں پر ظلم وناانصافی سے روکے، اور ہر شخص کے حقوق کو بیان کرے اور عدل وانصاف کے حدود معین ہوجائیں تاکہ اس کی بنیاد پر عوام الناس کو پتہ چل جائے کہ کون سا کام ظلم ہے اور کون سا کام عدل وانصاف کے مطابق ہے.

ورنہ ہر شخص دوسرے کے حقوق پر دست درازی کرے گا اور دوسرے بھی خود اس کے حقوق کو پامال کریں گے جس کے نتیجہ میں نہ امن وسکون رہے گا، اور نہ ہی آرام وآسائش باقی رہے گا نہ تو سعادت اخروی حاصل ہوسکے گی اور نہ ہی کوئی شخص اپنی فطری خواہشوں کو حاصل کرسکتا ہے۔

بنا برایں اسلامی فکر کے تحت ہمارے تمام حرکات وسکنات، چاہے وہ انفرادی زندگی سے مربوط ہوں چاہے سماجی اور معاشرتی زندگی سے، سب کے لئے احکام وقوانین موجود ہیں، حتی کہ بین الاقوامی روابط کے لئے بھی اصول وقوانین پائے جاتے ہیں، اور اسلام انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کے لئے قانون رکھتا ہے ان ہی میں سے شہری اور سماجی قوانین بھی ہیں، اسلام میں حتی انسانوں کے خیال وتصورات کے لئے بھی قانون موجود ہے اور اسلام کے نزدیک تمہیں یہ حق نہیں ہے کہ جو چاہو اپنے دل میں سوچو، اور جس

طرح کا خیال چاہو اپنے دل و دماغ میں لاؤ، اور دوسروں کے بارے میں بدگمانی سے کام لوکیونکہ : (إن بَعض الظَّن إثمٌ [1]) یقیناًبعض گمان گناہ ہیں،جس طرح حفظان صحت کے اصولوں کا خیال نہ کرنے سے بیماریاں پیدا ہوجاتی ہیں،اور انسان اور معاشرہ کی سلامتی خطرہ میں پڑجاتی ہے،اسی طرح قوانینِ اسلام کا لحاظ نہ کرنے سے سماج اور معاشرہ کو نقصان پہونچتا ہے۔

یہ جو بات کہی گئی ہے کہ انسانی زندگی کا کوئی بھی پہلو اسلامی قوانین کے دائرے سے باہر نہیں ہے،یہاں تک کہ انسان کو اپنے دل و دماغ، خیال اور فکر پر بھی کنٹرول رکھنا ضروری ہے، اور اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ انسان کی آزادی چھین لی گئی ہے، بلکہ آزادی سے صحیح فائدہ اٹھانے کا سلیقہ سکھایا گیا ہے اس کے راستہ میں ایک چراغ رکھ دیا گیا ہے،کہ وہ آزادی واختیار سے صحیح طور پر فائدہ اٹھائے،البتہ ان قوانین میں وہ امور جو انسان کی اجتماعی زندگی سے تعلق نہیں رکھتے ہیں اس کے لئے کوئی دنیوی سزا نہیں ہے صرف اخروی سزا ہے یعنی جو شخص اپنے کسی مومن بھائی کے بارے میں بدگمانی سے کام لیتاہے اسے دنیا میں سزا نہیں ملتی صرف آخرت میں سزاء ملتی ہے۔

لیکن اگر اجتماعی قوانین واحکام کی مخالفت ہو اور معاشرتی مصلحتوں کو پائمال کیا جائے تو دنیوی سزائیں رکھی گئی ہیں اور یہ دنیاوی سزائیں دراصل تمام شہری قوانین کا لازمہ ہیں، صرف اسلام کے شہری قوانین پر منحصر نہیں ہے جو بھی قانونی نظام،معاشرہ میں نظم ونسق قائم کرنے کے لئے قانون بنانا چاہے وہ مجبور ہے کہ خلاف ورزیوں اور قانون شکنیوں کے لئے بھی سزا ئیں معین کرے۔ خلاصۂ کلام یہ کہ سماجی زندگی بغیر ایسے قوانین کے جو آزادیوں کو کنٹرول میں رکھے، منظم نہیں رہ سکتی، جس قدر سماجی روابط بڑھیں اور پھیلیں گے اتنا ہی زیادہ سماجی قوانین کی ضرورت اور اس کے نفاذ کی ضمانت بڑھتی چلی جائے گی۔

---

[1] سوره حجرات آيت ١٢۔

گیارہویں تقریر

اہم سیاسی مسائل پر گہری تحقیق کی ضرورت

ہم اپنی گذشتہ تقریروں میں اسلام کے سیاسی نظریہ پر گفتگو کرتے ہوئے چند مسائل کی طرف اشارہ کر چکے ہیں اور عرض کیا ہے کہ اس بارے میں دو طریقوں سے بحث کی جاتی ہے: بحث کا پہلا طریقہ جَدلی ہے جس میں اس بات کا خیال کئے بغیر کہ مخاطب مسلمان ہے، سنی ہے شیعہ ہے یا کسی اور مسلک سے وابستہ ہے، جن اصولوں اور ابتدائی سرچشموں پر دونوں فریق توافق وتفاہم رکھتے ہوں مسلمہ اصول اور بنیاد قرار دیکر ان ہی محور پر بحث کی جاتی ہے اور ان ہی مقدمات پر اعتماد کرتے ہوئے آخر تک بحث کو آگے بڑھایا جاتا ہے۔

بحث کا دوسرا طریقہ دلیلوں پر استوار ہے، جس میں بڑے ہی منظم انداز سے عقلی دلیلیں پیش کی جاتی ہیں اور گفتگو کے تمام پہلو یہاں تک کہ مقررہ اصول و قواعد کی بھی تحقیق و جستجو کی جاتی ہے اور یقینی وقطعی مسلمات پر اعتماد کرتے ہوئے اپنے مدعا کے لئے عقلی اورنا قابل انکار دلیلیں قائم کی جاتی ہیں۔

اگرچہ برہانی بحثیں خستہ کنندہ ہوتی ہیں اور علمی حلقوں اور اعلیٰ درس گاہوں کے لئے ہی مناسب ہیں اور ان کے سننے والے بھی خاص افراد ہونے چاہئے،لیکن اس بات کو بھی مدنظر رکھنا چاہئے کہ ہمارا معاشرہ تہذیبی ارتقا کی طرف گامزن ہے اوراس نے معلومات کی سطح بلند کرنے کے لئے اہم قدم اٹھائے ہیں اور آج ہمارے بہت سے جوانوں کی معلومات خاص طور سے دینی اور سیاسی مسائل میں زمانۂ گذشتہ کے بعض دانشوروں سے بھی زیادہ ہے اسی وجہ سے مدلل قسم کی گہری برہانی مباحث کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تاکہ ہمارے معاشرہ کا فکری اور ثقافتی معیار، خاص طور سے ان مسائل میں جو ہمارے اصل نظام اور اسلام کے بنیادی عقائد سے متعلق ہیں،اس میں اور زیادہ ترقی ہو، ان میں شکوک و شبہات کا مقابلہ اور جواب دینے کی قوت پیدا ہو،اور دوسروں کے سفتوں

سے متاثر نہ ہوں،چنانچہ ہماری کوشش ہوگی کہ مسلمہ اصول وضوابط سے مربوط مطالب پیچیدہ قسم کی علمی اور فلسفی اصطلاحوں کے بغیر آسان طریقہ سے بیان کریں، اور ان عقائد کی عقلی بنیادوں کو ذہن میں راسخ اور مستحکم کریں تاکہ وہ شکوک و شبہات کے سیلاب سے محفوظ رہیں۔

ایک حکومت اور سیاسی نظام کا بنیادی ترین کام یہ ہے کہ وہ معاشرہ میں حقوق و فرائض کا تعین کرنے والے شہری قوانین پر عمل در آمد کی ضامن اور پشت پناہ ہو،اوریہیں سے اخلاقی قوانین کا آئینی اور سیاسی قوانین سے فرق واضح ہوجاتا ہے، اخلاقی قوانین اس لحاظ سے کہ اخلاقی ہیں ان پر عمل درآمد کے لئے الگ سے کسی ضامن و پشت پناہ کی ضرورت نہیں ہوتی، ہر انسان اپنے عقائد اور معنوی پہلوؤں کے تحت ان کی پابندی کرتا ہے اور اس پر عمل کرتا ہے، لیکن شہری قوانین کے لئے الگ سے ایک ضامن وپشت پناہ کا ہونا ضروری ہے شہری قوانین کی خاصیت یہ ہے کہ وہ معاشرہ یا کسی سرکاری ادارہ کے ذریعہ عوام پر مسلط کئے جاتے ہیں یہاں تک کہ اگر کوئی ان کا معتقد نہ ہو تو بھی ان قوانین کی پابندی کرنا ضروری ہے اور اگر کوئی ان قوانین کو ماننے سے گریز کرے تو حکومت کا فریضہ ہے کہ اس کے خلاف طاقت وقوت سے کام لے اور اگر ضرورت پڑے تو ان قوانین کے نفاذ کیلئے وہ اسلحہ کا بھی استعمال کرسکتی ہے۔

اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ انقلاب کے بعد خاص طور سے اندرونی جھڑپوں اور دہشت گردانہ کاروائیوں سے بچنے کے لئے حکومت کے ذمہ داروں نے مسلسل قانون کی پابندی کا نعرہ لگایا ہے یہاں تک کہ انقلاب کے ابتدائی برسوں میں ایک سال کا نام ہی ''قانون کا سال'' رکھ دیا گیااور اب تک تمام حکومتوں نے اس نعرے کا استعمال کیاہے، خصوصاً دوم خرداریعنی ۲۳ مئی ۱۹۹۷ء کو بر سر اقتدار آنے والی موجودہ حکومت کا تو ایک اہم اور بنیادی ترین نعرہ ملک میں پوری طرح قانون نافذ کرنا اورقانون کی خلاف ورزی کی روک تھام کرنا ہے، لہٰذا سب سے پہلے آئین اور اس کی ثانوی حیثیت کے بارے میں بحث ضروری ہے تاکہ اس بارے میں جو سوالات اورشکوک و شبہات پائے جاتے ہیں ان کا اطمینان بخش جواب دیا جا سکے۔

قانون کی سرکاری حیثیت اور دائرۂ کار

وہ بہت سے سوالات جو لوگوں کے لئے پریشان کن ہیں ان میں سے کچھ اس طرح کے ہیں کہ قانون پر کس حد تک اعتبار اور عمل کیا جاسکتا ہے اور اس کے اعتبار کی بنیاد کیا ہے؟ اور بنیادی طور پر قانون کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اور کون سا قانون اس قدر معتبر ہے کہ سوفی صدی اس کی اطاعت اور پابندی ضروری ہے؟ بحث کو آگے بڑھانے اور ان سوالوں کے جوابات دینے سے پہلے اس نکتہ کی طرف اشارہ کردینا لازم ہے کہ ہم مسلمانوں کی نظر میں جو اسلامی نظام کے تابع ہیں۔

اور جن کے لئے حضرت امام خمینیؒ او رمقام معظم رہبری حضرت آیت اللہ العظمیٰ خامنہ ای مدظلہ العالی کے اقوال وارشادات حجت کی حیثیت رکھتے ہیں ۔کسی قسم کا کوئی شک وشبہ باقی نہیں رہ جاتا چاہے اسلامی جمہوریہ ایران کے قوانین ہوں یا حکومتی کابینہ نے پاس کئے ہوں یہاں تک کہ وہ دستور وضوابط جو مختلف وزارتخانوں کی طرف سے جاری کئے جاتے ہیں سب کے سب لازم العمل ہیں ،اور امام خمینیؒ کے حکم کے مطابق جنھوں نے فرمایا ہے اسلامی حکومت کے تمام قوانین وضوابط لازم الاطاعت ہیں ، ہمارے لئے ان سب پر عمل کرنا ضروری ہے، اور ہم (علماء بھی)ذاتی طور پر اسلامی جمہوریہ کے چھوٹے سے چھوٹے قوانین ودستور کی بھرپور رعایت کرتے ہیں حتیٰ وہ کسی مسئلہ میں ہمارے فقہی فتوے کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔

اس بارے میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ اسلامی حکومت کے احکام و قوانین کی رعایت اور ولی امر مسلمین کی اطاعت ہم سب پر واجب ہے، اب اگر ہم قانون کے معتبر ہونے کے معیار ومیزان کے بارے میں سوال کرتے ہیں تو کسی کو یہ وہم نہ ہو کہ ہم اسلامی حکومت کے قوانین کے لازم الاطاعت ہونے کے بارے میں شک کررہے ہیں بلکہ ہمارا مقصد ان فکری بنیادوں اور اساسوں کو قوی و مستحکم کرنا ہے کہ جس کے تحت اسلامی حکومت کی اطاعت کرنا لازم وضروری ہے۔

ہم اس سوال کی وضاحت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ اسلامی حکومت کے قوانین کی اطاعت کیوں کریں؟ یہ طے ہونا چاہئے کہ قانون کے معتبر ہونے کی بنیاد کیا ہے؟ تاکہ جب حکومت کسی دن سرکاری چھٹی کا اعلان کرے یا قوانین ومقررات میں آنے والے افراد کے لئے ٹیکس کی شرح معین کرے یا عام حالات میں ٹیکس کے کچھ احکام نافذ کرے یا جنگ کے مانند غیر معمولی حالات میں عمومی سطح پر رضا کارانہ بھرتی کا اعلان کرتے ہوئے مخصوص قوانین جاری کرے تو عوام الناس کو یہ معلوم ہو کہ وہ قوانین و مقررات پر کیوں عمل کریں، کیونکہ صرف اتنا کہ کوئی حکم صادر کردے اور عوام الناس اس کی پیروی کرنے لگے اور اس پر عمل شروع کردے یہ کافی نہیں ہے۔

دوسری طرف ہماری بحث ''سیاسی فلسفہ'' سے مربوط ہے، قانون اس کے معتبر ہونے اور اس کی اطاعت کے لازم ہونے کا مسئلہ بھی سیاسی نظام کی بنیادی بحثوں میں سے ہے اور یہ صرف اسلامی نظام سے مخصوص نہیں ہے، ''فلسفۂ سیاست اور فلسفۂ حقوق'' سے جو لوگ واقفیت رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ان دونوں شعبوں کے محققین اور ماہرین نے معارفِ بشری کے اس مسئلہ کو روشن کرنے کی بڑی حد تک کوششیں کی ہیں اور مختلف نظریات مناسب دلیلوں کے ساتھ پیش کئے ہیں، لیکن اب تک وہ کسی ایسے آخری نتیجہ پر نہیں پہونچ سکے ہیں جو پوری طرح مدلل اور قابل دفاع ہو، اور قانون کے معتبر ہونے کے سلسلہ میں ان محققین کے افکار و نظریات مندرجہ ذیل تین اہم نظریوں میں خلاصہ کئے جا سکتے ہیں:

الف: نظریۂ عدالت بعض محققین نے قانون کے معتبر ہونے میں عدل و انصاف کو معیار قرار دیا ہے، اور کہا ہے کہ اگر کوئی قانون عدالت اور عوام کے حقوق کی رعایت کی بنیاد پر بنایا جائے گا تو وہ معتبر ہوگا اور لوگوں پر اس کی اطاعت واجب ہوگی، لیکن اگر قانون انصاف کی بنیاد پر نہ بنایا گیا ہو بلکہ نا انصافی پر استوار ہو تو وہ قانون معتبر نہیں ہے۔

ب: معاشرے کی ضرورتوں کی تکمیل دوسرا نظریہ یہ ہے کہ قانون کے معتبر ہونے کا معیار جو معاشرے کی ضروتوں کو پورا کرتا ہے، کیونکہ معاشرہ کے افراد اپنی اجتماعی زندگی کے سبب مخصوص ضرورتیں رکھتے ہیں ان میں ان کا کوئی شخصی اور ذاتی پہلو نہیں ہوتا، اگرچہ تمام لوگوں کو خود اپنی جگہ ان ضرورتوں کا سامنا کرنا پڑسکتا ہے لیکن اصل میں وہ ضرورتیں اجتماعی ہیں اور اجتماعی زندگی کی صورت میں وہ ضرورتیں پیش آتی ہیں،مثال کے طور پر حفظان صحت کی رعایت کرناایک معاشرتی ضرورت ہے اگرچہ ہر شخص اگر چاہے تو اپنی شخصی زندگی میں گھر کی چاردیواری کے اندر رہ کر بھی اس کی رعایت کرسکتا ہے۔

لیکن صحت عامہ کے اصولوں کی رعایت کرنے کی خاطر ہر شخص کو اس کے لئے آمادہ کرنا ایک مشکل کام ہے اور اس بات کی ضرورت محوس ہوتی ہے کہ شخصی فیصلے اور اقدام سے بالا تر کوئی ادارہ یا اجتماعی ڈھانچہ موجود ہو جو عمومی ضرورتوں کو پورا کرسکے. مثال کے طور پر اگر معاشرہ میں کوئی وبا یا طاعون جیسی خطرناک بیماریاں پھیل جائیں تو ان بیماریوں پر کنٹرول کرنے کے لئے فردی اقدامات سودمند ثابت نہیں ہوسکتے بلکہ اس چیز کی ضرورت پیش آئے گی کہ حکومتی پیمانہ پر کسی ادارہ کی طرف سے بیماری پر کنٹرول صحت عامہ کی حفاظت کے لئے تمام لوگوں کو ٹیکے وغیرہ لگائے جائیں چنانچہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایسے قوانین وضع کرے، اگرچہ وہ ایک خاص موسم کے لئے کیوں نہ ہوں لوگوں کو اس بات کا پابند بنایا جا سکے کہ فلاں مدت تک سب کو ٹیکے لگوالینا چاہئے، (جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کرچکے ہیں کہ قانون سے ہماری مراد ہر طرح کے قوانین و دستور ہیں جو مختلف سرکاری سطحوں پر لازم العمل دستور و آئین کی صورت میں جاری کئے جاتے ہیں)قارئین کرام !جیسا کہ آپ نے ملاحظہ کیا چونکہ حفظان صحت عامہ معاشرہ کی ضرورت ہے

اور اس کی رعایت کرنا ایک اجتماعی ضرورت ہے، لہٰذا اس ضرورت کی تکمیل کے لئے کچھ خاص قوانین بنائے گئے ہیں،اور ہر ایک پر ان قوانین کی پابندی ضروری ہے اسی طرح ماحولیات کی حفظ و سلامتی اور رفاہ عامہ کی تکمیل کے لئے حکومت کی طرف سے کچھ ادارے قائم کئے گئے ہیں جن کا کام ہی ان ضرورتوں کو پورا کرناہے اور عوام الناس پر بھی ان اداروں کی طرف سے صادر

ہونے والے قوانین اور دستور العمل کی پیروی لازم ہے، نتیجہ کے طور پر حکومت کی طرف سے منظور شدہ ادارے سرکاری ہوں یا نیم سرکاری جیسے تعلیم و تربیت علاج ومعالجہ اور حفظان صحت کے ادارے، مختلف وزارتخانوں، او رمیونسپلوں سے وابستہ ادارے ،ان سب کے دستور و ضوابط جو معاشرہ کی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے جاری کئے جاتے ہیں اسی بناپر شرعی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کے مطابق ہر فرد پر عمل کرنا واجب ہے۔

ج: عوام کیا چاہتے ہیں بعض نے قانون کے معتبر ہونے کا معیار عوام کی خواہش کو قرار دیا ہے ان کے نظریہ کے مطابق قانون معاشرہ کی خواہشوں کو پورا کرنے کے لئے ہے، لہٰذا جب بھی عوام کوئی مطالبہ حکومت اور قانون بنانے والے اداروں سے کرے ارکان حکومت اور پارلیمنٹ میں عوام کے نمائندوں کا فرض ہے عوام کی خواہش کے مطابق قانون بنائے، اورچونکہ قانون لوگوں کی خواہش کو مدنظر رکھ کر بنایا گیا ہے، معتبر ہے اور عوام کا فریضہ ہے کہ اس کی پیروی اور اس کی حفاظت کریں اور اس پر عمل کرنے کی بھرپور کوشش کریں، درحقیقت عوام کی خواہش کا عملی مجسمہ پارلیمنٹ میں ایسے نمائندوں کا منتخب ہونا ہے جو عوام کی خواہش اور ضرورت کے مطابق قوانین بنائیں، اس بناپر اگر عوام کے منتخب نمائندے قانون بنانے کا حق نہ رکھتے ہوں تو عوام کی طرف سے ان کاانتخاب بے فائدہ ہوگا، اور اگر ان کو قانون بنانے کا حق ہو لیکن ان کے ذریعہ بنائے گئے قانون لازم الاجراء نہ ہوں تو قانون سازی کا عمل عبث اور فضول ہوگا۔

یہ جو کچھ بیان کیا گیا ان تمام نظریوں کا خلاصہ ہے جوقانون کے اعتبار کے سلسلہ میں قانون وسیاست کے فلاسفہ نے پیش کئے ہیں، ظاہرہے ہم مسلمان ہونے کی حیثیت سے قانون کے معتبر ہونے کا معیار خداوندعالم کی رضا اور طلب کومانتے ہیں، اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ جس چیز کا خداوند عالم نے حکم دیا ہے وہی قانون شمار کیا جائے اور اسی کو معتبر سمجھا جائے، البتہ یہ آخری نظریہ وہی لوگ قبول کریں گے جو خدااور اس کے دین کو قبول کرتے ہیں ۔

(ہم مذکورہ نظریوں کی تفصیلی طور پر علمی اور اکیڈمی تحقیق وتنقید اور تجزیہ و تحلیل سے صرف نظر کرتے ہوئے صرف اسی حد تک تحقیق وتنقید پر اکتفاء کررہے ہیں کہ جس کو عام افراد بھی سمجھ سکتے ہیں)

پہلے نظریہ کا جائزہ   پہلے نظریہ میں بیان کہا گیا ہے کہ قانون کے معتبر ہونے میں عدل وانصاف کی رعایت ضروری ہے، یہاں ایک بنیادی سوال جودنیا کے بڑے بڑے محققین نے پیش کیا ہےاور اس کے جواب میں بڑی بڑی کتابیں لکھی ہیں یہ ہے کہ عدل وانصاف ہے کیا؟اور عدالت کیسے متحقق ہوتی ہے؟ چونکہ عدالت کا مفہوم سب کے لئے بالکل واضح ہے یہ سوال سیاست اورقانون کے نظریہ پردازوں کے لئے اتنا وسیع اور گنجلک ہوگیا ہے کہ وہ اس میں پھنس کر رہ گئے ہیں اور اسی لئے انھوں نے اپنی اپنی عدالت کے مختلف معانی و مطلب نکالے ہیں۔

آیا،اگر تمام لوگ معاشرہ کے سرمایوں سے برابر فائدہ اٹھائیں تو انصاف قائم ہوجائے گا یا نہیں؟یعنی اگر ایک سیاسی نظام ایسے تمام ذرائع اوروسائل فراہم کردے کہ تمام افراد گھر، لباس اورروزی روٹی وغیرہ کے اعتبار سے بالکل برابر کی زندگی بسر کریں تو عدالت برقرار رہے گی ورنہ ظلم و نا انصافی پیش آئے گی؟اسی طرح کی فکر ''مارکسزم'' میں پیش کی گئی او رنتیجہ میں ''کمیونزم'' کا نظریہ وجود میں آیا۔

اور اس نظریہ کو پیش کرنے والوں نے کم سے کم اپنے نعروں کی حد تک دعویٰ کیاکہ ہم ایک ایسے معاشرہ کے لئے زمین فراہم کرنا چاہتے ہیں کہ جس میں کوئی طبقہ بندی نہ ہو، اور اس معاشرہ کا ہر فرد اپنی طاقت وقدرت کے لحاظ سے کام کرے، اور اپنی ضرورت کے مطابق استفادہ کرے، لیکن جلد ہی وہ لوگ اس نتیجہ پر پہونچے کہ اس نظریہ کو عملی جامہ نہیں پہنایا جاسکتا، کیونکہ مذکورہ نظریہ کی راہ میں بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا اور ان ہی مشکلات میں سے ایک انصاف اور آزادی کا ٹکراؤ ہے،اسی وجہ سے ان لوگوں نے اپنے نظریہ پر نظر ثانی کی اور اپنے نعروں میں کچھ تنزل کرکے سوشلسٹ حکومت پر راضی ہوگئے

اگر چہ ایک کمیونسٹ حکومت کو ہی انھوں نے نمونہ اور آئیڈیل قرا ر دیا تھا جس وقت مارکس نے دیکھا کہ لوگوں کی اکثریت خاص طور پر مزدوروں اور کسانوں پر ظلم ہورہا ہے تو اس نے اس نا انصافی اور ظلم سے منع کرتے ہوئے کہا کہ ہم کو وہ راہ اپنانی چاہئے کہ حقوق کے اعتبار سے تمام افراد یکساں اور برابر ہو یعنی ایک ''نئے میعار'' کے تحت ایسا غیر طبقاتی، مالی اور بہشت نما معاشرہ وجود میں آئے کہ جس میں سب کے درمیان بطور کامل مساوات قائم ہو اور پھر کچھ مسلمانوں نے جنھوں نے اسلامی افکار کے ساتھ کمیونستی طرز فکر کو مخلوط کرنے کی کوشش کی ہے اس میں ایک اور لفظ توحیدی کا اضافہ کردیا اور کہا ایک ''نئے توحیدی میعار'' کے تحت سب لوگ ایک جیسے ہو جائیں اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا ''عدالت'' کا مطلب یہی ہے کہ تمام افراد ایک جیسے اور برابر ہو جائیں؟

اس نظریہ کے برخلاف بعض کے خیال میں عدالت کا مطلب یہ ہے کہ ہر فرد اپنی محنت وصلاحیت کے مطابق معاشرتی سرمایوں اور وسیلوں سے استفادہ کرے، یعنی اگر کوئی شخص ایک کام انجام دیتا ہے تو اس کے کام کی اہمیت کے مطابق مزدوری ملنا چاہئے،اب اگر کوئی شخص کاہلی اور سستی کرے اور کوئی کام انجام نہ دے تو اس کو دوسروں کے برابر استفادہ کا حق نہیں ہے اور کامل مساوات قائم کرنے کے نام پر سماجی مفادات میں اس کو شریک کرنا درست نہیں ہے یہ عدالت اسی وقت ایجاد ہوگی کہ جب وہ تمام افرد کہ جنھوں نے کوئی کام انجام دیا ہے اپنے کام کے مطابق فائدہ اٹھائیں اب اگر کوئی اپنی محنت وکوشش سے زیادہ کام کرے اور اس کو اس اضافی کام کا کوئی معاوضہ نہ ملے تو یہ اس کے حق میں ظلم ہوگا۔

اسلامی قوانین کی برتری

بغیر کسی شک وشبہ کے عدالت کی دونوں تعریفیں جو نمونہ کے طور پر عرض کی گئیں مکمل طور پر ایک دوسرے سے مختلف اور مقام عمل میں لفظ انصاف کے ساتھ میل نہیں کھاتیں اور اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ الٰہی و توحیدی احکام و عقائد کے ساتھ سازگار نہیں ہیں، نمونہ کے طور پر ہمارے دین اسلام میں بہت سے ایسے احکام ہیں جو خود ہمارے عقائد کے بنیادی سرچشموں کے مطابق معاشرہ کے لئے سب سے بہتر اور سب سے زیادہ مفید ہیں اور مسلمہ طور پر عدالت کے مطابق ہیں لیکن دنیا کے بہت سے افراد

ان کو نہیں مانتے اور ان کو عادلانہ نہیں سمجھتے، مثال کے طورپر اسلامی قوانین میں بہت سے مقامات پروراثت کے مسئلہ میں مرد وعورت کے درمیان فرق رکھا گیا ہے اگرچہ بعض صورتوں میں دونوں کی میراث میں مساوات اور برابری بھی رکھی گئی ہے اور وہ فرق قرآن کی نص صریح کے مطابق یہ ہے کہ عورت کو مرد کی ملنے والی میراث کا نصف ملے گا: (فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الأُنْثَيَيْنِ.[1]) ''مرد کو عورت کے حصہ کا دوگنا ملے گا''،بلاشبہ جو افراد اسلام کے فکری اور اعتقادی سر چشموں کی معرفت نہیں رکھتے وہ اس طرح کے قانون کو ظالمانہ سمجھتے ہیں، کیونکہ ان کے نظریہ کے مطابق خداوند عالم مرد وعورت کے درمیان امتیاز کا قائل ہواہے، دوسری طرف گھر کی مشترکہ زندگی میں اسلام نے مرد کا فریضہ قرار دیاہے کہ گھریلو زندگی کے تمام اخراجات یعنی بیوی بچوں کے کھانے پینے پہننے اور رہائش کی تمام چیزیں اسی کو ہی فراہم کرنا ہے، اور اسلامی نقطۂ نظر سے عورت کو یہ پورا حق حاصل ہے کہ وہ اپنی تمام آمدنی خود جمع کرے اس کی میراث اور آمدنی پوری طرح اسی سے تعلق رکھتی ہے، اور اپنی زندگی کی ضروریات کے لئے خرچ کرنا قطعی لازم نہیں ہے حتی وہ گھر کی تمام خدمات جیسے لباس دھونے، کھانا پکانے، یہاں تک کہ بچہ کو دودھ پلانے تک کی مزدوری لینے کا حق رکھتی ہے، یقیناً جو افراد نزدیک سے اسلام کو نہیں جانتے جب اس طرح کے احکام کو دیکھتے ہیں اگر انصاف سے کام بھی لیں تویہی کہتے ہیں کہ اسلام نے عادلانہ قانون نہیں بنائے ہیں۔

ان تہمتوں سے بچنے اور اسلامی احکامات کی مناسب توجیہ اور وضاحت نیز ثابت کرنے کے لئے کہ اس طرح کے قوانین منصفانہ ہیں یا نہیں؟ ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ ہمارے یہاں عدالت کی کیا تعریف کی گئی ہے، کیونکہ اگر عدالت کے معنی مساوات ہوں تو تمام قوانین کو غیر منصفانہ کہنا ہوگا اس لئے کہ ان میں مساوات کی رعایت نہیں کی گئی ہے، اب اگر یہ طے ہے کہ عدالت کے کوئی اور معنی ہیں تو یہ دیکھنا ہوگا کہ وہ معنی کیا ہیں؟ یقیناً عدالت کی حقیقت کو سمجھنا اور بروئے کار لانا آسان کام نہیں ہے اسی لئے بڑے بڑے فلاسفہ نے

[1] سورہ نساء آیت ۱۷۶۔

عدالت کے بارے میں وسیع پیمانے پر تحقیقات کی ہیں اور ان میں سے بعض نے عدالت اورقانون و آزادی کے درمیان پائے جان والے رابطہ کی تحقیق کی ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ اگر ہم قانون کے معتبر ہونے کا معیار عدالت کو قرار دیں تو ہماری مشکل رفع نہیں ہوتی اورہمارے سامنے سب سے پہلا سوال یہ آتا ہے کہ عدالت سے اس کے کون سے معنی مراد ہیں؟ کیونکہ ہر ایک اپنے لحاظ سے عدالت کی تعریف اور تفسیر کرتا ہے، اور اسی کی بنیاد پر قانون کو عادلانہ اور معتبر سمجھتا ہے اور اس پر عمل کرنا ضروری قرار دیتا ہے اس کے جواب میں دوسرا شخص عدالت کی اپنی تعریف کے تحت اس قانون کو غیر عادلانہ اور غیر معتبر سمجھتا ہے۔

دوسرا نظریہ عملی نہیں ہےقانون کے معتبر ہونے کا دوسرا معیار یہ تھا کہ اس سے معاشرہ کی ضرورتوں کو پورا کیا جا سکے،یقیناًیہ معیار کسی حدتک زیادہ واضح اور قابل قبول ہے کیونکہ سبھی افراد،کم وبیش معاشرتی ضروتوں کو سمجھتے ہیں، اور جانتے ہیں کہ معاشرہ کوکن چیزوں کی ضرورت ہے، خاص طور سے جس معاشرہ میں ہم زندگی بسر کررہے ہیں اور ہم سے پہلے ہمارے آباو اجداد زندگی بسر کرتے رہے ہیں یقیناًوہ قانون اور حکمراں موجود تھے جو ضرورتوں کو سمجھتے تھےاور ان کو معلوم تھاکہ کس طرح معاشرہ کی ضرورتوں کوپورا کیا جاسکتا ہے۔

اس نظریہ کی مشکل یہ ہے کہ معاشرہ کی ضرورتوں کو مختلف طریقوں سے پورا کیا جاسکتا ہے اور یہی چیز قانون بنانے میں نظریوں کے فرق کا سبب بن جاتی ہے. مثال کے طور پر کسی شہر کو خوبصورت بنانا اور صاف ستھرا رکھنا ایک عمومی ضرورت ہے اور اس ضرورت کو ضرور پورا ہونا چاہئے، لیکن اس کا بجٹ کہاں سے آئے؟ کیا خاندانوں کے اعتبار سے اس کو تقسیم کر کے بجٹ پوراکیاجائے؟ یعنی ہرگھر کا یہ فریضہ قرار دیا جائے کہ وہ شہر کی خوبصورتی اور اس کو صاف وستھرا رکھنے کی بابت اصلی بجٹ سے خرچ کا ایک حصہیعنیکچھ رقم خود ادا کرے. دوسرا نظریہ یہ ہے کہ شہر کے ان اخراجات کودولتمندوں سے پورا کیا جائے یعنی جو عام

طور پر ٹیکس وغیرہ کے ذریعہ اور سرمایہ داروں سے وصول کیا جاتا ہے، اور شہر کے پسماندہ علاقوں میں بسنے والے غریب لوگ جو معمولی جھوپڑیوں میں رہتے ہیں اس ٹیکس کے ادا کرنے سے معاف ہوتے ہیں۔ اسی سلسلے میں تیسرا نظریہ یہ ہے کہ حکومت کا فریضہ ہے کہ وہ یہ کام قومی سرمایوں یعنی زمین سے نکلنے والے تیل، گیس، لوہے، اور تانبے وغیرہ جیسی مانند معادن سے حاصل شدہ رقم سے معاشرہ کی ضرورتوں کو پورا کرے۔

اب چونکہ قانون کے معتبر ہونے کا معیار معاشرہ کی ضرورتوں کو پورا کرنا قرار دیا گیا ہے اور مندرجہ بالا تمام نظریوں میں الگ الگ طریقوں سے معاشرہ کی ضرورتوں کو پورا کرنے کی بات کہی گئی ہے تو سوال یہ ہے کہ کس نظریہ کو عملی جامہ پہنایا جائے؟ اور اسے قانون کے معتبر ہونے کا معیار سمجھا جائے؟ اور عوام ان میں سے کون سی راہ کو صحیح اور زیادہ منصفانہ سمجھتے ہیں؟ لہٰذا یہ معیار بھی اپنی جگہ تنہا قانون کے معتبر ہونے کے لئے کافی نہیں ہے۔

تیسرے نظریہ کی خامیاں اور ضرورتوں کا دائرہ تیسرے معیار کے مطابق صرف وہی چیزیں معتبر ہوں گی جس کو عوام چاہتے ہیں اور جو کچھ وہ چاہیں اسی کو قانون کی صورت دینا چاہئے، یہاں سوال یہ پیش آتا ہے کہ کیا معیار تمام لوگوں کی سو فی صدی خواہش کو قرار دیا جائے؟ تو یقیناً ایسا ممکن نہیں ہوسکتا کہ تمام لوگ کسی ایک چیز پر متفق ہوجائیں، شاید لاکھوں قوانین کے درمیان کوئی ایک قانون بھی ایسا نہ ملے کہ جس پر دنیا کے تمام افراد سو فی صدی موافقت رکھتے ہوں.

اور ہر ایک قانون، چاہے عمومی طور پر لوگوں کا من پسند ہی کیوں نہ ہو اس کی بھی ایک دو فی صدی افراد ضرور مخالفت کرتے ہیں، اس صورت میں مخالفت کرنے والوں کے لئے قانون کے معتبر ہونے کا معیار کیا ہوگا؟ دوسرا نکتہ یہ ہے کہ جو کچھ عوام چاہتے ہیں اگر وہ عدل وانصاف کی میزان پر پورا نہ اترے تو کیا وہ معتبر ہے یا نہیں؟ اسی طرح اگر عوام کا مطالبہ دوسرے معیار کے ساتھ اختلاف رکھتا ہو، یعنی عوام کا مطالبہ معاشرہ کی ضرورتوں کو پورا کرنے والی فہرست میں نہ آتا ہو تو کیا اسے معتبر قرار دیں گے؟ اگر

کسی قانون کے ذریعہ لازم کیا جارہا ہو کہ عوام سے ایک رقم وصول کی جائے تو شاید اکثر افراد اس کی مخالفت کریں کیونکہ جب بھی نئے ٹیکس لگائے جاتے ہیں تو عوام اس کو منہ بنا کر ہی بہ مشکل قبول کرتے ہیں عام طور پر کسی بھی جگہ ٹیکس کے قوانین کا عوام کی طرف سے خوشی سے استقبال نہیں کیا جاتا، جب بھی کوئی حکومت معاشرہ کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے رقم وصول کرتی ہے، عوام بڑی مشکل سے اس کو قبول کرتے ہیں۔

اس صورت میں، اگر لوگوں کی خواہش کے مطابق عمل کرنا چاہیں تو معاشرہ کی ضرورتیں پوری نہیں ہوسکتیں، جبکہ ایک نظریہ کے تحت فرض یہ کیا گیا تھا کہ قانون کے معتبر ہونے کا معیار معاشرہ کی ضرورتوں کو پورا کرنا ہے،سوال یہ ہے جب لوگوں کا مطالبہ عمومی ضرورتوں کی تکمیل کے خلاف ہو تو معاشرہ کی مصلحتوں کو مد نظر رکھا جائے گا یا لوگوں کی خواہش کو معیار قرار دیں گے؟ بلاشبہ جو لوگ قانون بنانے اور معاشرہ کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے ذمہ دار ہیں، عملی طورپر دشواری ان کے سامنے ہے اور جانتے ہیں، کہ اگر ان موقعوں پر لوگوں کی مرضی کے مطابق عمل کیا جائے تو کام آگے نہیں بڑھ سکتا، (البتہ یہ بحث ''جمہوریت'' کی نوعیت کی طرف پلٹتی ہے جس پر ہم آئندہ تفصیل سے گفتگو کریں گے)

بہر حال اس طرح کے اعتراضات قانون کے معتبر ہونے کے مذکورہ معیارات پر کئے گئے ہیں، البتہ ہماری نظر میں ان سب سے زیادہ اہم اور بنیادی اعتراض کی بات یہ ہے کہ ان معیارات میں جو مصلحتیں اور ضرورتیں بیان ہوئی ہیں وہ صرف مادی ضرورتیں ہیں اور عام تصور یہی ہے کہ معاشرہ میں انسان کی انہیں مادی ضرورتوں کا پوری ہونا ضروری ہے؟ کیا حکومت کا صرف یہی وظیفہ ہے کہ وہ لوگوں کی مادی اور دنیاوی ضرورتوں کو پورا کرے یا حکومت کے دوسرے فرائض بھی ہیں؟جن کا دائرہ اس دنیا سے وسیع تر ہے اس سے واضح الفاظ میں عرض کیا جائے کہ ہم تمام مسلمان اور وہ تمام افراد جو ادیان الٰہی میں سے کسی بھی دین کو مانتے ہیں سب کا عقیدہ یہ ہے کہ انسان دو چیزوں سے مرکب ہے ایک بدن اور دوسرے روح، علاوہ ازیں زیادہ تر بلکہ تمام ادیان کا نظریہ یہ ہے کہ روح بدن سے افضل واشرف ہے اور بدن کی حیثیت روح کے لئے ایک خادم کی سی ہے.

ان سب کا عقیدہ یہ ہے کہ بدن کو صحیح دیکھ بھال اور صفائی کی ضرورت ہے اس کو بیمار ہونے سے بچانا ضروری ہے، اگر مریض ہوجائے تو اس کا علاج کرنا چاہئے، اسی طرح انسان کی روح کو بھی دیکھ بھال اور صفائی کی ضرورت ہے، اور بیماری سے بچنے کے لئے حفاظتی تدبیر ضروری ہے، اور اگر مریض ہوجائے تو اس کا علاج بھی ضروری ہے، اگر ہم مادی ضرورتوں کا معنوی ضرورتوں سے مقابلہ کریں تو اس نتیجہ پر پہونچیں گے کہ روحانی اور معنوی ضرورتیں زیادہ اہمیت کی حامل ہیں،

روح کی بیماری بدن کی بیماری سے زیادہ خطرناک اور زیادہ اہمیت رکھتی ہیں، کیونکہ انسان کی انسانیت اوراس کی امتیازی خصوصیات اس کی روح سے وابستہ ہے اگر کسی کی روح مریض ہوجائے تو وہ انسانیت سے گر جاتا ہے،تمام حیوانات بدن اور بدن کی سلامتی رکھتے ہیں اور اپنی مادی اور جسمانی لذتوں کو پورا کرنے میں لگے ہوئے ہیں ،وہ چیز جو انسان سے مخصوص ہے اور جوہر انسانیت کو تشکیل دیتی ہے وہ اس کی انسانی روح ہے، اب اگر وہ چیز جو انسانیت کا معیار ہے خطرہ میں پڑجائے تو انسان اپنی حقیقی موت سے ہمکنار ہوجاتا ہے جیسا کہ خداوندعالم ارشاد فرماتا ہے:(أَوَمَن كَانَ مَيْتاً فَأَحْيَيْنَاهُ وَجَعَلْنَا لَهُ نُوراً يَمْشِي بِهِ فِي النَّاسِ كَمَن مَّثَلُهُ فِي الظُّلُمَاتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا كَذَلِكَ زُيِّنَ لِلْكَافِرِينَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ[1]) ''کیاوہ جو پہلے مردہ تھا پھر ہم نے اس کو زندہ کیا اور اس کے لئے ایک نور قرار دیا جس کے ذریعہ وہ لوگوں کے درمیان تکلفی سے چلے پھرے اس شخص کے مانند ہے کہ جواندھیروں میں پھنسا ہوا ہو اور وہاں سے کسی طرح وہ نکل نہ سکتاہو؟!اسی طرح کافروں کے لئے انکے(برے) اعمال جو وہ انجام دیتے ہیںآراستہ کردئے گئے ہیں''(اور ان کو اچھے نظر آتے ہیں)آیا ان مطالب کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک حکومت جومعاشرہ کی مصلحتوں کو پورا کرنے کے درپے ہے اس کو عوام کے روحانی اور معنوی امور کی طرف توجہ نہیں دینا چاہئے؟ کیا حکومت کا فریضہ صرف یہی ہے کہ وہ لوگوں کی مادی ضرورتوں کو پورا کرے ،یا معنوی مصالح کو پورا کرنا بھی حکومت کا ہی فریضہ ہے؟

[1] سورۂ انعام آیت ۱۲۲۔

اسلامی انقلاب اور معنوی مصلحتوں کی برتری

یہاں پر ایک پیچیدہ مسئلہ جو اٹھایا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ اگر کسی وقت معنوی اور مادی ترقیوں میں ٹکراؤ پیدا ہوجائے تو دونوں میں سے کس کو مقدم کرنا چاہئے؟ اگر کسی خاص زمان ومکان میں معاشرہ کی مادی ترقی کے لئے، معنوی مصلحتوں کو نظرانداز کر دینا لازم ہو جائے مادی اور اقتصادی توسیع وترقی اور معنوی مصلحتوں کی تکمیل کے درمیان ٹکراؤ (یعنی ایک کو دوسرے کے لئے چھوڑ دینا)ضروری ہوجائے، تو اس وقت حکومت کا فریضہ ہے کہ مادی ترقی کو محدود کردے تاکہ معنوی مصلحتیں بھی محفوظ رہ جائیں یا یہ کہ معنوی مصلحتوں کی تکمیل سے حکومت کا کوئی سروکار نہیں ہے،

حکومت کا کام صرف مادی ضرورتوں کو پورا کرنا ہے اپنی معنوی مصلحتوں کو پورا کرنا خود عوام کی ذمہ داری ہے چاہیں تو وہ اس کی خود فکر کریں؟ یہ مسئلہ بہت ہی اہم اور سنجیدہ ہے اور ہماری معاشرتی زندگی کے لئے عملی نتائج رکھتا ہے، اور آج کل بڑے وسیع پیمانے پر اخبار و رسائل میں اس کا چرچا رہتا ہے اور مختلف ذرائع ابلاغ میں اس سے متعلق بڑے بڑے مناظرہ اور بحثیں ہوتی رہتی ہیں۔ ایک طرف کچھ افرد کہتے ہیں: حکومت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ ترقی کی فکر کرے اور سیاست، اقتصاد اور فرہنگ وثقافت کو فروغ دے ،ترقی و فروغ ان ہی معنوں میں جو دنیا میں عام طور پر مشہور ہے جس کی بنیاد پر ثقافتی ترقیوں کے مصادیق ان چیزوں سے جو ہم معنوی مصلحتوں کے ضمن میں بیان کرتے ہیں بالکل مختلف ہے اور اس سے مراد قومی میراث کی حفاظت اور کھیل کود اور موسیقی وغیرہ کو بڑھاوا دینا ہے۔

بلا شبہ جو افراد دین اسلام سے دلچسپی رکھتے ہیں اور انقلاب اسلامی کے طرفدار ہیں، معنوی مصلحتوں کو خصوصی اہمیت دینے کے قائل ہیں اور ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ انقلاب برپا کرنے کا اصل مقصد معنوی مصالح کی حفاظت کرنا تھا. البتہ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ اسلام کے زیر سایہ مادی ترقیاں بھی ضرور کریں گے ۔

اگرچہ کچھ زمانہ ہی کیوں نہ لگ جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ قلیل المدت طور پر بعض مادی نقصانات کا سامنا کرنا پڑے اوران سب باتوں کے باوجود ہماری قوم نے اپنے معنوی و الٰہی اقدار و معیارات پر پختہ اعتقاد اور معنوی مصالح کی حفاظت کی خاطر عملی طور پر یہ ثابت کردیاہے کہ ہم معاشی ناکہ بندی، مہنگائی اور دوسری مادی مشکلات کو برداشت کر سکتے ہیں، اپنے عزیز واقارب بقائے اسلام کی خاطر قربان کر سکتے ہیں، عورتیں بیوہ اور بچے یتیم ہو سکتے ہیں چنانچہ شہیدوں کے وصیت ناموں سے بھی اس بات کا مسلم ثبوت ملتا ہے کہ ان کا ہدف اسلام کی حفاظت اور معنوی اقدار کو باقی کھنا تھا.

ہم نے جو کچھ عرض کیااس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ کم ازکم ہمارے لئے مادی ضرورتوں کو پورا کرنے کے علاوہ ایک اور معیار بھی موجود ہے اور وہ معنوی مصلحتوں کی تکمیل ہے اور اگر معاشرہ کی مصلحتوں کو پورا کرنا، ہم قانون کے معتبر ہونے کا ایک معیار مان لیں تو ہماری نگاہ میں مصلحتوں میں مادی اور معنوی دونوں مصلحتیں شامل ہیں۔

البتہ معاشرے کی مصلحتوں کا تحقیقی جائزہ اور اس کے مصادیق کو معین کرنا ایک بڑی ہی عمیق اور تفصیلی بحث ہے اوراس سے بھی کہیں زیادہ وسیع ہے جو فلسفۂسیاست اور فلسفۂ قانون میں بحثیں کی جاتی ہیں اس بحث کا اصل محور یہ ہے کہ کیا حقیقت میں انسان کے لئے مادی امور کے علاوہ کوئی اور مصلحت پائی جاتی ہے یا یہ کہ انسان کی مصلحت وہی مادی مصلحتیں ہیں اس کے علاوہ کچھ آداب ورسومات ہیں جو کبھی کبھی بدل جاتے ہیں، معنوی اقدار اور ضرورتوں کی شکل میں کوئی دوسری مصلحت نہیں پائی جاتی آیاواقعی ضرورتیں اور مصلحتیں وہی مادی امور ہیں جو علمی تجربوں کی شکل میں انجام پاتے ہیں اور مادی قدر و قیمت سے ان کاتعین کیا جاتا ہے جیسے طبی سہولیات معاشی اور اقتصادی ترقی، صنعت اور ٹکنالوجی، یا اس سے بالا تر دوسری روحانی اور معنوی مصلحتیں بھی موجود ہیں، جو حس کے قابل نہیں ہیں۔

یقینا ہمارا عقیدہ ہے کہ واقعی مصلحتیں وہی معنوی وروحانی مصلحتیں ہیں جو ''مٹافیزیک'' یعنی ماوراء الطبیعۃ سے متعلق ہیں اور مروجہ اصطلاح کے تحت وہ علمی مسائل کا جز نہیں ہیں اور علمی یا سائنسی طریقے سے قابل اثبات بھی نہیں ہوتے، نتیجہ کے طور پر قبل اس کے کہ ہم یہ کہیں کہ معاشرہ میں معنوی مصلحتوں کو پورا کرنا ضروری ہے اور ان کو پورا کرنا حکومت کا فریضہ ہے اگر ہم اس کوایک برہانی اور مدلّل بحث ثابت کرنا چاہیں تو ہم کو اس مسئلہ کی وضاحت کرنا چاہئے کہ آیا ہمارے لئے مادی مصلحتوں کے علاوہ کچھ اور بھی مصلحتیں ہیں یا نہیں؟۔

بارہویں تقریر

اقدار کے حوالے سے اسلام اور مغربی طرز تفکر میں فرق

ہماری بحث کا اصلی موضوع اسلام کا سیاسی نظریہ بیان کرنا ہے جس کے گرد تمہیدی طور پر چند موضوعات پر گفتگو ضروری ہے کیونکہ اس نظریہ کو عقلی طور پر ثابت کرنے کے لئے ان کے مقدمات پر توجہ دینا ضروری ہے، جیسا کہ ہم نے بیان کیا اسلام کے سیاسی نظام میں خدا کا قانون کسی ایسے شخص کے ذریعہ جاری ہونا چاہئے، اور حکومت کا ذمہ دار ایسے شخص کو ہونا چاہئے جو خدا کے طرف سے منصوب ہو اور خدا کی طرف سے اس کو اجازت حاصل ہو، چنانچہ مندرجہ بالا نظریہ کے سلسلے میں مندرجہ ذیل مفروضات کو تمہید کے طور پر قبول کرنا ضروری ہے:

۱۔ معاشرہ کے لئے قانون کا ہونا ضروری ہے۔

۲۔ اور وہ قانون خدا کی جانب سے نازل ہوا ہو۔

۳۔ ان قوانین پر عمل در آمد لازم ہے اور ان کے نفاذ کی ذمہ دار اسلامی حکومت کی ہے۔

(ذکر شدہ مقدموں کو مد نظر رکھتے ہوئے جو لوگ مسلمان ہیں مذکورہ نظریہ کو قبول کرنے میں کوئی شک وشبہ نہیں کریں گے، لیکن بحث کو مزید ہمہ گیر بنانے کے لئے تاکہ دوسرے افراد پر بھی حق ظاہر ہوجائے ان مقدمات کو عقلی استدلال کے ساتھ بیان کرنا ضروری ہے)

یہ مسئلہ کہ ''معاشرہ میں قانون کا ہونا ضروری ہے'' جہاں تک ہم کو علم ہے کہ کوئی شخص بھی اس کا منکر نہیں اور وہ افراد کہ جنھوں نے اس بارے میں بحث کی ہے، اس بات میں کوئی شک نہیں کرتے کہ بشر کو اپنی معاشرتی زندگی کے لئے ایک قانون کی

ضرورت ہے لیکن معاشرہ میں کس قانون کو حاکم ہونا چاہئے اس بارے میں بہت زیادہ اختلاف پائے جاتے ہیں اور اسی بنیاد پر قانون کے معتبر ہونے کا معیار کیا ہو قانون کے فلاسفۂ اور قانون کے ماہرین نے کافی بحث و تحقیق کی ہے اور ہم کس طرح دوسروں سے بہتر و برتر قوانین کا تعین کر سکتے ہیں اس بارے میں ہم نے اپنی گذشتہ تقریر میں قانون کے معیار ات کی وضاحت کرتے ہوئے تین اہم نظریوں کی طرف اشارہ کیا تھا،اور کہا تھا کہ اس بارے میں دوسرے نظریات بھی ہیں لیکن اتنے زیادہ اہمیت کے قابل نہیں ہے کہ ان کے بارے میں بحث کی جائے۔

قانون کے معیار واعتبار کے بارے میں پہلا نظریہ ہے کہ قانون کا عدل وانصاف کے مطابق ہونا ہے یعنی جو قانون معیار عدل پر استوار ہے اسے معاشرہ میں جاری ہونا چاہئے،دوسرے نظریہ کے مطابق وہ قانون بہتر اور برتر ہے جو معاشرہ میں نظم و نسق اور امن وامان قائم کر سکے،اور تیسرے نظریہ کے تحت وہ قانون بہتر اور برتر ہے جو لوگوں کی زندگی کی تمام ضرورتوں کو پورا کر سکے،یہ تین نظرئے اس نظریہ کے حد مقابل ہیں جن کے حامیوں کا خیال ہے قانون کے اچھے یا برے اور بہتر یا بدتر ہونے کی تشخیص اور تعین کا کوئی بنیادی معیار نہیں ہے، صرف ایک معیار لوگوں کی خواہش اور رائے ہے؛ معاشرہ جس چیز کو پسند کرے وہ بہتر ہے اور قانون بھی اسی بنیاد پر بننا چاہئے،یہ مثبت ایک رجحان ہے جو ہماری نظر میں واضح طور پر باطل ہے اس لئے کہ ایسا نہیں ہوسکتا کہ ہر دن جس شخص کا جو دل چاہے وہی قانون برتر ہوجائے بلکہ ایک عقلی معیار ہونا چاہئے تاکہ اس کے بارے میں کوئی بحث کرکے کسی منطقی نتیجہ پر پہونچا جا سکے۔

اسلام کی نظر میں بہترین قانون اور فکری آمیزش کے خطرات

دین اسلام کی نظر میں وہ قانون سب سے اچھا اور سب سے بلند و برتر ہے جو انسانوں کے مادی اور معنوی ارتقاء کے راستے ہموار کرے اور ایسا قانون ہو کہ اس کے سایہ میں انسانوں کی تمام مادی اور معنوی مصلحتیں چاہے وہ کتنی ہی وسیع پیمانے پر کیوں نہ ہوں

بہترین طریقہ پر فراہم ہوسکتی ہوں اس نظریہ کا دوسرے نظریوں سے فرق یہ ہے کہ اس میں معنوی مصلحتوں پرزیادہ زور دیا جاتا اورزیادہ اعتماد کیا جاتا ہے ۔

لیکن افسوس! یورپ میں نئی بیداری کی تحریک ''رنسانس'' کے بعد ''ہیونزم''(آدمی پرستی) کے رجحان کو تقویت ملی اور آہستہ آہستہ علمی رجحانات انسانی افکار کے دائرے سے معنویت کا تصور اور آخرت کی فکر دور ہوگئی، اوربالآخرانسان ان سب کو بھلا بیٹھا، اگرچہ کہیں کہیں گوشہ وکنار میں ایک محدود سطح پر معنوی امور کو بھی سامنے رکھا جاتا ہے،لیکن عام طور پر دنیا کے فلسفی اورقانونی حلقوں میں حکمراں کے اعتماد اور رغبت کا اصل محور یہ ہے کہ قانون وہ ہونا چاہیئے جو انسانوں کی مادی اور معاشرتی ضرورتوں کو پورا کرسکے، چاہے معنوی ضرورتوں سے اس کا کوئی سروکار نہ ہو، البتہ ہمارے نظریہ کے اعتبار سے یہ بات واضح ہے کہ قانون کو معنوی ضرورتوں پر بھی بھرپور توجہ رکھنا چاہیئے، اس لئے کہ انسان کے وجود کا سب سے اہم اور بنیادی پہلو، اس کا روحانی، معنوی اور الٰہی پہلو ہے اس بنیاد پر ہم اس بلند وبالا پہلو اوراس پر استوار معنوی مصلحتوں کو نظرانداز نہیں کرسکتے، اسی لئے اب ہمارا موضوع بحث یہ ہوگا کہ کیا قانون کو معنوی ضرورتوں پر توجہ دینا ضروری ہے یا نہیں؟

اس بات پر اس قدر زور دینا اور اس بارے میں بحث کرنا اس انحراف کی وجہ سے ہے جو آج کل کی فکری آمیزش کی وجہ سے مختلف سطح کے افراد میں رونما ہوا ہے ہم اس مطلب کی مزید وضاحت ایک مثال کے ذریعہ کردینا چاہتے ہیں، فرض کیجئے علم فیزیکس میں کوئی محقق کسی نظریہ پر پہنچتا ہے تو ''انس ٹائن'' کی مانند وہ لوگ جو اس علم کے اعلیٰ درجات پر پہونچے ہوئے ہیں اس نظریہ کے بارے میں اظہار خیال کرسکتے ہیں۔

لیکن اگر اسی دانشور سے مثلاً علم نفسیات کے کسی نظریہ کے بارے میں کوئی رائے پوچھی جائے تو وہ اپنی نظر نہیں دے سکتا،کیونکہ اس کو اس علم میں مہارت نہیں ہے اب اگراس نظریہ کے بارے میں کچھ کہنا ہو توماہرین نفسیات سے مشورہ اور معلومات حاصل کرنا ہوگا،

کیونکہ یہ علم اس کی مہارت کے دائرہ میں نہیں آتا، اسی طرح وہ تمام افراد جو کسی مخصوص علم میں مہارت نہیں رکھتے، صاحبان نظر کی تائید کی بنیاد پر ایک نظریہ کی تائید و تصدیق کرتے ہیں، لیکن کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شخص مختلف علوم کے ماہرین کے نظریات کا مطالعہ کرتااور ان کی طرف جھکاؤ پیدا کر لیتاہے لیکن اسکو اتنا وقت میسر نہیں ہوتا کہ ان نظریات کی آپس میں تطبیق دے اورایک دوسرے سے موازنہ کر سکے کہ یہ نظریات ایک دوسرے سے میل کھاتے بھی ہیںیا نہیں؟آیاوہ آراء ونظریات انسانی افکار کا کوئی متحد وہم آہنگ مجموعہ تشکیل دے سکتے ہیں یا نہیں؟اس نے ان مسائل پر نہ ہی کوئی فکر کی ہے نہ ہی اس کاکوئی خیال رکھتا ہے وہ تو صرف یہ کہتا ہے کہ میری نظر میں فلاں ماہر نفسیات یا فلاں ماہر قانون کا نظریہ بہتر ہے اور یہی امر فکری آمیزش اور انحراف کا سبب ہے، لیکن اہل نظر و تحقیق تمام نظریات کو جمع کرکے ان کا ایک دوسرے سے موازنہ کرتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ یہ آپس میں ایک دوسرے سے سازگار ہیں یا نہیں، اگر فلاں ماہر نفسیات کے کسی نظریہ کو قبول کرنا چاہتے ہیں تو اس کو سماجیات کے دوسرے نظریہ کے ساتھ ملا کر دیکھتے ہیں کہ وہ آپس میں مطابقت کرتے ہیں اور ایک دوسرے سے مناسبت رکھتے ہیں یا نہیں؟اور اسی طرح کی مطابقت دوسرے تمام موضوعات کے مختلف نظریات کے سلسلے میں انجام دیتے ہیں۔

معلوم ہوا کہ اہل نظر و تحقیق سے قطع نظر نچلی سطح پر کم علموں کے درمیان انحراف کی راہیں زیادہ پائی جاتی ہیں، جب بھی ان افراد کو کوئی کتاب مل جاتی ہے وہ اس کا مطالعہ کرتے ہیں او رکسی تحقیق کے بغیر کہ اس کتاب کا لکھنے والا معتبر ہے یا نہیں اس کے نظریات دوسرے تمام موضوعات میں بیان شدہ نظریات سے مناسبت رکھتے ہیں یا نہیں اس کتاب کے مطالب سے متاثر ہو کر فکری انحراف سے دوچار ہوجاتے ہیں، لہذا کسی بھی کتاب اور فکر ونظر کے مجموعے کا مطالعہ کرنے سے پہلے دیکھ لینا چاہئے کہ اس کتاب کا لکھنے والا معتبر ہے یا نہیں؟ آیا اس کے نظریات دوسرے تمام متعلقہ موضوعات کے نظریات سے یگانگت اورمناسبت رکھتے ہیں یا نہیں؟

مذہبی افکار کے دائرے میں فکری آمیزش اور انحراف

افسوس کی بات ہے کہ ہمارے اسلامی معاشرہ میں خصوصاً اس صدی کے نصف دوم میں دوسروں کے نظریات سے متاثر ہوکر زیادہ فکری آمیزش نے زور پکڑا ہے، بعض افراد نے اپنی زندگی کے ایک مرحلہ میں، اپنے ماں باپ ،ماحول اور دینی رہنماؤں سے اسلامی عقائد کو پڑھا ،سنا اور قبول کر لیا .

اس کے بعد جب وہ زندگی کے دوسرے مراحل میں داخل ہوئے، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں گئے اور وہاں کے ماحول میں مختلف علوم اور موضوعات سے متعلق دوسروں کے عقائد و نظریات سے آشنا ہوئے، تو توجہ کئے بغیر کہ یہ افکار ونظریات جو مختلف علوم اورافراد سے حاصل کئے ہیںآپس میں سازگار ہیں یا نہیں ؟ان کو بھی قبول کرلیا ۔

مثال کے طور پر انھوں نے یہ سوچا ہی نہیں کہ جس نظریہ کو وہ فلسفہ میں قبول کررہے ہیں ، علم الحیات، فیزیکس،حساب یا مذہب کے فلاں نظریہ سے میل کھاتا اور مناسبت رکھتا ہے یا نہیں؟ چنانچہ اگر ہم غور وفکر سے کام لیں تو یقیناًاس نتیجہ پر پہونچیں گے کہ بعض موارد میں یہ افکار ایک دوسرے کے ساتھ سازگار نہیں ہیں اور ایک متحد وہم آہنگ مجموعہ تشکیل نہیں دیتے اوراسی طرح کے انداز تفکر کوفکری آمیزش اور انحراف کہتے ہیں؟

آج ہمارے دینی معاشرے میں ،بہت ہی وسیع سطح پر لوگ اس فکری آمیزش میں مبتلا ہیں، کیونکہ ایک طرف تو انھوں نے اسلامی معاشرے سے موروثی اور خاندانی عقائد حاصل کئے ہیں جن کو وہ اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دینے چاہتے.اور دوسری طرف سوشل سائنس کے مختلف علوم میں بہت سے مسائل ان کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں وہ ان کو بھی مان لیتے ہیں اور دینی عقائد کے ساتھ ملادیتے ہیں. وہ اس چیز سے غافل رہتے ہیں کہ یہ مختلف نظریات آپس میں ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتے ایسی صورت میں ہم کو یا تو دینی عقائد کو تسلیم کرنا چاہئے یا ان افکار کو جو دین کے ساتھ میل نہیں کھاتے ۔

اس بنا پر اگر ہم سماجیات ،قانون، سیاست اور ان کے مانند دوسرے علمی میدانوں میں ان افکار ونظریات کو جو ہمارے دینی عقائد سے ہم آھنگ ہیں اپنا نا چاہتے ہیں توضروری ہے کہ وہ مکاتب جو دوسرے ممالک کی کتابوں کے ترجمہ اور تبلیغ کے ذریعہ ہم تک پہونچے ہیں ہم ان کوالگ کریں،سوشل سائنس کے وہ جدید نظریات جو علمی نقطہ نظر سے بھی اور اصول و بنیاد کے لحاظ سے بھی ہمارے دینی عقائد کے ساتھ سازگار ہیں ان ہی سے فائدہ اٹھائیں ورنہ یا تو ہم اپنے دینی عقائد سے دست بردار ہوجائیں یا پھر سرے سے اپنے دینی عقائد کے خلاف تمام نظریات و افکار کو چھوڑ دیں،اس لئے کہ دونوں کوایک ساتھ جمع نہیں کیا جاسکتا۔

جس طرح یہ تسلیم نہیں کیا جاسکتا کہ اس وقت دن بھی ہے اور رات بھی نتیجہ کے طور پر ہم نے جوبنیادی نکتے بیان کئے ہیں ان پر توجہ کئے بغیر تمام افکار و نظریات اوراس کے ہر جزء کو قبول نہیں کیا جاسکتا اور فکری اور مذہبی آمیزش کو قبول نہیں کیاجاسکتا کیونکہ اس صورت میں ہمارے اندر شناخت ومعرفت کے سلسلے میں ''انتہا پسند پلورالیزم'' کی طرف جھکاؤ پیدا ہو جائے گا،اس کا مطلب یہ ہوگا کہ کوئی بھی جوکچھ بھی کہے وہ صحیح ہے اور بالکل غلط نام کی کوئی شئے نہیں پائی جاتی،اور ہر کوئی حقیقت کاایک حصہ بیان کرتا ہے اور ہر مکتب میں کچھ نہ کچھ حق ضرور پایا جاتا ہے،

یہ رجحان فلسفہ میں شکاکیت (جو آج بھی مغرب کے فلسفی حلقوں میں رائج ہے(seepticism) (پر ختم ہوتا ہے یہ رجحان اس بنیاد پرجنم لیتا ہے کہ عام طور سے مختلف علوم میں مختلف نظریات ہوتے ہیں اور سبھی میں کچھ نہ کچھ حقیقت پائی جاتی ہےاور ہم بھی کسی چیز پر قطعی اور یقینی اعتقاد نہیں رکھ سکتے،پس ہمارے لئے بہتر یہی ہوگا کہ کسی چیز پر بھی قطعی اوریقینی اعتقاد نہ رکھیں اورایک نظریہ کے صحیح یا غلط ہونے کے سلسلے میں صرف احتمال پراکتفا کریں،

اور دین کے مسئلہ میں بھی ہم کو دینی پلورالیزم کو قبول کرلینا چاہئے،او راس بنیاد پر مسلمانوں کا عقیدہ بھی کہ جو خدا کی وحدانیت کے قائل ہیں اور جو شخص اس کے خلاف عقیدہ رکھتا ہے کہ جس کو ہم ابدی عذاب کا مستحق سمجھتے ہیں اس کو بھی تسلیم کرلیں اور صحیح

سمجھیں اسی طرح عیسائیوں کا عقیدہ بھی جو تین خداؤں کے قائل ہیں اسے بھی صحیح سمجھیں اس طرح جو دو خداؤں (خدائے خیر وخدائے شر) کے معتقد ہیں ان کو بھی درست سمجھیں، اس لئے کہ ان میں سے کوئی ایک عقیدہ بھی قطعی اور یقینی نہیں ہے، ممکن ہے اس میں سے ہر ایک عقیدہ درست ہو یا ایک بھی درست نہ ہو اور ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ ان میں سے کسی ایک سے بھی جھگڑا مول لیں، چونکہ وہ تمام عقائد صحیح خوب اورا چھے ہو سکتے ہیں۔

تمام مختلف و متضاد عقائد و نظریات کا تحمل یا توشکاکیت اور سپٹی لزم کی بنیا پر استوار ہے (کہ جن میں کوئی شخص کوئی بھی یقینی تصور نہیں رکھتا) یا پھر پلورلیزم پر قائم ہے، اجتماعی رواداری اور عدم تشدد و عدم تعصب اور غیر جانبداری پر مبنی ہے، اور جس کی بنیاد پر آج کل خوب تبلیغ کی جارہی ہے کہ کسی مسئلہ میں حد سے زیادہ تعصب اور حد سے زیادہ سختی کا رویہ صحیح نہیں ہے جو شخص بھی جو کچھ کہے اس کے بارے میں خیال کرلینا چاہئے کہ شاید یہی بات صحیح ہو، درحقیقت یہ رجحان انسان کے اندر مذہبی، فلسفی اور علمی عقائد وتصورات کی طرف سے بالکل لاپرواہ ہو جانے کی حالت ایجاد کر دیتا ہے۔

آج کل مغربی دنیا میں اکثر افراد یہی طرز فکر رکھتے ہیں او رہمارے لئے یہ نظریہ ایک تحفہ سمجھا جانے لگاہے اور کوشش ہے کہ ہمارے معاشرہ میں بھی یہی حالت پیدا کر دی جائے کہ کوئی مذہبی، علمی او رفلسفی عقائد کے سلسلے میں کٹڑپن اور سختی سے کام نہ لے او رہر نظریہ اور زاویۂ فکر کے بارے میں خیال کرے کہ ممکن ہے یہ نظریہ اور فکر درست ہو یا یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی اور نظریہ درست ہو، کبھی کبھی یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہمیں اپنے علم اور شناخت کو حق مطلق نہیں سمجھ لینا چاہئے کہ سو فیصدی یہی صحیح اور درست ہے اس کے سواکچھ نہیں ہے، ہم کو اس قدر سخت نہیں ہونا چاہئے، ہم بھی خود اپنے اعتقاد پر برقائم رہتے ہوئے اپنے عقائد کا احترام کریں اور دوسرے بھی اپنا عقیدہ رکھیں، (ہم سے کیا مطلب ہے ؟!) یہ وہی ثقافت ہے جس کو مغربی دنیا نے اپنے لئے منتخب کیا ہے اور چاہتے ہیں کہ تمام عالم میں اسی ثقافت پر عمل ہو اور اسی کے زیر سایہ زندگی بسر کی جائے۔

اس کا مطلب ہے سرے سے کسی بھی یقینی اور حتمی اعتقاد کا انکار کردیا جائے اور اس چیز کا انکار کر دیا جائے کہ کوئی ایک دین حق، مذہب حق اور نظریۂ حق پایا جاتا ہے لوگوں کے اذہان عالیہ میں یہ بات ڈال دیں کہ ممکن ہے نظریۂ حق کئی ہوں لہٰذا انسان کو ایک ہی چیز پر یقینی اور حتمی نہیں سمجھ لینا چاہیئے. نہ ہی مقام بحث میں سختی سے کام لینا چاہیئے، دینی غیرت اور مذہب کے معاملہ میں تعصب ختم کردینا چاہیئے، لوگوں کے درمیان ایک دین ایک مذہب اور ایک فکر کی طرف دعوت کا رجحان ختم ہوجانا چاہیئے تاکہ سب مل کر ایک اجتماعی زندگی بسر کرسکیں اور مذہبی مسائل میں کوئی اختلاف نہ ہو، کیونکہ یہی مذہبی اختلافات قتل وغارت اور جنگ وجدال کا باعث بنتے ہیں اب تمام مذاہب، ادیان اور افکار کو صحیح اور حق مان لینا چاہیئے تاکہ آپس میں امن وآشتی کا ماحول ہموار ہوجائے۔

مذہبی پلورالیزم کسے کہتے ہیں؟ اگرچہ ہم پلورالیزم کے مسئلہ پر ماہرانہ بحث کرنا نہیں چاہتے لیکن مختصر طور پر یہ عرض کردیں کہ ایک دفعہ ہم مقام عمل میں کہتے ہیں کہ مختلف مذاہب کے ماننے والوں اور مختلف علوم اور فلسفہ میں مختلف نظریے رکھنے والوں کے ساتھ متانت اور احترام سے پیش آنا چاہیئے اور ان کو بھی اس بات کی اجازت دینا چاہیئے کہ وہ اپنے نظریات بیان کریں اور ان کا دفاع کرسکیں، اور مختلف میدانوں میں بحث وگفتگو اور تحقیق وجستجو کریں، آج کی دنیا میں ہم یہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ ایک عیسائی یہودی اور مجوسی ایک ساتھ دوستانہ زندگی بسر کررہیں ہے اور ان کے درمیان کوئی کشمکش، اختلاف، برادرکشی اور قتل وغارت گری بھی نہیں پائی جاتی۔

اس چیز کو مذہب اسلام کے اندر شاید جتنی اہمیت دی گئی ہے اتنا تقریباً کسی بھی مذہبی، دینی اور سیاسی نظام میں لحاظ نہیں کیا گیا ہے اور اس قدر زیادہ صاحبان ادیان کا پاس ولحاظ کسی اور مذہب میں نہیں دیکھا گیا ہے، جب کہ اسلام میں اعتقادات کا محور ومرکز عقیدہ ''توحید'' (خدا کی وحدانیت کا تصور) ہے اور توحید کو رائج اور مستحکم کرنے کے لئے ''تثلیث'' (تین خداؤں کے تصور) اور شرک سے مقابلہ کرنا ضروری ہے۔

پھر بھی ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام میں عیسائیت او ریہودیت دونوں مذہب کو قانونی مذہب کے عنوان سے تسلیم کیا گیا ہے اور ان دونوں مذہبوں کے پیرووں کو اسلام کی پناہ حاصل ہے ان کی جان ومال اور ناموس محفوظ ہیں او رکسی شخص کو ان کے حقوق کو پامال کرنے کا قطعی حق نہیں ہے۔

سبھی الٰہی ادیان کے پیرووں کے ساتھ اس طرح کی روش وایثار ہم نے ،اولیائے دین خصوصاً حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کی سیرت سے سیکھی ہے جیسا کہ حضرت علی علیہ السلام نہج البلاغہ کے ایک خطبہ میں ارشاد فرماتے ہیں کہ میں نے سنا ہے کہ عراق کے ایک شہر میں کسی کافر ذمی کی لڑکی کے پیر سے پازیب چھین لی گئی یہ مسلمانوں کے لئے ڈوب مرنے کا مقام ہے، کیونکہ ایک اسلامی ملک اور اسلامی حکومت کی پناہ میں ایک غیر مسلم لڑکی پر یہ ستم ہوا، دوسرے مذہبوں کے ماننے والوں کے ساتھ اس طرح کارویہ اسلام کی خصوصیات اور افتخارات میں سے ہے جس کی تعلیم قرآن مجید کی آیت میں صاف طور پر موجود ہے: (قُلْ یا أَہْلَ الْکِتَابِ تَعَالَوا إِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَاءٍ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ اَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللّٰہَ۔[1]) ''(اے رسول) آپ (ان سے) کہہ دیں کہ اے اہل کتاب وہ کلمۂ حق جو تمہارے اور ہمارے درمیان یکساں ہے (اور سبھی بر حق سمجھتے ہیں) اس کی پیروی کریں اور وہ یہ کہ خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں۔''

ایک دوسری آیت میں ہم کو جدل احسن کی طرف دعوت دی گئی ہے ، ارشاد ہوتا ہے:(وَلاَ تُجَادِلُوا أَہْلَ الْکِتَابِ إِلاَّ بِالَّتِیْ ہِیَ أَحْسَنُ[2]) ''او ر(اے ایماندارو) اہل کتاب یعنی یہودیوں عیسائیوں اور مجوسیوں سے مناظرہ نہ کیا کرو مگر یہ کہ عمدہ او رشائستہ الفاظ عنوان سے ''اگر پلورالیزم کا مطلب یہ ہے تو ہم کو کہنا پڑے گا کہ یہ اسلامی افتخارات میں سے ہے،لیکن اگر پلورالیزم کا مطلب یہ ہے کہ ہم دل سے قبول کر لیں کہ عیسائیت بھی اسلام کی مانند ہے یہودیت بھی اسلام کی مانند ہے او ریہودی ہونے اور مسلمان ہونے میں کوئی فرق نہیں ہے اس لئے کہ ہر دین میں کچھ نہ کچھ حقیقت پائی ہی جاتی ہے۔

---

[1] سوره آل عمران آیت ۶۴.
[2] سوره عنکبوت آیت ۴۶.

نہ اسلام مطلق طور پر حق ہے اور نہ ہی یہودیت مطلق طور پر حق ہے، یا یہ کہ دونوں حق ہیں اس راستہ کی مانند جو ایک ہی منزل پر پہونچاتے ہیں جس کسی راستہ سے چلے جائیں مقصد تک پہونچ جائیں گے، بے شک اس طرح کے نظریہ کو کوئی بھی مذہب قبول نہیں کرتا اور نہ ہی عقل اس بات کو تسلیم کرتی ہے۔

کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ توحید کا عقیدہ اور تثلیث کا عقیدہ دونوں یکساں اور برابر ہیں؟ یعنی خدا کی وحدانیت کا اعتقاد اور تین خداؤں کا اعتقاد رکھنے کے درمیان کوئی فرق نہیں پایا جاتا؟ کیا اس دین کی اساس اور بنیاد پر جو یہ کہتا ہوا نظر آرہا ہے: (وَلاَ تَقُولُوا ثَلاَثَۃٌ اِنْتَھُوا خَیْرًا لَکُمْ[۱]) ''اور (اے اہل کتاب!باپ بیٹے اور روح القدس) تین (خداؤں) کے قائل نہ ہو (اس شرک سے) دور رہو، اسی میں بھلائی ہے''

یا قرآن اس نسبت کے بارے میں جو خدا کی طرف ناروا طور پر دی جاتی ہے کہ خدا اولاد رکھتا ہے، کہتا ہے: (تَکَادُ السَّمٰوَاتُ یَتَفَطَّرْنَ مِنْہُ وَتَنْشَقُّ الْأَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ ھَدًّا[۲]) ''قریب ہے کہ تمام آسمان اس نازیبا بات (اور باطل تصور) سے پھٹ پڑیں اور زمین شگافتہ ہوجائے اور پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر پڑیں''، جب اسلام شرک آمیز اعتقادات کے سلسلے میں اس طرح کا قطعی رویہ رکھتا ہے تو ہم کو یہ کہنے کا کیا حق ہے کہ اگر تمہارا دل چاہے تو مسلمان رہو اور نہ چاہے تو بت پرست بن جاؤ،

کیونکہ ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے، ایک ہی ہدف اور مقصد تک پہونچانے والے ہیں، دونوں راستے صراط مستقیم شمار ہوتے ہیں!! میں تو بعید سمجھتا ہوں کہ کوئی صاحب عقل کسی غرض اور باطل مقاصد کے بغیر اس طرح کی باتیں کرے اور اس طرح کے عقیدہ کو قبول کرے۔

---

[۱] سورہ نساء آیت ۱۷۱۔
[۲] سورہ مریم آیت ۹۰۔

بہر حال فکری اختلاط و آمیزش اس زمانے کی ایک بڑی مشکل اور آفت ہے اس لئے اس کی طرف توجہ ضروری ہے کہ اپنے افکارونظریات کو صحیح وسالم رکھے او راصل نظریہ کی شناخت کے بعد اس پر باقی رہے۔بندگی خدا کی عظمت اور اس کا مطلق آزادی سے میل نہ کھاناان تمام نظریات کا ہماری بحث کے ساتھ رابطہ یہ ہے کہ بعض افراد نے مغربی تہذیب سے متاثر ہو کر اصل آزادی کوہی مطلق طور پر سب سے بڑی انسانی قدر کے عنوان سے قبول کرلیا ہے۔

اور آزادی کو انسانیت کا سب سے بڑا معیار سمجھتے ہیں. باوجودیکہ خود کو اسلام اوراسلامی احکامات کا پابند سمجھتے ہیں اور اپنے دیندار ہونے کے مدعی ہیں،چنانچہ مغربی معیارکی اس قدر سختی سے حمایت کرتے ہیں گویا دیگ سے زیادہ چمچہ گرم ہے،اور بے شک یہ ایک قسم کا انحراف ہے اگر ہم اس گروہ کے ساتھ کوئی منطقی بحث کرنا چاہیں تو ہم یہ عرض کریں گے کہ اسلام کی اساس وبنیاد ،خداوندعالم کی پرستش اور عبادت پر ہے ،(وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْکُلِّ اُمَّۃٍ رَسُوْلاً اَنِ اعْبُدُوْا اللّٰہَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ[1]) ''اور ہم نے تو ہر امت میں ایک رسول اس بات کی تبلیغ کے لئے ضرور بھیجا کہ لوگ خدا کی عبادت کریں اور بتوں (کی عبادت) سے دوررہیں''

صرف اسلام ہی نہیں بلکہ ہر آسمانی دین کی بنیاد خداوندعالم کی خالصانہ عبادت وبندگی ہے۔کیا کوئی صاحب دین، ایک مسلمان، ایک یہودی یانصرانی اس سے ہٹ کردین الٰہی کا کوئی اور تصور رکھتا ہے؟! ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ اسلام تمام ادیان توحیدی کے ساتھ سوائے ان احکام کے جو زمان و مکان کے تقاضے کے اعتبار سے صادر ہوئے ہیں تمام اعتقادی کلیات اور اصول میں یکساں ہے۔اوراگر اس بارے میں اختلاف نظر آتے ہیں تو یہ اس تحریفکی وجہ سےہے جو بعض ادیان الٰہی میں کی گئی ہیں، معلوم ہوااسلام میں سب سے بڑ امعیار یہ ہے کہ انسان خالص خدا کا بندہ ہو او رخداوندعالم نے اس حقیقت کو قرآن مجید کی کئی آیتوں میں بیان فرمایا ہے:

[1] سورۂ نحل آیت ۳۶۔

(وَمَا اُمِرُوٓا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰہَ مُخْلِصِینَ لَہُ الدِّینَ[1]۔) ''انھیں حکم نہیں دیا گیا مگر یہ کہ خداوندعالم کی پورے اخلاص کے ساتھ دین میں پرستش وعبادت کریں''

اور سورہ زمر میں ارشاد ہوتا ہے: (اَلَا لِلّٰہِ الدِّینُ الْخَالِصُ[2]) (۲) ''آگاہ رہو کہ عبادت تو خاص خدا ہی کے لئے ہے۔

اور سورہ لقمان میں فرماتا ہے: (وَمَن یُسْلِمْ وَجْہَہُ اِلَی اللّٰہِ وَہُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَکَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰی[3].) ''اور جو شخص خدا کے آگے اپنا سر (تسلیم) خم کرے اور وہ نیکو کار (بھی) ہو تو بے شک اس نے (ایمان کی) مضبوط رسّی پکڑلی ہے''

اب جب انسان اپنے کو خدا کا بندہ سمجھتا ہے اورخدا کی بندگی کو سب سے زیادہ قیمتی جانتا ہے اور اس نے اپنے کو مکمل طور سے خداوندعالم کے اختیار میں دیدیا ہے توکیا وہ مطلق آزادی کا معتقد ہوسکتا ہے اور جس چیز کوبھی اس کا دل چاہے معیار بناسکتا ہے؟ کیا یہ دونوں اعتقادایک دوسرے سے میل کھاتے اور مطابقت رکھتے ہیں؟اگر میں دل سے اسلام کے حق ہونے کا معتقد ہوں اور مانتا ہوں کہ یہ خدا کا دین ہے اور اس کو قبول کرنا ضروری ہے اور میں یہ عقیدہ رکھتا ہوں کہ ایک خداہے اور اسکی عبادت واجب ہے اور تمام چیزوں کو اسی کے اختیار میں دیدینا اور اسی کی مرضی پر چلنا فرض ہے تو میں کس طرح مطلق طور پر آزاد ہونے اورحسب خواہش عمل کرنے کا قائل ہو سکتاہوں؟ فکر کرنے کے یہ دونوں طریقے کس طرح ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہو سکتے ہیں۔

جو لوگ اس طرح کا دعویکرتے ہیں یاوہ بے خبری کی بنیاد پر فکری اختلاط سے دوچار ہوگئے ہیں، یا دل سے اسلام کا عقیدہ نہیں رکھتے یاصرف دوسروں کو فریب دینے کے لئے اس طرح کا دعویکرتے ہیں یا پہلے سے اس بات کی طرف متوجہ ہی نہیں ہیں کہ یہ دونوں نظرئیے آپس میں ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتے؟ ورنہ یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ انسان ایک طرف تو یہ کہے کہ میں پوری طرح

[1] سورہ بینہ آیت ۵۔
[2] سورہ زمر آیت ۳۔
[3] سورہ لقمان آیت ۲۲۔

اپنے تمام وجود کے ساتھ مشائے الٰہی کا تابع ہوں او ردوسری طرف اپنے لئے مطلق آزادی کے قائل ہوں اور کہیں کہ ہمارا جودل چاہے گا ہم انجام دیں گے۔

یہ طرز تفکر یعنی انسان کے مطلق طور پر آزاد ہونے کا تصور یورپ والوں کی فکر کی پیداوار ہے وہاں عیسائیت پر یقین رکھنے والے ایک گروہ نے اپنے دینی عقائد کے ضمن میں کہ جس سے وہ (شاید اپنے فطری لگاؤ یا اپنے ماحول اور دینی تربیت کی نوعیت کے سبب دست بردار تو نہیں ہو سکے لیکن مخصوص دلیلوں اور استدلالوں سے متاثر ہو کر بعض شکوک و شبہات کے تحت انہوں نے انسان کی مطلق آزادی کا ایک معیار تصور کر لیا۔بے شک جو لوگ اس طرح کے دعوے کرتے ہیں بغیر کسی دلیل کے اس طرح کی بات نہیں کرتے، بلکہ ایک ایسے نقطہ سے اپنی بات شروع کرتے ہیں اور اس انداز سے گفتگو کرتے ہیں جو دوسروں کے لئے پر کشش اور قابل قبول ہو۔

مثال کے طورپر وہ کہتے ہیں: کیا ایک پرندہ کو پنجرہ میں قید کردینا اور اس پنجرہ کو بھی کسی لوہے کے پنجرہ میں رکھ دینا بہتر ہے یا یہ کہ پرندہ کے اڑنے کے لئے پنجرہ کا دروازہ کھول دینا بہتر ہے؟کہ وہ جہاں چاہے پرواز کرے، ظاہر ہے پرندہ کو پرواز کے لئے آزاد چھوڑدینا بہت اچھا ہے اور وہ بھی یہی چاہتا ہے، اور اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ جس آزادی کے بارے میں ہم بحث کرتے ہیں اس سے مراد یہی آزادی ہے۔

ہمارے معاشرہ میں پہلے تو مکمل طور پر اسلامی دائرے میں قوانین بنائے گئے ہیں اور پھر تمام قوانین جو ''ولایت فقیہ'' سے تعلق رکھتے ہیں اس کے اندر رکھے گئے ہیں، پھر اس کے اندر ہی پارلیمینٹ کے پاس شدہ قوانین رکھے گئے ہیں اور اس کے بعد ''تعیین مصلحت کونسل'' ہے اورآخر میں فقہاء و زعما کی سپریم کونسل ''شورائے نگہبان'' کہ جو منظور شدہ قوانین پر اظہار نظر کرتی ہے، اس طرح کاآئینی ڈھانچہ واقعاًپنجرہ کو دوسرے پنجرہ کے اندر رکھنے کے مانند ہے! بہترین قانون وہ ہے جو انسانوں کو جس طرح وہ چاہیں

عمل کرنے اور جس طرح چاہیں گفتگو کرنے کی اجازت دیں، یعنی مجموعی طور پر انھیں پوری آزادی ہو؟! اور ظاہر سی بات ہے کہ پہلا قانون ''قید'' ہے اور دوسرا قانون ''آزادی'' ہے۔

جس وقت دوسری ثقافتوں کے عقائد وافکار اور آراء و نظریات کا جائزہ لینا ہو تو ہم سختی سے یہ بات کہیں گے کہ سب سے پہلے ہم کو ان کی جڑیں ڈھونڈنے کی کوشش کرنا چاہئے اس کے بعد یہ دیکھنا چاہئے کہ وہ نظریات اسلامی نظریات کے ساتھ سازگار ہیں یا نہیں؟ اگر اسلامی نظریات سے ہم آہنگ اور موافق ہیں تو کیا کہنا اور اگر اسلامی نظریات کے خلاف ہیں تو ہمیں چاہیئے کہ ان کو چھوڑ کر اپنے مذہبی اصولوں کا جائزہ لیں اور انھیں اپنے عقائد و نظریات اور تہذیب و ثقافت کی بنیاد قرار دیں۔

یورپ میں علم اور دین کے ٹکراؤ کا سد باب

علم اور دین کے ٹکراؤ کو حل کرنے کے لئے مغرب کے دیندار حضرات نے دین کے دائرہ میں شک وشبہ ایجاد کرتے ہوئے ایک راہ حل نکالا اور یہ شبہ پیش کیا کہ بنیادی طور پر علم وفلسفہ کا دائرہ دین کے دائرے سے الگ ہے، ہم جو یہ کہتے ہیں کہ فلسفی اقدار، اخلاقی اقدار یا انسانی اقدار دین کے ساتھ سازگار ہیں یا نہیں ہیں تو اس فرض کی بنا پر کہتے ہیں کہ دونوں کسی ایک نقطہ پر ملیں کیونکہ جب دو لکیریں ایک دوسرے کی طرف جھکی ہوئی ہوں تو ایک نقطہ پر پہونچ کر دونوں ایک دوسرے سے مل جاتی ہیں لیکن اگر دو سیدھی لکیریں ایک دوسرے کے برابر مقابل میں کھینچی جائیں تو کبھی بھی آپس میں ایک دوسرے سے نہیں مل سکتیں، اور ان میں ایک دوسرے سے ٹکراؤ نہیں ہوگا کیونکہ ان میں سے ہر لکیر اپنے اس نقطے پر ختم ہوگی جو دوسری لکیر سے الگ اور مستقل ہے۔

وہ علم اور دین کے باہمی رابطہ کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ دین اور علم، دین اور فلسفہ، دین اور عقل دین اور اخلاقی اقدار کے درمیان مفاہمت کا ہونا ضروری ہے اور اس کے لئے دو مستقل دائروں کی توصیف دو جہت سے کرنی چاہیئے یعنی دین کا دائرہ دوسرے علوم کے دائروں سے الگ ہونا چاہئے دین کا دائرہ خدا سے ہے اور جو کچھ اس سے مربوط ہے جیسے نماز، دعا و مناجات

اور ایک طرح کے شخصی مسائل جن کا دوسروں سے کوئی ربط نہیں ہو، اس دائرے میں نہ علم کا کوئی دخل ہے نہ فلسفہ کا اور نہ کسی دوسرے محرک کومداخلت کا کوئی حق ہے اس کا صرف اور صرف دل سے تعلق ہے اگر کوئی اور چیز اس دائرہ میں دین کے ساتھ شریک ہے تو وہ عرفان ہے کیونکہ دین اور عرفان دونوں کا ایک ہی موضوع ہے اور دونوں ایک ہی چشمے سے سیراب ہوتے ہیں، معلوم ہوا علم، فلسفہ اور عقل کا دین سے کوئی ربط نہیں ہے بلکہ ان تینوں کا دائرہ آپس میں بھی ایک دوسرے سے الگ الگ ہے اور ہر ایک کے اپنے مخصوص وسائل ہیں ۔

اب رہی اخلاق کے دائرے میں ان اقدار و معیارات کی بات کہ جس کا ربط چاہئے یا نہیں چاہئے ہے اور جو خدا سے تعلق کے دائرے میں آتی ہیں مثال کے طور پر کہ کیا نماز پڑھی جانی چاہئے یا نہیں؟ تو یہ دین سے مربوط ہے اور اس سلسلہ میں علم کے ساتھ کوئی ٹکراؤ نہیں ہے، لیکن اگر یہ چاہئے اور نہیں چاہئے انسان کی اجتماعی زندگی سے مربوط ہو مثلاًچور کے بارے میں سوال اٹھے کہ اس کے ساتھ کس طرح کا برتاؤ کرنا چاہئے؟اس کو سزا دینا چاہئے یا نہیں؟ آیا خیانت یا کسی بھی جرم کرنے والے شخص کو سزا دینی چاہئے یا نہیں؟اس سلسلہ میں وہ کہتے ہیں: جو شخص بھی کسی جرم اور گناہ کا مرتکب ہوا ہے وہ بیمار ہے اس کا علاج ہونا چاہئے اور نرمی اور مہربانی کے ساتھ کسی مناسب جگہ اس کا علاج، دیکھ بھال اور نگرانی کرنا چاہئے تاکہ وہ اس جرم سے باز آجائے۔

یہاں تو دنیا کے کسی ملک میں، کسی بھی جگہ ایسی کوئی اطلاع نہیں ہے ایک قاتل اور گناہ گار کے ساتھ بیمار جیسا برتاؤ کیا جاتا ہو اور اس کو سزا نہ دی جاتی ہو لیکن کتابی تھیوری کے طور پر کہتے ہیں کہ: قاتل کو موت کی سزا نہیں دینی چاہئے ،در اصل انسان کو سزا دینا ہی اس کے شایان شان نہیں ہے،

یہ چیز انسانی کرامت سے میل نہیں کھاتی اور ایک کلیہ کے طور پر بیان کرتے ہیں کہ انسان چاہے بد ترین جرائم کا مرتکب کیوں نہ ہو اس کو مطلق طور پر سزا نہیں دینی چاہئے اس لئے کہ انسان سے اس طرح کا برتاؤ اسکی شان اور مرتبہ کے خلاف ہے، اس نظریہ

کے مقابل ہم مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ دین زندگی کے تمام امور میں مداخلت کا حق رکھتا ہے اور اس نے قانون بیان کیا ہے مثال کے طور پر چوری کرنے والے کے لئے کہ (وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا[1] ۔ ''''اور چور مرد اور چور عورت کے ہاتھ کاٹ دئے جائیں''....

اجتماعی مسائل کو دین سے جدا کردینے والے کہتے ہیں کہ دین کو ان دائروں میں مداخلت کا کوئی حق نہیں، مذہب صرف یہ کہہ سکتا ہے کہ نماز پڑھو یا یہ کہہ سکتا ہے کہ خداوند عالم سے کس طرح دعا کی جائے لیکن یہ کہ ایک مجرم سے کس طرح پیش آیا جائے اس کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہے دوسری طرف یہ امر بھی تسلیم شدہ ہے کہ اس طرح کے امور میں تجربی علم کا بھی کوئی دخل نہیں ہے اس لئے کہ تجرباتی علم سے حاصل شدہ نتائج کا تعلق ایسے صفات سے ہوتا ہے جو آشکار طور پر مختلف چیزوں کے رابطہ کو بیان کرتے ہیں، دوسرے الفاظ میں سائنس جو چیز ہے اس کو بیان کرتی ہے لیکن کیا ہونا چاہئے یا کیا نہیں ہونا چاہئے اس کا تعین نہیں کر سکتی، اقدار اور معیارات کا تعین کرنا علم کا کام نہیں ہے، لہٰذا اخلاقی اور معاشرتی معیارات کے بارے میں چاہے وہ حقوق کے اصول ہوں یا شہریت اور جرم و سزا کے قوانین، یہ تمام کے تمام خالص اخلاقی مسائل کہ کیا ہونا چاہئے اور کیا نہیں ہونا چاہئے، اس میں نہ تو دین مداخلت رکھتا ہے اور نہ وہ علم جو سائنس اور تجرباتی علم کہے جاتے ہیں، اس میں دخل رکھتے ہیں۔

اسلام اور لبرلزم میں عوامی مطالبات کی حیثیت

جب اخلاقی مسائل اور کیا چاہئے اور کیا نہیں چاہئے کے مانند اقدار میں نہ تو دین کا کوئی دخل ہے، اور نہ ہی علم دخیل ہے، تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان مسائل کو کون طے کرے گا؟ کس کو حق مداخلت ہے؟ آج مغربی دنیا میں حکمراں ثقافت اس سوال کا جواب یہ دیتی ہے کہ انسانی اقدار، اور کن باتوں کو انجام دینا چاہئے اور کن باتوں کو انجام نہیں دینا چاہئے یہ امور اعتباری ہیں ان کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں ہے، ان کے بارے میں یہ دیکھنا چاہئے کہ عوام کی کیا رائے ہے؟ معلوم ہوا کہ ان کے نقطہ نظر سے کیا

[1] سورہ مائدہ آیت ۳۸۔

ہونا چاہئے اور کیا نہیں ہونا چاہئے یہ سب معیارات باہمی مفاہمت سے طئے پانے والی اعتباری چیزیں ہیں یعنی ان کی بنیاد ذاتی حقائق اور عینی،مشاہدات اور بیرونی نتائج پر نہیں ہے، صرف عوام کے سوچنے کے انداز پر موقوف ہیں، پس ہم کو کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں کرنا چاہئے اس کا جواب نہ تودین میں تلاش کرنے کی ضرورت ہے اور ، نہ ہی علم کے پیچھے دوڑنے اور نہ ہی اس کا فلسفہ جاننے کی ضرورت ہے،بلکہ عوام سے پوچھنا اور دیکھنا چاہئے کہ وہ کیا چاہتے ہیں!قانون سازی کے بارے میں یورپی جمہوریت کی بنیاد اس چیزپر استوار ہے کہ عوام کی خواہش کے علاوہ کوئی اور واقعیت پائی ہی نہیں جاتی لہذا ضروری ہے کہ اس مسئلہ کو چاہئے اور نہیں چاہئے کی بنیاد پر انکشاف کیا جائے۔

مادی امور میں چاہئے اور نہیں چاہئے، تجرباتی امور کے دائرہ میں آتے ہیں اور ان کا تعلق علوم تجربیات سے ہے جو تجربہ گاہ میں ثابت ہوتے ہیں، لیکن خدا سے ارتباط کے دائرے میں چاہئے اور نہیں چاہئے کا تعلق دین سے ہے اور یہ سب دینی دائرہ میںآتے ہیں،جو کچھ بھی دین کہے اس کو بجالانا چاہئے، ان کا علم سے کوئی تعلق نہیں ہے، لیکن معاشرتی زندگی سے متعلق چاہئے او ر نہیں چاہئے کے مسائل خود انسانوں سے تعلق رکھتے ہیں نہ توان میں خداوند عالم کومداخلت کا حق ہے اور نہ ہی علم ان کو معین و مشخص کر سکتا ہے.

اگر آپ یہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ مغربی تہذیب میں عوام الناس کی رائے اور عمومی ووٹ پر اعتماد کیا جاتا ہے تو یہ وہاں موجودہ مخصوص ثقافت کی بنیاد پرہے، اب اگر کوئی یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ دین، انسان کی زندگی کے تمام امور کوشامل ہے،اور ہم کووہ تمام امور جو زندگی میں انجام دینے چاہئے یا انجام نہیں دینے چاہئے خدا وندعالم سے معلوم کرنا چاہئے، اس بارے میں عوام الناس کی رائے کا تابع نہیں ہونا چاہئے،اب سوال یہ ہے کہ اگر خدوند عالم کسی چیزکے لئے ''کیا چاہئے'' معین فرمادے اور کسی کام کے انجام دینے کا حکم دیدے لیکن عوام الناس کچھ اور چاہتے ہوں تو ایسی صورت میں کس کا حکم معتبر ہوگا؟

(کیونکہ)تمام معاشروں میں، عوام جو چاہتے ہیں اور دین میں جو کچھ بیان ہوا ہے ان میں کم وبیش تضاد پایا جاتا ہے،ہم کو تحریف شدہ دوسرے تمام ادیان سے کوئی مطلب نہیں ہے بلکہ ہماری بحث تو اس ملک کے بارے میں ہے جہاں افراد کی اکثریت مسلمان ہے، اور لوگ ایسے دین کے پیرو ہیں جس نے زندگی کے تمام امور میں خواہ وہ انفرادی ہوں یا اجتماعی،بیوی کے انتخاب یا اولاد کی تربیت کی مانند گھریلو مسائل ہوں، یا اجتماعی اور بین الاقوامی مسائل قرآن کریم ، رسول کی سنت ، اہل بیت کی روایات اور ان کی عملی سیرتیں پیش کر دی گئی ہیں ۔

جو لوگ سمجھدار ہیں اور صرف تقلید سے کام نہیں لیتے : میں انھیں ایک ایسے دین کے بارے میں کہ جس کا دعویٰ ہے کہ وہ انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں سے متعلق منصوبے رکھتا ہے شہری قوانین ہوں یا بین الاقوامی حقوق سب کچھ اس میں موجود ہے؛اپنا معاملہ صاف اور واضح کر دینا چاہئے،آیا اس صورت میں ایسے افراد یہ کہنے کا حق رکھتے ہیں کہ ہم دین کو تو تسلیم کرتے ہیں پھر بھی ہم کہتے ہیں کہ قانون کے معتبر ہونے کا معیار وملاک عوام الناس کی رائے ہے؟کیا وہ ان دونوں کو،کم ازکم وہاں کہ جہاں ان میں تضاد پایا جاتا ہے، تسلیم کر سکتے ہیں؟

افسوس آج ہمارے اخبارات ورسائل میں ہر ان باتوں کو جو مغرب میں کہی جا رہی ہیں ان کورواج دیا جارہا ہے آیا دین کی نظر میں جب کہ لواط اور ہم جنسی سب سے برااور سب سے شرمناک عمل ہے خدا نخواستہ اگر عوام الناس اس کے صحیح ہونے کے حق میں ووٹ دیدیں تو کیا عوام کی اس مانگ کو دین کے احکام پر مقدم قرار دیا جاسکتا ہے؟!

اور کیا بنیادی طور پر یہ دونوں ایک ساتھ جمع ہو سکتے ہیں ؟ مغربی دنیا نے اس طرح کے مسائل کو جہاں دین اور عوام کی مانگیںآپس میں ٹکراتی ہوں حل کرلیا ہے ان کا خیال ہے کہ اس طرح کے مسائل میں دین کومداخلت اور عوام کی خواہش کونظرانداز کرنے کا کوئی حق نہیں ہے دین کا تعلق کلیسا سے ہے جہاں آکر افراد اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے اور مخصوص اعمال انجام دیتے ہیں اور ان کے

گناہ معاف ہوجاتے ہیں جس کے بعد کلیسا ان کو بہشت کے لئے روانہ کردیتا ہے، لیکن اجتماعی مسائل سے دین کا کوئی تعلق نہیں ہے، اجتماعی مسائل صرف عوام کی رائے سے ہی مشخص ہوتے ہیں، کنیڈا میں ایک نئے مذہبی فرقے کی بنیاد ڈالنے والے ایک پادری (روحانی پیشوا) سے ایک ٹی وی پروگرام میں سوال کیا گیا کہ خود مردوں یا عورتوں کے درمیان جنسی تعلقات کے بارے میں آپ کے فرقہ کا کیا نظریہ ہے؟تو اس نے جواب دیا: ابھی تو کوئی قطعی نظریہ نہیں دے سکتا لیکن اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ انجیل کا نئے سرے سے مطالعہ ہونا چاہئے۔

اسلام اور مغربی دنیا میں جمہوریت اور قانون سازی کے سرچشمےآپ نے ملاحظہ فرمایا کہ اہل مغرب نے دین اور معاشرتی مسائل کے دائروں کو آپس میں جدا کرکے اپنی پسند کا حل تلاش کرلیا اور دین اور عوام کی مانگوں کے درمیان ٹکراؤ کا حل ڈھونڈ نکالاہے، کیا ہم اسلام کے ماننے والے بھی اسی طرح کے راہ حل کی تلاش میں ہیں؟ یہ وہی نظریہ ہے جو ''سیکولرزم'' کے نام سے مشہور ہے یعنی دین کو زندگی کے امور سے جدا کردینا چاہے وہ مسائل اجتماعی، حقوقی، سیاسی اور گھریلو مسائل کیوں نہ ہوں،ہمارے یہاں کچھ افراد نے اس بارے میں ''ایرانی ثقافت کی خدمت'' کے نام پر دسیوں تقریریں کی ہیں اور متعدد مقالے لکھ ڈالے ہیں کہ دکھائیں مذہب کا دائرہ، سیاست اور اجتماعی، حقوقی اور اقتصادی مسائل سے الگ ہے اور اس بارے میں رات دن محنت اور قربانیاں دیا کرتے ہیں، تو کیا ہمارا بھی ایسا ہی عقیدہ ہے؟ اگر اس طرح کا عقیدہ نہیں رکھتے تو توجہ رہے دھوکہ میں نہ آئیں اور یاد رکھیں کہ جو کچھ وہ بیان کرتے ہیں ہمارے عقیدہ کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے خیال رکھیں کہ اگر خدا کے مطالبے اور عوام الناس کی خواہش کے درمیان ٹکراؤپیدا ہوجائے تو جو کچھ دین خدا نے معین کیا ہے اسکو اپنائیں اور حقیقت میں خدا کی مرضی کو مقدم قراردیں۔

البتہ میں کسی کا فریضہ مشخص ومعین کرنے کا قصد نہیں رکھتا کہ کوئی ہمارے بیان کو آزادی کی مخالفت قرار دے لوگ اپنے انتخاب میں آزاد ہیں لیکن ان کو توجہ دینی چاہئے کہ انتخاب پوری آگاہی کے ساتھ آزادانہ طور پر انجام پائیں، انھیں معلوم ہو کہ کیا انتخاب کر رہے ہیں آج کل ''قانون سازی میں جمہوریت'' کے عنوان سے جوبات کی جاتی ہے اس کا مطلب ہے عوام کی رائے کو خدا کی مرضی

اور مطالبہ پر مقدم رکھنا یعنی دین اور رضائے خدا کو کنارے لگا دینا، اگر عوام حق انتخاب چاہتے ہیں تو ان کو متوجہ رہنا چاہئے کہ دھوکا اور فریب نہ کھائیں کہ اسلام معاشرہ پر حاکم قوانین و دستور کے عنوان سے قبول کرنے کے ساتھ قانون سازی میں جمہوریت کی بات کو قبول کرنا، درحقیقت ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتا۔

جو افراد عوام الناس کو دھوکہ دینے، معاشرہ میں آمیزش و انحراف پھیلانے اور بحث کو خلط ملط کرنے میں لگے ہوئے ہیں وہ میری تقریروں اور پیش کی گئی مثالوں سے ناراض اور غصے میںآتے ہیں کیونکہ ان کی نیت اور ان کی سازش کہیں فاش نہ ہوجائے اس سے پریشان ہوتے ہیں البتہ کچھ افراد کو سیاسی یا اجتماعی اغراض و مقاصد کی وجہ سے میری باتیں اچھی نہیں لگتیں، لیکن یہ باتیں کسی کو اچھی لگیں یا بری، میں اپنی زندگی کے آخری لمحے تک دین کی توضیح اور اس کے جامع و کامل ہونے کی حمایت سے دریغ نہیں کروں گا،اور ہر قسم کے ناگوار نتائج دل و جان کے ساتھ برداشت کرنے کے لئے آمادہ ہوں نہ کسی دھمکی سے ڈرتا ہوں، اور نہ کسی کے دھوکہ میں آنے کو تیار ہوں۔

ہم یہاں قطعی اور فیصلہ کن احکام صادر کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے لیکن یہ یاد دہانی کرادینا چاہتے ہیں کہ عوام الناس ہوشیار رہیں اور واقعیات جاننے کی خاطر اپنی عقل سلیم کو کام میں لائیں اہل مغرب کی پر فریب اصطلاحات اور مفاہیم کے دھوکہ میں آنے سے ہوشیار رہیں، تاکہ ایسا نہ ہو اپنے دین سے ہی ہاتھ دھوبیٹھیں، ضروری ہے کہ وہ نظریات وآراء جو بیان کئے جاتے ہیں ان کے اصل سر چشموں سے پوری طرح واقف ہوجائیں۔

مثال کے طور پر جب یہ کہا جاتا ہے کہ قانون کو تسلیم کرنے کا معیار عوام الناس کی خواہش اور ان کی مانگ ہے اور ''قانون سازی میں جمہوریت'' کا مسئلہ اٹھایا جاتا ہے تو ان کو یہ سوچنا چاہئے کہ کیا انسان صرف اسی بدن سے بنا ہے، اوراس کو صرف ایک مادی زندگی اور حیوانی خواہشات کا مجسمہ بناکر بھیجا گیا ہے؟ اگر ایسا ہے تو اس صورت میں عوام الناس کو ہی قانون سازی کا حق ہے، جیسا کہ

مغرب نے اسی نظریہ کو تسلیم کر رکھا ہے، یا وہ باتیں ہیں جو اسلامی نظریات میں بیان کی گئی ہیں کہ انسان مادی ڈھانچے کے علاوہ ایک بلند وبالا مقام اور روحانی اور معنوی اہمیت کا بھی حامل ہے اوراس بنیاد پر قانون سازی میں اس کی مادی مصلحتوں، اور اجتماعی نظم و تحفظ کے پاس و لحاظ کے علاوہ معنوی مصلحتوں کی بھی رعایت ضروری ہے،اور اس صورت میں انسان کوخدا کی مرضی کا تابع ہونا پڑے گا اور قانون کا معیار خداوند عالم کی مرضی قرا رپائے گی۔

پس وہ بات کہ جس کی طرف ہم پہلے بھی اشارہ کرچکے ہیں قابل توجہ قرار پائے گی کہ کیا واقعاً انسان مادیت سے بالاتریعنی ماوراء الطبیعۃکوئی معنوی پہلو بھی رکھتا ہے یا نہیں؟ کیا انسان اس مادی بدن اور حیوانی خصلتوں کے علاوہ کوئی اور پہلو بھی رکھتا ہے، کہ اس کی اساس وبنیاد پر خداوند عالم سے تعلق اور رشتہ جوڑ سکے؟ کیا واقعاً مرنے کے بعد انسان کے لئے کوئی اور زندگی بھی ہے؟ کیا واقعاً اس مادی زندگی اور مرنے کے بعد کی اخروی زندگی کے درمیان کوئی رابطہ ہے؟ مسلمانوں خصوصاً دیندارافراد کے لئے توان سوالات کے جوابات واضح ہیں۔ پھر بھی اس بات پر توجہ رکھنا چاہئے کہ ہمارے سیاسی اور اجتماعی رجحان ہمارے اعتقاد کے ساتھ ہم آہنگ ہوں اورہماری فکر اوراندیشہ و عمل میں انحراف کی آمیزش نہیں ہونی چاہئے،اگر واقعاً ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ خدا ہے، قیامت ہے، اور حساب وکتاب دینا ہے توہم کواس کی وضاحت کرنی ہوگی اور ایک قطعی فیصلے پر پہونچنا ہوگا کہ حقیقت میں ایک غیر الٰہی قانون پر عمل کرنا کہ (عوام الناس کی مرضی قانون کا معیار ہے) کہیں ہماری ابدی زندگی پر منفی اثرتو نہیں ڈالے گی؟ اس سوال کاایک قطعی اوریقینی جواب دینا ہوگاکیونکہ شک و شبہات سے مشکل کا حل نہیں نکلتا اور اس بارے میں شک ایجادکرنا عقلمندی کا کام نہیں کہا جاسکتا۔

مغرب میں یہ مسئلہ حل ہوچکا ہے وہ بھی اس طرح کہ سرے سے یا توکسی بھی غیر مادی، معنوی دنیا کا انکار کر دیا گیا ہے یا افکار ونظریات کو شک و شبہ میں مبتلا کر کے ذہنوں میں یہ ڈال دیا گیا ہے کہ چاہئے اور نہیں چاہیئے، جیسے معیارات قابل مشاہدہ بیرونی حقائق پر مبنی نہیں ہیں کہ ان کے متعلق کوئی یقینی فیصلہ کیا جائے یا یہ محض باہمی مفاہمت سے طے شدہ اعتباری اور قراردادی چیزیں ہیں جن

کی بنا عوام کی خواہش پر ہے ان معاملات کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہے، پھر بھی ہمارے مغرب پرست روشن فکر ان ہی مطالب کو اپنی کتابوں میں لکھ کر ہمارے نوجوانوں کے حوالے کر دیتے ہیں اور بات یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ ہر چیز کو شک کی نظر سے دیکھنا قابل احترام سمجھا جانے لگتا ہے اور اس پر فخر بھی کرتے ہیں!! لیکن دین کی نظر میں مسئلہ اس طرح نہیں ہے، ہم کو شک وشبہ اور حیرت و بے یقینی کی دنیا سے باہر نکلنا چاہئے اور آگاہی و یقین کے ساتھ ایک مطمئن راستہ کو منتخب کرنا چاہئے جیسا کہ قرآن کریم نے ابتدا ہی میں یقین پر زور دیا ہے سورۂ بقرہ میں خدا فرماتا ہے: (وَبِالآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ[۱]) ''متقین وہ لوگ ہیں جو عالم آخرت پر یقین رکھتے ہیں'' ''یشکّون'' نہیں کہا گیا ہے،اب اگر کوئی قرآن کریم سے استفادہ چاہتا ہے تو اسکو عالم آخرت پر یقین رکھنا ہوگا؛ قرآن کریم دوسری جگہ فرماتا ہے: (وَفِي الأَرْضِ آيَاتٌ لِلْمُوقِنِينَ.[۲]) ''اور یقین کرنے والوں کے لئے زمین میں (قدرت خدا کی) بہت سی نشانیاں ہیں''

دوسری طرف مغربی ثقافت سے متاثر افراد جواب میں کہتے ہیں کہ منطقی طورپر انسان کسی بھی مسئلہ میںیقین پیدا ہی نہیں کرسکتا، خصوصاًوہ مسائل کہ ج کا تعلق مادہ سے ماوراء ہے ان میں یقین ہی نہیں ہے، قرآن کریم نے انسان کے لئے زوال و پستی کی جو بدترین حالت بیان کی ہے وہ شک اور بے یقینی کی حالت ہے قرآن مجید منافقین کے لئے فرماتا ہے: (فَهُمْ فِي رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُونَ[۳].) ''پس وہ ہمیشہ اپنے شک میں ڈانواڈول رہیں گے (کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں،)اسی طرح قرآن کریم ایک دوسرے مقام پر فرماتا ہے: (أَءُنْزِلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ مِنْ بَيْنِنَا بَلْ هُمْ فِي شَكٍّ مِنْ ذِكْرِي[۴]۔) ''کیا ہم میں سے قرآن فقط ان (محمدؐ) پر نازل ہوا ہے؟ یہ لوگ درحقیقت خود میرے کلام ''وحی'' کے بارے میں شک رکھتے ہیں ۔ ''قرآن کریم ہم کو،اہل یقیقن دیکھنا چاہتا ہے خاص طور سے اصول دین یعنی خدا کی وحدانیت، عدل، نبوت، امامت اور قیامت کے بارے میں، اب ہم کو ان دو راستوں میں سے ایک راستہ کو

---

[۱] سورہ بقرہ آیت ۴۔
[۲] سورہ ذاریات آیت ۲۰۔
[۳] سورہ توبہ آیت ۴۵۔
[۴] سورہ ص آیت ۸۔

منتخب کرنا ہے یا ہم اس مکتب فکر کو اختیار کریں کہ جس میں انسان بنیادی طور پر کسی یقین تک نہیں پہونچتا، اور ہمیشہ شک وشبہ کی غیر یقینی حالت میں مبتلا رہتا ہے، یا اس مکتب فکر کو منتخب کریں کہ جو ہم کو پوری آگاہی اور یقین کے ساتھ انتخاب کی دعوت دیتا ہے اور کہتا ہے جب تک اہل یقین نہ بن جاؤ کتاب خدا سے استفادہ نہیں کر سکتے ۔

ان دونوں مکاتب فکر میں فرق اتنا زیادہ ہے کہ ان میں سے ایک انسان کے لئے شک وشبہ اور بے یقینی کی حالت کو بد ترین حالت سمجھتا ہے اور شک وشبہ میں گرفتار شخص کو اس شخص کی مانند قرار دیتا ہے جو کسی خوفناک ،بھیانک جنگل میں پہونچ گیا ہو اور چاروں طرف سے ہر شخص اس کو اپنی طرف بلارہا ہو اور اس کی سمجھ میں نہ آرہا ہو کہ کدھر جائے اس کے برعکس مغربی ثقافت میں شک وشبہ کو بہترین معیار قرار دیا جاتا ہے، ان کا خیال ہے کہ جب تک انسان اہل حیرت وشک نہ ہو،انسان نہیں ہوسکتا پس ہم کو ان دونوں راستوں میں سے ایک راستہ منتخب کرنا ہے یا اسلام کو مانیں یا اس ثقافت کو جس میں حیرت وشک کو بہترین معیار بتایا جاتا ہے،ان دونوں راستوں کو ایک ساتھ تسلیم نہیں کیا جا سکتا کیونکہ کبھی یہ تسلیم نہیں کیا جاسکتا کہ اس وقت دن بھی ہے اور رات بھی،اور اسی طرح توحید اور تثلیث (تین خداؤں کا ماننا) بھی ایک عقیدہ اور ایک نظریہ میں نہیں سما سکتے ۔

جوانوں کے لئے ایک نصیحت

میں اپنے عزیز نوجوانوں سے جو علمی بنیادوں پر اپنے اعتقادات محکم کرنے کے خواہشمند ہیں ایک واضح فکر کے حامل بننا چاہتے ہیں او راہل تقلید بننا پسند نہیں کرتے، یہ نصیحت کرتا ہوں کہ وہ پہلے ان بنیادی مسائل کو حل کریں،سوچ لیں کہ کیا ہونا چاہئے اہل شک یا اہل یقین، دین کی پیروی کریں گے یا سیکولرز بننا پسند کریں گے، خدا پرست بنیں گے یا ہر قسم کی بندگی یہاں تک کہ خدا کی عبودیت سے بھی آزادی چاہتے ہیں، ہم کو ان دونوں میں سے ایک راستہ اپنانا ہو گا، ایسا نہیں ہوسکتا کہ کبھی اِس راستہ پر چلیں اور کبھی اُس راستہ پر چل پڑیں، کبھی دین کی باتوں کو قبول کریں اور کبھی دوسرے کی، اس طرح کا رویہ بہت خطرناک ہے، اور ہماری عاقبت کفر اور جہنم کے ابدی عذاب میں تبدیل کر دے گی ۔

اگر ہم قرآن کو خدا کی کتاب مانتے ہیں اور اس کی حقانیت کو قبول کرتے ہیں تو کیوں انسان کی مطلق آزادی کو تسلیم کرلیں؟! کیوں دین کے بھی معتقد ہوں اور لیبرلزم اور سیکولرزم کے بھی؟ یہ چیز بنیادی طور پر ناممکن ہے اس سلسلہ میں ایک بلند وبالا تر راستہ کا انتخاب پہلے سے فرض شدہ کچھ اصولوں پر ہے جس کے بارے میں بحث ہونی چاہئے مثلاً یہ بحث کریں کہ کیا ہم انسان کو صرف ایک مادی وجود سمجھیں اور اس کی سعادت ونجات صرف حیوانی لذتوں میں تلاش کریں ؟آزادی کا مطلب بھی صرف خواہشات نفسانی کی تکمیل سمجھیں؟یا یہ کہ مادیت سے ماوراء انسان کے لئے ایک جوہر ہے،ایک روح الٰہی ہے،اور بدن صرف روح کے کمال وارتقاء کا ایک وسیلہ ہے اور ہماری حقیقی زندگی ایک ابدی زندگی ہے جیسا کہ خداوند عالم نے فرمایا ہے:(وَاِنَّ الدَّارَ الآخِرَۃَ لَہِیَ الحَیَوان.[۱]) ''اور اس میں شک نہیں کہ ابدی زندگی (کی جگہ) تو بس آخرت کا گھر ہے ۔

دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے: (وَمَا الحَیٰوۃُ الدُّنیَا اِلَّا مَتَاعُ الغُرُورِ.[۲]) ''اور دنیا کی (چند روزہ) زندگی تو دھوکے کی پونجی کے سوا کچھ نہیں ہے''.اگر عالم آخرت ہماری اصلی اور حقیقی زندگی ہے تو دنیا میں ہم کو اپنی پوری توجہ اور کوشش اسی بات پر صرف کرنی چاہئے جو ہم کو اس عظیم سعادت تک پہونچا سکے،ان مذاہب کے برعکس کہ جن کا خیال ہے کہ اُخروی سعادت دنیا کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتی،اگر کوئی شخص اخروی سعادت کا خواہاں ہے تو اس کو دینا میں گوشہ نشینی اختیار کرلینا چاہئے،دنیا سے کم سے کم استفادہ کرنا چاہئے،یہ بڑی ہی خوش قسمتی کی بات ہے کہ دین اسلام دنیا وآخرت دونوں کی سعادت ایک جگہ جمع ہونا ممکن سمجھتا ہے اور معتقد ہے کہ انسان خاص طور سے معاشرتی زندگی میں دنیا کی ترقیاں بھی حاصل کرسکتا ہے اورآخرت کی ابدی نجات اور کامیابیاں بھی حاصل کرسکتا ہے۔

---

[۱] سورہ عنکبوت آیت ۶۴۔
[۲] سورہ آل عمران آیت ۱۸۵۔

تیرہویں تقریر

قانون کے سلسلے میں اسلام اور مغربی طرز فکر میں بنیادی فرق

گذشتہ مطالب پر ایک نظر جیسا کہ گذشتہ تقریروں میں عرض کیا جا چکا ہے ہماری گفتگو کا اصلی موضوع اسلام کے سیاسی نظریہ کی توضیح ہے، اور یہ نظریہ کچھ وضع شدہ اصول اور طے شدہ مفروضوں پر مبنی ہے کہ جن کی بنیاد پر اپنی بحث استوار کرنا ہے،ان اہم ترین فرضیات میں سے کہ جن کو مدنظر رکھتے ہوئے بھی اپنی بحث کو آگے بڑھانا ہے تین باتیں خاص اہمیت رکھتی ہیں: پہلے یہ کہ: انسان کی اجتماعی زندگی بغیر قانون کے دائم و برقرار نہیں رہ سکتی،یعنی انسان کی اجتماعی زندگی کے لئے قانون کا ہونا ضروری ہے۔

دوسرے یہ کہ :قانون کے لئے قانون سازی کی ضرورت ہے تاکہ مناسب قوانین وضع کر کے قانون کے اغراض و مقاصد کو پورا کیا جا سکےاور تیسرے یہ کہ :قانون،بن جانے کے بعد اس پر عمل درآمد کے لئے ایک نافذ کرنے والے کی ضرورت ہے کہ اگر کوئی قانون کی خلاف ورزی کرنا چاہے تو اس کو قانون قبول کرنے کیلئے طاقت کا استعمال کیا جا سکے۔

پہلا موضوع کہ کسی بھی معاشرہ کیلئے قانون ضروری ہے، اس کے بارے میں ہم عرض کر چکے ہیں کہ ہر تاریخ کے طویل سفر میں تقریباً سبھی انسانوں نے اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے اور شاید ہی کوئی اسلامی محقق ہو جو معاشرہ کیلئے قانون کی ضرورت کا قائل نہ ہو،یقیناً کچھ گنے چنے افراد مل جائیں گے جن کا خیال ہے کہ اخلاقی قدر و قیمت کی موجودگی معاشرہ کو قوانین سے بے نیاز کردیتی ہے۔ لیکن یہ محض ایک خیالی تصور اور آرزو ہے اور تاریخ میں کبھی ایسا دیکھنے میں نہیں آیا کہ کسی معاشرے کے تمام افراد اخلاقیات کے اس قدر پابند ہوں کہ قانون سے بے نیاز ہو جائیں اور مستقبل میں بھی کسی ایسے دور کی توقع نہیں رکھی جاسکتی کہ تمام افراد ااخلاقی اصولوں کی اس قدر رعایت کریں کہ ان کومعاشرتی قوانین کی ضرورت نہ رہے، لہٰذا ہم یہ فرض کرتے ہیں کہ وہ تمام محققین جو اسلام کے سیاسی نظریہ پر بحث کرنا چاہتے ہیں وہ قانون کی اصل ضرورت کو تسلیم کرتے ہیں اور اس ذیل میں، جس مسئلہ پر بحث کرکے کسی نتیجہ تک

پہونچنا چاہتے کہ ایک قابل قبول قانون کی کیا خصوصیات ہونا چاہیئے ہیعنی ہم یہ تسلیم کر چکے ہیں کہ اصولی طور پر قانون کا ہونا ضروری ہے لیکن کیا معاشرہ میں پیش کیا جانے والا ہر قانون کافی ہے اور وہ معاشرہ کو فلاح و ترقی تک پہونچا سکتا ہے یا ایسا نہیں ہے، مطلوبہ قانون کے لئے مخصوص خصوصیات کا حامل ہونا ضروری ہے؟ ہم نے عرض کیا اس بارے میں مختلف نظریات پائے جاتے ہیں: کچھ افراد کا کہنا ہے کہ قانون عادلانہ ہونا چاہئے اس صورت میں قانون کی خصوصیت اس کا عدل وانصاف پر مبنی ہونا قرار پائے گی، کچھ اور افراد کہتے ہیں کہ قانون ایسا ہو کہ جو اجتماعی ضرورتوں کو پورا کر سکے، اس طرح ایک تیسرے گروہ کا کہنا ہے کہ: قانون کا کام صرف معاشرہ میں نظم و نسق اور امن و تحفظ قائم کرنا ہے،یہ تینوں نظریے مغرب کے سب سے زیادہ شہرت یافتہ نظریے مانے جاتے ہیں۔

ان کے برخلاف خدا پرستوں خصوصاً اسلام کے ماننے والوں کے نظریے ہیں جو کہتے ہیں کہ قانون ایسا ہو کہ جو دنیوی اور اخروی تمام مصلحتوں کا حامل ہو صرف لوگوں کے مطالبے، نظم ونسق اور امنیت کا ضامن ہونا قانون کے لئے کافی نہیں ہے بلکہ قانون ایسا ہونا چاہیئے کہ جس میں دنیا اور آخرت کی تمام انسانی مصلحتوں کو مد نظر رکھا گیا ہو،یعنی اگر قانون اس طرح کی کسی بھی مصلحت کے لئے خلل ایجاد کرے، تو وہ قانون قابل قبول نہیں ہے، وہ انسان اور معاشرہ کی ضروتوں کو پورا نہیں کر سکتا، اس بارے میں بڑی حد تک بحث کی جا چکی ہے، لیکن اب بھی چونکہ کچھ تعلیم یافتہ طبقوں اور صاحب نظر افراد کے اذہان عالیہ میں شبہات باقی رہ گئے ہیں لہٰذا مسئلہ کی،مزید وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔

انفرادی آزادی کے ساتھ قانون کا رابطہ

آج مختلف ذرائع ابلاغ اور بحث و گفتگو میں اس نکتہ پر بہت زیادہ تاکید کی جا رہی ہے کہ انفرادی آزادی اتنی زیادہ اہم ہے کہ اس کو کوئی بھی قانون محدود نہیں کر سکتا، اور آزادیوں کے اس دائرے میں کسی شخص کو رخنہ ڈالنے کا کوئی حق نہیں ہے یعنی انفرادی آزادیوں کی حفاظت کا مسئلہ قانون سے بالاتر ہے اب اگر کوئی قانون انفرادی آزادیوں میں مانع ہو تو ایسے قانون کا کوئی اعتبار نہیں

ہے،چنانچہ اس نظریہ کی بنیادوں کے بارے میں تحقیق و جستجو لازم ہے تاکہ اور زیادہ بصیرت کے ساتھ کی گئی تحقیق و جستجو کے بعد کسی منطقی اور علمی نتیجہ تک پہنچا جا سکے در حقیقت یہ طرز فکر اس مغربی ثقافت کی پیداوار ہے جسکو ہم بالکل پسند نہیں کرتے،اور اس سے اجتناب کرتے ہیں اور ہمارے ملک کے حکام نے بھی اکثر معاشرہ میں اس تہذیب سے وابستہ عناصر کے اثر و رسوخ کی طرف سے خبر دار کیا ہے، ہم مزید وضاحت کے لئے اصل بحث کے مقدمہ کے طور پر کچھ مطالب کو بیان کیا جارہا ہے تاکہ ان کے ذریعہ اسلام کے نظریات کا صائب و درست ہونا آسانی سے پتہ چل جائے۔

مغربی ثقافت کی بنیاد کچھ عناصر پر قائم ہے چنانچہ انسان محوری یا انسان کو تمام امور کا مرکز و محور قرار دینے والا رجحان اس ثقافت کا سب سے بنیادی ترین عنصر ہے، یورپ میں ''ہیومنزم (Humanism)''کا تصور قرون وسطی کے آخر میں اس زمانہ کے مشہور مصنفین اور ادباء منجملہ اٹلی کے ''دانتہ'' کے ذریعہ پیش کی گئی، در حقیقت یہ قبل از مسیحیت کے دور کی ایک باز گشت تھی۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں عیسائیت کا جنم مشرق اور فلسطین میں ہوا ہے، قبل اس کے کہ عیسائیت یورپ میں پہونچے ،یورپی معاشرہ بت پرست تھا،اور اس زمانہ کی سب سے اہم سلطنت روم تھی جو مشرقی روم موجودہ ٹرکی اور مغربی روم (اٹلی) پر مشتمل تھی،یہ پورا علاقہ ،سوائے یہودیوں کے، مکمل طور پر بت پرست تھا ان کے معاشرہ میں عیسائیت کے وارد ہونے کی وجہ سے عیسائیت میں تحریفات شروع ہوگئیں اور بت پرستی کے کچھ عناصر ان میں شامل ہوگئے،اور یورپی معاشرہ نے اس طرح کی عیسائیت کے سامنے سر تسلیم خم کردیا، ان تحریفات کے نمونے مسئلۂ تثلیث اور اس کے بعد کلیساؤں میں حضرت مریمؑ اور فرشتوں کے مجسموں کا نصب کیا جانا ہے،اسی لئے یہ کلیسا بڑی حد تک پہلے کے بت خانوں کی شبیہ نظر آتے ہیں۔

معلوم ہوا کہ مغربی دنیا میں ایک تحریف شدہ عیسائیت کورواج ملا، اور اس نے شرک کی جگہ لے لی اور وہ حکومت جو اس پر استوار ہوئی، در حقیقت شرک کی بنیادوں پر قائم ایک دنیاوی حکومت تھی جو معنوی اقدار سے محروم تھی جو عیسائیت کے نام سے،

الٰہی حکومت اور آسمان و ملکوت کی طرف دعوت کے نام سے یورپ پر حاکم ہوگئی اور بہت سے جرائم عیسائیت کے لبادہ میں آسمان و ملکوت کے نعروں کے ساتھ لوگوں پر کئے جاتے رہے۔

یہاں تک کہ لوگ آہستہ آہستہ ان مظالم جرائم سے تنگ آگئے اور عیسائیت سے پہلے کی زندگی کی طرف پلٹ گئے، درحقیقت ہیومنزم کا نظریہ ایک طرح سے خدا کے بجائے انسان، آسمان کے بجائے زمین اور آخرت کے بجائے دنیاوی زندگی کو ترجیح دینے کی طرف ایک برگشت ہے۔

ہیومنٹی طرز تفکر کا ماحصل یہ ہے کہ وہ انسان کو خدا کی جگہقرار دینا چاہتا ہے ،اور یہ نظریہ آہستہ آہستہ اس زمانہ میں رائج ہوا اور ادبیات کے فروغ کے ساتھ اٹلی کے مشہور ومعروف شاعر و محقق ''دانتہ''کی مانند ترقی پسند مصنفین کے ذریعہ یورپ کے تمام ممالک میں پھیلتا چلاگیا، اسے ایک ایسے محور کے طور پر پیش کیا گیا کہ جس کے اندر طرح کے طرح کے پہلو اور زاویے موجود ہیں، اس بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہیومنزم ان تمام نظریات کی ماں ہے کہ جن کے مجموعے سے مغربی ثقافت وجودمیںآئی ہے، یہاں تک جہاں بھی ہم مغربی ثقافت کی بات کرتے ہیں تو ہماری مراد صرف مغرب کی جغرافیائی ثقافت نہیں ہوتی اور نہ ہی اس سے وہ لوگ مراد ہیں جو مغرب میں زندگی بسر کررہے ہیں کیونکہ وہاں بھی دوسرے رجحانات رکھنے والے افراد رہتے ہیں، جو کچھ اچھے الٰہی عقائد رکھنے والے، دوسرے مکاتب فکر کے افراد ہیں چنانچہ ہم جس ثقافت کا مغربی ثقافت کے نام پر ذکر کر رہے ہیں وہ ایک ایسے معاشرے کی ثقافت ہے کے جس کے لوگ غیر الٰہی اقدار بلکہ الحادی ثقافت پر گامزن ہیں، لہٰذا ممکن ہے بعض مشرقی ممالک جیسے جاپان وغیرہ میں بھی یہی ثقافت حاکم ہوپس جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا میری یہ گفتگو مغرب کی جغرافیائی ثقافت سے مخصوص نہیں ہے۔

ہیومنزم اور لبرلزم کا قانون میں داخل ہونا معلوم ہواکہ مغربی ثقافت کفر و الحاد پر قائم ہے جس میں دین سے خدا کے تصور کو غائب کرکے خود انسان کو خدا کی جگہ رکھ دیا گیاہے یعنی انسان ہی تمام اقدار و معیارات کا محور ہے. اس طرز تفکر کے تحت انسان ہی تمام

ارزش واقدار کو جنم دیتے ہیں، اور انسانوں کے تفکر سے بالاتر کوئی واقعیت نہیں پائی جاتی، انسان ہی قانون وضع کرتا ہے اور انسان کے سوا کسی اور کو قانون بنانے کا کوئی حق نہیں ہے، انسان ہی انسانوں کی سرنوشت معین و مشخص کرتا ہے نہ کہ خدا ، یہ ہیومنسٹ تفکر کے اصلی عناصر ہیں کہ جن کے ذیل میں دوسرے رجحانات بھی وجود میں آگئے اور زمانہ کے طویل سفر میں آہستہ آہستہ اس کی جڑیں پھیل گئیں اور دو بہت ہی اہم رجحانات (جن کا آجکل مغربی ثقافت میں، اسلامی ثقافت کے مقابلہ میں بہت زور ہے) کو سیکولریزم اور لبرلزم کی شکل میں بیان کیا جاتا ہے ۔

ظاہر ہے جب انسان کی زندگی سے خدا کا تصور ختم ہو جائے تو انسانی زندگی کے اہم مسائل میں دین کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہے گی، اور اس وقت دین کو سماجی ، سیاسی اور قانونی مسائل کے دائروں سے الگ کر دینا چاہئے، اس نظریہ کی بنیاد پر اگر کچھ افراد دین کے نام پر کچھ اقدار اور معیارات کو قائم کرنا چاہیں تو وہ ان اقدار کو صرف عبادتخانوں میں انفرادی زندگی تک محدود کر دیں یعنی حقیقت میں دینی اقدار صرف افراد کی شخصی اور خصوصی زندگی میں جگہ رکھتے ہیں اجتماعی زندگی میں ان کی کوئی جگہ نہیں ہے یہ وہی دین اور سیاست کی جدائی کا تصور ہے اور اس کے اجتماعی زندگی کے اہم مسائل میں شمار ہوتا ہے جسکو سیکولرزم کہا جاتا ہے، اور ایک آخر میں جو چیز مغربی ثقافت کا ایک ثمرہ ہے وہ لبرلزم ہے ۔

جب تمام اقدار کا محور انسان ہو اور اس کے علاوہ دوسری کوئی اور چیز اسکی سرنوشت پر حاکم نہ ہو، تو یہ کہنا چاہیے کہ ہر وہ کام جو انسان کا دل چاہے انجام دے یہ وہی مطلق آزادی یا لبرلزم ہے لیکن چونکہ ہر انسان مطلق طور پر اگر آزاد رہنا چاہے تو حرج ومرج لازم آئیگا افراتفری پھیلے گی اور قانون کے لئے کوئی مقام باقی نہیں رہے گا اور ظاہر سی بات ہے کہ اس طرح کے حالات قبول نہیں کئے جا سکتے ،اور معاشرہ میں ایک قانون کی ضرورت کا احساس واضح و روشن ہے پس ایسا قانون ہونا چاہیے جو بدنظمی کو برطرف کر دے اس طرح سے کہ کوئی اپنی من مانی نہ کر سکے پھر جب نظم برقرار ہو جائے اور افراتفری ختم ہو جائے تو قانون کی ضرورت بھی ختم ہو جائے گی، اور ہر فرد کا دل جو چاہے گا، آزادانہ طور پر انجام دے گا ۔

مغربی ثقافت کے اصول اور اسلامی ثقافت سے ان کا موازنہ

جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا ہیومنزم کا نظریہ کا ہی بالآخر سیکولرزم اور لبرلزم پر ختم ہوا ہے۔اور یہ دونوں عناصر مغربی ثقافت کے بنیادی ترین عناصر ہیں اور بار بار جو یاد دہانی کرائی جاتی ہے کہ ہوشیار و خبردار رہئے کہیں مغربی ثقافت کی یلغار آپ کی ثقافت کا جنازہ نہ نکال دے اس سے مراد اسی طرح کی ثقافت ہے کہ جس کا ثمرہ لبرلزم اور سیکولرزم ہے، اس ثقافت کو مغرب میں رواج حاصل ہوا اور صنعتی اور ٹکنیکی ترقیوں کے ساتھ مختلف انسانی معاشروں میں وسیع سطح پر اس ثقافت کی طرف کشش پیدا ہوئی اور دوسرے ممالک میں بھی کم و بیش اس ثقافت سے لوگ متاثر ہوئے یہی وجہ تھی جیسا کہ سماجیات کے ماہرین کا خیال ہے، مغربی ٹیکنالوجی کی توسیع کے ساتھ ہی ساتھ مغربی تہذیب بھی توسیع اور منتقل ہوئی، یہ وہ واقعیت ہے جس پر عصر حاضر کے ترقی پذیر ممالک کو خوب غور و فکر کرنا چاہیئے۔اس مقام پر سوال یہ ہے کہ کیا مغربی تہذیب اپنائے بغیر علم اور ٹیکنالوجی حاصل کی جا سکتی ہے؟ یقیناً اس موضوع پر تفصیلی گفتگو کا یہ محل نہیں ہے

لیکن ہم یہاں پر اجمالی طور پر بتادیں کہ اب تک مغربی ٹیکنالوجی جن ملکوں میں بر آمد کی گئی ہے اس کے ساتھ ہی ساتھ مغربی ثقافت بھی منتقل ہوئی ہے، اور کم و بیش تمام انسانی معاشرے اس ثقافت سے متاثر ہوئے ہیں یہاں تک کہ ہمارے اسلامی معاشرے اور اسلامی ممالک بھی اس ثقافت سے بے بہرہ نہیں رہ سکے ہیں (البتہ بیرونی تہذیب اور ٹکنالوجی کی در آمدات کے سلسلے میں یہ لازم و ملزوم کا رشتہ صرف اس لئے کامیاب رہا کہ اسلامی اقدار کی حفاظت میں لاپرواہی سے کام لیا گیا ہے ورنہ ایسا نہیں ہے کہ ان دونوں کا جدا کرنا ممکن نہیں تھا)۔

افسوس! کہ آج یہ آمیزش اور اختلاط روشن خیال طبقوں کے درمیان مختلف سطحوں پر قابل مشاہدہ ہے اور اس چیز نے اسلامی ثقافت کے ساتھ مغرب کی الحادی تہذیب کو ضم کر دینے کا ماحول فراہم کر دیا ہے، البتہ مختلف سطحوں کے اعتبار سے یہ اختلاط بھی فرق کرتا ہے:

بعض امور میں مغربی ثقافت غالب آگئی ہے اور اسلامی رنگ پھیکا پڑگیا ہے اور بعض دوسرے امور میں اسلام کی جلوہ نمائی ہےلیکن افسوس اس بات کا ہے کہ مغربی ثقافت نے ایک غبار آلود دھندلی فضا ایجاد کردی ہے اور اسلام کی صاف وشفاف حقیقی فضا دنیا کے کسی کونے میں بھی اصل شکل میں دکھائی نہیں دیتی، ہمارے خیال میں وہ ماحول اور وہ فضا اسلامی ثقافت کا چہرہ صاف کر سکتی ہےاور اس پر چھائی ہوئی دوسری ثقافتوں کی گرد ہٹائی جا سکتی ہے اسلامی جمہوریۂ ایران کی فضا ہے اور چونکہ اس نظام میں اس طرح کی طاقت و قدرت موجود ہے اور یہاں کے عوام نے اسلام اور اسلامی ثقافت کیلئے اپنا سب کچھ قربان کردیا ہے، آج انقلاب اسلامی کومغربی ثقافت کے لئے سب سے بڑا خطرہ سمجھا جارہاہے۔

جیسا کہ ابھی کچھ دن پہلے واشنگٹن میں مشرق وسطیٰ کی سیاست کے ایک تحقیقی ادارہ کے سربراہ نے کہا تھا : ''جمہوری اسلامی ایران اپنے جغرافیائی دائرہ میں وہ خطرہ ہے جس کی اعتقادی لحاظ سے کوئی مثال نہیں'' ظاہر ہے کہ جس چیز سے وہ ڈرتے ہیں اورجس کو اپنے لئے ایک اہم خطرہ سمجھتے ہیں ،اقتصادی خطرہ نہیں ہے اس لئے کہ ان کا اقتصاد ہم سے کہیں زیادہ مضبوط ہے، اسی طرح ان کو فوجی خطرہ بھی نہیں ہے اس لئے کہ ان کے پاس ایسے تباہ کن اسلحے موجود ہیں جو دوسرے ممالک کے پاس نمونے کے طورپر بھی نہیں مل سکتے ،ان کے پاس وہ فوجی قوت ہے جو دنیا کے کسی بھی ملک کے پاس نہ تعداد کے اعتبار سے ہے اور نہ کیفیت کے اعتبار سے، چنانچہ وہ اگر ڈرتے ہیں تو جمہوری اسلامی ایران کی فکری، عقیدتی اور ثقافتی توانائیوں سے خوف کھاتے ہیں جبھی تو صاف لفظوں میں کہتے ہیں:

''جمہوری اسلامی ایران اپنے جغرافیائی دائرے میں وہ خطرہ ہے جس کی اعتقادی لحاظ سے کوئی مثال نہیں ہے''، یہی وہ چیز ہے جو مغربی معاشرہ کے لئے سب سے بڑے خطرہ کا باعث ہے، اسی وجہ سے وہ اس نظام کو کمزور کرنے کی مسلسل کوششوں میں لگے ہوئے ہیں اور صاف لفظوں میں کہتے ہیں کہ نظام ولایت فقیہ وہ نظام ہے جس میں رخنہ اندازی ناممکن ہے مگر یہ کہ خود اس نظام کے محور یعنی ولایت کو سرنگوں کر دیا جائے ۔

علماء اور اسلامی تہذیبی ڈھانچے کی خصوصیاتجو چیز اسلامی ثقافت کا اصل جوہر ہے وہ یہ کہ اس میں انسان کے بجائے خدا کو محور قرار دیا گیا ہے اسی بنیاد پر یہاں ایک سوال پیش آتا ہے کہ کیا اقدار ومعیارات کی بنیاد خدا کو قرار دیا جائے یا انسانی خواہشات کو؟آیا حقیقی حاکمیت خدا کی ہے یا انسانوں کی؟آیا فکر ونظر، حقوق اور سیاست کی مانند زندگی کے تمام مسائل بنیادی حیثیت سے خدا سے وابستہ ہیں یا انسانی خواہشات سے ؟

اگرچہ میں جانتا ہوں کہ ان باتوں کا بیان کرنا میرے لئے ناگوار نتائج کا سبب بنے گا لیکن عصر حاضر میں علماء کی سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ عصر حاضر کی غبارآلود فضاؤں میں اسلامی افکار ونظریات کی تصویر صاف وشفاف آئینہ کی طرح نمایاں کردیں، تاکہ لوگ کتابوں اور رسالوں میں شائع ہونے والے مختلف نظریوں کی تحقیق و جستجو کرتے وقت اسلام اور اسلامی کتابوں سے ماخوذ نظریات دوسروں کے پیش کردہ نظریوں سے جدا کرلیں اور اس طرح اسلام اور کفر وشرک کا فرق واضح ہو جائے اور کفر آمیز الحادی نظریہ رکھنے والوں کو اسلامی محققین کی فہرست سے الگ کیا جا سکے، علماء کی بنیادی اور اصلی ترین ذمہ داری یہی ہے اور قرآن بھی اس بارے میں فرماتا ہے: اگر علماء اور اہل علم بدعتوں کو آشکار اور حقائق کو واضح نہ کریں تو ان پر خدا، فرشتے اور تمام مخلوق لعنت کرتی ہے، ارشاد ہوتا ہے: (أُولٰئِکَ یَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَیَلْعَنُهُمُ اللاّٰعِنُونَ[۱]...) ''یہی لوگ ہیں جن پر خدا (بھی) لعنت کرتا ہے اور لعنت کرنے والے بھی لعنت کرتے ہیں۔''

ہمارا اصل فریضہ یہ ہے کہ ہم فضا کو صاف کریں تاکہ اسلامی مفاہیم اور اسلام وکفر کی درمیان کی سرحدیں واضح ہو جائیں اور یہ بھی معین و مشخص ہوجائے کہ کن افکار میں آمیزش اور ملاوٹ پائی جاتی ہے؟کیونکہ اسی آمیزش اور ملاوٹ کی وجہ سے حق و باطل کے درمیان عاشورا جیسا درد ناک واقعہ رونما ہواہے اور واقعہ عاشورا سے پہلے بھی نام نہاد مسلمانوں اور حضرت امیرالمومنین علیہ السلام کے درمیان جنگیں اور مقابلہ آرائیاں ہوئی ہیں بلکہ تاریخ کے طویل دور میں نبیادی طور پر اسی آمیزش، ملاوٹ اور ابہامات کے سبب

[۱] سورہ بقرہ آیت۱۵۹۔

اسلامی معاشرہ میں بہت سی خرابیاں پھیلی ہیں یہاں تک کہ اہل بیت علیہم السلام کی نسل پاک سے ایک شخص نے قیام کیا اور بہت سے اسلامی حقائق کی وضاحت فرمائی، لوگوں نے بھی ان کی باتوں کو قبول کیا اور ان کی آواز پر لبیک کہی اور ایران میں ایک عظیم اسلامی انقلاب برپا ہوا ۔

یہ ظاہر ہے جب تک دین اسلام کے لئے اپنی تمام چیزوں کو قربان کردینے والے غیرتمند جوان موجود ہیں ہرگز دین اسلام پر ذرہ برابر بھی آنچ نہیں آنے دیں گے،؛ الحمد اللہ ہمارے برادران اسلامی بہت اعلیٰ سطح کی سیاسی اور اجتماعی سوجھ بوجھ رکھتے ہیں، اور اپنے فرائض سے اچھی طرح واقف ہیں اور جانتے ہیں کہ ان کو کیسے کام کرنا چاہئے، ہم ان کے عملی فرائض معین و مشخص کرنا نہیں چاہتے بلکہ ہمارا کام تو صرف فکری اور عقیدتی فضا کو استوار و ہموار کرنا ہے، ہم تو صرف اسلام کے عملی اور نظری اصولوں کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں کہ وہ کیا ہیں؟

ہم تو بتانا چاہتے ہیں کہ اسلامی تہذیب وثقافت کسے کہتے ہیں اور مغربی اور الحادی تہذیب و ثقافت کیا ہے؟ ہم لوگوں کو بتانا چاہتے ہیں کہ ہیومنزم و سیکولرزم اور لیبرلزم کفرو الحاد کے بنیادی ترین عناصر ہیں اور ان کے برخلاف خدا کو محور و مرکز قراردینا، دین کو ایک حقیقت سمجھنا خدا و رسول اور اہل بیت کی پیروی اورولایت فقیہ اور خدا کی اطاعت کے دائرہ میں ہی انسان کی تمام قانونی فعالیت کا محدود ہونا اسلامی افکار کے بنیادی عناصر ہیں، یہ دونوں ثقافتیں ایک دوسرے کے مقابل سرگرم ہیں: ایک ثقافت انسان کو ہرچیز سے مطلق طورپریہاں تک کہ خدا کی اطاعت سے بھی آزاد ہوجانے کی دعوت دیتی ہے تو دوسری ثقافت ہم کوپوری طرح خداوندعالم کے سامنے تسلیم ہوجانے کی دعوت دیتی ہے ایک ثقافت انسان کے تفکر اور اسکی زندگی سے خدا کو نکال دینے کے سلسلہ میں کمر ہمت باندھ لینے کی دعوت دیتی ہے، تو دوسری ثقافت پرچم توحید کو سربلند رکھنے اور انسانی زندگی میں یکتا پرستی کی فکر کو محفوظ کر لینے کی کوشش کرتی ہے اور یہی ثقافت ہماری فکر و نظراور انقلاب کا محور ہے۔

قانون کی حقیقت اور اسلام اور لبرلزم میں اس کی اہمیت جیسا کہ ہم نے گذشتہ تقریروں میں بیان کیا ہے اسلام کے نقطۂ نظر سے قانون ایسا ہونا چاہیے جو انسان کو اسکے معنوی مفادات اور مصلحتوں تک پہونچانے میں بھی مددگار ہو صرف نظم و نسق اور اجتماعی امن و تحفظ فراہم کر دینا ہی قانون کا کام نہیں ہے جب کہ لیبرل نقطہ نظر سے چونکہ دنیا سے لذت اندوزی کے سوا انسان کا کوئی اور مقصد نہیں ہے، قانون کا کام صرف اسباب لذت فراہم کر دینا ہے اور بس، جو چیز انسانی زندگی میں لذت حاصل کرنے کی راہ میں اپنی توانائیوں سے استفادہ کرنے میں مخل ہو تو وہ دوسروں کیلئے مزاحمت ایجاد کرنے کے مترادف ہے ۔

بنا بر این جب ان توانائی اور لذتوں سے اس طرح استفادہ کیا جائے کہ اس سے دوسروں کی آزادی میں کوئی رکاوٹ نہ ہو تو قانون اس سے کوئی سروکار نہیں رکھتا؛ مطلب یہ ہوا کہ قانون کا فلسفہ صرف دوسروں کی آزادی کی حفاظت کرنا اور ان کی خواہشات نفسانی کی تکمیل کے لئے ماحول کو سازگار کرنا ہے، قانون کا یہی ہدف و مقصد مغربی ہیومنیزم اور لیبرلزم میں بیان کیا گیا ہے،اور اس بنیاد پر قانون کا دائرہ بہت محدود ہو جاتا ہے ۔ لوگوں کی زندگی میں حکومت کو کم سے کم مداخلت کرنا چاہئے کیونکہ اصل یہ ہے کہ لوگ آزاد رہیں اور جو کام ان کا دل چاہے انجام دیں اور اسی اساس و بنیاد پر یہ جملہ اپنا مفہوم پیدا کر لیتا ہے کہ آزادی کا تحفظ قانون سے بالاتر ہے۔

لیکن اسلام کی نظر میں قانون اس لئے ہے کہ انسانوں کو ان کی زندگی میں صحیح راستہکی ہدایت کرے اور معاشرہ کی مادی اور معنوی مصالح کی طرف رہنمائی کرے، اسلامی حاکم بھی وہی شخص ہو سکتا ہے جو ان مصالح کو معاشرہ میں عملی جامہ پہنائے اور وہ ہر چیز جو ان مصلحتوں کے لئے خطرہ ہو اس کو راستے سے صاف کر دے، لہٰذا ایک اسلامی حاکم اور ایک ڈیموکریٹک یا لیبرل حاکم کے فرائض کے درمیان بہت زیادہ فرق ہے اس لئے کہ وہ اپنا فرض سمجھتا ہے کہ ایسے مواقع فراہم کرے کہ لوگ اپنی خواہشات اور ہوس رانیوں کی تکمیل کر سکیں اور اس راہ میں وہ صرف بے نظمی اور ہرج و مرج روکنے کا ذمہ دار ہے اسکے علاوہ کسی طرح کے موانع کے ایجاد کرنے کا اسے کوئی حق نہیں ہے، جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ آزادی قانون سے بالاتر ہے خاص طور سے جو لوگ اہل علم و

دانش اور صاحب تحقیق و تالیف ہیں اور اپنے کو صاحب نظر سمجھتے ہیں ان کو زیادہ دقت نظر سے کام لینا اور مطالب کی باریکی سے تحقیق وچھان بین کرنا چاہیے اصولی طور پر قانون کا کام ہی یہ ہے کہ وہ کسی شخص کیلئے کوئی حق تو کسی کیلئے اس کے تئیں کچھ فرائض معین کرے، قانون آزادی کو لگام لگانے کا وسیلہ ہے، اگر یہ طے پایا جائے کہ ہر شخص جو کچھ بھی اس کا دل چاہے انجام دے تو قانون کی کوئی ضرورت ہی نہیں رہے گی، قانون وہاں بنایا جاتا ہے جہاں پر افراد اپنی بعض شخصی خواہشوں سے صرف نظر کریں ورنہ قانون کا کیا کام رہ جاتا ہے، اگر بنا یہ ہو کہ ہر شخص جو کچھ چاہے انجام دے تو قانون کی کیا ضرورت ہے؟

نتیجہ کے طور پر ماہیت قانون یہ ہے کہ کسی کے لئے حق تو دوسروں کیلئے کچھ فرائض معین کئے جائیں، اگر ہمارے لئے کوئی ایسا قانون ہو جو برابر سے کوئی حق تمام انسانوں کیلئے معین کرے تو اس میں بھی دوسروں کے لئے فریضہ کی ضمانت ضروری ہوگی، مثال کے طور پر اگر ایک ایسا بین الاقوامی قانون ہوتا جس میں یہ حکم دیا جاتا کہ ہر انسان آزاد ہے اور اس کا یہ حق ہے کہ وہ دنیا کے کسی بھی گوشے میں اپنے رہنے کے لئے جگہ کا انتخاب کرلے تو اگرچہ اس قانون کا مفاد تمام انسانوں کیلئے ایک حق کا اثبات ہے۔

لیکن دوسروں کا فریضہ معین کئے بغیر اس حق کا اثبات ممکن نہیں ہے کیونکہ اس طرح کے قانون کا مطلب یہ ہوگا کہ ہر شخص کسی بھی جگہ رہنے کے لئے جگہ کے انتخاب کا حق رکھتا ہیتو اس کے معنی یہ ہوئے کہدوسروں کو اس حق کا احترام کرنا چاہیے اور اسکی راہ میں رکاوٹ نہیں کھڑی کرنا چاہیے، معلوم ہوا قانون صریحی طور پر، یا اشاروں میں یہ کام انجام دینا چاہیے اور وہ کام انجام نہیں دینا چاہیے کا ضامن ہے، یہاں تک کہ اگر معاشرہ کی ہر فرد کیلئے کوئی حق ثابت ہے تو بھی اس کا مفاد یہ ہوگا کہ دوسرے اس حق کی رعایت اور اس کا احترام کریں۔

جو قانون یہ کہتا ہے کہ ہم کو ایسا کرنا چاہیے اس میں یہ بات موجود ہے کہ اسکے خلاف عمل نہیں کرنا چاہیے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ آزادی محدود ہے یعنی کن افعال کو انجام دینا چاہیے اور کن افعال کو انجام نہیں دینا چاہئیے کی پابند ہے، نتیجتاً جو قانون یہ کہے کہ کسی

بھی آزادی کو محدود نہیں ہونا چاہئے وہ قانون تناقض رکھتا ہے، کیونکہ قانون کا مطلب ہے وہ چیز جو آزادی کو محدود کردے بنابریں قانون سے بالاتر کوئی آزادی نہیں ہے مگر یہ کہ ایک جگہ ہم مخصوص آزادیاں چاہتے ہوں اس صورت میں بھی ہم یہ کہتے ہیں کہ ان آزادیوں کی رعایت ضروری ہے، تو یہ بھی قانون ہوگا مگر کچھ دوسرے قوانین سے بالاتر قانون کہا جائیگا ۔

پھر بھی اگر کوئی قانون ہونا چاہئے کہ آزادی میں کسی طرح کی محدودیت نہ ہو تو وہ لغو ہے اور تناقض کا باعث ہوگا ۔اور کوئی بھی عاقل اس طرح کی بات نہیں کر سکتا ، اس لئے کہ بنیادی طور پر قانون کا کام ہی آزادی کو محدود کرنا ہے اب اگر یہ نعرہ کہ قانون کو آزادی پر پابندی لگانے کا کوئی حق نہیں ہے مطلق طور پرآزادی ہونا چاہیے تو یہ تناقض ہے اور اگر ان کی مرادوہ آزادیاں ہیں جو جائز ہیں تو ہم ان سے یہ عرض کریں گے کہ شرعی وہ جائز اور قانونی آزادی کونسی ہے؟ اوریہ کون معین کرے گا کہ جائز و قانونی آزادیاں کونسی ہیں اور ناجائز ، غیر قانونی آزادیاں کونسی ہیں؟قانونی آزادی ہر نظام اپنی مخصوص ثقافت کی بنیاد پر کچھ امور کو جائز قانونی ،اور معقول سمجھتا ہے اگرچہ دوسرے افراد ان کو غیر قانونی اور ناجائز ہی کیوں نہ سمجھتے ہوں۔

لہذا مطلق آزادی کوئی مطلب نہیں رکھتی اور کوئی بھی قانون مطلق آزادی کی ضمانت نہیں دے سکتا، جب کسی قانون میں یہ لکھا جائے کہ قانون جائز آزادیاں فراہم کرنے کا ذمہ دارہے، تو اس کو یہ بھی طے کرنا چاہئے کہ قانونی آزادیوں کا تعین کس کا کام ہے؟ یعنی جائز، معقول اور مفید آزادیوں کے تعین کا معیار کیا ہے؟ اس مقام پر یہ کہا جاتا ہے کہ قانونی آزادیوں کے معین کرنے کا ذمہ دار خود قانون ہے۔

بہر حال ہم پھر سے اصل مطلب کی طرف پلٹتے ہیں کہ اگر کوئی یہ کہتا ہے: معاشرہ قانونی طور پر ہر طرح کی آزادی رکھتا ہے تو اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ معاشرہ کیلئے کسی قانون کا ہونا لازم نہیں ہے،!! لیکن کوئی عاقل انسان اس طرح کی باتیں نہیں کرسکتا مگر یہ کہ وہ اپنی بات کی طرف متوجہ نہ ہو کہ کیا کہہ رہا ہے اور اس کی بات کا لازمہ کیا ہے پس پتہ چلا کہ جو شخص بھی آزادی کا دم بھرتا ہے یقیناً اس کی

مراد محدود آزادی ہے، اب یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ آزادی کی یہ حدود کون اور کس معیار پر معین کرے گا؟ اگر خود افراد اپنی مرضی کے مطابق آزادی کی حدوں کو معین کریں گے تو بھی ہرج ومرج لازم آتا ہے، اس لئے کہ اس صورت میں ہر انسان اپنے مفادات کو پورا کرنے کی کوشش کریگا ۔ لہذا آزادی کی حدوں کو معین کرنے والا کوئی ہونا چاہئیےپس ہم ناچار ہیں کہ قانون کسی قانون ساز کے ذریعہ مشخص ومعین ہو، ظاہر ہے اگر قانون ساز لوگوں کی خواہشات پر فیصلہ کرے گا اور قانون کا معیار اور اس کی کسوٹی لوگوں کی خواہشات کو قرار دے گا تو عملی طور پر اہل ہوس غالب آئیں گے یعنی وہی چیز جو ہیومنیزم اور لبرالزم کے نظریہ کی بنیاد ہے کیونکہ اس نظریہ کے تحت قانون کا کام صرف امن وامان بر قرار کرنا اور لوگوں کی خواہشات کی تکمیل کرنا ہے، لیکن اسلامی نقطۂ نظر سے یہ موضوع قابل قبول نہیں ہے، کیونکہ اس میں بنیادی خرابی پائی جاتی ہے ۔

اسلام کی لبرلزم سے مخالفت

یہ طے ہے کہ ہم اسلام کو قبول کرنے کے ساتھ لبرلزم قبول نہیں کر سکتے اگر ہم مانتے ہیں کہ قانون کا مطلب تمام انسانوں کے مصالح پورا کرنا ہے تو پھر ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہر انسان جو کچھ بھی اس کا دل چاہے کر سکتا ہے چونکہ یہ دونوں باتیں آپس میں میل نہیں کھاتیں، یا محور خدا کی ذات ہوگی یا انسان کی، دوسرے لفظوں میں! یا تو ہم کو اللہ پرست ہونا چاہئے یا ہیومنسٹ، یہ نہیں ہو سکتا کہ انسان کو بھی محور قرار دیں اور خدا کو بھی، ان دونوں اصولوں کو قبول کرنا تعارض اور تضاد کے ساتھ ساتھ ایک قسم کا شرک بھی ہے، اور اگر خدا کو نہ مانیں تو یہ کفر و الحاد ہے، اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ مغرب کی ہیومنسٹ تہذیب الحادی تہذیب ہے کیونکہ اسلام اور کفر و الحاد آپس میں ایک دوسرے کے مخالف ہیں ۔

اور ایک دوسرے سے بنیادی قسم کی جنگ رکھتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ امریکا کے سیاست دانوں کا خیال ہے جب تک ایران میں اسلامی نظام حاکم رہیگا، ہم ایران سے سمجھوتہ نہیں کر سکتے چونکہ یہ دونوں نظریے ایک دوسرے کے مخالف ہیں اور دونوں نظام ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتے ۔

معلوم ہوا اصل مسئلہ یہ ہے کہ مختلف نظریات میں منظور نظر قانون کی کیا خصوصیتیں ہیں؟آیا قانون کا کام معاشرہ میں صرف نظم و نسق برقرار کرنا اور انفرادی خواہشات اور آزادیاں،جب تک وہ دوسروں کی آزادی کی راہ میں آڑے نہ آئیں،فراہم کر دینا ہے ؟یا قانون کا کام انسان کی حقیقی مصلحتوں کی تکمیل ہے، چاہے افراد کی اکثریت اس کو چاہتی ہو یا نہ چاہتی ہو،البتہ اگر لوگوں نے اسکو تسلیم کرلیا تو اسکو عملی جامہ پہنایا جائیگا اور اگر تسلیم نہ کیا تو اسی طرح دستوری شکل میں باقی رہیگا ۔

پس معاشرے کے افراد سر فہرست ہیں لیکن یہ دیکھنا چاہیے کہ قانون کے جواز کی بنیاد اور قانونی حیثیت کیا ہے؟ کیا مطلوبہ قانون صرف وہ قانون ہے جو لوگوں کی خواہشوں کو پورا کرتا ہو یا وہ قانون ہے جو لوگوں کی مصلحتوں کو پورا کرتا ہو؟ یہ دونظریے آپس میں ایک دوسرے سے سمجھوتہ نہیں کر سکتے اور ان کو خلط کر دینے کا مطلب ایک ایسی دھندلی ثقافتی فضا ایجاد کرنا ہوگا کہ جو افراد غلط استفادہ کے چکر میں ہیں وہ کیچڑ میں مچھلی کا شکار کرلیں، ہماری ذمہ داری ماحول کو صاف و شفاف کرنا ہے تاکہ معلوم ہوجائے اسلام کیا ہے اور کفر کیاہے اور پھر انسان جس کو چاہے انتخاب کرے،جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے: (فَمَن شَاءَ فَلْيُؤْمِن وَمَن شَاءَ فَلْيَكْفُرْ[1])

شاعر کہتا ہے:

متاع کفر و دین بی مشتری نیست　　　　گروہی این گروہی آن پسندند

متاع کفر وایمان کب خریداروں سے خالی ہے　　　کوئی اس کا پجاری توکوئی اس کا سوالی ہے

''دین اور کفر دونوں کے خریدار بہت ہیں،　　　کچھ لوگ اس کوتو کچھ لوگ اس کو پسند کرتے ہیں''

بہر حال لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ کون متاع دین ہے اور کون متاعِ کفر ہے،تاکہ دونوں میں سے ایک کو منتخب کریں، ہمارا فریضہ ہے کہ ہم ان مفاہیم کو صاف وشفاف پیش کریں اورثقافتی ماحول پر چھائے ہر طرح کے گرد و غبار کو دور کردیں تاکہ لوگ سمجھ بوجھ کر

---

[1] سورہ کہف آیت ۲۹۔

انتخاب کریں، کچھ لوگوں نے اس طرح کی فضا بنائی ہے اور چاہتے ہیں کہ دین کی جگہ ڈیموکریسی اور آزادی کو حاکم قرار دیں، ہمیں ہر حال میں ہوشیار رہنا چاہئے اور معلوم ہونا چاہئے کہ کیا کہہ رہے ہیں او رکیا کررہے ہیں پوری طرح خبردار رہنے کی ضرورت ہے۔

اسلام اور جمہوریت میں قانون سازی ہم اس سے پہلے اشارہ کر چکے ہیں کہ قانون سازی کے مرحلے میں اسلام اور جمہوریت کے درمیان کبھی سمجھوتا نہیں ہوسکتا ہے، ڈیموکراسی یعنی عوام کی حکمرانی یا عوامی حکومت، دوسرے الفاظ میں لوگوں کی رائے اور نظر کو قانونی اعتبار دینا، اب یہ سوال کہ یہ اعتبار محدود ہے یا لا محدود؟ایک الگ مسئلہ ہے کہ آیا جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اصل معیار و میزان، لوگوں کی رائے ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خدا کی مرضی کے خلاف ہی کیوں نہ ہو ؟یا لوگوں کی رائے صرف اسی حد تک معتبر ہے کہ جب وہ حکم خدا اور منشائے خدا کے خلاف نہ ہو؟ مغرب میں اس اصلاح اور نعرے کا مطلب یہ ہے کہ عوام کی نظر اصل معیار ہے اور آسمان و زمین میں کسی دوسری طاقت کو لوگوں کے مقدرات کے فیصلے اور قانون سازی میں مداخلت کا کوئی حق نہیں ہے قانون وہی ہے جو لوگ چاہتے ہیں۔

یہاں ایک اور سوال پیش آتا ہے کہ قانون کے معتبر ہونے کا ملاک و معیار تمام افراد کا ایک نظریہ پر متفق ہونا ہے یا اکثریت کا متفق ہوجانا ہی کافی ہے؟ عملی طور پر توتمام افراد متفق نہیں ہو سکتے،اب اگر اکثریت کا متفق ہوجانا کافی ہے توتمام کے تمام افراد کا فریضہ کیا ہوگا اکثریت کی رائے ان کیلئے کیسے معتبر ہوسکتی ہے؟ درحقیقت آج کی ڈیموکریسی، جمہوریت اورامارت (بیوکریسی)کامکسچر ہے۔

یعنی لوگ قانون بنانے کے لئے،بیوکریسی کا انتخاب کرتے ہیں،اب اگر عوام کی اکثریت منتخب بیوکریسی کے نظریہ سے مختلف ہو، تو دونوں میں کس کی نظر معتبر ہوگی؟یقیناً عام طور سے منتخب نمائندے لوگوں کی خواہش کے مطابق قانون بناتے ہیں کیونکہ اگر انھوں نے ایسا نہ کیا تو اگلے دور کے انتخابات میں کوئی ان کو ووٹ نہیں دے گا اور وہ منتخب نہیں ہو سکیں گے۔

اسی لئے لوگوں کی خواہش کو پورا کرنے کے لئے وہ ان ہی کی مرضی کے مطابق قانون بناتے ہیں، لیکن بعض موقعوں پر لوگوں کی نظر منتخب نمائندوں کی اکثریت کی نظر سے مختلف بھی ہوتی ہے۔

کچھ لوگوں نے صاف لفظوں میں کہا ہے ان کا ہدف ومقصد یہ ہے کہ ایران میں علماء کی حکومت اور ولایت فقیہ یعنی حکومت اسلامی کے بجائے ایک ڈیموکریٹک حکومت قائم ہو، ڈیموکریٹک حکومت کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کی خواہش کے علاوہ کوئی اور دوسری چیز قانون کے تعین میں دخیل نہ ہو اب سوال یہ ہے کہ کیا مسلمان اس کو تسلیم کر سکتے ہیں یا نہیں؟

وہ لوگ جو اسلام کو ڈیموکریسی کے ساتھ میل کھانے کا دعوی کرتے ہیں یہ سوال پیش آتا ہے کہ عوام کی رائے اگر خدا کے قطعی حکم کے خلاف ہو تو کیا پھر بھی وہ معتبر اور قابل احترام ہے یا ایسا نہیں ہے؟ اگر معتبر نہیں ہے تو ماننا ہوگا کہ ڈیموکریسی ایجاد نہیں ہوئی اور اگر معیار لوگوں کی رائے ہے حتی خدا کے قطعی حکم کے خلاف ہی کیوں نہ ہو تو اس صورت میں کہنا ہوگا کہ ڈیموکریسی اسلام کے ساتھ میل نہیں کھاتی کیونکہ اسلام، خدا ورسول کی اطاعت کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں ہے؟

کیا اس کے علاوہ بھی کوئی اور اسلام ہے؟ آج کہا جاتا ہے کہ اسلام کی اور بھی بہت سی تعریفیں ہیں لیکن جس تعریف کو بنیاد بنا کر یہ انقلاب برپا ہوا وہ یہی ہے کہ احکام خدا اور الٰہی اقدار کو معاشرہ میں حاکم ہونا چاہئے؛ جن افراد نے یہ انقلاب برپا کیا ہے اور اپنے خون کے آخری قطرہ تک اس کی حمایت کی ہے اور آیندہ بھی حمایت کرتے رہیں گے ان کا ہدف اسکے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔

اب اگر قانون سازی کے دائرہ میں، جمہوریت کا مطلب انسانوں کی رائے کو اصل قرار دینا ہے حتی اگر یہ قانون اور ان کی رائے حکم خداوندی کے خلاف ہی کیوں نہ ہو تو اسلام اور مسلمانوں کے نقطہ نظر میں ایسی ڈیموکریسی ناقابل قبول ہے، لیکن اگر ڈیموکریسی کا مطلب کچھ اس طرح کا ہے کہ لوگ اسلام کے بنیادی اور اصول و اقدار کو محفوظ رکھتے ہوئے اپنے معاشرہ کے قانونی اور معاشرتی مسائل میں خود اپنے چنے ہوئے افراد کے ذریعہ حق مداخلت رکھتے ہوں اور منتخب شدہ نمائندے زمانے اور جگہ کے مخصوص حالات

کا خیال رکھتے ہوئے مخصوص قوانین بنائیں تو یہی وہ چیز ہے جو ہمارے اسلامی ملک ،ایران میں رائج ہے عوام پالیمنٹ کے اراکین کا انتخاب کرتے ہیں، اور پارلیمنٹ کے نمائندے پارلیمانی بلوں کے بارے میں بحث اور مشورہ کر کے اسکو منظور کر سکتے ہیں، لیکن پارلیمنٹ کے منظور کئے ہوئے قوانین کو اسی شرط پر قانونی حیثیت ملے گی کہ جب وہ اسلامی احکام کے مخالف نہ ہوں۔

بہر حال یہ کہ لوگوں کو زمانہ و ملک کے مخصوص حالات کے قوانین معین کرنے کے لئے نمائندے منتخب کرنا وہ چیز ہے جو ہمارے ملک میں رائج ہے اور امام خمینیؒ نے اسی روش کی تائید فرمائی ہے، اور ہمارے ملک کے آئین میں بھی اس کی تائید ہوئی ہے چنانچہ اگر قانون سازی میں جمہوریت کا یہی مطلب ہے تو اس جمہوریت کا کوئی مخالف نہیں ہے یہ ایران میں بھی موجود ہے۔

اسلامی حکومت میں قانون کا اعتبارایک مسئلہ جو بڑی اہمیت رکھتا ہے وہ یہ ہے کہ جب عوامی نمائندے اسلامی پارلیمنٹ میں کوئی قانون منظور کرتے ہیں تو کیا وہ قانون اس لئے معتبر ہے کہ لوگوں کے نمائندوں نے اس کو ووٹ دے کر پاس کیاہے، اور اصل میں لوگوں نے نمائندوں کو اسی کام کیلئے منتخب کیا ہے یا اس لئے معتبر ہے کہ ولی فقیہ نے اسکی تائید فرمائی ہے؟ نظریاتی طور پر ہماری نظر میں انسان کو اپنی زندگی میں وہ سب سے پہلا حق جس کی رعایت کرنا چاہیے خدا کا حق ہے، اگر یہ مان لیں کہ ہم کو کبھی حقوق کا پاس و لحاظ کرنا چاہئے تو خداوندعالم کا حق سب سے مقدم ہے اور انسانوں پر خداوندعالم کا بلند ترین حق، حق ربوبیت ہے اور اس ربوبیت کے دو شعبہ ہیں:

۱۔ تکوینی ربوبیت ۔ ۲۔ تشریعی ربوبیت

تشریعی ربوبیت کا مطلب یہی ہے کہ خداوندعالم جو بھی حکم دے وہ انسانوں کیلئے واجب العمل ہے، اب اگر خداوندعالم کسی چیز کی ممانعت فرمادے کہ اس کام کو انجام نہ دو اور خداوندعالم کے قوانین واحکام کی نافرمانی کرنا ربوبیت الٰہی کے حق کو ضائع کرنا ہے اور اس کا انکار اور معتبر نہ جاننا ایک قسم کا شرک ہے، اس بنیاد پر اسلامی معاشرہ میں وہی قانون معتبر ہوگا جو خداوندعالم کی مرضی کے

مطابق ہو اگر خدا کسی قانون کی نفی فرمادے تو وہ قانون اعتبار نہیں رکھتا،کیونکہ حق خدا ضائع ہوا ہے اور حق خدا ضائع ہونے کے زیر اثر انسانوں کا حق بھی ضائع ہوا ہے۔ظاہر ہے قانون سازی میں خدا کا کیا فائدہ ہے؟آیا خداوند عالم جب ہم کو کسی کام کا حکم دیتا یا منع کرتا ہے تو کیا وہ انسان کی بھلائی کے علاوہ کچھ اور چاہتا ہے؟ تو اب اگر کسی نے خدا کی مرضی کے خلاف کام کیا یہ خود انسانوں کی بھلائی کے خلاف کام کیا ہے۔

نتیجہ کے طور پر انسانی مفادات کی حفاظت جو قانون کے معتبر ہونے کا بنیادی ترین رکن ہے خطرہ میں پڑ جائیگا خدا کا حق بھی ضایع ہوا ہے اور انسانی مصلحتیں بھی خطرے میں پڑی ہیں اسی لئے اس طرح کے قانون کا کوئی اعتبار نہیں ہے ،اسی وجہ سے نمائندوں کے ذریعہ قانونی مسودہ کی منظوری کے بعد جانچ کے لئے ایک اور منزل معین کی گئی ہے کہ کچھ قانون دان اور دین سے آگاہ افراد اس قانون کی شرع سے مطابقت کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ یہ قانون خداوند عالم کے حکم کے خلاف تو نہیں ہے ؟ فقہا اور زعما کی سپریم کونسل شورائے نگہبان کا یہی کام ہے۔

اگر قانون کے معتبر ہونے میں صرف لوگوں کی رائے کافی ہوتی تو شورائے نگہبان کے فقہا کی کیا ضرورت تھی ؟ لوگ ووٹ کے ذریعہ اپنے نمائندوں کا انتخاب کرتے ہیں اور ان کے نمائندے لوگوں کی خواہش کے مطابق ایک قانونی بل منظور کرچکے ہیں اور وہ قانونی اعتبار سے حیثیت رکھتا ہے.

لہٰذا اسلامی جمہوری نظام میں ''شورائے نگہبان'' کی پہلی اور وجودی حیثیت یہ ہے کہ پارلیمنٹ کے بنائے اور منظور کئے ہوئے قوانین کی یعنی لوگوں نے اپنے نمائندوں کے ذریعہ جو چیز منظور کی ہے اسکی احکام شرع سے مطابقت کریں کہ کہیں وہ قانونی بل حکم خداوندی کے خلاف تو نہیں ہیں؟ مغربی ثقافت سے متاثر کچھ افراد جو دشمن کی جھولیاں بھرنے کی کوشش کیا کرتے ہیں شورائے

نگہبان کو حذف کرنے کا دم بھرتے ہیں اسکی وجہ یہی ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ کوئی ایسی کسوٹی اور چھلنی نہ ہو جو قوانین اسلام کو غیر اسلامی قوانین سے الگ کردے ۔

آج یہ حقیر صرف آپ حضرات کی اطلاع کے لئے یہ جملہ زبان پر لارہا ہے شاید آپ کو یقین نہ آئے اور خدا کرے وہ دن نہ آئے کہ اسکا حقیقی مصداق وجود میں آجائے کہ مغربی ثقافت کے دلدادہ لبرل عناصر چاہتے ہیں کہ اسلام اور ولایت فقیہ کو اس ملک کے آئین سے حذف کریں، خدا انشاء اللہ اسلام اور اسلامی نظام کے دشمنوں کو کبھی ایسا موقع نہیں دے گا ۔

چودہویں تقریر

قانون اور مغرب کی مادی نگاہ

گذشتہ مطالب پر ایک نظر جیسا کہ ہم نے عرض کیا ہے اسلام کے نقطۂ نظر سے معاشرہ کو قانون کی ضرورت ہے اور وہ بھی ایسا قانون جو انسان کے لئے دنیا وآخرت کی سعادت کا ضامن ہو، اور قانون کا اجراء کرنے والا ایک ایسا فرد ہو جو ہر طرح سے آگاہ ،عادل و پرہزگار ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی ذمہ داری کا احساس کرنے والا ہو نیز قانون کو اس کے مصادیق اور موارد پر تطبیق دینے کے سلسلہ میں بہت زیادہ توانا ہو کیونکہ یہ چیزیں ایک مدیریت کے لئے لازم ہیں ۔

حکومت کے سلسلہ میں اسلام کا یہ اصولی نظریہ ہے جس کو ہمارا معاشرہ ''ولایت فقیہ ''کے نام سے جانتا ہے اس نظریہ کی وضاحت عرض کرتے وقت ہم نے عرض کیا تھا کہ انسان کا کسی جنگل یا غار میں تنہا زندگی بسر کرنا ممکن ہے، لیکن ایک انسان کی مادی او رمعنوی ترقی سماجی زندگی کے بغیر کبھی ممکن نہیں ہوتی، تمام علوم، فنون اور ٹکنالوجی سماجی زندگی کا ہی ثمرہ ہے،یہاں تک کہ جن افراد نے تہذیب نفس اور تہذیب اخلاق سے کام لیا ہے اور سیر و سلوک یاعرفان کے راستوں کو طے کیاہے اجتماعی زندگی کے زیر سایہ تربیت و اخلاق کے اساتذہ اور مربیوں کی مدد سے ہی کسی مقام تک پہونچے ہیں ۔

پس اگر بشر کے مابین یہ رشتہ و رابطہ نہ ہوتا تو وہ کبھی مادی اور معنوی ترقی نہیں کر سکتے تھے، اس بنا پر انسان کیلئے اجتماعی زندگی ضروری ہے تاکہ مختلف افراد اس نعمت الٰہی سے استفادہ کرسکیں اور ان کی معاشرتی زندگی کے لئے ان پر کچھ قوانین واصول کا حاکم ہونا بھی ضروری ہیں ۔

ظاہرہے اگر قوانین نہ ہوں تو معاشرہ میں بے نظمی، افراتفری اورحرج مرج پھیل جائے گااور انسانی زندگی حیوانی زندگی میں تبدیل ہوجائیگی، بعض محققین کہتے ہیں کہ انسان ذاتی طور پر ایک دوسرے کیلئے بھیڑیے کی مانند ہیں اور ان کو کسی قوت وطاقت کے ذریعہ

ہی متوازن رکھا جا سکتا ہے اگر چہ اس طرح کی نسبت دینا افراط اور انسانوں کے ساتھ نا انصافی ہے،پھر بھی انسان کے اندر ایسے رجحانات پائے جاتے ہیں کہ اگر ان کو نظم اور قانون کے ذریعہ مہار نہ کیا جائے تو معاشرہ میں شر اور برائیاں پھیل جائیں گی۔

اب یہ سوال پیش آتا ہے کہ یہ قوانین کس طرح کے قوانین ہوں؟ان میں کیا خصوصیات ہونی چاہئے کہ وہ انسانی معاشرہ کے لئے دنیا و آخرت کی سعادت فراہم کر سکے ؟ اجمالی طور پر بیان کیا جا چکا ہے کہ ایک گروہ یہ خیال کرتا ہے کہ قانون معاشرہ میں صرف نظم و امنیت برقرار کرنے کے لئے ہے اس کے علاوہ قانون کا اور کوئی کام نہیں ہے، جب کہ دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ قانون کا کام معاشرہ میں نظم و امنیت قائم کرنے کے علاوہ عدل و انصاف برقرار کرنا بھی ہے لہٰذا قانون کی تعریف کے لئے مختلف نظریے بیان کئے گئے ہیں جو مجمل طور پر ہم عرض کر چکے ہیں، اسی ذیل میں کچھ افراد کہتے ہیں کہ معاشرہ میں نسانوں کے فطری حقوق کے خلاف قوانین پر عمل در آمد نہیں ہونا چاہئے۔

کچھ اخباروں، رسالوں اور تقریروں میں بھی مختلف جذبوں کے تحت اس خیال کی تائید کی جاتی رہی ہے ان کا خیال ہے کہ آزادی بیان انسانوں کے طبیعی حقوق میں سے ہے، اور کوئی قانون انسانوں سے اس فطری حق کو چھین نہیں سکتا، ہم عرض کر چکے ہیں کہ یہ خیال مختلف اشخاص کی طرف سے مختلف مقاصد کے لئے پیش کیا جاتا رہا ہے اور میں بذات خود ان افراد کے بارے میں نہیں کہہ سکتا کہ ان مطالب کا اظہار کرنے والے کس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں ؟ان کا کیا مقصد ہے اور وہ کیوں ایسی باتیں کیا کرتے ہیں؟ میں صرف ایک ایسے طالب علم کی حیثیت سے کہ جس کا پچاس سال،علوم دینی سے سروکار رہا ہے ،فلسفۂ حقوق یا فلسفۂ سیاست کے بارے میں اسلامی نقطہ نظر سے بحث کر سکتا ہوں اور اپنا نظریہ پیش کر سکتا ہوں، اور شاید اکثر افراد کو معلوم ہوگا کہ میرا کسی گروہ، کسی پارٹی،او رکسی تنظیم سے کوئی تعلق نہیں ہے، اور صرف شرعی فریضہ کے تحت یہ مطالب عرض کررہا ہوں۔اگرکچھ افراد ماحول کو خراب کرنا چا ہیں،اور لوگوں کے سامنے اس کی غلط تفسیر پیش کرنے لگیں یا باتوں کو تحریف کر دیں، اور گفتگو کی ابتدا یا آخر سے کچھ الفاظ اور جملہ حذف کر کے بیان کریںیا ایک جملہ کو کسی کی طرف منسوب کر کے اس کو مائکرو فیلم کے سامنے رکھ کر جائزہ اور غلط استفادہ

کریں تو ہم کو ایسے افراد سے کچھ نہیں کہنا ہے، معاشرہ میں ایسے افراد ہمیشہ رہے ہیں اور آئندہ بھی رہیں گے۔ یقیناً بعض اوقات جب کوئی بات کہی جاتی ہے تو کچھ اس کی حمایت کرتے ہیں اور کچھ مخالفت کرتے ہیں اور یہ ایک فطری بات ہے۔

اگر آپ کو یاد ہو تو میں نے پہلے بھی کئی بار اس مسئلہ پر زور دیا ہے کہ ہم کبھی کبھی ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں کہ جن کا کوئی مشخص و معین مفہوم نہیں ہوتا، ہر شخص اپنی فہم کے مطابق اس سے مطلب اخذ کرتا ہے اور یہی چیز غلط فہمی کا سبب بنتی ہے اور اسی کے سبب سننے والا صحیح طریقہ سے کہنے والے کی بات کو نہیں سمجھ پاتا اور بعض موقعوں پر مغالطہ کا سبب ہوتا ہے، البتہ کبھی تو یہ مغالطہ اتفاقی ہوتا ہے، اور کبھی ایک شخص جان بوجھ کر یہ مغالطہ کرتا ہے۔

اس طرح کے الفاظ میں سے ایک ''فطری حق'' کی اصطلاح بھی ہے جو اس جگہ پر استعمال ہوئی ہے لہٰذا اصولی طور پر یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ ''حق'' کیا ہے؟ اور اس کے فطری ہونے کا کیا مطلب ہے؟

فطری حقوق جو افراد فلسفہ حقوق سے آشنا ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ فلسفہ حقوق سے متعلق مکاتب میں سے ایک ''فطری حقوق'' کا مکتب بھی ہے، زمانہ قدیم سے یعنی جب سے تاریخ فلسفہ مرتب ہوئی ہے کچھ لوگوں نے اس موضوع پر بحث کی ہے۔

یونان کے بعض قدیم فلاسفہ معتقد تھے کہ: انسانوں کے کچھ حقوق ہوتے ہیں جو فطرت نے ان کو دیئے ہیں اور کوئی ان سے وہ حق چھین نہیں سکتا۔ کیونکہ انسان کی فطرت اور مزاج میں شامل ہیں اور اسی بنیاد پر انھوں نے نتائج اخذ کئے ہیں اور خود یہ نتائج بظاہر ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتے اور یہیں سے فلسفہ حقوق و اخلاق کے باب میں ایک مشہور مغالطہ ایجاد ہوا ہے جس کو ''فطرت پسند مغالطہ'' کا نام دیا گیا ہے، کیونکہ کچھ افراد یہ بھی کہتے ہیں کہ مختلف انسانوں کی طبیعتیں اور فطرتیں بھی مختلف ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر سفید فاموں کی طبیعت الگ ہوتی ہے اور سیاہ فاموں کی طبیعت الگ ہوتی ہے، سیاہ فام جسمانی اعتبار سے سفید فاموں سے زیادہ طاقتور لیکن فکری اعتبار سے ڈل اور کمزور ہوتے ہیں، اسی سے ملتا جلتا نظریہ ارسطو سے بھی نقل ہوا ہے یہاں یہ غلط فہمی

پیدا نہ ہو کہ میں ان نظریات کو سرے سے تسلیم نہیں کرتا فقط نقل کر رہا ہوں پس چونکہ سیاہ فام بدن کے اعتبار سے زیادہ طاقتور ہوتے ہیں ان کو صرف جسمانی کام انجام دینا چاہیے؟! اور گورے چونکہ فکری اعتبار سے زیادہ قوی ہیں معاشرہ کے تمام افسرانہ کام ان کے حوالہ کر دینا چاہئے، نتیجہ یہ نکلا کہ بعض انسان بعض دوسرے انسانوں کی خدمت کیلئے پیدا ہوئے ہیں اور اس بنیاد پر رسم غلامی ایک ''فطری'' قانون ہے، فی الحال ہم اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتے ،کہ کیا واقعاً سیاہ فاموں کی طبیعت اس چیز کا تقاضا کرتی ہے یا نہیں؟ یہ خود ایک مفصل بحث ہے اور اس کے لئے بہت زیادہ وقت درکار ہے۔

بہر حال تاریخ کے طویل دور میں فطری حقوق سے متعلق شاید سب سے زیادہ عاقلانہ، متوازن اور صحیح بات یہی کہی گئی ہے کہ اگر کوئی چیز کلی طور پر انسانوں کی فطرت کے مطابق ہے تو اس پر عمل ہونا چاہئے ، انسان کو فطرت کے ان تقاضوں سے محروم نہیں کرنا چاہیے، جو ہمہ گیر ہیںیہاں تک تو بات قابل قبول ہے لیکن اس کے قطعی اثبات کے لئے استدلال کی ضرورت ہے کہ جس چیز کا انسان کی فطرت تقاضا کرے اس کو پورا کیا جانا چاہئے انسان کو اس سے محروم نہیں کرنا چاہئے بہر حال اصل بات مشترکہ اصول کے عنوان سے قابل قبول ہے۔

ہمارا بھی یہی خیال ہے کہ انسانی فطرت کے تقاضے جو فطری طور پر وہ تمام انسانوں میں مشترک ہیں انسان کو ایسی ضرورتوں سے محروم نہیں کرنا چاہیے اس بات کی تائید میں عقلی دلیلیں بھی موجود ہیں جن کو ہم فی الحال بیان نہیں کرنا چاہتے ، لیکن سوال یہ ہے کہ ان فطری ضرورتوں کے مصادیق کیا ہیں؟! انسان کی طبیعت کھانے کا تقاضا کرتی ہے اور تمام انسانوں کو غذا کی ضرورت ہے، اس بنا پر کسی انسان کو کھانا کھانے سے محروم نہیں کرنا چاہیے یعنی نہ اس کی زبان کاٹنی چاہئے نہ اس کو کوئی ایسی دوا کھلانی چاہئے کہ وہ بات کرنے سے محروم ہو جائے یا اسی طرح کے دوسرے امور، لیکن اس بات کی طرف توجہ رہے کہ یہ لوگ جب اس طرح کی باتیں کرتے ہیں تو اس کے پیچھے ان کے خاص اہداف ومقاصد ہوتے ہیں۔

مغرب میں انسانی حقوق کے دائرے

آپ جانتے ہیں کہ ان آخری زمانوں میں انسانی حقوق کے عالمی منشور کے عنوان سے ایک مسئلہ سامنے آیا ہے، شروع میں اس اعلانیہ کی چھیالیس ملکوں کے نمائندوں نے تائید کی تھی اس کے بعد آہستہ آہستہ دوسرے ممالک بھی ان کے ساتھ ملحق ہوتے گئے اور نتیجہ میں وہ اعلانیہ عالمی منشور کی صورت اختیار کر گیا، اس منشور میں انسانوں کے حقوق بیان کئے گئے ہیں، منجملہ ان حقوق کے، اظہار خیال یا بیان کی آزادی، رہائش کے انتخاب کی آزادی، مشغلہ اختیار کرنے کی آزادی، مذہب انتخاب کرنے کی آزادی اور ہمسر انتخاب کرنے کی آزادی بھی ہے۔اب یہ کہ یہ حقوق، (جن کیلئے اس منشور میں کوئی دلیل بھی نہیں پیش کی گئی ہے) کہاں سے وجود میں آئے اور کس طرح تمام انسانوں کے حقوق کے عنوان سے بیان کئے گئے ہیں

اس کی ایک مفصل داستان ہے، فلسفۂ حقوق سے آشنا اور قانون دانوں (خاص طور سے مسلمان حقوقدانوں) کی طرف سے اس اعلانیہ کے بارے میں کئی بحثیں اٹھائی گئی ہیں، منجملہ یہ کہ:وہ مطالب جن کو آپ نے مطلق طور پر تمام انسانوں کے حقوق کے عنوان سے بیان کیا ہے اورآپ کا خیال ہے کہ ان کو محدود کرنے کا کوئی حق نہیں ہے ان کی فلسفی بنیاد کیا ہے؟ اور ان کیلئے کون سی دلیلیں پائی جاتی ہیں؟

کیا ان کے مشخص و معین دائرے اور حدیں ہیں یا نہیں؟ اور کیا یہ حقوق مطلق طور پر قانون سے بالاتر ہیں اور کسی قانون کو ان حقوق کو محدود کرنے کی اجازت نہیں ہے؟ کیا کوئی قانون اظہار خیال کی آزادی کے دائرے اور اس کی حدیں معین کرنے کی اجازت نہیں رکھتا؟ کیا کسی قانون میں انتخاب ہمسر کے محدود کرنے کی اجازت نہیں ہے؟ کیا کوئی قانون یہ بیان کرنے کا حق نہیں رکھتا کہ آپ کو ایک دائرے سے باہر رہائش کی جگہ انتخاب کرنے کا حق نہیں ہے؟ کیا کسی بھی قانون کو ان حقوق کی حدیں مشخص و معین کرنے کی اجازت نہیں ہے؟

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ فلاں شئی ایک فطری حق ہے اور انسانی فطرت کا تقاضا ہے، بالفرض اس پر کوئی عقلی دلیل بھی موجود ہو تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ان حقوق کا کوئی دائرہ اور حدبندی نہیں ہے؟ اگر ہے تو کون اس حدبندی کو معین و مشخص کرتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ خود اس منشور کے بنانے اور اس کی تفسیر کرنے والے (جہاں تک میری اطلاع میں ہے) ابھی تک ان سوالوں کا کوئی صحیح جواب دینے سے کتراتے نظر آتے ہیں۔

آخر وہ کون سی آزادی ہے جو قانون سے بالاتر ہے؟ کیا کچھ ایسی آزادیاں بھی ہیں جن کا دائرہ معین کرنے کا کسی قانون کو حق نہیں ہے؟ کیا ہم یہ سوال نہیں کر سکتے کہ ان آزادیوں کی انتہا کہاں تک ہے؟ کیا آزادی بیان کا مطلب یہ ہے کہ جس کا جو دل چاہے کہدے؟! ہم تو دیکھ رہے ہیں کوئی ملک بھی اس کی اجازت نہیں دیتا سبھی آزادی بیان کیلئے ایک حدبندی کے قائل ہیں، مثال کے طور پر باشخصیت افراد کی توہین دنیا میں کہیں بھی قابل قبول نہیں ہے۔

آزادی کی حدبندیوں میں اختلاف کا ظہوراب یہ سوال کہ آزادیوں کی حداور اس کی انتہا کہاں تک ہے اور کون اس کو معین کرتا ہے؟ اجمالی طور پراس کا جواب یہ ہے کہ جب کہا جاتا ہے آزادی قانون سے بالاتر ہے اس کو محدود نہیں کرنا چاہیے تواس سے مراد وہ آزادیاں ہیں،جو قانون نے دی ہیں کچھ افراد اس کو جائزاور معقول آزادی کہتے ہیں اور کچھ دوسرے لوگ دوسری شرطوں کا اضافہ کرتے ہیں۔

حقوق انسانی کے منشور کی بعض شقوں میں بھی فقط فقط ''اخلاقی'' کا سہارا لیاگیا ہے کہ اخلاقی معیارات کے ساتھ حقوق کی رعایت ضروری ہے جس کا مفہوم کم وبیش مبہم ساہے ظاہر ہے کہ قانونی ہونے سے ان کی مراد یہ نہیں ہے کہ مثلاً اسلام کی شریعت نے جس کو شرعی قرار دیا ہو،یہ صحیح ہے کہ لغت کے اعتبار سے شرعی یاقانونی شریعت اور قانون سے ہی ماخوذ ہے لیکن حقوق و سیاست کے بارے میں جائزشرعی سے مراد وہ قانونی حیثیت ہے جسکو حکومت معتبر جانتی ہو نہ یہ کہ حتمی طور پر شریعت نے اس کو اجازت دی

ہو یہ بات بعض دیندار افراد کو شک و شبہ میں مبتلا نہ کرے کہ جب ہم جائز حقوق یا جائزآزادی کی بات کرتے ہیں تو ان سے مراد وہ حقوق اور آزادیاں ہیں جو شریعت اسلام نے مشخص و معین کی ہیں، جائز ہونے سے ان کی مراد وہ حقوق ہیں جو معتبر اور قانونی ہیں، اور ناجائزہونے سے مراد دوسروں کے قانونی حقوق کا پامال کرنا ہے۔

لیکن یہ سوال باقی رہتاہے کہ کون سے حقوق جائزاور معقول ہیں اور کون سے ناجائزاور نامعقول ہیں؟ کس شخص کو یہ معین و مشخص کرنے کا حق ہے؟ ان کے پاس اس کے جواب میںیہ کہنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں ہے کہ آزادی سے مربوط جزئیات اور حدبندیوں کو قانون معین و مشخص کرتا ہے اور یہیں سے سب سے پہلے تناقض اور ٹکراؤ کا آغاز ہوتا ہے: ایک طرف تو کہتے ہیں کہ یہ حقوق اور آزادیاں قانون سے بالا تر ہیں اور کوئی قانون ان کو محدود نہیں کر سکتا، لیکن جب ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ یہ آزادی مطلق ہے یا محدود؟ تو وہ جواب میں کہتے ہیں: آزادی مطلق نہیں ہے اور چونکہ صحیح جواب نہیں دے پاتے کہہ دیتے ہیں کہ ہماری مراد جائز اور قانونی آزادیاں ہیں۔

جب ہم سوال کرتے ہیں کہ جائز سے کیا مراد ہے؟ تو جواب دیتے ہیں کہ جس چیز کو قانون نے منظور کیا ہو، یعنی قانون آزادی کی حدبندی کو مشخص و معین کرتا ہے،ارے ابھی تو آپ نے کہا تھا کہ یہ آزادیاں قانون سے بالا تر ہیں تو پھر قانون کی پابند کیسے ہوگئیں؟! ممکن ہے آپ اس کا جواب دیں کہ جائز اور معقول آزادیوں سے مراد کیا ہے اس سے تو تمام انسان اور عقلائے عالم واقف ہیں،تو ہم کہتے ہیں ٹھیک ہے اگر اس بات کو تمام انسان اور عقلائے عالم جانتے ہیں تو بحث ہی ختم ہو جاتی ہے، کیونکہ اس صورت میں ہم اور تمام مسلمان ان ہی تمام انسانوں میں شامل ہیں، اور دنیا میں تقریباً ایک ارب اور کئی کروڑ مسلمان ہیں اور سبھی عقلاء میں شامل ہیں، اور سب یہ بتا سکتے ہیں کہ اسلام میں کس قسم کی آزادی کو قبول کیا گیا ہے اور وہ کس قسم کی آزادیوں کو قبول کرتے ہیں اور کس قسم کی آزادی سے منع کرتے ہیں، بہر حال ہماری تمام تر معلومات اور مطالعات کے مطابق ابھی تک اس سوال کا جواب نہیں دیا جا سکا ہے اور فلاسفۂ حقوق کے پاس اس کا کوئی قطعی جواب نہیں ہے کہ آزادیوں کو کونسی چیز محدود کرتی ہے؟

انسانی حقوق میں آزادی کے دائرے انسانی حقوق کے عالمی منشور کی شرح کرنیوالوں اور قانون دانوں نے فلسفۂ حقوق کی کتابوں میں آزادی کے دائروں کے بارے میں مندرجہ ذیل چند چیزیں لکھی ہیں: سب سے پہلی جو چیز انفرادی آزادیوں کو محدود کرنے کے عنوان سے بیان کی گئی ہے وہ دوسروں کی آزادی ہے، یعنی ہر شخص اس وقت تک آزاد ہے کہ جب تک وہ دوسروں کی آزادی میں رکاوٹ نہ ہو اور دوسروں کے حقوق میں زیادتی نہ کرے، یہ وہ اہم ترین بات ہے جو فلاسفۂ حقوق نے کہی ہے اور جس پر بہت زیادہ زور دیا ہے اور حقیقت میں حقوق بشر کے منشور میں جو مغربی فلاسفۂ حقوق کے نزدیک انجیل کی مانند ہے اس چیز پر بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے کہ ہر انسان اس وقت تک آزاد ہے کہ جب تک وہ دوسروں کی آزادی میں خلل نہ ڈالے ۔

لیکن اگر انفرادی آزادی دوسروں کی آزادی میں مخل ہو تو وہ اس طرح کی آزادی سے محروم رہے گا اور یہیں آکر آزادی محدود ہو جاتی ہے ۔یہاں بہت سے سوال اٹھتے ہیں: سب سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ آپ دوسروں کی آزادی میں مخل ہونے کو کس عنوان سے تعبیر کرتے ہیں؟ کیا یہ رکاوٹ صرف مادی امور سے تعلق رکھتی ہے یا معنوی امور بھی اس میں شامل ہیں؟ آیا لوگوں کے دینی مقدسات کی مخالفت ان کی آزادی کی مخالفت ہے یا نہیں؟ مغرب کا لبرل طرز تفکر کہتا ہے کہ آزادیوں کے دائرے معنوی امور کو شامل نہیں ہیں اور معنوی امور کی مخالفت آزادی کو محدود نہیں کرتی ۔

لہٰذا جب یہ کہا جاتا ہے کہ دین اسلام ،خدا، وپیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دیگر مقدسات اسلام کی اہانت کرنے والے کو مرتد سمجھتا ہے، مثال کے طور پر اسلام، سلمان رشدی کو مقدسات اسلام کی اہانت کرنے کی وجہ سے واجب القتل سمجھتا ہے تو وہ اس چیز کو تسلیم کرنے کیلئے آمادہ نہیں ہوتے، کہتے ہیں کہ اظہار خیال کی آزادی ہے، وہ قلمکار ہے جو چاہے لکھ سکتا ہے، آپ بھی جو چاہیں لکھیں! ہمارا ان سے یہ سوال ہے کہ اس کتاب کے مطالب سے دوسروں کے مقدسات کی توہین ہوتی ہے یا نہیں؟ تو یقیناً آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ توہین آمیز نہیں ہے۔

کیا آزادی بیان اس قدر وسیع ہے کہ ایک شخص دنیا کے ایک ارب سے زیادہ مسلمانوں کی محترم ہستی پیغمبر اکرمؐ،جن کو مسلمان اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھتے ہیں اور اپنے ہزاروں عزیزوں کو ان پر فدا کرنے کیلئے تیار ہیں،ان کی شان میں گستاخی کرتاہے؟ کیا اس حرکت کو اظہار خیال کی آزادی کہتے ہیں؟اور یہ وہی بات ہے جو تمام لوگ سمجھتے ہیں؟کونسی عقل، منطق استدلال اور شریعت اجازت دیتی ہے کہ ایک انسان، دوسرے ایک ارب مسلمانوں کی ایک مقدس ہستی کی شان میں گستاخی کرے؟اگرانسانی حقوق کے عالمی منشور میں آزادی بشر سے مراد یہی چیز ہے تو ہم بغیر کسی چون و چرا کے،آرام کے ساتھ اعلان کرتے ہیں کہ ہم اس منشور کو تسلیم نہیں کرتے۔

مغرب میں آزادی کی حدبندیوں پر اعتراضات

جو افراد اس اعلانیہ کو معتبر سمجھتے ہیں اور اس کو انجیل کی حدتک محترم خیال کرتے ہیں ان سے ہمارا بنیادی سوال یہ ہے کہ اس منشور کے اعتبار کی اساس کیا ہے؟کیا آپ کے پاس کوئی عقلی دلیل ہے؟اس صورت میں آپ کو اس پرکوئی عقلی دلیل پیش کرنا چاہیے، آسانی سے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ''آزادی قانون سے بالاتر درجہ رکھتی ہے اور اس کو محدود نہیں کر سکتے''اگر آپ یہ کہتے ہیں کہ اس کا اعتبار اس وجہ سے ہے کہ مختلف ممالک کے نمائندوں نے اس منشور پر دستخط کئے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کا اعتبار دستخط کا تابع ہے،تو اب جن ممالک نے اس منشور پر دستخط نہیں کئے ہیں یا کسی شرط کے تحت دستخط کئے ہیں ان کے بارے میں کیا خیال ہے؟کیا ان پر بھی بغیر کسی چون وچرا کے اس کی پیروی ضروری ہے ؟ ہر معاشرہ ایک ثقافت،اور مخصوص مقدسات اور احکام رکھتا ہے اور اسی انسانی حقوق کے عالمی منشور کی ایک شق میں آیا ہے کہ ہر شخص اپنے مذہب کے انتخاب میں آزاد ہے تو ٹھیک ہے جب انسان کسی مذہب کا انتخاب کرلے تو اس کو اسکے احکام پر عمل کرنا چاہئے مذہب کے منتخب کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ صرف زبان سے ادا کر لیا جائے بلکہ انسان کو میدان عمل میں بھی آزادانہ طور پر اپنے مذہب پر عمل کرنا چاہئے۔

ہم نے بھی مذہب اسلام کو آزادانہ طور پر منتخب کیا ہے،اور اسلام کا فرمان ہے کہ جو شخص بھی اولیائے اسلام کی اہانت کرے اسکی سزا موت ہے، مغربی ثقافت کہتی ہے کہ اسلام کا یہ حکم انسانی حقوق کے خلاف ہے، انسانوں کے فطری حقوق کے خلاف ہے! اس لئے کہ ہر انسان اپنے فطری تقاضوں کے مطابق، جو کچھ بھی کہنا چاہے کہنے کا حق رکھتا ہے! نتیجہ کے طور پر ماننا ہوگا کہ انسانی حقوق کے عالمی منشور میں جو یہ دو باتیں کہی گئی ہیں متضاد اور ایک دوسرے کے خلاف ہیں۔

ہم اپنی پہلی بحث کی طرف پھر پلٹتے ہیں کہ ہر شخص جو چاہے وہ کہنے کا حق رکھتا ہے اس بات پر کونسی دلیل ہے؟ پھر ایک اپنے ملک میں ہر شخص کو جو کچھ وہ کہنا چاہیں اسکی اجازت کیوں نہیں دیتے؟ اگر کوئی شخص تہمت لگاتا ہے تو عدالت میں اسکی کیوں شکایت کرتے ہیں؟ اور جب وہ کہتا ہے کہ ''اظہار خیال کی آزادی'' ہے جو کچھ میں نے چاہا وہ کہا ہے تو کس دلیل کے تحت اس سے کہتے ہیں کہ اس طرح کی باتیں نہیں کرنا چاہئے؟ معلوم ہوا کہ اظہار خیال کی آزادی مطلق نہیں ہے بعض مطالب نہیں کہنا چاہیے، اس بات کو دنیا کے تمام انسان تسلیم کرتے ہیں کہ ہر چیز کی آزادی نہیں ہے ورنہ انسانیت اور وہ معاشرہ باقی نہ رہتا کہ جس میں کوئی قانون حاکم نہ ہو اور حقوق کا پاس و لحاظ نہ ہو۔

نتیجہ کے طور پر کوئی بھی مطلق آزادی کو تسلیم نہیں کرتا، لیکن بحث اس میں ہے کہ اسکی حد کہاں تک ہے؟ اظہار خیال کی آزادی کا نمونہ کے طور پر ذکر کرتے ہوئے ہم نے عرض کیا ہے کہ آپ آزادی کو لامحدود نہیں کہہ سکتے اور ایسا کسی نے بھی نہیں کہا ہے اور عملی طور پر کوئی بھی حکومت اس بات کو نہیں مان سکتی کہ جس انسان کا جو دل چاہے وہ کہتا پھرے اور لکھتا رہے چاہے وہ تہمت و افتراٗ ہی کیوں نہ ہو اور دوسروں کی گمراہی کا سبب ہی کیوں نہ بنے اور قومی سلامتی کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن بعض وقت صرف زبان سے اپنی گفتگو میں اس طرح کی بات کرتے ہیں جو خود محل بحث ہے۔

اب اگر گفتگو کرنا آزاد ہے تو ہم بھی گفتگو کر رہے ہیں، اگر ہم کو اجازت دیں تو ہم بھی ان سے ایک سوال کرنا چاہتے ہیں، ہم انسانی حقوق کا منشور تیار کرنے والوں کی خدمت میں مودبانہ زانوئے ادب تہہ کرکے ان کے سامنے اپنا سوال پیش کرنے کی اجازت چاہتے ہیں، ہمارا ان سے سوال یہ ہے کہ کس دلیل سے انسان اس قدر آزاد ہے کہ وہ جو چاہے کہے؟ اگر انسان پوری طرح آزاد ہے تو آپ تو خود اس بات کو تسلیم نہیں کرتے ہیں؟ تہمت لگانے، افتراً باندھنے اور توہین کرنے کی آزادی کو کیا آپ خود تسلیم کرتے ہیں کہ آزادی مطلق مان لی جائے؟

پس آپ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ آزادی کا دائرہ محدود ہے، تو اب بتائیے یہ محدودیت کس حد تک ہے؟ کیا صرف جہاں تک آپ کا دل چاہے محدود ہے؟ جب آپ کہتے ہیں کہ دوسروں کی آزادی میں مخل نہیں ہونا چاہیے تو ہمارا آپ سے سوال یہ ہے کہ آپ دوسروں کی آزادی کس حد تک معتبر سمجھتے ہیں؟ کیا آپ کی نظر میںآزادی کا دائرہ یہی ہے کہ جب تک دوسروں کی جان مال اور حیثیت خطرے میں نہ ہو انسان آزاد ہے؟ کیا روح، معنوی حیات، افکار و نظریات اور ان کی مقدس آرزؤوں پر جو چوٹیں لگتی ہیں وہ ممنوع ہیں یا نہیں؟ اگر ممنوع ہیں تو ہمارا آپ کے ساتھ کوئی اختلاف نہیں ہے، ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ آزادی بیان کا ایک دائرہ ہے، مقدسات کی اہانت نہیں کرنی چاہئے کیونکہ اس سے دوسروں کے حق پامال ہوتے ہیں۔

اسلامی قانون میں مادی اور معنوی مصلحتوں کا خیال اب اس سلسلۂ بحث کو آگے بڑھانے میں یہ سوال پیش آتا ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے آزادی کی اساس و بنیاد کیا ہے اور اس کے دائرے اور حدود کیا ہیں؟ قانون کے سلسلے میں بیان شدہ خصوصیات سے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ معاشرہ میں اجتماعی زندگی کے اہداف و مقاصد کی تکمیل نیز انسانوں کی مادی و معنوی مصلحتوں اور ضرورتوں کو پورا کرنے کی خاطر قانون کا وجود ضروری ہے، اگر اجتماعی زندگی نہ ہو تو افراد کے مادی اور معنوی مصالح پورے نہیں ہو سکیں گے، اجتماعی زندگی کے تحت انسان اس چیز کی توقع رکھتا ہے کہ وہ مختلف علوم، ٹیکنالوجی اور صنعتوں کی مانند خداداد مادی نعمتوں سے بھی بہرہ مند

ہواور روحانی معارف و کمالات کے بلند پایہ اساتذہ سے بھی کما حقہ استفادہ کرے، ان معارف و علوم کا حصول صرف اجتماعی زندگی میں ہی میسر ہو سکتا ہے۔

لہٰذا قانون ایسا ہونا چاہیے جو انسان کی مادی اور معنوی ہر طرح کی ترقیوں کا ضامن ہو قانون کا صرف معاشرہ میں نظم برقرار کرنا ہی کافی نہیں ہے، مثال کے طور پر اگر دو افراد آپس میں یہ طے کریں کہ وہ دوسروں کو کوئی نقصان پہونچائے یا معاشرہ کے نظم میں کوئی خلل ڈالے بغیر ،ایک دوسرے کو قتل کردیں گے تو کیا ان کا یہ کام انجام دینا صحیح ہوگا؟

اگر آپ حضرات کو یاد ہو تو کچھ عرصہ پہلے امریکہ کے ایک شہر میں انسانوں کے ایک گروہ کو جلا دیا گیا اور یہ اعلان کردیا گیا کہ یہ وہ افراد تھے جو اپنے رسم و رواج میں خودکشی کو کمال سمجھتے تھے! البتہ یہ بات شک وشبہ میں مبتلا کرتی ہے کہ بہت ممکن ہے خود امریکا کے حکام نے اس گروہ کو اپنے نظام کا مخالف پاکر سب کو نیست و نابود کردیا ہو،پھر بھی فرض کرلیجئے کہ اس گروہ نے اپنے مذہبی عقیدہ کے مطابق یہ کام انجام دیا ہو تو کیا ان کا ایسا کرنا صحیح ہے؟ کیا یہ کہا جا سکتا ہے چونکہ انہوں نے کسی دوسرے کو کوئی اذیت نہیں دی ہے اور خود آپس میں موافقت کرکے ایک دوسرے کو قتل کیا ہے ان کا یہ کام صحیح ہے؟ کیا حکومت ایسے کام کی اجازت دے سکتی ہے؟ کیا قانون کو اس طرح کی اجازت دینی چاہیے؟ یا نہیں اگر صرف نظم اور امن وامان کی رعایت ہی معیار ہے تو یہ نظم اور امن و امان تو کچھ افراد کی اجتماعی خودکشی سے بھی باقی رہتا ہے! اور قانون کا کوئی اور کام بھی نہیں ہے!!

لیبرل نقطۂ نظر سے حکومت کا فریضہ صرف نظم وامن برقرار کرنا ہے اور قانون کا کام ہرج و مرج روکنے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے،یہ طرز تفکر وہی ہے جس کا مغربی ممالک میں مشاہدہ کیا جاسکتا ہے جہاں کم وبیش اخلاقی، جنسی، اور معاشرتی برائیاں عام ہیں اور یہ تمام مسائل ان کے اسی تصور کا نتیجہ ہیں کہ: حکومت افراد کے حقوق اور ان کی زندگی میں مداخلت کا کوئی حق نہیں رکھتی حکومت کا کام صرف نظم برقرار رکھنا ہے، حکومت کو مسلح پولیس کی طرح اسکولوں میں تعینات رہنا چاہیے کہ بچے ایک دوسرے کو یا اپنے

استادوں کو قتل نہ کردیں، وہاں نظم و نسق کی بر قراری اسی حد تک ہے کیا قانون کا کام صرف یہی ہے؟ یا انسانوں کے لئے کمال و ارتقا کا ماحول فراہم کرنے کی مانند دوسرے امور کرنا بھی قانون کی ذمہ داریوں میں شامل ہیں؟ قانون کو اخلاقی برائیوں کی روک تھام بھی کرنا چاہیے؟

جو کچھ ہم نے عرض کیا اور جو ہمارا طرز فکر ہے اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ: قانون کو مصالح معنوی بھی مد نظر رکھنا چاہیے، اس بنا پر جو چیز بھی انسانوں کی معنوی مصلحت ان کی شخصیت، الٰہی روح اور الٰہی جانشینی، اور انسانیت میں رکاوٹ ایجاد کرتی ہو اور اسی طرح جو چیز بھی مادی فوائد ، سلامتی اور انسانوں کی امنیت کو ضرر پہونچاتی ہو وہ سب ممنوع ہونا چاہیے، کیا معاشرہ کی تشکیل کا مقصد یہ نہیں ہے کہ انسان اپنی انسانیت کی راہ میں ترقی کرے اور صرف اپنے حیوانی مقاصد ہی نہیں بلکہ انسانی مقاصد کو بھی حاصل کرے؟ معلوم ہوا قانون کو مادی اور معنوی دونوں فوائد کا متکفل ہونا چاہیے، لہٰذا لوگوں کی عزت۔

حیثیت، اور مذہبی مقدسات سے ٹکراؤ چونکہ یہ انسانوں کی روحانی اور معنوی ترقی میں رکاوٹ ہے ممنوع ہے، جس طرح منشیات کا رواج یا زہریلی دوا کا انجکشن لگانا منع ہے اس لئے کہ یہ چیز انسان کو بیمار اور ہستی کو تباہ کردیتی ہے، اور اس کے مادی فوائد خطرہ میں پڑ جاتے ہیں ۔

اب اگر کوئی زہر کا عادی ہوجائے اور اسکے جسمانی افعال میں کوئی خلل بھی ایجاد نہ ہو بہ ظاہر صحیح و سالم ہو صرف اس کے فہم و شعور پر اثر پڑا ہو تو کیا یہ زہر پینا اس کیلئے جائز ہو جائیگا؟ اور اگر کسی دوسری طرح کی آفتیں اور زہر اپنا کام کریں اور کسی کی معنوی سلامتی اور ایمان کے ختم ہوجانے کا باعث ہوں تو کیا ایسے امور کا انجام دینا ممنوع نہیں ہوگا؟ کیا یہ انسان کی انسانیت کو ضرر پہونچانا نہیں ہے؟ اگر کچھ افراد معاشرہ میں ایسی صوت حال پیدا کردیں جو لوگوں کو دینداری سے دور کردے تو کیاان کو آزادی دیجا سکتی ہے ؟

قرآن کریم ارشاد فرماتا ہے کہ: (صَدٌّ عَن سَبِيلِ اللهِ وَكُفْرٌ بِهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ...[1])''اور (یاد رہے) کہ خدا کی راہ سے روکنا اور خدا کا انکار کرنااو رمسجد الحرام (کعبہ) سے روکنا (اس سے بڑھ کر گناہ ہے)جو چیز ترقی و کمال کی راہ، اور انسانوں کے دینی حقائق سے آشنا ہونے کی راہ میں رکاوٹ ہوا ورجو چیز جوانوں کی نظر میں دین کی شکل بگاڑ دینے کا باعث ہواس کی اجازت نہیں ہے

کیونکہ وہ انسان کی انسانیت کو ضرر پہونچاتی ہے، یہ کیا بات ہوئی کہ جو چیز انسان کے جسمانی کمال کو ضرر پہونچاتی ہو وہ ممنوع لیکن جو چیز انسان کی انسانیت کو ضرر پہونچائے وہ آزاد چھوڑ دی جائے؟ دنیا کہتی ہے: ہاں یہ صحیح ہے لیکن دین کہتا ہے کہ: نہیں یہ صحیح نہیں ہے، ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ معاشرہ میں اس قانون کا نفاذ ہونا چاہیے جو انسانوں کی معنوی مصلحتوں کا خیال کرے اور معنوی فوائدکی رعایت مادی فوائدسے زیادہ اہم ہے۔ (قارئین کرام یہاں اس بات کا خیال رکھیں کہ جو کچھ میں نے عرض کیا ایک علمی بحث ہے اور ممکن ہے اس کا مصداق ہمارے معاشرے میں نہ مل سکے لہٰذا اس کا مطلب یہ نہیں نکالنا چاہئے کہ میں اقتصاد کو بالائے طاق رکھ دینے کا قائل ہوں۔)

معنوی اور مذہبی مصلحتوں کا مادی فوائد پر مقدم ہونااگرہمارے سامنے کوئی ایسا مرحلہ آجائے جہاں ہماری اقتصادی ترقی سے ہمارے دین پر آنچ آتی ہواور دوسری طرف دینی ترقی کے ساتھ بھی کسی حد تک اقتصادی حالت متاثر ہوتی ہو توآپ ہی بتائیں ہم کو دونوں میں سے کونسی صورت انتخاب کرنی چاہیے؟ ہمارا تو خیال ہے، اسلام کی ترقی اقتصادی ترقی کی بھی ضامن ہے، مگراس کے لئے ایک طویل المدت منصوبہ بندی کی ضرورت ہے جس پر پوری طرح عمل کیا جائے،

لیکن بعض حالات میں یہ امکان ہے کہ اقتصادی منافع کو تھوڑی مدت کیلئے نقصان پہنچےاورکچھ افراد کیلئے تنگی کا باعث بن جائے، اب اگر اس طرح کی صورت حال پیش آجائے، تو بیان کئے گئے مقدمات اور دلائل کو مدنظر رکھتے ہوئے دینی مصلحتوں کو مقدم قرار دینا

[1] سورہ بقرہ ٢١٧۔

چاہیے یا دنیوی فوائد کو مقدم کرنا چاہیے؟ جیسا کہ شرح نہج البلاغہ میں ابن ابی الحدید نے لکھا ہے: ”فان عرض بلاء فقدم مالک دون نفسک فان تجاوز البلاء فقدم مالک و نفسک دون دینک۔[1]“

”اگر تمہاری جان خطرہ میں پڑ جائے تو اپنے مال کو جان پر فدا کردو اور جان کو بچالو لیکن اگر بلائیں اپنا دامن پھیلالیں تو جان ومال قربان کر کے دین بچالو یعنی جب مسئلہ یہ آجائے کہ کفر کے ساتھ زندہ رہیں یا ایمان کے ساتھ مر جائیں تو ایمان کے ساتھ مرجانا اور اپنی جان اورمال کو دین پر قربان کردینا چاہئے، اس موقع پر اگر انسان کو قتل ہوناپڑے تو اس کا کوئی نقصان نہیں ہوگا “ کیونکہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے: (قُلْ هَلْ تَرَبَّصُونَ بِنَا إِلَّا إِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ[2]) ”(اے رسول) آپ منافقوں سے کہہ دیں کہ تم ہمارے لئے (فتح یا شہادت) دو بھلائیوں میں سے ایک کے (بہر حال) منتظر رہو“)

جو شخص اپنے دین کی راہ میں قتل ہوجائے اس کا کیا نقصان ہوگا ؟ وہ سیدھا جنت میں جائیگا، لیکن بالفرض اگر بے دین ہو کر سو سال تک مزید زندہ رہے تودن بہ دن اسکے عذاب میں اورزیادتی ہونے کے علاوہ اس کا اور کیا فائدہ ہوگا؟، پس اسلامی نقطۂ نظر سے دینی اور معنوی مصالح، مادی فوائد سے زیادہ اہم ہیں،اس بنا پر قانون کو مصالح معنوی کی رعایت کے علاوہ مصالح معنوی کو اولویت بھی دینا چاہیے، ہماری بحث استدلالی ہے اور ہم اپنے استدلال کو کسی دوسرے پر تھوپنا نہیں چاہتے جو قبول کرنا چاہیں قبول کریں اور جو افراد تسلیم نہیں کرنا چاہتے وہ رد کر سکتے ہیں، اپنے دلائل کی بنیاد پر ہم نے کوئی غیر منطقی بات بیان نہیں کی ہے۔ اسلام اورلیبرلزم میں آزادی کا دائرہ اور پابندی میں فرقبنابرین جسے دنیا کے تمام عقلاء مانتے ہیں ہماری نگاہ میں بھی آزادی محدود ہے، لیکن ان کے اور ہمارے مابین فرق یہ ہے کہ ان کے یہاں آزادی کا دائرہ، دوسروں کی آزادی میں خلل نہ ڈالناہے اور ہمارے یہاں آزادی کے دائرے کا مطلب مادی یا معنوی کسی بھی طرح کی اجتماعی مصلحت میں خلل نہ ڈالنا ہے، انسانوں کو اپنی زندگی میں پوری آزادی ہے، بات کریں، کھائیں پیئں، کام کریں، تجارت کریں، اقتصادی امور انجام دیں، بحث ومباحثہ کریں، سفر کریں، معاہدوں پر

---

[1] شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید ج۸ ص۲۵۰“۔

[2] سورہ توبہ ۵۲۔

دستخط کریں، مختصر یہ کہ ان کو ہر کام کی اجازت ہے لیکن کس حد تک؟ جہاں تک کہ معاشرہ کے مادی اور معنوی مصالح متاثر اور پامال نہ ہوتے ہوں۔

جس طرح مادی لحاظ سے معاشرہ کے مصالح کو اگر آزادی سے نقصان پہنچے تو ممنوع ہے، اسی طرح جہاں اپنی آزادیوں سے استفادہ کرنا معاشرہ کی معنوی مصلحتوں کے ساتھ معارض و مخالفت ہو، آزادیوں کا دائرہ محدود ہو جائے گا مندرجہ بالا دونوں صورتوں میں آزادی سے استفادہ کی اجازت نہیں یہی ہماری دلیل اور منطق ہے، اور اگر کسی کے پاس ہم سے بہتر منطق ہے تو ہم اس کو بھی سننے اور اس سے فائدہ اٹھانے کیلئے تیار ہیں، فلسفۂ حقوق کے استادوں سے میری گذارش ہے کہ وہ ذرا زیادہ توجہ سے کام لیں۔

جہاں تک ہم کو اطلاع ہے آج تک حقوق اور سیاست کے فلاسفہ نے اس سوال کا کوئی قطعی اور منطقی جواب نہیں دیا ہے کہ آزادی کی حد کیا ہے؟ اگر ہمارے آئین یا روز مرہ کے قوانین میںیا علمائے بزرگ کے کلمات میں یہاں تک کہ اگر امام خمینیؒ قدس سرہ کے بیانات میں اس سے ملتی جلتی کوئی تعبیر موجود ہو تو اسکی تفسیر کے لئے اسکے اہل حضرات کی طرف رجوع کرنا چاہیے، ہم بھی قانون کے ہر عمل در آمد کے طرفدار ہیں اسلامی ملک میں قوانین کی نسبت ہماری ذمہ داری دوسروں سے کہیں زیادہ ہے۔ لیکن ہمارا دوسروں سے یہ فرق ہے کہ ہم قانون کو اس لئے معتبر سمجھتے ہیں کہ ان کو ولی فقیہ کی تائید حاصل ہے، اور چونکہ امام خمینیؒ قدس سرّہ نے فرمایا ہے کہ ''اسلامی حکومت کی اطاعت واجب ہے'' کچھ یہ بھی کہتے ہیں: چونکہ لوگوں نے اس کی تائید میں ووٹ دیئے ہیں، اب کونسی منطق زیادہ قوی ہے؟ اور کس کا اثر زیادہ ہے؟ یہ ایک الگ مسئلہ ہے جب کسی سے کہا جائے گا چونکہ لوگوں نے ووٹ دئے ہیں، اس لئے اس قانون پر عمل کرنا واجب ہے؟ ممکن ہے وہ جواب دے کہ میں نے اس نمائندے کو ووٹ نہیں دیا ہے، یا میں اس قانون سے راضی ہی نہیں ہوں!

لیکن جب امام خمینیؒ قدس سرہ نے فرمایا کہ : اسلامی حکومت کوئی حکم جاری کرے یا اسلامی مجلس (پارلیمنٹ) کسی حکم کو پاس کر دے تو شرعی فریضہ کے عنوان سے اس کی اطاعت کرنا چاہیے؟ تو اس وقت دیکھئے اس کو کیسی پشت پناہی ملتی ہے، اب بتائیے ہم قانون کے زیادہ پابند ہیں یا وہ.؟ہاں اگر قانون میں حتی آئین میں بھی کوئی ابہام پایا جاتا ہے تو اس کی تفسیر کے لئے صاحب صلاحیت افراد کی طرف رجوع کرنا چاہیے کسی اور کی طرف نہیں۔

پس نتیجہ یہ نکلاکہ: تمام قوموں اور ملکوں اور تمام عقلاء کے درمیان آزادی کا دائرہ محدود ہے، لیکن اسلامی نقطۂ نظر سے اس کا دائرہ معاشرہ کی مادی اور معنوی مصلحتوں کے ساتھ وابستہ ہے یعنی تمام انسان وہاں تک آزاد ہیں جہاں تک معاشرہ کے مادی اور معنوی مفادات کو کوئی نقصان نہ پہونچتا ہو۔

پندرہویں تقریر

اسلامی حکومت،ثقافتی حربے اور خطرے

گذشتہ مطالب پر ایک نظر جیسا کہ آپ حضرات کو معلوم ہے کہ ہماری گفتگو اسلام کے سیاسی نظریہ کے بارے میں چل رہی ہے اور گذشتہ تقریروں میں ہم اس سلسلہ کی بہت سی باتیں بیان کر چکے ہیں جن میں اہم ترین بات سیاست کا دین سے جدا نہ ہونا ہے، ہم نے عرض کیا تھا کہ اسلامی نقطہ نگاہ سے وہ قانون معاشرے میں معتبر ہے جو یا تو خدا کی طرف سے براہ راست قرآن کریم میں بیان ہوا ہو، یا پیغمبر اکرم اور ائمہ معصومین علیہم السلام کے ذریعہ یا اس شخص کے ذریعہ کہ جس کو امام معصومؑ کی اجازت حاصل ہو بہر حال قوانین کا خدا کی مرضی کے مطابق،اسلامی نظریہ کے دائرے میں بیان ہونا ضروری ہے،اس سلسلہ میں گفتگو بہت ہے؛ ہم نے یہ بھی عرض کیا تھا کہ بعض لوگ اس کے مخالف ہیں کہ معاشرہ میں دینی احکام کی حکمرانی ہو، اس طرح کے لوگوں کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ کچھ لوگ وہ ہیں جو دین کو بالکل نہیں مانتے، ظاہر ہے یہ لوگ کبھی بھی پسند نہیں کریں گے کہ کسی ملک میں دینی احکام اور دینی اصول حاکم ہوں، لیکن الحمد للہ ایسے افراد ہمارے معاشرے میں بہت کم ہیں۔

۲۔ کچھ وہ لوگ ہیں جو اصل دین کو قبول کرتے ہیں لیکن مغربی تہذیب سے متاثر ہو کر خیال کرتے ہیں کہ دین کا دائرہ ،سیاست اور معاشرے کے دائرے سے جدا ہے،وہ دین کو فقط شخصی زندگی اور خدا سے رابطہ میں منحصر جانتے ہیں اور کہتے ہیں: اجتماعی زندگی کے مسائل، دین سے کوئی ربط نہیں رکھتے اسی نظریہ کو عمومی طور پر سیکولرزم یا دین کو سیاسی مسائل سے جدا رکھنا کہا جاتا ہے۔

اور ۳۔کچھ وہ حضرات ہیں جو اس بات کے پوی طرح معتقد ہیں کہ اسلام میں سیاسی اور اجتماعی احکام بھی موجود ہیں، لیکن غیر محسوس طور پر مغربی کلچر سے متاثر ہو کر کبھی کبھی ایسی باتیں کر جاتے ہیں جو اسلام سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔

علماء اور ان کی خطرناک ذمہ داریا بہر حال خداوند عالم کے معین کردہ فرائض اور ذمہ داریوں کے تحت ہمارا یہ کام ہے کہ اسلامی موقف کی نشاندہی کریں اور حتی المقدور فکری اور اعتقادی انحرافات سے لوگوں کو روکیں، اور ان حقائق کی طرف اشارہ کردیں، بعض احباب اور خیر خواہ حضرات فکر کرتے ہیں کہ اس زمانہ کے مخصوص سیاسی و معاشرتی حالات میں ان بحثوں کو چھیڑنے کی ضرورت نہیں ہے! حتی بعض حضرات کا تصور ہے کہ ان باتوں کو چھیڑنا نقصان دہ بھی ہے، کیونکہ ان باتوں سے افکار و عقائد پراکندہ ہوتے ہیں، ان حضرات کا خیال ہے کہ ہم جس قدر سعی و کوشش کرسکتے ہیں اگر فکری و اعتقادی اتحاد ایجاد کرنے کی راہ میں کریں اور ایسے مسائل سے پرہیز کریں جو اختلاف و افتراق کا باعث بنتے ہیں تو یہ معاشرے کیلئے زیادہ سود مند ہے۔

بعض حضرات خیر خواہی میں کہتے ہیں آپ اس طرح کی بحثوں کو چھوڑ کر معاشرے کے لئے کچھ اور مثبت کام کریں اور کسی ایسے عہدۂ و منصب کو قبول کرکے خدمت کریں اور ایسے کام کریں جو آپ کے لئے بھی سود مند ہو اور معاشرے کیلئے بھی مفید ہو۔

میں ان حضرات سے، جن میں بہت سے لوگ خیر اندیش و خیر خواہ بھی ہیں عرض کردوں کہ ہم کو بھی وہ راستہ اچھا لگتا ہے کہ جس میں آرام و عافیت ہو، اور ان لوگوں کو خوش کرنا بھی اچھی طرح جانتے ہیں جو واہ واہ کرتے اور تالیاں بجاتے ہیں، لیکن ہماری مشکل وہ شرعی ذمہ داری ہے جو خداوند عالم نے ہمارے سپرد کی ہے البتہ یہ ذمہ داری پہلے مرحلے میں انبیاء اور ائمہ علیہم السلام کی ہے اور اسکے بعد علمائے کرام کو دی گئی ہے اور واقعاً یہ راستہ بہت مشکل اور خطرناک ہے اور واہ واہ ، سبحان اللہ سبحان اللہ کی جگہ تہمت گالیاں، بہتان، بدگوئی اور کبھی کبھی جلاوطنی، قید و بند اور شخصیت کی قربانی حتی قتل و شہادت تک کو قبول کرنا پڑتا ہے۔

بہر حال اس راہ میں بہت سی مشکلات ہیں جیسا کہ تاریخ کے طویل دور میں انبیاء، اور ائمہ معصومین علیہم السلام نے سب کچھ برداشت کیا ہے لہٰذا ہم بھی اس راستہ پر قائم ہیں اگرچہ ہمارے دوست اور احباب بھی ہماری ملامت کیوں نہ کریں، کیونکہ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے: (اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَا اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَیِّنَاتِ وَالْھُدیٰ مِنْ بَعْدِ مَا بَیَّنَّاہُ لِلنَّاسِ فِی الْکِتَابِ اُوْلٰئِکَ یَلْعَنُھُمُ اللّٰہُ وَیَلْعَنُھُمُ اللاَّعِنُوْنَ.[1]).

[1] سورۂ بقرہ آیت۱۵۹۔

''بے شک جو لوگ (ہماری) ان روشن دلیلوں اور ہدایتوں کو جو ہم نے نازل کی ہیں اس کے بعد بھی چھپاتے ہیں جب کہ ہم کتاب (تورات) میں لوگوں کے سامنے صاف صاف بیان کر چکے ہیں تو یہی لوگ ہیں جن پر خدا (بھی) لعنت کرتا ہے (اور) لعنت کرنے والے جن وانس وملک بھی لعنت کرتے ہیں''جو حضرات مذہبی حقائق سے آگاہ ہیں لیکن اپنے ذاتی مفادات یا کسی خاص گروہ کے فائدہ کی خاطر ان حقائق کو مخفی رکھتے ہیں ان پر خدا، ملائکہ اور اولیأ خدا کی لعنت ہوتی ہے جیسا کہ حدیث شریف میں بھی بیان ہوا ہے'' :اِذَا ظَہَرَتِ البِدَعُ فِی اُمَّتِی فَلْیُظْہِرِ العَالِمُ عِلْمَہُ وَاِلَّا فَعَلَیْہِ لَعْنَۃُ اللہِ.''(۲)''جس وقت دین میں خرافات اور بدعتیں نمایاں ہونے لگیں تو علماء پر واجب ہے کہ اپنے علم کو ظاہر کریں، اور لوگوں کو انحرافات سے روکیں، ورنہ خدا کی لعنت کے مستحق بن جائیں گے''

لہٰذا ہمارے سامنے دو راستے ہیں یا تو ہم اپنے دوستوں کی ملامت اور دشمنوں کی تہمتوں کو برداشت کرکے خدا کی خوشنودی حاصل کریں، یا بعض لوگوں کی داد و تحسین اور واہ واہ کو پسند کریں اور خدا کی لعنت کے مستحق ہوں، لہٰذا ہم ترجیح دیتے ہیں کہ لوگوں کی تہمتوں اور بدگوئیوں کو برداشت کریں، لیکن خدا کی لعنت کے مستحق نہ بنیں، لہٰذا ہم پر یہ اہم ذمہ داری ہے اور ہمارے لئے نیز ہمارے جیسے دوسرے علماء کیلئے ان مسائل پر بحث و گفتگو کرنا دوسری چیزوں سے زیادہ واجب ہے۔

ٹھیک ہے آج کل سرحدی علاقوں میں ہمارے لئے بہت سی مشکلات ہیں اور ہو سکتا ہے کہ آئندہ ہم کو فوجی خطرات کا سامنا ہو، ٹھیک ہے کہ افغانستان میں طالبان کے ذریعہ ہمارے سفارتخانہ کے ذمہ دار افراد اور ۳۵ ڈرائیور گرفتار کر لئے گئے جس کی وجہ سے ہماری ملت اور حکومت ناراض ہے احتجاجات اور ، مظاہرے ہوئے ہیں اور بین الاقوامی سطح پر اس مسئلہ کو متعلقہ اداروں میں اٹھایا گیا ہے، لیکن ان ۴۰ یا ۵۰ ایرانیوں کے دشمن کے ہاتھوں گرفتار ہوجانے کا خطرہ ہماری یونیورسٹیوں میں ہزاروں مسلمان جوانوں کے امریکی آلۂ کاروں کے چنگل میں پھنس جانے سے زیادہ خطرناک نہیں ہے۔

[1] بحار الانوار، ج۵۷، ص۲۳۴۔

جی ہاں! مغربی ثقافت سے متاثر آلۂ کاروں اور مزدوروں کے ہاتھوں گرفتار ہوجانے کا خطرہ، چند ایرانیوں کے دشمن کے ہاتھوں میں گرفتار ہونے سے کہیں زیادہ خطرناک ہے، اگرچہ وہ لوگ مشکلات میں ہیں لیکن ان کا اجر خداوند عالم کے نزدیک محفوظ ہے، لیکن اگر ہمارے جوان و نوجوان خصوصاً شہداء اوراسیروں کی اولادیں یونیورسٹیوں میں دین سے منحرف ہوجائیں تو پھر اس کا مداوا کیسے کیا جا سکتا ہے؟ کیا فکری اسیری زیادہ خطرناک نہیں ہے؟ کیا اس سلسلے میں کسی کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے؟ اور کسی کو سرمایہ کاری کرنے کی ضرورت نہیں ہے؟!

(ممکن ہے کوئی ہم کو قصور وار ٹھہرائے اور کہے کہ آپ غلط سوچتے ہیں تو ٹھیک ہے اگر انسان آزاد ہے تو اس کو آزادی سے اپنی رائے کا اظہار کرنا چاہیے،کم ازکم ہمیں بھی ایک ایسے شخص کی حیثیت سے کہ جس نے اپنی عمر کے تقریباً ۵۰ سال، دینی علوم کی تعلیم و تعلم میں صرف کئے ہیں یہ حق ملنا ہی چاہئے کہ ہم اپنی رائے کا اظہار کرسکیں) ہماری بحث اس موضوع پر چل رہی تھی کہ ہمارے اس دعوے کے مقابلے میں (کہ معاشرے میں اسلامی و الٰہی قوانین کو حاکم ہونا چاہیے) بعض نے کچھ شکوک و شبہات پیدا کئے ہیں جن میں سے بعض کی طرف ہم نے اشارہ کیا تھا، بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ معاشرے میں اسلامی احکام پر عمل در آمد کا لازم ہونا انسان کے فطری حقوق کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے، انسان کے فطری حقوق میں سے ایک آزادی بھی ہے جو فکری، دینی،اور سیاسی آزادی نیز اظہار خیال کی آزادی میں جلوہ گر ہوتی ہے ۔

فطری طور پر ہر انسان یہ حق رکھتا ہے کہ اپنی پسند کا دین منتخب کرے،اور اگر چاہے تو حسب خواہش اپنے دین کو تبدیل کر دے،اور اس کو یہ بھی حق ہے کہ اپنے نظریات و عقائد کی ترویج و تبلیغ کرے،اگر آپ یہ کہیں گے کہ اس ملک میں اسلامی قوانین کا حاکم ہونا ضروری ہے، تواس ملک میں ایسے لوگ بھی ہیں جوان قوانین کو نہیں چاہتے،ان کو بھی حق ہے کہ اپنے خیال کا اظہار کریں اور کہیں کہ ہم ان قوانین کو نہیں چاہتے، ظاہر ہے جو لوگ سرے سے دین کے منکر ہیں ان کی طرف سے اس طرح کی باتیں اٹھایا جانا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے لیکن افسوس تو ان لوگوں پر ہوتا ہے جو دیندار ہونے کا دم بھرتے ہیں اور کبھی کبھی اس طرح کی باتیں بھی

کرتے ہیں یہاں تک کہ بعض لوگ اپنے ساتھ اسلامی القاب کا دم چھلا بھی لگائے ہوئے ہیںیا خود کو امام خمینی کا پیرو بھی کہتے ہیں!!
اخبارورسائل میں مغربی مخرب اخلاق آزادی کی ترویج بات یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ بعض اخباروں میں (کبھی شوخی میں اور کبھی سنجیدگی کے ساتھ کبھی کسی مصنف کا قول نقل کرتے ہوئے اور کبھی کسی لڑکے یا لڑکی کی زبانی) لکھتے ہیں کہ آخر مرد کیلئے کئی بیویوں کا رکھنا کیوں جائز ہے لیکن عورتوں کیلئے کئی شوہروں کا رکھنا کیوں ممنوع ہے، یا یہ کہ اس طرح کی تجویز پیش کی جاتی ہے کہ شادی کا تعاونی ادارہ تشکیل دیا جائے اور کئی مرد مل کر ایک عورت سے مشترکہ شادی کریں۔

توجہ رہے کہ یہ باتیں کسی کمیونسٹ ملک کے اخباروں کی نہیں ہے بلکہ جمہوری اسلامی ایران کے اخباروں میں ایسی باتیں لکھی جاتی رہی ہیں! یا ایک اسلامی یونیورسٹی میں اس طرح کی تقریر کی جاتی ہے خود کو ایک اسلامی ادارہ سے منسلک بتاتے ہوئے ایک شخص تقریر کرتاہے، اور کہتا ہے کہ آج رہبری کی مخالفت تو جانے دیجئے، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت بھی جانے دیجئے اگر عوام چاہیں توخدا کے خلاف بھی مظاہرہ کر سکتے ہیں اور کوئی ایسا قانون نہیں ہے جو ان کو روک سکے! یہ باتیں اگر کسی غیر اسلامی ملک میںیا کسی کافر و مشرک کے ذریعے کہی جاتیں تو کوئی جائے تعجب نہیں تھا لیکن اگریہی باتیں جمہوری اسلامی ایران میں، اسلام اور ولایت فقیہ کی حکمرانی میں یہاں کی یونیورسٹیوں میں کی جارہی ہیں اور کوئی ان کے خلاف کھڑا نہیں ہوتا یہ واقعاً شرم آور ہے، اور جب بھی طالب علم اعتراض کرتے ہیں تو اس کو اہمیت نہیں دی جاتی۔

اسی وجہ سے ہم کو اپنی ذمہ داری کا احساس ہوا، اور ہم اعلان کرتے ہیں کہ اس طرح کی باتیں ایک خطرناک بدعت ہیں اور اسلامی بنیادوں کے خلاف ہیں اور اگر کوئی اپنی تقریروں میں ایسی باتیں کرنا چاہتا ہے تو کم از کم اسلام کے نام سے ایسی باتیں نہ کرے، تاکہ معلوم ہوجائے کہ اسلام کیا ہے اور کفر کیا ہے؟ اور ہر شخص اپنی مرضی کے مطابق جس کو چاہے انتخاب کرے، یہ آزادی دین اور آزادی بیان مغربی ثقافت کا پھل ہے اور ایسا پھل، جو ظاہر میں بہت عمدہ اور میٹھا ہے لیکن اندر سے زہر بھرا ہے، یہ پھل مغربی تہذیب کے درخت سے سازگار ہے لیکن ہماری اسلامی تہذیب سے اس کا رابطہ اس صورت اور اس وسعت کے ساتھ بالکل بے

ڈھنگا لگتا ہے اس سلسلہ میں مغربی تہذیب کی صورت حال کیا ہے اس کی عکاسی کے لئے ہمیں مجبوراً کہنا پڑ رہا ہے کہ آج کل مغربی ممالک اور مغربی دنیا میں مذہب کسی سیاسی نظریہ کی طرح پارٹی کی شکل اختیار کر گیا ہے مثلاً کسی ملک میں اگر کئی پارٹیاں ہوں اور کل وہاں کوئی نئی پارٹی وجود میں آجائے، اور کوئی ایک پارٹی سے دوسری پارٹی میں چلا جائے تو یہ کام ہمارے لئے باعث تعجب نہیں ہے، مذہب کے سلسلے میں بالکل اسی طرح کا ماحول مغربی ممالک خصوصاً امریکہ میں پایا جاتا ہے جہاں ہر روز ایک نیا مذہب اور نیا فرقہ پیدا ہوتا رہتا ہے یہ مسئلہ واقعاً ہمارے لئے باعث تعجب ہے، تقریباً سو سال پہلے ایک شخص پیدا ہوا جس کا نام ''باب'' تھا اس نے دعویٰ کیا کہ ''میں ایک نیا اسلام لے کر آیا ہوں، اور شیعوں کے امام زمانہ کا ظہور ہو چکا ہے''

اس بات پر سب کو تعجب تھا کہ یہ کیسے ایک نئے مذہب کا دعویدار پیدا ہوگیا؟! (البتہ ایران سے باہر خصوصاً امریکہ میں اس باطل و بے بنیاد گروہ کی جدید اسلام کے نام سے ترویج جاری ہے، کیونکہ ان کے لئے اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے) لیکن آپ دیکھ لیں امریکہ، کناڈا اور یورپی ممالک میں ہر سال کئی جدید مذاہب اور فرقے پیدا ہوتے رہتے ہیں، مثال کے طور پر عیسائیت کے اصل مذاہب ارتھوڈکس، کیتھولک اور پروٹسٹنٹ ہیں لیکن صرف پروٹسٹنٹ کے پانچ سو سے زائد فرقے مغربی ممالک میں موجود ہیں۔

ہم نے سال گذشتہ لاتینی امریکہ کے کچھ ملکوں کا سفر کیا اور اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ امریکہ میں بہت سے نئے مذہب وجود میں آچکے ہیں اور ان کے مبلغ تبلیغ کرنے میں مشغول ہیں، وہاں اس طرح کے مسائل عام ہیں جب بھی کسی اخبار میں اعلان ہوتا ہے کہ ایک نیا فرقہ پیدا ہوچکا ہے اور فلاں کشیش نے ایک جدید فرقہ،جدید مذہب، یا جدید دین کی بنیاد رکھی ہے اور فلاں کلیسا کی بنیاد ڈالی ہے تو وہاں کوئی تعجب نہیں کرتا، اور لوگ بھی بہت آسانی سے اس فرقہ میں شامل ہو جاتے ہیں، اور اس کو ''مذہب کی آزادی'' کہتے ہیں۔

اسلامی پروٹسٹنٹانیزم، اسلام کے خلاف سازش بعض لوگوں کو توقع ہے کہ اسلامی جمہوری ایران میں بھی مذہبی آزادی کا در کھول دینا چاہیے اس بنا پر عرصہ ہوا ان لوگوں نے تجویز پیش کی تھی کہ اسلام میں بھی ایک اسلام پروٹسٹانیزم وجود میں آنا چاہیے جہاں تک

ہماری اطلاع ہے یہ تجویز سب سے پہلے فتح علی آخوند زادہ (آخوند اف) نے پیش کی تھی، اس کے بعد دوسرے روشن خیال دانشوروں نے بھی اپنی اپنی تقریروں میں یہ خیال ظاہر کیا ہے،اپنی کتابوں میں لکھا ہے اور مشورہ دیاہے کہ اسلام میں بھی ایک پروٹسٹینٹ مذہب ہونا چاہیے،اور آج کل امریکہ میں اس طرح کی تبلیغات ہوتی رہتی ہیں کہ ایران میں بھی ایک دوسرا ''مارٹن لیبو تھر'' پیدا ہونا چاہئے جو ایک نیا پروٹسٹینٹ مذہب ''جدید اسلام'' تشکیل دے،جو آج کی اس ماڈرن زندگی کے مناسب حال ہو، یہچودہ سوسال کا پرانا اسلام آج کی زندگی کیلئے کام کا نہیں ہے اگر امریکہ ایسا مشورہ پیش کرے تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔

کیونکہ ان کا مقصد اسلام کو ختم کرنا ہے خود ان کے کہنے کے مطابق انہوں نے اس سلسلے میں پروگرام بنا رکھے ہیں اور اس کے لئے مخصوص بجٹ بھی معین کر رکھا ہے اور بارہا اس چیز کا اقرار کیا ہے کہ اس زمانے میں ان کا اصل دشمن اسلام ہے لیکن تعجب کی بات تو یہ ہے کہ ان کے پروپگنڈوں کا اثر آہستہ آہستہ ہمارے ملک کے اندر بھی ہوتا جارہا ہے،اور بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو اخباروں اور رسالوں میں اسلام کے قطعی اور ضروری مسائل پر سوالیہ نشان لگارہے ہیں مثال کے طور پر وراثت میں مرد و عورت کے حصے برابر ہونا، یا یہ کہ عورت کئی شوہر کیوں نہیں رکھ سکتی؟یہ لوگ اسی طرح کی چیزوں پر انگلیاں اٹھاتے ہیں اور کبھی کبھی تو، اسلام کے بنیادی احکام کا مذاق اڑاتے ہیں۔

آپ حضرات کو یاد ہوگا کہ انقلاب کے شروع میں کچھ لوگ تھے کہ جب قصاص کے بارے میں بل پیش کیا گیا تو انھوں نے اعتراض کیا تھا کہ قصاص کا عمل غیرانسانی ہے،اس وقت امام خمینیؒ نے فرمایا تھا:اگر کسی نے جان بوجھ کر ایسی باتیں کی ہیں تو ان کی مسلمان بیویاں ان پر حرام ہیں ،اور ان کے مال ومنال مسلمان ورثہ کی طرف منتقل ہوں گے ،اور اب ان کی جان بھی قابل احترام نہیں رہے گی، البتہ ارتداد کے احکام صرف قصاص اوراس کے احکام کے منکرین تک منحصر نہیں ہیں ،بلکہ اگر کوئی اسلام کے کسی بھی ضروری حکم کا انکار کرے تو وہ مرتد ہوجاتاہے،لیکن پھر بھی دیکھنے میں آرہا ہے کہ بعض لوگ کسی بھی شرم وحیاء کے بغیر ملک کے مختلف اخباروں اور رسالوں یہاں تک کہ کبھی کبھی ان روزناموں میں بھی، جو مسلمانوں کے بیت المال کی مدد سے نکلتے ہیں،

ایسی باتیں لکھتے ہیں اور اسلام کے ضروری احکام کا انکار کرتے ہیں کچھ لوگوں کو تو ایسا ہونا ہی چاہیے جو ان لوگوں کو خبر دار کریں کہ امام خمینیؒ کا فتوی صرف قصاص کے منکروں سے مخصوص نہیں ہے (بلکہ ہر اس شخص کو شامل ہے جو اسلام کے کسی بھی مسلمہ ضروری حکم کا منکر ہو) اور کبھی کبھی تو یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ وہ مسائل جو تمام شیعہ و سنی فقہا میں متفق علیہ ہیں اور حتی اہل سنت کے درمیان بھی مخالفت نہیں ہے،ان پر بھی اعتراض کرتے یا ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔

کیا ذمہ دارانہ افراد کواس طرح کے مسائل کی تحقیق اور چھان بین نہیں کرنی چاہئے؟یا کم از کم یہ ضروری نہیں ہے کہ کوئی یاد دلائے اور بتائے کہ اس طرح کا خطرہ آئندہ جوان نسلوں کیلئے موجود ہے؟ جن لوگوں نے امام خمینیؒ کے بیان نہیں سنے ہیں، اور ان کے دروس میں شرکت نہیں کی ہے کیا ان کیلئے اس طرح کا خطرہ نہیں ہے کہ وہ اسلامی جمہوری ایران کے اخباروں میں چھپنے والی ان باتوں سے متاثر ہو جائیں اور سوچنے لگیں کہ ہماری اسلامی حکومت اور اسلامی نظام ان باتوں سے اتفاق رکھتا ہے اور یہ اسلامی نظریات ہیں؟کم از کم کوئی تو ہو جو اُن کو بتائے کہ ان نظریات کا اسلام سے کوئی ربط نہیں ہے۔

بہر حال یہ خیال کہ دین کا تعلق بھی ذوق سے ہے،انسان کو جو دین بھی پسند آئے انتخاب کر سکتا،اور بعد میں جب دل چاہے اپنا دین تبدیل کر سکتا ہے،بہت ہی خطرناک ہے، مغربی ممالک میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک جوان اپنے دوست کے ساتھ کسی ایک کلیسا میں جاتا ہےاور اس کا دوست کہتا ہے کہ میں فلاں کلیسا کو بہت پسند کرتا ہوں جس کے نتیجہ میں وہ اپنے مذہب کو بدل دیتا ہے وہ جوان بھی اس سے متاثر ہوکر اپنے دوست کی پیروی کرتے ہوئے اپنا مذہب بدل لیتا ہے یہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ مذہب بھی ایک ایک طرح کا لباس ہے،کہ جب چاہا پہن لیا اور جب چاہا بدل لیا یا اس کا ماڈل بدل لیا، اسلامی افکار کی بنیاد اس چیز پر قائم نہیں ہے کہ سعادتیں اور شقاوتیں لوگوں کی خواہش کے مطابق مختلف ہوتی رہتی ہیں کہ یہ نتیجہ نکالا جا سکے کہ دین بھی ایک طرح کا ذوق اور سلیقہ ہے کبھی یہ دین کبھی وہ دین، کبھی یہ مذہب اور کبھی وہ مذہب، جو بھی پسند ہو انتخاب کر لو، اور حکومت کو بھی فطری حق کے عنوان سے لوگوں کو اس طرح کی آزادی دینی چاہئے، اسلام دین کو انسانی زندگی کا اہم ترین مسئلہ مانتا ہے اور دنیا و آخرت کی سعادت و

شقاوت کو صحیح دین کے انتخاب میں مضمر جانتا ہےلہٰذا اس طرح کی گفتگو چھیڑنے کے پیچھے اس طرح کے خطرے موجود ہیں جن کا ہم احساس کررہے ہیں اس کی بو فضا میں بکھری ہوئی ہے اور کبھی کبھی ہم اس کا نظارہ خود اپنی آنکھوں سے بھی کرتے ہیں افسوس کہ بعض لوگ غفلت کررہے ہیں یا خود کو غافل ظاہر کررہے ہیں، ان بحثوں کے چھیڑنے کی وجہ یہ ہے کہ ہم ان انحرافات سے مقابلہ کرنااور اپنی ذمہ داری ادا کرنا چاہتے ہیں۔

فطری حق کا حقیقی مفہوم

یہاں اس مسئلہ کی وضاحت بہت ضروری ہے کہ واقعاً فطری حق کا مطلب کیا ہے؟اور آزادی کس معنی میں انسان کا فطری اور پیدائشی حق ہے؟فطری حق کے لئے بہترین تعریف یہ ہے کہ وہ ضروریات جو انسان کی فطرت کے مطابق ہوں اور کوئی اس کا انکار نہ کرے لہٰذا گفتگو کرنا اوراپنی رائے کا اظہار کرنا یہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے اور کسی کو بھی منع کرنے کا حق نہیں ہے۔

ہم نے عرض کیا کہ کھانا پینا انسان کا فطری تقاضا ہے بلکہ ہر انسان کا پیدائشی ترین حق کھانا پینا ہے لیکن کیا صرف اس بنیاد پر کہ کھانا پینا انسان کا فطری حق ہے وہ دوسروں کی بھی ہر چیز کھاسکتا ہے؟اور کیا کسی بھی قانون کو یہ طے کرنے کا حق نہیں ہے کہ کونسی چیز کھانا حلال ہے اور کون سی چیز کا کھانا حرام ہے؟ کس کے مال کو کھا یا جاسکتا ہے اور کس کے مال کو نہیں کھایا جاسکتا، کیا کوئی عقلمند انسان اس بات کو قبول کر سکتا ہے کہ انسان آزاد ہے اور اپنی مرضی سے جہاں بھی جو بھی چاہے کھائے کسی کا بھی مال کیوں نہ ہو بس پیٹ بھرنے سے مطلب ہے؟اسی طرح گفتگو کرنا بھی ہرانسان کا مسلمہ حق ہے لیکن کسی کو یہ حق نہیں کہ جو بھی جہاں بھی، جس مقصد کے تحت بھی منہ میں آجائے وہ بکتا پھرے، جس طرح قانون کو یہ کہنے کی اجازت ہے کہ کون سی چیز کھائی جائے اور کیا نہ کھائی جائے؟ جس طرح دین کو یہ کہنے کا حق حاصل ہے کہ خنزیر کا گوشت کھانایا شراب پینا جائز نہیں ہے، جبکہ کھانا پینا انسان کا طبیعی حق ہے، اظہار خیال کے بارے میں بھی اسی طرح ہے کون سی بات کہاں اور کب کی جائے اس کی حدیں قانون معین کرتا ہے، جس کو تقریباً تمام دنیا قبول کرتی ہے۔

لیکن مغربی حضرات دین کے سلسلے میں آزاد ہیں جو چاہیں کہیں، کیونکہ دین ایک شخصی ذوق اور سلیقہ کی چیز ہے انسان کی حقیقی زندگی سے اس کا کوئی ربط نہیں ہے زیادہ سے زیادہ انسان اور خدا کے رابطہ تک محدود ہے، اور خدا سے یہ رابطہ مختلف طریقوں سے قائم ہو سکتا ہے، انسان دینی خواہش کے مطابق کوئی بھی طریقہ اپنا سکتا ہے۔

یہ دین بھی صراط مستقیم ہے اور وہ دین بھی صراط مستقیم ہے، بت پرستی بھی صراط مستقیم ہے اور اسلام بھی صراط مستقیم ہے!! لیکن اسلام کا یہ نظریہ نہیں ہے، البتہ اس اسلام کا کہ جس کو حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چودہ سو سال پہلے لے کر آئے تھے نہ کہ وہ نیا اسلام کہ جس کو وہابیوں (بہائیوں) اور مارٹن لیوتھر نے پیش کیا ہے ہم تو اس اسلام کی بات کر رہے ہیں جو حضرت محمد بن عبد اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لے کر آئے ہیں۔

روایتی تعریف دراصل اسلام کی حقیقی تعریف

یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہاں ہم بھی اسی اسلام کو مانتے ہیں، لیکن اس اسلام کی تعبیریں مختلف ہیں آپ ایک تعریف بیان کرتے ہیں، تو کچھ لوگ دوسری تعریفیں اور تعبیریں بیان کرتے ہیں، یہ طریقہ بھی مغربی ثقافت کا ایک ثمرہ ہے کہ اسلامی متون کی مختلف تعبیریں کی جا سکتی ہیں، جیسا کہ ہم نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ کینا ڈا میں چند سال پہلے عیسائیت کا ایک نیا فرقہ وجود میں آیا ہے اس فرقے کے بانی پادری سے سوال کیا گیا کہ ہم جنسی یا لواط کے بارے میں آپ کا کیا نظریہ ہے؟ تو انھوں نے جواب دیا: اس وقت میں اپنی رائے کا اظہار تو نہیں کر سکتا لیکن آپ کے لئے میرا مشورہ ہے کہ انجیل کو از سر نو دوبارہ پڑھا جائے! کیونکہ تورات و انجیل میں صاف طور پر اس کی مذمت کی گئی ہے جس طرح اسلام نے اس کی مذمت کی ہے! اور جب ان سے سوال ہوا کہ آپ تو اس مقدس کتاب کا احترام کرتے ہیں آپ خود اس بارے میں اپنی نظر بیان کریں؟ تو وہ اگرچہ ہم جنسی کے حامی تھے لیکن صاف صاف کھل کر نہیں کہہ سکتے تھے لہٰذا انھوں نے جواب دیا انجیل کی پھر سے تشریح کرنی چاہئے۔

اسی طرح یہ لوگ بھی کہتے ہیں کہ اسلام اور قرآن کی از سر نو تفسیر کی جائے،ان کے جواب میں ہم یہ عرض کریں گے ہم لوگ، شیعہ و سنی علماء کی چودہ سو سالہ روایتی تفسیر کو ہی معتبر جانتے ہیں، ہم جس اسلام کا دم بھرتے ہیں یہ وہی اسلام ہے جس کی آئمہ معصومین علیہم السلام نے تفسیر کی ہے اور ان کے بعد بھی چودہ سو سال سے علمائے اسلام نے وہی تفسیر کی ہے،وہی تفسیر و تعبیر ہمارا معیار وملاک ہے،اور اگر اسی اسلام کی جدید تعبیریں ایجاد کی جائیں اور ان کی بنیاد پر تمام اسلام اور اسلامی احکامات بدل دئیے جائیں تو ہم کو اس نئے اسلام سے کوئی سروکار نہیں ہے، اور نہ ہی ایسے اسلام کو ہم پسند کرتے ہیں اور ہم نہیں سمجھتے کہ ہمارا کوئی بھی مسلمان بھائی کسی ایسے اسلام کو کہ جس کو بابیوں اور مارٹن لوتھر نے پیش کیا ہو قبول کرے گا۔

ہم جس اسلام کو جانتے ہیں اور جس کا دم بھرتے اور حمایت کرتے ہیں اس کا سر چشمہ قرآن اور سنت پیغمبر و آئمہ معصومین علیہم السلام ہیں، جس کے احکام شیعہ اور سنی فقہاء چودہ سو سال سے بیان کرتے چلے آرہے ہیں،خصوصاً وہ احکام کہ جن میں شیعہ سنی میں کوئی اختلاف نہیں ہے،یہ اسلام ہم سے کہتا ہے کہ جس طرح کھانے پینے میں اسلامی قوانین کی رعایت ضروری ہے اسی طرح گفتگو کرنے میں بھی قوانین کی رعایت ضروری ہے اسلام کوئی لباس نہیں ہے کہ آج پہنا اور دوسرے دن اتار پھینکا، تحقیق و جستجو کے بعد دین حق قبول کرنا چاہئے۔

دارالاسلام میں اسلام کی حقانیت کو ثابت کرنے کیلئے اتنی دلیلیں موجود ہیں کہ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں مسئلہ کو نہیں سمجھ سکا یا میں دین حق کو تشخیص نہیں دے سکا؟ مگر یہ کہ کوئی صحیح طریقہ سے تحقیق اور اس کا مطالعہ نہ کرے،اگر کوئی جزائری ''میکرونیزی'' کا رہنے والا یہ کہے کہ مجھ پر اسلام کی حقانیت واضح نہیں ہوسکی ہے، تو شاید اس کی یہ بات قبول کر لی جائے لیکن اگر کوئی دار الاسلام میں،چودہ سو سالہ اسلامی تاریخ کے بڑے بڑے علمائے اسلام کی موجودگی اور اسلام کے بارے میں بہترین کتابوں کی فراہمی کے باوجود یہ کہے کہ میں اسلام کو نہیں سمجھ سکا تو کوئی بھی اس کی باتوں کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ ہوگا۔

بہر حال جس اسلام کو ہم مانتے ہیں وہ یہ کہتا ہے کہ جس طرح آپ نے کھانے پینے میں محدودیت کے قائل ہیں اسی طرح گفتگو میں بھی قوانین کے تحت محدودیت ضروری ہے، یعنی کسی کو یہ حق بالکل نہیں ہے کہ جو چاہے کہنا شروع کردے، بلکہ اسلامی قوانین کا تابع ہونا ضروری ہے، اگر اسلامی قوانین کے خلاف عمل کیا تو آپ کا یہ کام اسلامی معاشرے کیلئے نقصان دہ ہے، جیسا کہ آپ جانتے ہیں وہ محرمات کہ جن کا مراجع عظام کے عملیوں میں بھی ذکر موجود ہے کہ گمراہ کن، کتب ضالّہ کی خرید وفروخت حرام ہے، اسلام اس چیز کی اجازت نہیں دیتا کہ ہر ایک خصوصاً جن لوگوں میں حق و باطل کے شناخت کی صلاحیت نہیں ہے ہر کتاب کو خریدیں اور پڑھنا شروع کردیں، یا ہر کس و ناکس کی تقریریں سنیں۔

جیسا کہ قرآن مجید میں صاف طور پر موجود ہے: (وَاِذَا رَاَیْتَ الَّذِیْنَ یَخُوْضُوْنَ فِیْ اٰیَاتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْھُمْ حَتّٰی یَخُوْضُوْا فِیْ حَدِیْثٍ غَیْرِہٖ.[1]). ''اور جب تم ایسے لوگوں کو دیکھو جو ہماری آیتوں کے بارے میں بے ہودہ بحث کررہے ہیں تو ان (کے پاس) سے اٹھ جاؤ یہاں تک کہ وہ اس بحث کو چھوڑ کر کوئی اور بات شروع کردیں''

یا مومنین کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے کہ اگر ایسے لوگوں کو دیکھیں جو دین میں عیب نکالتے یا نکتہ چینی کرتے ہیں تو ان کی صحبت میں نہ بیٹھیں: (وَقَدْ نَزَّلَ عَلَیْکُمْ فِی الْکِتَابِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰیَاتِ اللّٰہِ یُکْفَرُ بِھَا وَیُسْتَھْزَأُ بِھَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَھُمْ حَتّٰی یَخُوْضُوْا فِیْ حَدِیْثٍ غَیْرِہٖ اِنَّکُمْ اِذاً مِّثْلُھُمْ اِنَّ اللّٰہَ جَامِعُ الْمُنَافِقِیْنَ وَالْکَافِرِیْنَ فِیْ جَھَنَّمَ جَمِیْعاً.[2]) ''(مسلمانو) تم پر الٰہی کتاب، قرآن میں یہ حکم نازل کیا جاچکا ہے کہ جب تم سنو کہ خدا کی آیتوں کا انکار کیا جارہا ہے اور اس کا مذاق اڑایا جارہا ہے تو تم ان (لوگوں) کے ساتھ مت بیٹھو یہاں تک کہ وہ کسی دوسری بات میں لگ جائیں ورنہ جس وقت قرآن اور اسلامی رسم ورواج کا مذاق اڑایا جا رہا ہو اور تم نے ان کی ہم نشینی اختیار کی تو تم بھی ان کی طرح منافق ہوجاؤ گے اور اس میں تو شک ہی نہیں کہ خدا تمام منافقوں اور کافروں کو (ایک دن) جہنم میں جمع کرے گا''، پس وہ لوگ جو اسلام کا دم بھرتے ہیں لیکن اسلام دشمنوں کے ساتھ اُٹھتے بیٹھتے ہیں، اور اسلام دشمنوں کی باتوں کی تبلیغ کرتے ہیں

---
[1] سورہ انعام آیت۶۸۔
[2] سورہ نساء آیت۱۴۰۔

یہ وہی منافقین ہیں جن کا ٹھکانہ کافروں کی طرح جہنم ہے،میں ایک بار پھر پر زور الفاظ میں کہتا ہوں کہ اسلام نے صاف طور پر کہا ہے :جاؤ ، حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرو اور اس کے بعد دشمنوں سے بحث کرو ، اسلام کے تعلیم کردہ حقائق کے ذریعہ تم ان کو مغلوب کرلوگے، لیکن جب تک تم میں اتنی صلاحیت پیدا نہ ہوجائے کہ اسلامی عقائداور معیارات کا اچھی طرح دفاع کر سکو، تم کو گمراہ اور انسانی نما شیاطین کی ہمراہی اور ہم نشینی اختیار نہیں کرنی چاہئے جس طرح کہ ایک کشتی لڑنے والے کو مشورہ دیتے ہیں کہ پہلے مشق اور پریکٹس کرے تب کشتی کے میدان میں اترے اور کشتی لڑے ،وہ جوان کہ جس نے ابھی مشق نہیں کی ہے وہ کسی پہلوان سے کشتی نہیں لڑسکتا،کیونکہ پہلوان اس کو ذرا سی دیر میں زمین پر دے مارے گا،

اور اس کی ہڈیاں ٹوٹ جائیں گی، یہ آزادی کی مخالفت نہیں ہے بلکہ جوانوں کے لئے ایک نصیحت ہے کہ پہلے اسلامی علوم اور اسلامی معارف سے آشنائی پیدا کریں، اس کے بعد دشمن سے بحث کریں۔بہر حال جو اسلام ہم جانتے ہیں اس میں آزادیاں محدود ہیں،اور اس طرح کے استدلال کا سہارا لیناکہ گفتگو کرناچونکہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے لہذا گفتگو کرنے میں وہ آزاد ہے صحیح نہیں سمجھتا ،ورنہ انسان کی دوسری خواہشات بھی ہیں اور وہ بھی انسان کا فطری حق شمار ہوتی ہیں جیسے جنسی خواہشات یاکھانا پینا لہذا ان میں بھی کوئی محدودیت نہیں ہونی چاہیے، مگر سب محدودیت کے قائل ہیں تو جس طرح کھانے پینے میں محدودیت کا نہ ہونا کسی بھی عقلمند انسان کے لئے قابل قبول نہیں ہے گفتگو کرنا بھی اسی طرح ہے، لہذا گفتگو اور اظہار خیال چونکہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے اس کو دلیل نہیں بنایا جاسکتا کہ اس سلسلے میں کوئی حد و قانون نہ ہو لہذا عقل اور دین کوان کی حدود معین کرنا چاہئے اور حدبندی کی بنیاد معاشرے کی وہ مادی اور معنوی بھلائی ہے جو دین نے بیان کر دی ہے۔

آزادی کہاں تک جائز ہے؟شاید آپ حضرات نے بھی اخباروں میں پڑھا ہو کہ بعض لوگوں نے ہماری باتوں پر اعتراضات کرتے ہوئے کہا ہے کہ فلاں صاحب مغالطہ سے کام لیتے ہیں ہم نے کیا مطلق آزادی کی بات کی ہے ؟ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ کچھ جائز آزادیاں بھی ہیں جو ہونا چاہیے۔

ہم پوچھتے ہیں کہ جائز آزادی سے آپ کی مراد کیا ہے؟کیا آپ کی مراد وہ آزادی ہے کہ جس کو شرع پسند کرتی ہے؟!کیونکہ لفظ ''جائز'' کے دو معنی بیان کئے جاتے ہیں :جائزیعنی جس کی شریعت نے اجازت دی ہے (اوریقیناآپ کی مرادیہ معنی نہیں ہیں کیونکہ جو لوگ ایسی باتیں کرتے ہیں وہ شریعت کے زیادہ پابند نہیں ہیں) بہر حال اگر جائز کا مطلب وہی ہے کہ جس کو شرع پسند کرتی ہے تویہی ہم بھی کہتے ہیں کہ آزادی شرعی قوانین کے دائرے میں ہونا چاہئے۔

جائزکے دوسرے معنی یہ ہیں کہ وہ جس کی ملک کے قانون میں اجازت ہو اس معنی کے لحاظ سے بھی اسلامی جمہوریۂ ایران میں جیسا کہ ملک کے آئین میں بیان ہواہے قانون کو اسلام کے مطابق ہونا چاہیے، ہماراپورا آئین اس بات کی غمازی کرتاہے کہ تمام قوانین واحکام اسلام کے مطابق ہونے چاہئے، اوربنیادی طور سے آئین میں فقہاء اور قانون دانوں کی کونسل شورائے نگہبان کے وجودکا فلسفہ ہی یہی ہے کہ وہ قوانین جو پارلیمنٹ میں منظور ہوئے ہیں ان کا جائزہ لیں کہ وہ قوانین اسلام کے مطابق ہیں یا نہیں؟ بالفرض یہ کہ ملک کے تمام عوام اور پارلمانی نمائندے (ایک اقلیت اور ان کے نمایندوں کے علاوہ کہ جن کے حقوق بھی محفوظ ہیں) مسلمان، مومن اور دیندار ہوں پھر بھی ممکن ہے کہ یہ ممبران کبھی غفلت کر بیٹھیں اور ایسے قانون کو منظوری دیدیں جو اسلام کے خلاف ہو،تو ائین کی رو سے پارلیمنٹ کے منظور شدہ مسودے شورائے نگہبان میں دیکھے جائیں گے کہ آیا یہ بل آئین اور اسلامی قوانین کے مطابق ہیں یا نہیں؟ شورائے نگہبان کے فقہاء پارلیمنٹ کے منظور کردہ بل کے اسلامی ہونے کی تائید کرتے ہیں اور شورائے نگہبان کے حقوق داں حضرات ان کی آئین سے مطابقت کی تائید کرتے ہیں۔

اگر ہمارے آئین میں احکام و ضوابط کا اسلامی ہونا ضروری نہ ہوتا تو شورائے نگہبان کے وجودکی کیا ضرورت تھی؟اوراسلام کی حکمرانی اور ولایت مطلقۂ فقیہ پر آئین کے بنیادی اصولوں میں جو اس قدر زور دیا گیا ہے اس کا کیا مطلب ہے؟ ورنہ کوئی جائے تعجب نہیں تھا کہ ایک شخص حقوق داں کے عنوان سے کہہ دیتا چونکہ آئین کہتا ہے آزادی کی رعایت کی جائے لہذا کوئی بھی دین اور قانون اس آزادی کو محدود نہیں کر سکتا، آئین کہتا ہے کہ آزادی جائز ہو نہ کہ ناجائز ؟اور آپ بھی کہتے ہیں جائزآزادی؟اب جائز آزادی سے مراد

کیا ہے؟ اگر جائز شرع کی روشنی میں ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ آزادی جس کی شرع نے اجازت دے رکھی ہے اور اگر جائز قانون کی روشنی میں ہے تو اس کا مطلب وہ آزادیاں ہیں کہ جن کی شرع اور قانون نے اجازت دی ہے وہ جائز ہیں۔

دین اور قانون آزادی کا دائرہ معین کرتے ہیں

آزادی کبھی بھی قانون سے مافوق نہیں ہو سکتی، لیکن جو لوگ کہتے ہیں کہ آزادی دین اور قانون سے بالا تر ہے، ان سے ہمارا سوال یہ ہے کہ اگر ایسا ہے تو پھر دین اور قانون کس لئے ہیں ؟ سرے سے قانون کی کیا ضرورت ہے ؟ کیا قانون اس کے علاوہ کچھ اور ہے کہ وہ کہتا ہے منصوبے ایک خاص دائرے میں بروئے کار لائے جائیں سب کچھ قوانین کے تحت ہو، فلاں کام انجام دیجئے اور فلاں کام انجام نہ دیجئے۔

یہاں بعض مطالب کی یاددہانی پر ہم مجبور ہیں کہ تقریباً ہر قانون صاف صاف یا اشارہ کے طور پر، یہ کہتا ہے کہ انسانی عمل و رفتار کو محدود ہونا اور خاص دائرے میں ہی انجام پانا چاہئے، لہٰذا قانون کا کام ہی آزادی کو محدود کرنا ہے، اگر دین اور قانون کو آزادی کا دائرہ محدود کرنے کا حق نہ ہو تو پھر دین اور قانون کا وجود بے کار ہے، دین اس لحاظ سے کہ یہ سیاسی اور معاشرتی قوانین پر مشتمل ہے انسان کے سیاسی اور معاشرتی عمل و رفتار کو محدود کرتا اور اس کی راہیں معین کرتا ہے اور حکم دیتا ہے کہ یہ امور ایک خاص دائرے میں انجام پائیں چنانچہ اگر دین کے معنی اس کے علاوہ کچھ اور ہوں تو پھر دین کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے؟ اگر دین اس لئے آیا ہے کہ ہر شخص اپنی مرضی کے مطابق جو بھی چاہے کرے تو پھر دین کا کیا فائدہ ؟

دین کی حیثیت اور اس کا مقام کیا ہے؟ دین اور قانون کا وجود انسان کی آزادی کا دائرہ معین و محدود کرنے کے سوا کچھ نہیں ہے، لہٰذا آزادی کو دین اور قانون سے جو بالاتر قرار دیا جاتا ہے ایک فضول سی بات ہے ہاں ممکن ہے بعض حضرات دین کے نام پر لوگوں کو ان کی جائز آزادیوں سے بھی محروم کر دیں اور جو چیز خدا نے حلال کی ہے اس کو خرافات اور قومی رسم و رواج کہہ کر

حرام قرار دیں، جیسا کہ، افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے آج بھی ہمارے ملک کے گوشۂ و کنار میں بعض قومیں اور قبیلے ہیں جنھوں نے خدا کی حلال کردہ چیزوں کو حرام کر رکھا ہے ،اور ہماری موجودہ تہذیب میں اب بھی خدا کی بعض حلال چیزوں کو برا سمجھا جاتا ہے،اور اگر ایسا نہ ہوتا تو بہت سی جنسی برائیاں ختم ہو جاتیں،

حضرت امیرالمومنین علیہ السلام نے فرمایاہے'' :لولا ما سبق من ابن الخطاب فی المتعۃ ما زنا الاّ شقی[1]''.''اگر عمر بن خطاب نے متعہ کی مخالفت اور روک تھام نہ کی ہوتی تو شقی و بد معاش شخص کے علاوہ کوئی بھی زنا نہ کرتا'' افسوس !کہ اب بھی اس حلال خدا کو برا و حرام سمجھا جاتا ہے جب کہ بہت سی مشکلات اس کے ذریعے حل ہو سکتی ہیں ہاں اگر کوئی شخص دین کے نام پر خدا کی حرام کردہ چیزوں کو حلال کرنا چاہے،تو یہ کام بھی برا ہے نہ صرف یہ کہ برا ہے بلکہ حرام اوربدعت ہے، جس طرح اس کے بر عکس خدا کی حلال کردہ چیزوں کو حرام کرنا بھی بدعت ہے '':ان اللہ یحب ان یؤخذ برخصہ کما یحب ان یؤخذ بعزائمہ[2]''خداوند عالم جس طرح پسند کرتاہے کہ لوگ اس کے مباح اور حلال سے فیض اٹھائیں اسی طرح چاہتا ہے کہ اس کے واجبات کو انجام دیں اور محرمات کو ترک کریں۔

معلوم ہوا کہ کسی کو دین یا قوم یا علاقائی تعصب کے نام پر خدا کی حلال کردہ چیزوں کو حرام کرنے کا کوئی حق نہیں ہے،اور آزادیوں کو بھی اس طرح محدود کرنا حرام و بدعت ہے،اور کوئی بھی اس سے موافقت نہیں رکھتا لیکن اگر ''آزادی'' سے مراد ناجائزآزادیاں ہیں تو کسی کو یہ توقع نہیں ہونی چاہیے کہ دین ناجائزآزادی کی بھی مخالفت نہ کرے !خلاصہ کلام یہ کہ آزادیاں دو حال سے خالی نہیں: یا جائز ہیں، یا ناجائز ،اگرجائز ہیں اور دین وقانون نے ان کو جائز قرار دیا ہے اور اس کی مخالفت نہیں کی ہے،تو پھر یہ کہنے کی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ دین اور قانون کو یہ حق نہیں ہے کہ معاشرے سے اس کی جائزآزادی بھی چھین لے،کیونکہ اگر خود دین نے اجازت دی ہے تو کس طرح وہ کہہ سکتا ہے کہ جس چیز کی میں نے اجازت دی ہے وہ کام انجام نہ دو؟ یہ تو خود ایک طرح کا تناقض ہے

---

[1] ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ، ج۱۲،ص۲۵۳۔
[2] بحار الانوار، ج۶۹،ص۳۶۰۔

لیکن اگر وہ آزادی مراد ہو جو دین و قانون کی نظر میں ناجائز ہے، اور دین نے اس کی مخالفت کی ہے تو پھر اس کے منع نہ کرنے کا حق دین نہ رکھتا ہو یہ کوئی معنی نہیں رکھتا اور یہ بھی ایک طرح کا تناقض ہوگا۔

آزادی کا دائرہ معین کرنے کی ضرورت لہٰذا بحث کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم بھی آزادی کو بہت ہی محترم، الٰہی نعمت سمجھتے نیز انسان کے معنوی کمال اور مادی ترقی کیلئے ایک شرط جانتے ہیں، ہمارا عقیدہ ہے کہ اگر انسان آزادی کی نعمت سے بہرہ مند ہو اور علم و آگہی کے ساتھ دین کا انتخاب اور اس پر عمل نہ کرے، تو پھر اس کے اعتقاد کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوگی، انسان کی ترقی اور کمال اسی میں ہے کہ دین کا پوری آگہی کے ساتھ انتخاب کرے، قرآن مجید کی آیت : (لَا اِکْرَاهَ فِی الدِّیْنِ[1]) ''دین میں کسی طرح کی زبردستی نہیں ہے'' کا مطلب بھی یہی ہے، ہمارا عقیدہ ہے کہ آزادی خداوند عالم کی بڑی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے لیکن الٰہی نعمت سے استفادہ کیلئے بھی ایک حد معین ہے: (وَمَنْ یَتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَأُولٰئِکَ هُمُ الظَّالِمُوْنَ[2]) ''اور جو خدا کی مقرر کی ہوئی حدوں سے آگے بڑھتے ہیں وہی لوگ تو ظالم ہیں''

الٰہی حدود سے آگے بڑھنا شقاوت اور الٰہی نعمت کے چھن جانے کا سبب ہے، وہی چیز جو انسان کی سعادت و کامیابی کا باعث ہے، اگر حد سے گزر جائیں تو شقاوت و بدبختی کا سبب بن جاتی ہے، جب انسان کھانے پینے میں حد سے بڑھ جائے، بیمار ہو جاتا ہے اور کبھی کبھی اپنی موت کا سبب بن جاتا ہے، جنسی خواہش بھی ایک خداداد نعمت ہے، لیکن جب یہ اپنی حد سے بڑھ جاتی ہے تو سماجی برائیاں پھیل جاتی ہیں اور کبھی کبھی معاشرے کی ہلاکت اور خطرناک بیماریوں میں مبتلا ہو جانے کا باعث ہوتی ہیں. لکھنا اور گفتگو کرنا بھی اس طرح ہے، ہمیں اس کا حق نہیں ہے کہ صرف اس بنا پر کہ بولنا انسان کی طبیعت کا تقاضا ہے بولنا شروع کر دے اور جو منھ میں آئے کہتے رہیں ؛جی نہیں تمام چیزوں میں حدود کا پاس لحاظ کرنا ضروری ہے، ٹھیک ہے اسلامی حکومت کے لئے لوگوں کی جائز آزادی فراہم کرنا ضروری ہے لیکن اسلامی حکومت کو ناجائز آزادیوں کی روک تھام کا بھی حق حاصل ہے۔

---

[1] بحار الانوار، ج۶۹،ص۳۶۰۔
[2] سورہ بقرہ آیت۲۶۵۔

اخباروں نے جو شکوک و شبہات ایجاد کئے ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ میں نے (مولف) اس طرح کی بحث چھیڑ کر آئین میں دی گئی قومی حاکمیت کو ختم کرنے کی کوشش کی ہے،ان کا کہنا ہے کہ آئین کے مطابق ہر انسان کواپنی زندگی کا فیصلہ نہ کرنے کا حق ہے اب اگر ان کو مجبور کیا جائے کہ فقط دین کا خیال کریں تو اس کا مطلب یہ ہوگا وہ اپنی زندگی کا فیصلہ نہیں کر سکتے! واقعاً یہ شک ایجاد کرنے کا پر فریب رخ ہے۔

میں ان سے عرض کروں گا: کیا ہمارے آئین میں صرف اس بات کو بیان کیا گیا ہے؟ کیا اسی آئین میں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ اصلی حکمرانی خدا کی ہے؟ کیا اسی آئین میںیہ نہیں ہے کہ ملک میں وہی قانون جاری ہوں گے جو اسلام کے مطابق ہوں؟ کیا یہ باتیںآئین میں اساسی نہیں ہیں اور صرف یہی بات کہی گئی ہے کہ لوگوں کو اپنی زندگی کے فیصلے خود کرنے چاہئے؟شاید کوئی کہے کہ آئین کی یہ دونوں باتیں ایک دوسرے کی مخالف ہیں لہٰذا ان کی تشریح وتفسیر اور راہِ حل نکالنے کی ضروت ہے، لیکن اگر ذرا سا غور وفکر سے کام لیں تو ان دونوں شقوں کو سمجھنا اور جمع کرنا آسان ہے آئین کی پہلی شق میں کہا گیا ہے کہ حاکمیت اور اصلی حکمرانی خدا کی ہے اور پھر دوسری شق میں کہا گیاہے کہ ہر انسان کواپنی زندگی کے بارے میں خود فیصلہ کرنا چاہئے تو مطلب یہ ہے کہ عوام خدا کی حکمرانی کے سایہ میں زندگی پر خود حکمراں ہیں، لہٰذا اس ملک کے عوام اور اسلامی معاشرے سے الگ کوئی بھی بیرونی قوت یہ حق نہیں رکھتی ہے کہ وہ اپنے افکار، اپنے طریقے اور اپنا مذہب اور اپنا قانون ہم پر تھونپے،یعنی امریکہ کو اپنا قانون ہم پر مسلط کرنے کا کوئی حق نہیں ہے، یہ ہمارے عوام کا حق ہے کہ وہ خود اپنے لئے منظور نظر قانون کا انتخاب کریں، اور ہمارے عوام نے ہی اسلامی قانون کے حق میں اپنا ووٹ دیا ہے۔

ایک شخص نے ''اہواز یونیورسٹی'' میں اپنی تقریر کے دوران کہا ہے: اگر عوام چاہیں خدا کے خلاف بھی مظاہرہ کر سکتے ہیں قانون کو انھیں روکنے کا کوئی حق نہیں ہے؟! کیا عوام کی حکومت کا مطلب یہ ہے؟ کیا آئین میں یہ بات کہی گئی ہے؟ اگر آئین سے ناواقف کوئی شخص اس طرح کی باتیں کرتا ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں تھی، تعجب تو ان لوگوں پر ہے جو خود کو قانون داں کہلاتے

ہیں، پھر بھی اس طرح کی باتیں کرتے ہیں! ممکن ہے وہ کہیں جو آپ کہہ رہیں وہی قانون اساسی ہے، ہم اس کو نہیں مانتے تو جواب میں ہم عرض کریں گے کہ اگر قانون میں کسی طرح کی پیچیدگی اور ابہام ہے تو اس کی تشریح کا کام فقہاء اور زعماء کی اعلیٰ کونسل ''شورائے نگہبان'' ہے اگر آپ اس آئین کو قبول کرتے ہیں تو دیکھ لیجئے یہ قانون آپ کو تشریح و تفسیر کی اجازت نہیں دیتا،

مبہم و متضاد باتوں کے حل کی راہ اس نے خود ہی معین کردی ہے اگر آپ اس آئین کو مانتے ہیں تو اس کی تشریح و تفسیر کے لئے شورائے نگہبان کی طرف رجوع کیجئے، وہ شورائے نگہبان جو اسلام اور اسلامی جمہوریہ ایران کے آئین کی نگراں کونسل ہے اور احکام اسلامی کی محافظت کیلئے مسلمان فقہاء سے تشکیل پائی ہے، اگر وہ آپ کی تائید کردے تو پھر آپ اسلام کے قوانین پامال کرنے میں حق بجانب کہے جا سکتے ہیں۔

بہرحال جو کچھ ہم نے عرض کیا اسلام دشمنوں کے وہ شکوک وشبہات ہیں جو مکڑی کے جالے سے بھی زیادہ کمزور ہیں، ان کے پاس ان موہوم دستاویزوں کے سوا اور کچھ نہیں ہے اسی لئے وہ سست اور کمزور باتوں کا سہارا لیتے ہیں۔

سولھویں تقریر

قانون اورآزادی کے دائرے میں الٰہی اورالحادی ثقافت کا فرق

مقاصد کی تکمیل میں انتخاب،آگہی اور قانون کی پابندی کا کردار ''اسلام کے سیاسی نظریہ'' سے متعلق سلسلۂ بحث کے دوران اس نظریہ کے مقررہ قواعد و اصول نیزکچھ بنیادی قسم کی ابتدائی باتیں بیان کرنے کی سعادت حاصل ہوئی،اوراس سلسلہ میں پیداکئے گئے کچھ شکوک کے جواب بھی دیئے گئے،اب بحث کوآگے بڑھانے سے پہلے عرض شدہ مطالب کاایک خلاصہ آپ کی خدمت میں عرض کردیا جائے:اسلامی نقطۂ نظر سے انسان ایک متحرک وجود ہے یا دوسرے لفظوں میں ایک ایسا مسافر ہے ، جو آغاز سے انجام تک(جواس کے کمال و ارتقاء کی آخری منزل ہے) مسلسل سفر میں(اور یہی آخری منزل اس کی سعادت اور اخروی کمال ہے) زندگی کا طول وعرض ایک ایسے راستے کی طرح ہے،اصل مقصد تک پہونچنے کے لئے جس کا طے کرنا ضروری ہے،اس سلسلہ میں آپ حضرات کے سامنے ایک مثال پیش کردوں،تاکہ یہ بات ہمارے جوانوں کے ذہنوں میں اچھی طرح اتر جائے: فرض کیجئے ایک ڈرائیور کو تہران سے مشہد جاناہے اب اگر اس ڈرائیور کے ہاتھ پیر مفلوج ہوں توظاہر ہے یہ شخص ڈرائیونگ نہیں کرسکتا،ڈرائیونگ اسی صورت میں کرسکتا ہے جب اس کے بدن کے اعضاء صحیح وسالم ہوں،اوروہ قدرت واختیار بھی رکھتا ہو۔

جب وہ چاہے گاڑی کودائیں بائیں موڑ سکے یا ایکسیلٹر یا بریک کا استعمال کر سکے،اسی طرح انسان کواپنی زندگی میں کمال وترقی کی راہ طے کرنے کے لئے بھی آزاد،مختاراور صاحب قدرت وانتخاب ہونا چاہئے،ورنہ اس کمال کے راستہ پر گامزن نہیں رہ سکتا،اسی وجہ سے خدا وندعالم نے انسان کو انتخاب واختیار کی قدرت دی ہے کہ وہ اپنی مرضی سے اوراپنے ''انتخاب و اختیار سے'' اس راستہ پر قدم بڑھائے اور منزل مقصود تک پہونچے،اگر ایسا نہ ہو تو یہ انسان اپنے اصل مقصد تک نہیں پہونچ سکتا،لہٰذااگر کوئی شخص یہ

وچے کہ زور زبردستی سے کمال کے راستہ کو طے کر سکتا ہے اور مقصد تک پہنچ جا سکتا ہے، تو یہ اس کی غلط فہمی ہے، انسان کو آزاد ہونا اور انتخاب پر قادر ہونا چاہئے تاکہ وہ اس راستہ کو طے کر سکے۔

انسان جتنا انتخاب میں آزاد ہوگا اتنا ہی اس کے عمل کی اہمیت ہوگی، لیکن جس طرح ایک ڈرائیور کا صرف جسمانی طور پر صحیح وسالم ہونا اس بات کی گارنٹی نہیں ہے کہ وہ منزل مقصود تک پہونچ جائے گا کیونکہ ہوسکتا ہے بھول چوک یا حرص ہوس میں پڑ کر غلط راستہ کا انتخاب کربیٹھے،اور کسی جبر واکراہ کے بغیر اپنے ہی ہاتھوں سے اسٹیرنگ گھمادے یا خود اپنے پیروں کے ذریعہ اکسلیٹر دبادے اور موٹر کسی کھائی میں چلی جائے، معلوم ہوا کامیابی کی منزل تک پہنچنے کے لئے صرف صاحب انتخاب واختیار ہونا کافی نہیں ہے، بلکہ اس کے لئے کچھ شرائط کا ہونا بھی ضروری ہے، یعنی تمام اسباب کی فراہمی یا دوسرے لفظوں میں مقصود تک پہونچنے کے لئے ٹریفک کی علامتوں اور نشانیوں پر توجہ نیز ڈرائیورنگ کے تمام اصولوں کا پاس و لحاظ کرنا ضروری ہے تاکہ منزل مقصود تک پہنچا جا سکے۔

اگر کوئی کہے کہ میں جسم وجسمانیت کے اعتبار سے طاقتور ہوں اور انتخاب کی صلاحیت بھی رکھتا ہوں، اور میرا دل چاہتا ہے کہ ٹریفک کے اصولوں کے خلاف ڈرائیونگ کروں اور کسی کو میرا راستہ روکنے کا حق نہیں ہے، تو ایسی صورت میں اس شخص کو سمجھ لینا چاہئے کہ اس کے سفر کا انجام ہلاکت ہے اور اس کا کسی کھائی میں گرنا یقینی ہے،لہٰذا جسمانی طور پر انسان کے صحیح وسالم ہونے کے ساتھ ساتھ راستہ کا علم ہونا اور ٹریفک کے قوانین کی رعایت کرنا بھی ضروری ہے. ٹریفک کے قوانین کی دو قسمیں ہیں:

١۔ کچھ ایسے قوانین ہیں کہ اگر ان کی رعایت نہ ہو تو خود ڈرائیور کو نقصان پہونچے گا،مثال کے طور پر اگر سڑک سے منحرف ہوگئے تو ممکن ہے کہ کسی کھائی میں گر پڑیں، یا پل سے نیچے جا گریں، اس کا نقصان خودڈرائیور یا اس کی گاڑی کو پہونچے گا،ایسے خطروں سے بچانے اور ہوشیار کرنے کے لئے سڑک کے کنارے مختلف علامتوں کے بورڈ لگادیئے جاتے ہیں مثلاً خطرناک موڑ ، یا بائیں طرف

ڈرائیورنگ یا رفتار کم کرنے کے بورڈ، تاکہ ڈرائیور ٹریفک کے قوانین کے خلاف ڈرائیونگ نہ کرے احتیاط سے کام لے تاکہ صحیح وسالم اپنی منزل تک پہونچ جائے۔

٢۔ لیکن ٹریفک کے کچھ ایسے قوانین ہیں جن کی خلاف ورزی سے صرف ڈرائیور کی جان ہی کو خطرہ میں نہیں بلکہ دوسروں کو بھی نقصان پہونچ سکتا ہے چنانچہ کبھی کبھی ایسے حادثات رونما ہوتے ہیں کہ سیکڑوں لوگوں کی جانیں چلی جاتی ہیں۔ کبھی یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ بعض ''ہائی ویز '' یا شاہراہوں پر خصوصاً بعض بیرونی ممالک میں جہاں بہت زیادہ تیز رفتار سے گاڑی چلانے کی اجازت ہے، معمولی سی خلاف ورزی کے نتیجہ میں سیکڑوں گاڑیاں ایک دوسرے سے ٹکراجاتی ہیں اور بہت سے انسانوں کی جان خطرے میں پڑجاتی ہے،آپ نے بھی اخباروں میں پڑھا ہوگا کہ مثلاًجرمنی میں ١٥٠ موٹرگاڑیاں آپس میں ٹکراگئیں، ظاہر ہے کہ ایسے موقعوں پر صرف احتیاط کی تاکید اورخبردار کرنے والی نشانیوں پر ہی اکتفا نہیں کیا جاتا بلکہ جگہ جگہ ریڈ لائیٹیں (لال بتی) یا ہوشیار کرنے والے بڑے بڑے بورڈ لگادئے جاتے ہیں۔

اور بعض جگہوں پر الکٹرونیک آنکھیں،آٹو مٹیک ویڈیو کیمرے اور پولیس کی گاڑیاں تعینات کرنی پڑتی ہیں تاکہ خلاف ورزی کرنے والے ڈرائیوروں کا پیچھا کر کے ان کا چالان کیا جا سکے،ٹریفک کی خلاف ورزی پہلی حالت میں چونکہ خود ڈرائیور کے لئے خطرناک ہے اور گاڑی سڑک سے گھوم کر الٹ پلٹ جاتی ہے ڈرائیور کے ہاتھ پیر ٹوٹ جاتے ہیں اور کبھی کبھی مر بھی جاتے ہیں، اس صورت میں ڈرائیور کا چالان نہیں کیا جاتا کیونکہ نقصان خود اسی کا ہوا ہے، لیکن دوسری صورت میں خلاف ورزی کے نتیجہ میں دوسرے کو بھی نقصان پہنچ سکتا ہے پولیس گاڑی کا پیچھا کر کے ان کے خلاف قانونی کاروائی کرتی ہے۔

اخلاقی اور آئینی قوانین میں فرق

انسانی زندگی کے سفر میں بھی دو طرح کے خطرے موجود ہیں: ا۔ایک تو وہ خطرے ہیں جن کا تعلق صرف ہماری ذات سے ہوتا ہے، اگر قوانین واصول کی رعایت نہ کریں تو گویا ہم نے خود اپنے کو نقصان پہنچایا ہے،اور درحقیقت ایسے قوانین و ضوابط کی خلاف ورزی کا نقصان ذاتی اور شخصی ہے، اس موقع پر کچھ احکام وضع کئے جاتے ہیں اور ان پر عمل کی تاکید کی جاتی ہے اور اصطلاح میں ان احکام کو اخلاقی قوانین واصول کہا جاتا ہے، فرض کیجئے کوئی شخص نماز نہیں پڑھتا یا نعوذ باللہ تنہائی میں دوسرے گناہوں کا مرتکب ہوتا ہے اس طرح سے کہ کوئی اس کے گناہوں کو دیکھ نہیں پاتا تو اس شخص نے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے،

کسی کو اس سے کوئی مطلب نہیں ہے کوئی نہیں پوچھے گا کہ کیوں اس نے تنہائی میں ایسا گناہ کیا؟حتیٰ کسی کو اجازت نہیں کہ کوئی اس کے بارے میں تحقیق و جستجو کرے،کیونکہ تنہائی میں کئے گئے انسان کے خصوصی مجرمانہ عمل کی تحقیق و تجسس (جاسوسی) حرام ہے۔

کیونکہ یہ ذاتی اور شخصی مسائل ہیں، اگرچہ ایسی اخلاقی نصیحتیں موجود ہیں جن میں حکم ہوتا ہے کہ کوئی شخص تنہائی میں بھی گناہ حتیٰ گناہ کا تصور بھی نہ کرے، لیکن یہ نصیحتیں وہی ٹریفک علامتوں کی طرح ہیں جو سڑکوں کے کنارے ہوشیار و خبردار کرنے کے لئے لگائے جاتے ہیں، مثلاً کہیں لکھا ہوتا ہے آہستہ چلیں لیکن اس کی خلاف ورزی کرنے اور تیز رفتاری یا، غلط طریقہ سے دائیں بائیں چلنے کے سبب خود ڈرائیور کو نقصان پہنچتا ہے ایسی صورت میں پولیس اس کا پیچھا کرنا ضروری نہیں سمجھتی۔

۲۔ لیکن کچھ خطرے صرف ایک شخص کی ذات سے تعلق نہیں رکھتے ایسے قوانین واصول کی خلاف ورزی کی صورت میں جو آئینی قوانین کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں خود خلاف ورزی کرنے والا شخص بھی نقصان اٹھاتا ہے اور معاشرے پر بھی اس کا غلط اثر پڑتا ہے، نتیجۃ میں اسے قوانین کے نفاذ کی ضمانتلازم ہوتی ہے اگر ان کی خلاف ورزی کی جائے تو خلاف ورزی کرنے والے کے خلاف قانونی کاروائی ہوگی، جس طرح ٹریفک کے ان قوانین کی خلاف ورزی جو موٹر ٹکرانے یا دوسروں کو کچلنے کا باعث ہو اور

دوسروں کی جان کے لئے خطرہ بن جائے، پولیس خلاف ورزی کرنے والے کا پیچھا کرتی ہے اور اس کے خلاف قانونی کاروائی کرتی ہے، یہی وہ منزل ہے جہاں اخلاقی اصول و ضوابط کے مقابلہ میں وہ آئین وقوانین آتے ہیں کہ جن کو جزا و سزا کے قوانین کا نام دیا گیا ہے؛ یعنی اسی دائرہ میں شعبۂ قانون سے متعلق علوم اور قانون بنانے والے اداروں کے وہ قوانین آتے ہیں جن پر عمل در آمد کی ضمانت حکومت پر ہوتی ہے ۔

پس معلوم ہوا کہ اخلاقی اصول و ضوابط اورآئینی قوانین ودستور میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ اخلاقی اصولوں پر عمل در آمد کا کوئی ضامن نہیں ہوتا، اگر کسی نے ان قوانین کی مخالفت کی تو اس کو سزا دی جائے او راگر کسی کے خلاف کبھی کوئی کاروائی ہوتی بھی ہے تو اخلاقی اصول کی خلاف ورزی کی وجہ سے نہیں ہوتی بلکہ اس کے آئینی پہلو کو سامنے رکھ کر کی جاتی ہے جس کا نفاذ حکومت کی ذمہ داری ہے اور اگر کوئی شکایت کرنے والا مدعی، شخص خاص ہے تو یہ اس کا خصوصی مسئلہ ہے ورنہ جزاء و سزا کے معنی میں ہے بہر حال جس طرح ایک ڈرائیور اپنی اور مسافروں کی جان کا ذمہ دارہے اور خطرات سے بچنا اس کا اصولی فریضہ ہے اسی طرح انسان بھی ایک مسافر ہے جو ایک جگہ سے اپنا راستہ شروع کرتا ہے اور منزل تک پہونچنے کے لئے راہ میں بہت سے خطروں سے روبرو ہوتا ہے، یہ خطرات کبھی تو خود اس کی ذات سے تعلق رکھتے ہیں،اور ان کے لئے اخلاقی نصیحتیں ہیں،لیکن جہاں ممکن ہے دوسروں کے لئے خطرہ پیدا ہو جائے یا کسی بھی عنوان سے دوسروں کے عقائد خراب ہوں یا جان ومال او رناموس پر زیادتی کی بات آجائے توپھر آئینی اور حکومتی قوانین پیش آتے ہیں جو اخلاقی اصولوں سے الگ ہیں اور ان پر عمل در آمد کی ذمہ داری حکومت پر ہے۔

ہم نے ڈرائیور کے قانون کی جو مثال پیش کی اس میں اگر کوئی مغرور ڈرائیور کہے کہ ''میں تو آزاد ہوں،اور میں قوانین کی مخالفت کرنا چاہتا ہوں'' تو جہاں تک خود اس کے نقصان کی بات ہے صرف اس کو نصیحت کی جائے گی او رکہا جائے گا کہ احتیاط سے ڈرائیوری کرو، ورنہ تمہاری جان کے لئے خطرہ ہے، لیکن جہاں دوسرے کی جان کو خطرہ ہو اس کو روکا جاتا ہے اور پولیس اس کا

پیچھا کرتی ہے اور مختلف الکٹرونیک دوربینوں اور آٹومیٹک کیمروں کی مانند مختلف وسائل استعمال کرتی ہے اور مجرم کو سزا دیتی ہے، یہاں کوئی نہیں کہتا کہ پولیس کا پیچھا کرنا انسان کی آزادی کے خلاف ہے ، دنیاکے تمام عقلاء اس کو مانتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کسی دوسرے کے لئے خطرہ پیدا کررہا ہو تواس کے لئے ایک قانون ہونا ضروری ہے جو خلاف ورزی کرنے والے کو روک سکے، کیونکہ یہ آزادی جائز اور قانونی نہیں ہے،اس آزادی کو عقل تسلیم نہیں کرتی۔ کیونکہ اس سے دوسروں کو خطرہ لاحق ہے،اس بات کو تمام عقلاء مانتے ہیں،اور ہمیں کوئی ایسا عقلمند انسان نہیں ملاجو علم وآگہی کے ساتھ یہ کہے کہ انسان اپنی زندگی میں اس قدر آزاد ہے کہ جو چاہے کرے یہاں تک کہ اپنی جان کے علاوہ دوسروں کی جان ومال او رعزت کو بھی نقصان پہنچائے،اس بات کو کوئی بھی قبول نہیں کرتا۔

معلوم ہوا کہ ایسے قوانین کا ہونا ضروری ہے،او رمعاشرہ کو بھی چاہئے کہ ان قوانین کو قبول کرے اور اس سلسلہ میں کوئی اختلاف بھی نہیں پایا جاتااختلاف جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے اس میں ہے،کہ کیا اخلاقی قوانین کافی ہیں یا حکومتی قوانین کا بھی ہونا ضروری ہے ؟اور کیا اس سلسلہ میں عمل درآمد کے لئے کسی خارجی ضمانت یعنی حکومت کی ضرورت ہے،یانہیں صرف اخلاقی نصیحتوں پر اکتفاء کرنا کافی ہے؟

جواب میں، جولوگ کہتے ہیں کہ حکومت ضروری نہیں ہے اخلاقی نصیحتوں کے ذریعہ انسانوں کی تربیت ممکن ہے، حکومت اور حکومتی قانون کی کوئی ضرورت نہیں ہے،! ہم ان کے جواب میں عرض کریں گے کہ یہ کہنا صحیح نہیں ہے، انسانی تاریخ کے تجربوں نے یہ ثابت کردیا ہے کہ کوئی بھی معاشرہ صرف اخلاقی نصیحتوں کے ذریعہ ہدف تک نہیں پہونچ سکتا،قانون پر عمل درآمد کے لئے کوئی بیرونی ضامن یعنی حکومت کا ہونا بھی ضروری ہے۔

الٰہی اور الحادی ثقافت اور ان کے طرز فکر کا اختلاف

اب یہ بات صاف ہوگئی کہ قوانین کی ضرورت میں کوئی اختلاف نہیں ہے، اختلاف یہاں سے شروع ہوتا ہے کہ جو قوانین آزادی کے دائرے محدود کرتے ہیں اور رکھتے ہیں: ''داہنی طرف چلو بائیں طرف نہ چلو یا یہ کہ آہستہ چلو'' تو اس طرح کے قانون کس حد تک انسان کی آزادی کو محدود کرنے کا حق رکھتے ہیں؟ اس چیز کو سب مانتے ہیں کہ اگر ایک انسان کا عمل دوسروں کی جان ومال کو خطرے میں ڈال دے، تو قانون آزادی کا دائرہ محدود کر سکتا ہے مثلاً اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ کسی کے خلاف اسلحہ نکالیں یا کسی کی جان لے لیں، ممکن نہیں ہے کہ قانون کسی کو بلاوجہ کسی دوسرے کو قتل کرنے اور ختم کر دینے کی اجازت دیدے !

اب جبکہ یہ مان لیا کہ قانون ایسی آزادی کو محدود کر سکتا ہے جو دوسروں کے لئے نقصان دہ ہو، تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا قانون بنانے والا انسان کی آزادی کو صرف اس وقت محدود کر سکتا ہے کہ جب وہ دوسرے لوگوں کے مادی مفادات کو ضرر پہونچائے یا قانون بناتے وقت انسان کے معنوی او رروحانی مفادات کو بھی نظر میں رکھا جانا چاہئے؟ اصل اختلاف اسی جگہ ہے۔ ہم تہذیبوں کو دو حصوں میں بانٹ سکتے ہیں : ایک الٰہی تہذیبیں ہیں جن کا سب سے نمایاں نمونہ اسلامی تہذیب ہے جس کو ہم مانتے ہیں لیکن ہمارا یہ اعتقاد ہے کہ الٰہی تہذیب صرف دین اسلام سے مخصوص نہیں ہے بلکہ دوسرے آسمانی ادیان میں بھی یہ الٰہی تہذیب موجود رہی ہے، اگرچہ ان میں تحریفات اور انحرافات پیدا ہوگئے ہیں، اس تہذیب کے مقابلے میں کفر والحاد یا غیر الٰہی تہذیب آج جس کا نمونہ مغربی ممالک ہیں، البتہ خیال رہے کہ اس سے ہماری مراد صرف جغرافیائی مغرب نہیں ہے بلکہ جس تہذیب کو ہم مغربی تہذیب کا نام دیتے ہیں اور جو امریکہ اور یورپ میں رائج ہے، اور جس کی بعض دوسرے ممالک حمایت کرتے ہیں، او ران کی تمام تر کوشش ہے کہ اس تہذیب کو دنیا کے مختلف ممالک میں پھیلادیں، لہٰذا آسانی سے سمجھانے کے لئے ہم نے تہذیبوں کو دو قسموں میں تقسیم کیا ہے:

۱۔ الٰہی تہذیب ۔

۲۔مغرب کی (الحادی)تہذیب ۔

اب ہم یہاں پر ان دونوں تہذیبوں کا اہم فرق بیان کرتے ہیں: مغربی تہذیب کے ارکان ثلاثہ کہا جاسکتا ہے کہ مغربی تہذیب و تمدن تین عناصر سے تشکیل پائی ہے ،یقیناًان کے علاوہ دوسرے عناصر بھی اس میں موجود ہیں لیکن تین عناصر اس تہذیب کے بنیادی ارکان ہیں:

پہلا رکن: ''ہیومنزم'' ہے یعنی انسان کے لئے زندگی میں ہر طرح کی خوشی اور راحت وسکون ہی اصل چیز ہے اس کے علاوہ کچھ ہویا نہ ہو ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے'' ہیومنزم '' خدا پرستی اوردین کے مقابلہ میں ہے، اگرچہ اس کے دوسرے معنی بھی بیان کئے جاتے ہیں جن سے ہماری بحث نہیں ہے اور اس اصطلاح کا اصل مطلب یہ ہے کہ انسان کو صرف اپنی لذتوں کی اور اپنی خوشی وراحت کی فکر کرنی چاہئے ، اور اگر کسی خدایا فرشتہ کا وجود ہے بھی تو اس سے ہمارا کوئی مطلب نہیں ہے. یہ تصور اس نظریہ کے مقابلہ میں ایجاد کیا گیا ہے کہ اس کے پہلےقرون وسطیٰ میںیورپ کے ممالک میں او راس سے بھی پہلے مشرقی ملکوں میں پایا جاتا تھا جس میں انسان کا اصل محور خدا او راس کی معنوی چیزیں ہوا کرتی تھیں۔

اس تصور کے پیش کرنے والے کہتے ہیں کہ وہ قدیم باتیں چھوڑدینا چاہئے ہم قرون وسطیٰ کی پرانی باتوں سے تھک چکے ہیں اورچاہتے ہیں کہ قرن وسطیٰ کے کلیساؤوں کی باتوں کے بدلے اصل انسانیت کی طرف رخ کریں اور انسان اور عالم طبیعت سے ماورا ذات خصوصاً خدا کے بارے میں بحث کرنا چھوڑ دیں؛ البتہ ضروری نہیں کہ ہم ان کا انکار کردیں لیکن ان سے ہمارا کوئی واسطہ نہیں ہے ہمارا اصل محور انسان ہے۔

یہ اصول الٰہی تہذیب کے مقابلہ میں بنائے گئے ہیں،جویہ کہتی ہے کہ ''اصل محوراللہ'' ہے اور ہمارے تمام تفکرات خدائی ہونا چاہئے او رہم اپنی تمام توجہ خدا کی طرف مرکوز رکھیں ، اوراپنی سعادت اورکمال وارتقاء خدا کے قرب میں تلاش کریں، کیونکہ تمام ترسعادتوں،

زیبائیوں، حقیقتوں اور کمالات کا سرچشمہ خدا ہے، پس اللہ اصل محور ومرکز ہے، او راگر ''ایزم'' سے آپ کو لگاؤ ہے تو سمجھ لیجئے یہ نظریہ ''اللہ ایزم'' ہے یعنی انسان کو توجہ کا مرکز قرار دینے کے بجائے خدا کی طرف توجہ ہونا چاہئے یہ وہ پہلا نقطۂ اختلاف و افتراق ہے جو الٰہی اور مغربی تہذیب کے درمیان پایا جاتا ہے، (البتہ ہم پُر زور الفاظ میں عرض کردیں کہ مغرب میں بھی اسثناء موجود ہے اور وہاں بھی کم وبیش معنوی اور الٰہی تصورات پائے جاتے ہیں مگر یہاں ہماری مراد وہاں کی اکثریت کا تصور اور رجحان ہے کہ جس کو آج مغربی تہذیب کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔)

دوسرا رکن: مغربی تمدن کا دوسرا رکن ''سیکولرزم'' ہے چنانچہ اہل مغرب نے انسان کو محور قرار دینے کے بعد اگر دیکھا کہ کوئی شخص دین کی طرف مائل ہونا چاہتا ہے تو ٹھیک ہے بالکل اسی طرح جس طرح کوئی شاعر یا پینٹر بننا چاہتا ہے تو وہ ایک مشغلہ کے طور پر دین و مذہب کو بھی اختیار کرسکتا ہے کسی کو اس سے کوئی مطلب نہیں ہوگا، جس طرح بعض مخصوص فرقے مجسمہ سازی اور مصوری کو پسند کرتے ہیں، بعض لوگ مسلمان یا عیسائی ہونا پسند کرتے ہیں ان کے لئے کوئی ممانعت بھی نہیں ہے، کیونکہ انسان کی خواہش کا ادب و احترام ہونا چاہئے۔

کہتے ہیں کہ اگر کوئی انسان اپنی زندگی کی مشغولیات کے ساتھ کسی دین پر چلنے کا انتخاب کرنا چاہے تو اس کی مثال اس شخص کی طرح ہے جو شاعری، ادبیات یا کسی اور فن و ہنر کا ذوق رکھتا ہے اور ان کے انتخاب کا احترام کیا جاتا ہے؛ لیکن خیال رکھیں کہ دین انسان کی زندگی کے بنیادی مسائل سے کوئی تعلق نہیں رکھتا اور اس کو انسان کی زندگی کے اصل محور میں نہیں تبدیل کیا جا سکتا،جس طرح شاعری یا کوئی اور ہنر خود اپنی جگہ اہم ہے، اسی طرح دین بھی بس اپنی جگہ اہم ہے، فرض کیجئے کچھ لوگ آرٹسٹ ہیں اور انھوں نے ایک آرٹ گیلری سجائی ہے اور اپنے آرٹ کی نمائش رکھی ہے تو، ہم بھی اس کا احترام کرتے ہیں، لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ مصوری سیاست، اقتصاد، او ربین الاقوامی مسائل کا محور بن جائے؛ یعنی مصوری ایک ثانوی مسئلہ ہے۔

ان کی نظر میں دین بھی اسی طرح کی حیثیت رکھتا ہے اگر کوئی شخص خدا سے راز ونیاز کرنا چاہتا ہے تو عبادتگاہ میں چلا جائے اور جیسے ایک شاعر شعر کہتا ہے وہ بھی خدا سے مناجات کر سکتا ہے، ہم کو اس سے کوئی مطلب نہیں ہے؛ لیکن یہ کہ ایک معاشرے میں کون سے قوانین حکمراں ہوں اقتصادی اور سیاسی نظام کس طرح کا ہو؟ دین کو ان چیزوں سے کوئی مطلب نہیں ہونا چاہئے، دین کی جگہ عبادتگاہ، مسجد کلیسایا بت خانہ ہے، او رانسان کی زندگی کے سنجیدہ مسائل علم سے وابستہ ہیں اور دین کوزندگی کے مسائل میں کوئی مداخلت نہیں کرنا چاہئے۔

یہی نظریہ اوراسی طرز فکر کو کلی طور پر ''سیکولرزم'' کہا جاتا ہے یعنی دین کو زندگی کے مسائل سے دور رکھنا۔اسے دنیا پرستی بھی کہا جاسکتا ہے، دوسرے لفظوں میں دینی وآسمانی اعتبار سے فکر کرنے کے بجائے اس کو دنیوی اعتبار سے فکر کرنا ہے۔ کہتے ہیں اسی طرح کی باتیں مثلاً پیغمبر پر آسمانی ملائکہ کا نازل ہونا یاانسان کا عالم آخرت میں ملکوت سے مل جانا وغیرہ سوچنا چھوڑ دیجئے اور اس دنیا کے بارے میں سوچئے! غذا، لباس مکان، ناچ گانے اور موسیقی کے بارے میں باتیں کیجئے، جن کا دین سے کوئی ربط نہیں ہے،اور جو انسانی زندگی کے لئے اہم اور مفید ہیں کیونکہ زندگی کے بنیادی امور بالخصوص اقتصاد، سیاست اور حقوق علم سے مربوط ہیں، دین کو ان میں کوئی مداخلت نہیں کرنا چاہئے،یہ ہے مغربی تمدن کا دوسرا رکن۔

تیسرا رکن: ''لیبرلزم'' ہے، چونکہ اصل انسان ہے اور انسان مکمل طور پر آزاد ہے لہٰذا ضرورت سے زیادہ، انسانی زندگی میں کوئی قید و شرط نہیں ہونا چاہئے،کوشش کرنا چاہئے کہ پابندیوں کو حتی الامکان کم کیا جائے او رقیودو شرائط کو محدود کیا جائے، صحیح ہے کہ ہر معاشرہ کے اندر کچھ قابل احترام چیزیں ہیں لیکن ان کو سب کچھ قرار نہیں دیا جاسکتا، ہر انسان حسب خواہش کچھ شخصی اور اجتماعی رسم ورواج کی پابندی کرنے میں آزاد ہے، لیکن اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ ایک طریقہ کار کو سماجی معیار قرار دیا جائے اوراس کو سیاست وقانون اور اقتصاد میں مداخلت کی اجازت دیدی جائے، انسان آزاد ہے جس طرح کا معاملہ کرنا چاہے کرے،اور جو چیز بنانا چاہے بنائے کسی بھی مشغلے کا انتخاب کرے فائدہ اٹھائے،او رجہاں تک ممکن ہو اسے اقتصاد میں آزادی حاصل ہو،اور کمائی کے

معاملات میں کسی طرح کی محدودیت نہیں ہونی چاہئے، چاہے سود کاروبار کیوں نہ ہو، جہاں تک ممکن ہو مزدور سے کام لینا چاہئے اور اس کے کام کا وقت معین نہیں کرنا چاہئے، تاکہ سرمایہ داروں کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہونچے۔

مزدور کی مزدوری جتنی کم ہو بہتر ہے، بنیادی طور پر انصاف ومروت اور عدالت جیسی صفت لیبرلزم سے میل نہیں کھاتی، لیبرل انسان کو چاہئے صرف اپنے اقتصادی مفاد کے بارے میں سوچے، البتہ کبھی کبھی ضرورتیں تقاضا کرتی ہیں کہ قانون کی رعایت بھی کی جائے تاکہ بغاوت اورلاقانونیت پیش نہ آئے، لیکن اصل یہ ہے کہ انسان جس طرح بھی اس کا دل چاہے زندگی بسر کرے، لباس کے انتخاب میں بھی انسان آزاد ہے یہاں تک کہ اگر چاہے تو برہنہ رہ سکتا ہے اعتراض کی کوئی بات نہیں ہے، اس پر پابندی لگانے کا کسی کو حق نہیں ہے، یقیناً کبھی کبھی سماجی حالات جب انسان کو مجبور کر دیتے ہیں اور وہ پوری طرح برہنہ باہر نکلنا چاہتا ہے تو لوگ اس کو گالی دیتے ہیں برا بھلا کہتے ہیں اور اس چیز کو برداشت نہیں کرپاتے، یہ ایک الگ بات ہے، ورنہ کوئی بھی قانون انسان پر پابندی لگانے کا حق نہیں رکھتا کہ وہ کیسا لباس پہنے لمبا ہو یا چھوٹا، کسا ہوا ہو یا ڈھیلا، مرد برہنہ ہو یا عورت، لوگوں کو آزاد ہونا چاہئے، اور جہاں تک ممکن ہے، مرد وعورت کے درمیان جنسی رشتہ میں آزاد ہونا چاہئے، البتہ جہاں معاشرہ میں حالات برہم ہو جائیں اور افراتفری کی صورت ہو تھوڑا بہت کنٹرول کیا جاسکتا ہے! آزادی کی حد وانتہا یہاں تک پہنچی ہوئی ہے، لیکن جب تک ضروری نہ ہوجائے عورت مرد آزاد ہیں جو کچھ بھی ان کا دل چاہے کریں، جہاں چاہیں جائیں اورجس طرح کا رابطہ رکھنا چاہیں، رکھیں۔ سیاست اور دوسرے تمام مسائل بھی اسی طرح ہیں، اصل یہ ہے کہ کوئی بھی قید وشرط انسان کو پابند ومحدود نہ کرے مگر یہ کہ ضرورت اس کا تقاضا کرے، یہ ہے لیبرلزم کی اساس، اور جیسا کہ ہم نے عرض کیا یہی مغربی تہذیب کے ارکان ثلاثہ ہیں، ''ہیومنزم، سیکولرزم اور لیبرلزم'' جو قانون سازی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

اسلامی تمدن اور مغربی تمدن کی بنیادوں کا تقابلی جائزہ پہلا مسئلہ ''ہیومنزم (HUMANISM)'' ہے جو خدا کو اصل قرار دینے کے بجائے میں انسان کو اصل سمجھتا ہے اور جو لوگ اس نظریہ کو مانتے ہیں وہ مسلمانوں کی طرح خدا اور اس کی قانون سازی کو نہیں مانتے،

یہ لوگ صرف اپنے اقتصادی فائدے ،آرام و اسائش اور لذتوں کی تکمیل کے چکر میں رہتے ہیں،یقیناً مغربی مکاتب فکر میں بھی کم وزیاد اختلاف پایا جاتا ہے مثلاً یہ کہ لذت ومنفعت وشخصی انفرادی ہے یامعاشرتی اور اجتماعی؟لیکن یہ تمام مکاتب ایک اصل پر متفق ہیں اور وہ یہ ہے کہ حتی الامکان پابندیوں اور شرطوں میں کمی آنا چاہئے.اس الحادی نظریہ کے مقابلہ میں الٰہی مکتب فکر اور الٰہی تمدن ہے ،جس کا کہنا ہے کہ انسان اصل نہیں ہے،بلکہ خدا اصل ہے خدا ہی تمام کمالات وزیبائیوں سعادت و خوشبختیوں کا سرچشمہ ہے وہ حق مطلق ہے انسان پر سب سے بڑا حق اسی کا ہے ہم کواس طرح عمل کرنا چاہئے کہ اس سے رابطہ بر قرار رہے، اپنی زندگی میں خدا کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا،ورنہ انسان اپنی انسانیت کھودے گاانسانیت کا جوہر اور انسان کا کمال خداپرستی ہے اور انسان فطری طور پر اللہ کی طرف جھکاؤ رکھتا ہے او راگر ہم اس فطری عشق کو نظر انداز کردیں توگویا انسان کوخود اپنی انسانیت سے محروم کر دیں گے،لہٰذا تمام افکار و نظریات کا اصل محور خدا ہےاور اس کے مد مقابل انسان کو محور بنانا ہے۔

دوسرا مسئلہ ''سیکولرزم'' ہے جس کے مقابلہ میں دین کو اصل قرار دیناہے،ایک مومن انسان کے لئے سب سے زیادہ ضروری او راہم کام دین کا انتخاب ہے اس کواپنے آب ونان کی فکر سے پہلے اپنے انتخاب کردہ دین کی تحقیق کرنی چاہئے کہ یہ دین حق ہے یا باطل،اس کا دین صحیح ہے یا غلط؟اور کیا خدا ئے واحد کا عقیدہ صحیح ہے یا غلط؟ کیا خدا کی یاد بہتر ہے یا خدا کا نہ ہونا؟ ایک خدا کا اعتقاد صحیح ہے یا تین یا کئی خداؤں کا عقیدہ؟ لہٰذا جس روز انسان بالغ و عاقل ہوجاتا ہے اور فرائضو تکلیف کی ذمہ داری اس کی گردن پر آتی ہے اسی دن اس کو یہ طے کرنا پڑے گا کہ وہ خدا،وحی اور قیامت وغیرہ کو قبول کرتا ہے یا نہیں؟ قرآن حق ہے یا باطل؟ شعبہ تعلیم ،پیشہ اور شریک زندگی کے انتخاب سے پہلے اسے دین کا انتخاب کرنا ہوگا ؛کیونکہ دین زندگی کے تمام شعبوں میں دخیل ہے،پس الٰہی تمدن میں دوسرا رکن دینداری ہے جس کے مقابلے میں سیکولرزم ہے دین کو زندگی میں ایک جنبی اور ثانوی حیثیت سے تسلیم کرنا اور یہ کہنا کہ دین کو زندگی کے بنیادی مسائل میں مداخلت نہیں کرنا چاہئے.اور دین کو ایک بنیادی مسئلہ کے عنوان سے پیش نہیں کیا جانا چاہئے جو زندگی کے تمام مسائل کو تحت الشعاع قرار دیدے،

جبکہ اسلام کہتا ہے کہ کوئی بھی ایسا موضوع نہیں ہے جودینی معیارات اور حلال و حرام کے دائرے سے خارج ہو، اور کسی بھی چیز کے حلال یا حرام ہونے کو دین معین کرتا ہے، یہ نظریہ سیکولرزم کا نقطۂ مقابل ہے۔

تیسرا مسئلہ لیبرلزم ہے؛ لبرلزم یعنی آزادی، ہوس رانی اور کسی بھی طرح کی پابندی قبول نہ کرنا، لیبرلزم یعنی دلی خواہشات اصل ہیں، کیونکہ آزادی کے مختلف مطالب بیان کئے جاتے ہیں لیکن اگر ہم ان کو ایک مشترک مفہوم دینا چاہیں تو اس کو ''خود خواہی'' کہہ سکتے ہیں، اس لیبرلزم کے مقابلہ میں حق وعدالت او رانصاف ہے، لیبرلزم کا کہنا ہے کہ اپنی خواہش کے مطابق جو چاہئے کیجئے جبکہ الٰہی تہذیب اور الٰہی طرز فکر کا کہنا ہے کہ حق و انصاف کے دائرے میں کام کرنا چاہئے، اور کوئی بھی ایسا کام نہ کیا جائے جو حق نہ ہو، یا انصاف کے خلاف ہو لیکن ان دونوں کا آپس میں گہرا رابطہ ہے کیونکہ حق اگر کماحقہ معنی بیان کئے جائیں تو اس میں عدالت بھی شامل ہے ''؛ العَدالۃ اعطاء کلّ ذی حقّ حَقّہ'' (عدالت، ہر صاحب حق کو اس کا حق عطا کرنا ہے) پس عدالت کے مفہوم میں حق کا مفہوم پوشیدہ ہے، لیکن صرف اس لئے کہ کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہو ہم نے ان دونوں اصولوں کو ایک ساتھ ذکر کیا ہے۔

معلوم ہواکہ لیبرلزم خود خواہی کو اصل قرار دیتا ہے ،اور اس کے مقابلہ میں دین حق و انصاف کا طرفدار ہے، دوسرے الفاظ میں یوں عرض کیا جائے کہ واقعاً حق وباطل دونوں پائے جاتے ہیں ایسا نہیں ہے کہ جو بھی چاہیں مان لیں بلکہ ہمیں چاہئے کہ ہم تحقیق کریں حق کیا ہے اور باطل کیا ہے؟ انصاف کیا ہے او ر ظلم کیاہے؟ اگر میں کسی دوسرے پر ظلم کو اچھا سمجھتا ہوں تب بھی مجھے چاہئے کہ میں کسی پر ظلم نہ کروں: لیبرلزم کا تقاضا ہے کہ ہم حق وانصاف کی رعایت صرف اسی حد تک ضروری سمجھتے ہیں جب اس کی مخالفت سے معاشرے میں بحرانپیدا ہوجائے ورنہ، ہر کوئی اپنے فائدہ کی فکر میں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مروّت اورانصاف وہ مفاہیم ہیں جن کا انسان نے اپنی کمزوری کی وجہ سے سہارالیا ہے، اگر آپ میں طاقت وقدرت ہے تو پھر جو چاہیں انجام دیں، مگر یہ کہ آپ کو احساس ہوجائے کہ اس آزادی سے معاشرہ میں بحران پیدا ہوسکتا ہے اورچونکہ بحران کی زد میں آپ خود بھی آسکتے ہیں اس لئے اس کام پر پابندی لگائی جا رہی ہے، معلوم ہوا اسلام کی الٰہی تہذیب میں تیسرا بنیادی اصول حق وانصاف ہے۔

جس کے مقابلے میں مغربی تہذیب لیبرلزم (خود خواہی) پر یقین رکھتی ہے مغربی تمدن میں ان تین ارکان کے علاوہ دوسری چیزیں بھی ہیں جو یاتو عمومیت نہیں رکھتیں یا انہیں اصل نہیں قرار دیا جا سکتا،جن میں ''اخلاق گرائی ETHIEAL) '' (OSITIVISMسب سے اہم ہے یعنی اخلاقی اقدار انسان کی خواہشات کے تابع ہیں خود کوئی حقیقت نہیں رکھتے، مثلاً آج کسی چیز کو پسند کیا اچھی تھی،اس کے حق میں ووٹ دیدیا تو باارزش ہوگئی، لیکن اگر کل اس کو ناپسند کردیا اور چھوڑ دیا تو بے ارزش ہوگئی ۔

ہم کئی بار عرض کر چکے ہیں کہ ہمارے معاشرے کے لوگ چونکہ ان کا دل صاف ہے، نہیں جانتے کہ مغربی تہذیب کس قدر شرمناک اور پلید ہے، مثال کے طور پر جس معاشرے میں کچھ عرصہ قبل لواط اور ہم جنسی کا سب سے گندے کاموں میں شمار ہوتا تھا آج اس کا شمار اقدار میں ہورہا ہے، اس کے جواز میں دلچسپ فلسفے او ر اشعار ڈھالے گئے ہیں اور باقاعدہ قانونی اجازت سے کلب بنائے جا رہے ہیں اور ملک کے بڑے بڑے ذمہ دار افراد، منسٹر اور عوامی نمائندے ان کلبوں کے ممبر ہیں !!

اس کی حمایت میں جو مظاہرے ہوتے ہیں ان میں شرکاء کی تعداد عام مظاہروں سے کہیں زیادہ ہوتی ہے، کیوں؟ اس لئے کہ لوگوں کا ذوق بدل چکا ہے ،اور لوگ مخالف جنس کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے بجائے ہم جنسی کی زندگی ترجیح دیتے ہیں !! مرد سے مرد اور عورت سے عورت کی شادی قانونی طور پر سرکاری دفتروں میں درج کرائی جاتی ہیں!!

اس طرز فکر کو ''اخلاقی مثبت گرائی (POSITIVISM) '' کا نام دیا جاتا ہے کہ واقعاً جس میں اخلاقی اقدار کو عقلی حقیقت سے عاری جانتے ہیں اور کہتے ہیں یہ اقدار اور صرف لوگوں کی مرضی، خواہشات اور ذوق ونظریات کی تابع ہیں آج جس چیز کو لوگ اچھا کہیں وہ اچھی ہو جاتی ہے اور اگر اسی چیز کو کل برا کہنے لگیں تو بری ہو جاتی ہے، لوگوں کی خواہش سے ماوراء کوئی ایسی حقیقت جس کو عظمتکا معیار بنایا جائے نہیں پائی جاتی؛ یہ ایک طرز فکر ہے اسی طرح کی اور بھی باتیں ہیں جن کی تفصیل میں جانا ہم مناسب نہیں سمجھتے، بہر حال جیسا کہ ہم نے عرض کیا مغربی تمدن کے تین اہم رکن ہیں: ۱۔ ہیومنزم، ۲۔ سیکولرزم، ۳۔ لیبرلزم،

اور یہ سب قانون سازی میں موثر ہیں.آزادی کا دائرہ معین کرنے میں اسلام اور مغربی تمدن میں فرق جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ دنیا کے تمام عقلاء، مطلق آزادی کے مخالف ہیں، ہم کو کوئی عاقل ایسا نہیں ملا جو یہ کہے کہ ہر کوئی اس قدر آزاد ہے کہ جہاں بھی جو کام چاہے انجام دے سکتا ہے، لہٰذا جب یہ طے ہوگیا کہ آزادی مطلق اور لامحدود نہیں ہے، تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آزادی کی حد کہاں تک ہے؟ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ آزادی کی حد قانون معین کرتا ہے، اب یہاں سوال اٹھتا ہے کہ قانون کس حد تک آزادی کو محدود کرسکتا ہے؟

ہم نے گذشتہ تقریروں میں بیان کیا تھاکہ بعض لوگوں کا کہنا ہے کچھ اس طرح کی آزادیاں ہیں جن کو کوئی بھی قانون محدود نہیں کرسکتا کیونکہ وہ نہ صرف قانون سے بلکہ دین سے بھی مافوق ہیں، چنانچہ ہم نے گذشتہ تقریروں میں یہ بھی وضاحت کے ساتھ عرض کیا ہے کہ قانون کا اصل کام وہی آزادی کومحدود کرنا ہے اور قانون بنانے والے کوایک حد تک آزادی محدود کرنے کا حق ہے،اور بنیادی طور پرقانون کے معنی بھی یہی ہیں، لیکن بحث اس میں ہے کہ قانون کہاں تک جا سکتا ہے اورآزادی کو کس حد تک محدود کرسکتا ہے؟اس کا جوابات الٰہی تہذیب اور مغربی تمدن کے لحاظ سے، الگ الگ دئے جاتے ہیں: مغربی تمدن میں جہاں انسان کے مادی مفادات کوخطرہ درپیش ہوآزادی کا دائرہ تنگ ہوجاتاہے اگر انسان کی زندگی میں اس کی جان ومال کو خطرہ لاحق ہوتو قانون آگے بڑھ کر اس کی روک تھام کرتا ہے۔

اس بناپر ،اگر قانون کہتا ہے کہ حفظان صحت کا خیال رکھنا ضروری ہے لہٰذا پینے کے پانی کو زہریلا نہیں کرنا چاہئے،کیونکہ اس سے لوگوں کی جان کے لئے خطرہ ہے، تواس طرح کی آزادیوں پر پابندی سب کو قبول ہے ،ایسی آزادیوں پر پابندی ہونا ہی چاہئے تاکہ لوگوں کی سلامتی محفوظ رہے بلاشبہ ،اس قانون کو سب مانتے ہیں، سب اس پر متفق ہیں، لیکن اگر کسی کام سے لوگوں کی پاکیزگی، ابدی سعادت اور معنوی اقدار کو خطرہ ہواور انسان کی روح آلودہ ہو رہی ہو توقانون کواس کی ممانعت کرنا چاہئے یا نہیں؟

اس سلسلے میں الٰہی تہذیب او رمغربیتمدن میں اختلاف پیدا ہوجاتا ہے:الٰہی نظریہ کے تحت انسان دائمی کمال وارتقاء کی طرف بڑھ رہا ہے او رقانون کو اس الٰہی کمال کاراستہ ہموار کرنا،او راس راستہ میں حائل رکاوٹیں بر طرف کرنا چاہئے،یہاں قانون سے ہماری مراد وہ آئینی اور حکومتی قانون ہیں جن کے نفاذکی ذمہ داری حکومت پر ہوتی ہے انسان کی شخصی زندگی سے مربوط (اخلاقی مسائل) سے ہماری بحث نہیں ہے، جہاں تک یہ سوال ہے کہ کیا قانون کو انسان کے معنوی فوائد کو بھی مد نظر رکھنا ہے؟اور وہ چیزیں جو انسان کی ابدی حیات کے لئے خطرہ ہوں ان کی بھی روک تھام کرنا چاہئے، اس کے جواب میں الٰہی تہذیب کہتی ہے کہ ہاں یہ کام بھی ضروری ہیں، لیکن مغرب کا الحادی تمدن اس سے منع کرتا ہے ان کی نظر میں یہ صحیح نہیں ہے ہماری شروع سے اب تک کی بحث، اسی بات کو واضح کرنے کے لئے تھی کہ اگر ہم مسلمان ہیں اور خدا،قرآن،اسلام، رسولاًسلام حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، حضرت علیؑ اور امام زمانہ(عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف) کو مانتے ہیں تو ہمارے لئے ضروری ہے کہ معنوی ابدی اور اخروی اقدار کی قدرو اہمت کو بھی پہچانیں اور مانیں ۔

ہماری قانون سازکونسل (پارلیمنٹ)نمائندے کوالٰہی اور معنوی مصلحتوں کا لحاظ کرنا چاہئے اور اسلامی حکومت کوجو چیز انسانی معنویات کے لئے خطرناک ہیں اس کی روک تھام کرنی چاہئے ورنہ ہم بھی مغربی تمدن کے پیرو ہوجائیں گے، ایسا نہیں ہے کہ قانون فقط صحت وسلامتی مربوط مادی آسائش کو فراہم کرنے یااور جو چیزیں معاشرے میں بد امنی یا بحران کا سبب بن رہی ہیں ان سے روکنے،اورایسے کاموں سے منع کرنے کے لئے کہ جن سے معاشرے کی اقصادی امنیت کو خطرہ لاحقہے،بلکہ قانون کے لئے ضروری ہے کہ معنویات کوبھی پیش نظر رکھے، ہم کو ان دو میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہے : یا اسلامی قانون قبول کریں یا مغربی قانون،البتہ ان دونوں انتخابات میں باہم آمیزش اور ملاوٹ موجود ہے جس کی طرف ہم نے گذشتہ بحثوں میں ذکر کیا ہے ۔

کچھ لوگ ہیں جو کہتے ہیں: ''یُؤخَذُ مِن ہٰذا ضِغثٌ وَمِن ہٰذا ضِغثٌ فَیُمزَجانِ[1]''تھوڑا یہاں سے لیا اور تھوڑا وہاں سے تاکہ آپس میں ملاکر ایک کردیں۔

کچھ الٰہی تہذیب سے اور کچھ مغربی تمدن سے اخذ کرلیں اور ایک غیر متوازن و ناموزوں مجموعہ تیار کر دیں، اسلام اس طریقہ کو قطعاً پسند نہیں کرتا، قرآن کریم اس چیز کی مذمت کرتے ہوئے فرماتا ہے: (إن الذین یکفرون باللہ ورسلہ ویریدون أن یفرقوا بین اللہ ورسلہ ویقولون نؤمن ببعض ونکفر ببعض ویریدون أن یتخذوا بین ذلک سبیلاً أولٰئک ہم الکافرون حقا[2]۔) ''بے شک جو لوگ خدا اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور خدا اور اس کے رسولوں میں امتیاز کے قائل ہیں او رکہتے ہیں کہ ہم بعض (پیغمبروں) پر ایمان لائے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان دونوں کے درمیان سے ایک علیحدہ راستہ اپنے لئے نکالیں، حقیقت میں وہ لوگ کافر ہیں''

آج بھی بعض لوگ یہی چاہتے ہیں کہ کچھ چیزیں اسلام سے لیں اور کچھ چیزیں مغربی تمدن سے اخذ کرلیں اور ان کو ملاکرایک جدید اسلام دنیا والوں کے سامنے پیش کریں ،یہ لوگ اسلام پر یقین نہیں رکھتے، اگر اسلام پر یقین ہوتا تو ان کو معلوم ہوتا کہ اسلام اس مجموعہ کا نام ہے کہ جس کے (دینی) ضروریات کو قبول کرنا ضروری ہے میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں اسلام کو قبول کرتا ہوں لیکن اس کی بعض ضروریات کو نہیں مانتا، لہٰذا مسئلہ قانون سازی اور آزادی پر پابندی لگانے کے درمیان ہے، ہمارے پاس دو راستوں کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں ہے، ان میں سے کسی ایک کا انتخاب ضروری ہے: یا تو آزادی کا دائرہ محدود کرنے کا معیار صرف مادی اوردنیوی خطرات کوقراردیں یا مادی اور معنوی دونوں طرح کے خطرات کی صورت میں پابندی لگانے کو معیار قرار دیں،اگر پہلے راستہ کو اپنایا توگویا ہم نے مغرب کی الحادی تہذیب کو قبول کرلیا ہے،اوراگر دوسرے راستہ کو اپنا یا توگویا الٰہی .اسلامی تہذیب کو قبول کیاہے، اب جس حد تک بھی آپ پہلے محورسے نزدیک ہوتے جائیں گے، مغربی تمدن کے قریب ہوتے چلے جائیں گے،او رجس قدر

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۵۰۔
[2] سورۂ نساء آیت ۱۵۰، ۱۵۱۔

دوسرے محور سے نزدیک ہوں گے گویا اسلام سے نزدیک ہوتے جائیں گے، بہر حال ان دونوں تہذیبوں میں کامل موافقت ممکن نہیں ہے، کیونکہ جہاں تک مادی فائدوں کی بات ہے مغربی تمدن اور اسلامی تمدن دونوں کہتے ہیں کہ ان کی تکمیل کی جائے مثلاً دونوں کہتے ہیں کہ حفظان صحت کا خیال رکھا جائے، لیکن جہاں معنوی مسائل کی بات آتی ہے اختلاف پیدا ہوجاتا ہے۔

جس وقت صرف مادی فائدے پیش نظر ہوں انسانی آزادی کے سامنے پابندیوں کا ایک چھوٹا سا دائرہ کھینچنا پڑتا ہے لیکن اگر اس کے ساتھ معنویات کو بھی شامل کردیا جائے تو اس کے مقابلہ میں پہلے دائرے کے ساتھ ایک اور دائرے کا اضافہ ہوجاتا ہے اور دو دائرے کھینچنے پڑتے ہیں جو ایک دوسرے میں مدغم ہوتے ہیں، نتیجہ میں پابندیوں کا دائرہ وسیع تر اور آزادیوں کا دائرہ محدودتر ہوجاتاہے، جب ہم کہتے ہیں کہ مذہبی آزادی مغربی آزادی کی طرح نہیں ہے تو اسی معنی میں کہتے ہیں یعنی صرف اس لئے کہ مادی مصلحتوں کی رعایت ضروری ہے ہم مغرب کی طرح بے لگام نہیں ہوسکتے، بلکہ انسانی روح سے متعلق ان اقدار کی بھی رعایت ضروری ہے، کہ جن سے ہماری انسانیت اور ابدی حیات کا تعلق ہے اور آخرت سنورتی ہے، لیکن مغربی تہذیب کہتی ہے کہ ان تمام اقدار کا اجتماعی قوانین سے تعلق نہیں ہے، حکومتی قوانین صرف معاشرہ کے مادی مسائل میں جاری ہوتے ہیں، باقی مسائل اخلاق سے مربوط ہیں جن کا حکومت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

جس وقت یہ کہا جاتا ہے کہ اسلامی مقدسات خطرہ میں ہے حکومت کے بعض ذمہ دار افراد کہتے ہیں کہ اس کا مجھ سے کیا ربط ہے! میرا کام توصرف لوگوں کی مادی زندگی کی آسائشوں سے مربوط ہے، دین کے مسائل علماء سے متعلق ہیں، ان کی حفاظت کرنا ملاؤں کی ذمہ داری ہے، حکومت کوان سے کوئی مطلب نہیں ہے، لیکن اگر حکومت ،حکومت اسلامی ہو تو کہتی ہے پہلے دین ہے پھر دنیا ہے۔

اس بناپر ،ان دونوں تہذیبوں کے معاملے میں ہم کو بہت غور وخوض سے کام لینا چاہئے توجہ رکھنا چاہئے کہ جس وقت بھی ہمارے قدم اسلامی اقدار کے مقابلہ میں لڑکھڑاتے نظر آئیں اور اپنے اندر کاہلی کا احساس پیدا ہونے لگے ، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم

کافرانہ تہذیب سے نزدیک ہورہے ہیں، اور اسلام کی حقیقت کو بھولتے جارہے ہیں، ہمارا یہ انقلاب صرف مادی فوائد کو پورا کرنے کے لئے نہیں ہے ، بلکہ ہم نے یہ انقلاب بنیادی طور پراسلام کی حیات نو کے لئیانجام دیا ہے، اس قدرلوگ شہید ہوئے ، خون دیا عزیزوں کی قربانی پیش کی، صرف اسی وجہ سے کہ اسلام باقی رہے، نہ کہ صرف اس وجہ سے کہ مادی آسائش یا اقصادی اورسیاسی فروغ و ترقی میں اضافہ ہو، ان شہیدوں نے اپنی جانیں قربان کیں تاکہ اسلام اور اسلامی تہذیب پھیلے ، اسلامی حکومت کو سب سے پہلے اسلامی مسائل اور الٰہی اقدار ومعیارات پر توجہ دینا ضروری ہے،او راگر کوئی بعض جملوں کی غلط تفسیر کرے مطالب کو توڑ مروڑ کے پیش کرے او رمختلف مفادات کی خاطر حقائق کی تحریف کرے تو ہمیں اس سے کوئی مطلب نہیں ، ہم تو مسلمانوں کو متوجہ کرنا چاہتے ہیں کہ دین کی حد کہاں تک ہے؟ اسلامی اقدار کتنی اہمیت رکھتے ہیں اور ان کی محافظت کے لئے کس قدر جاں فشانی کی ضرورت ہے؟ ہماری عوام ان سے واقف ہے، لیکن ایک عالم دین کی یہ ذمہ داری ہے کہ جس وقت معاشرہ میں کسی معنوی بیماری کے پھیلنے کا خطرہ محسوس کرے تو لوگوں کواس کی طرف متوجہ کرے اور خطرے سے خبر دار کرے ۔

سترہویں تقریر

حکومت اور قانون سازی کے ساتھ تشریعی ربوبیت کا تعلق

گذشتہ مطالب پر ایک نظر اسلام کے سیاسی نظریہ کی وضاحت کرتے ہوئے ہم نے گذشتہ تقریروں میں عرض کیا تھا کہ ایک حکومت کا اسلامی ہونا اس بات پر موقوف ہے کہ اس حکومت کے ارکان، اسلامی مقاصد اور اس کے معین کردہ راستہ پر قدم بڑھائیں، لہٰذا وہ حکومت، اسلامی ہوگی کہ جس کی قانون ساز اسمبلی (پارلیمنٹ)، عدلیہ اور حکومتی کابینہ اسلامی راہ پر چلیں، یا یوں کہا جائے کہ ایک الٰہی اور اسلامی رنگ پیدا کرلیں، اور اجمالی طور پر یہ بھی عرض کر دیا گیا کہ ان قوتوں کے الٰہی اور اسلامی رنگ اختیار کر لینے کا مطلب کیا ہے۔

اسی طرح یہ بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ یہ قوانین ایک تو، اسلامی مقاصد کے حامل ہوں اور یہ قوانین کہ جسے براہ راست خدا نے بھیجے ہیں یا پیغمبر اور ان کے معصوم جانشینوں کے ذریعے ہم تک پہونچے ہیں ان میں اختلاف نہ ہو، دوسرے یہ کہ قانون کا نفاذ کرنے والے بالعموم کہ جس میں عدلیہ بھی شامل ہے، اللہ سے نسبت رکھتے ہوں یعنی یا تو خدا براہ راست ان کو معین کرے، جیسے پیغمبر اکرمؐ یا خدا کی طرف سے بالواسطہ نام بنام منصوب ہوں، جیسے پیغمبرؐ کے ذریعہ ائمہ معصومین علیہم السلام منصوب ہیں، یا عمومی حکم کے تحت منصوب ہوں، اور یہ وہی ولایت فقیہ کا نظریہ ہے کہ جس کے بارے میں تا حد امکان بحث ہو چکی ہے۔

مسلمہ اصول طے کرنے کی ضرورت اس دعوے کو ثابت کرنے کیلئے کہ ایک صحیح و سالم اجتماعی نظام کو حکومت کی مذکورہ شکل و صورت میں ہونا چاہئے، ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے کہ اگر اس مسئلہ کو ان لوگوں کے سامنے بیان کرنا، جو ہماری فقہی و اعتقادی بنیادوں پر عقیدہ رکھتے ہیں، تو ہم شرعی دلیلوں سے جن میں سر فہرست قرآنی آیات ہیںیہ بات ثابت کر سکتے ہیں، لیکن وہ حضرات جو دین اسلام، یا اس کے بنیادی اصولوں کی حقانیت کو جو اس نظریہ کی اساس ہیں، قبول نہیں کرتے، اگر ان افراد کے سامنے اس نظریہ

کو ثابت کرنا ہے تو ظاہر ہے پہلے ان مسلمہ اصولوں کے بارے میں بحث کرنی ہوگی جو اب تک ہم نے ثابت کئے ہیں مسلمہ اصولوں سے مراد وہ طے شدہ مسائل ہیں جو بدیہی اور یقینی مسلمات عقلیہ سے شروع ہوتے ہیں اور اس نظریہ پر ختم ہوتے ہیں جو لوگ علم ریاضی کے فارمولوں یا ہندسوں کے ذریعہ قضیہ ثابت کرنے کے طریقوں سے واقف ہیں، وہ جانتے ہیں کہ ہندسہ کے ذریعہ کی جانے والی بحث اس طرح شروع ہوتی ہیں کہ پہلے ایک قضیہ یا فارمولا کو اصل موضوع کے عنوان سے بیان کیا جاتا ہے، اور اس کی بنیاد پر دوسرے قضیہ کو ثابت کیا جاتا ہے پھر قضیۂ دوم کی بنیاد پر قضیہ سوم کا اثبات کرتے ہیں اور اسی طرح چوتھے اور پانچویں مرحلہ سے گزرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں اب اگر بیسویں قضیے کو ثابت کرنا چاہیں تو اس کیلئے انیسویں قضیے کا پہلے سے ثابت ہونا ضروری ہے اسی طرح انیسویں کو ثابت کرنے کے لئے اس سے پہلے والا قضیہ کا ثابت ہونا ضروری ہے۔

ہم کو جب اپنے مخاطب کے سامنے ایک قضیہ ثابت کرنا ہو تو دیکھنا ہوگا کہ ہمارا مخاطب اس سے پہلے کے قضیوں کو کہاں تک سمجھ سکا ہے، تبھی ان کو بحث میں مسلمہ اصول قرار دیکر آئندہ کی بحث کا مبناء اور بنیاد بنا سکتے ہیں وگرنہ اگر ہر قضیہ کو ثابت کرنے کیلئے ابتداء سے تمام قضیوں کی تکرار کرنا پڑے، مثال کے طورپر یہ مسلمہ اصول کہ خط مستقیم دو نقطوں کے درمیان کمترین فاصلہ یا دو خط متوازی ایک دوسرے کے مقابل ان دو لکیروں کو کہتے ہیں کہ جن کو چاہئے جتنا بڑھائیں وہ ایک دوسرے کو قطع نہیں کرسکتیں اگر ہر قضیے میں بیان کریں، اور دہراتے رہیں تو کوئی نئے مسائل کو بیان کرنے اور مزید تحقیقات کرنے کی نوبت نہیںآئے گی، بلکہ ہمیشہ گذشتہ مطلب ہی کی تکرار ہوتی رہے گی۔

معلوم ہوا اگر کسی عقلی مسئلہ کو ثابت کرنا چاہتے ہیں تو پہلے اس بنیادی اصول اور مسلمہ قاعدے کی طرف اشارہ ضروری ہے، کہ جس کا پہلے کسی اور علم یا اور بحثوں میں اثبات کیا جا چکا ہے، مثال کے طور پر اگر یہ کہیں کہ قانون کو الٰہی قانون ہونا چاہیے تو پہلے اصل وجود خدا کا اثبات ضروری ہے، لہٰذا اگر کوئی کہے کہ میں خدا ہی کو نہیں مانتا تو پھر اس کے ساتھ کلامی اور فلسفی بحث کریں گے تا کہ اس پر پہلے خط کا اصل وجود ثابت ہوجائے کہ ہاں خدا ہے اور وہ خدا ایک ہے اور اس کو ہمارا رب ہونے کا حق ہے، تا کہ

حکومت کی بحث میں حق حکومت کو ذات خدا کے لئے ثابت کیا جا سکے لہٰذا اگر شروع سے تمام ابتدائی اصولوں پر بحث کریں تو یہ باتیں دہرائی ہوں گی اور لوگ تھک جائیں گے اس لئے ہم مجبور ہیں کہ اپنی بحث سے مربوط وہ قریبی ترین اصول بیان کر کے آگے بڑھ جائیں کہ جس کو مد مقابل بھی قبول کرتا ہے اور دور کی بحثوں کو اس کے علم پر چھوڑ دیں ،البتہ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر ہم ہندسہ کے دسویں قضیہ سے بحث شروع کررہے ہیں تو اس سے پہلے کے قضیوں کا اثبات نہیں کر سکتے بلکہ اس لئے کہ ان کو پہلے ثابت کر چکے ہیں ،اور اب جن اصولوں کو پہلے ثابت کر چکے ہیں ان سے نتیجہ حاصل کرنا چاہتے ہیں ،یہاں اس نکتہ کو بیان کرنے کی وجہ یہ پیش آئی کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ آپ خود اپنے (بنیادی اصولوں)پر گفتگو کرتے ہیں جبکہ دوسرے ان کو قبول نہیں کرتے،لہٰذا میں یہ عرض کردوں کہ ہمارے مخاطب کو یقینی طور پر کچھ اصولوں اور قضیوں میں ہمارے ساتھ موافق ہونا چاہئے تاکہ ان کی بنیاد پر دوسرے قضیوں کو ثابت کیا جا سکے اگروہ بنیادی اصول و مقدمات کو نہیں مانتے تو ہم پھر سے کسی اور علم کی طرف رجوع کریں اور وہاں ان بنیادی باتوں کو ثابت کریں۔

یہاں اس چیز کی طرف اشارہ ضروری ہے کہ بعض نے اعتراض کیا ہے کہ آپ نے مغربی تہذیب کو ''ہیو منزم اور لبرلزم'' کی بنیاد پر استوار کفر و الحاد کی تہذیب بتایا ہے جبکہ مغربی ممالک میں بھی بہت سے افراد خدا کو مانتے ہیں،یہ صحیح ہے اور ہم نے بھی بار بار عرض کیا ہے کہ جو لوگ مغربی تہذیب کی بات کرتے ہیں مغربی تہذیب سے ان کی مراد صرف جغرافیائی مغرب نہیں ہے، ہم نے ہرگز یہ نہیں کہا ہے کہ وہ سبھی لوگ جو مغربی ممالک میں زندگی بسر کرتے ہیں اس طرح کا نظریہ رکھتے ہیں کیونکہ وہاں بھی بہت سے لوگ دیندار ہیں، خدا کو مانتے ہیں اور اخلاقی قوانین کی پابندی کرتے ہیں اور ہم ان کا احترام کرتے ہیں لیکن عملی طور پر مغربی حلقوں میں جو چیز رائج ہے وہ ان ہی اصول پر مبنی ہے، اگرچہ بعض کو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کس منطق کے تحت گفتگو کر رہے ہیں،مگر جو حضرات اہل بحث و استدلال ہیں سمجھ جاتے ہیں کہ اس طرز تفکر کی بنیاد کیا ہے؟اسی طرح ہم نے اپنی گزشتہ تقاریر میں التقاط اور دین میں آمیزش کے بارے میں عرض کیا تھا کہ بعض لوگ مختلف ادیان سے کچھ کچھ باتیں لے کر ایک جگہ جمع کر لیتے ہیں لیکن نہ تو ان

باتوں کی استدلالی بنیادوں کو ثابت کرتے ہیں نہ ہی یہ دیکھنے کی زحمت گوارا کرتے کہ یہ باتیں آپس میں سازگار اور ہم آہنگ ہیں بھی یانہیں، بہرحال، مجموعی طور پر ہم یہ عرض کردینا چاہتے ہیں کہ اگر ہمارے بیان کردہ تمام مطالب کو آپ ملاحظہ فرمائیں تو اس طرح کی کوئی قابل اعتراض بات ہمارے یہاں نہیں ملے گی۔

بہر حال ان باتوں کو ثابت کرنے کیلئے کہ ہمارا یہ سیاسی نظام جو اسلام نے معین کیاہے سب سے زیادہ عاقلانہ اور سب سے زیادہ حکیمانہ نظام ہے،ہم اس کی دلیلیں پیش کرتے ہیں،اس منزل میں ظاہر ہے، خدا کے اصل وجود اور اس کے صفات کو ہم ایک مسلمہ امر قرار دیتے ہوئے اسی بنیاد پر اس مسئلہ کو بھی اثبات کریں گے،اب اگر چہ کچھ لوگ خدا کے وجود کو قبول نہیں کرتے یا اس کے بعض صفات کو نہیں مانتے تو ان کو چاہئے کہ علم کلام کا مطالعہ کریں کیونکہ اس وقت ہماری بحث علم کلام سے نہیں بلکہ سیاسی فلسفہ سے تعلق رکھتی ہے لہذا یہاں علم کلام کی بحث نہیں چھیڑی جا سکتی۔

خدا کی حکمرانی اور تشریعی ربوبیت

ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا تھا کہ اسلامی حکومت کے سیاسی نظام کی اصل بنیاد خداوند عالم کی حکمرانی پر استوار ہے،اور در حقیقت اس نظریہ کا سرچشمہ خدا کی تشریعی ربوبیت ہے، وضاحت کے طورپر اس بات کی یاددہانی بھی ضروری ہے کہ نہ صرف اسلام نے بلکہ تمام آسمانی ادیان نے نعرۂ توحید بلند کیاہے،کلمہ ''لا الہ الااللہ''، جو ہمارے نبی اکرمؐ کا اصل نعرہ رہاہے،دوسرے یہی تمام آسمانی ادیان کا بھی نعرہ رہاہے، اگرچہ اس میں تھوڑی بہت تحریفات ہوتی رہی ہیں، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ''لا الہ الااللہ'' کا کیا مطلب ہے؟بعض لوگوں کا خیال ہے کہ توحید کے معنی یہ ہیں کہ انسان یہ عقیدہ رکھے کہ اس جہان کا خالق اور پیدا کرنے والا ایک ہے،لیکن کیا توحید کے معنی صرف یہی ہیں؟کہ ''لا خالق الا اللہ'' (خدا کے علاوہ کوئی خالق نہیں ہے) کیا اسلام کی نظر میں توحید کا معیار صرف خلق اور پیدا کرنے والے کی وحدانیت کا اعتقاد رکھنا ہے؟ چند سال پہلے ''اسلام کے اعتقادی اور اقداری نظام میں مفہوم توحید کے'' عنوان سے سلسلۂ تقاریر میں ہم نے اسی جگہ پر عرض کیا تھاکہ توحید کا حدنصاب یہ نہیں ہے کہ انسان صرف دنیا

خلق کرنے والے کی وحدت و یگانگت کا قائل ہو جائے، اسلام کی منظور نظر توحید اس معنی میں محدود نہیں ہے، بلکہ مکہ کے مشرکین بھی پیدا کرنے والے کے ایک ہونے کا عقیدہ رکھتے تھے ۔جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے: (وَلَئِن سَأَلْتَهُم مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُولُنَّ اللّٰهُ [1]) ''اور جب بھی آپ ان سے پوچھیں گے کہ ان تمام آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا؟ وہ لوگ یہی کہیں گے کہ اللہ نے'' ...

اسی طرح شیطان باوجودیکہ خدا کے وجود کا اعتقاد رکھتا تھا اور خالقیت میں توحید کو قبول کرتا تھا خدا نے پھر بھی اس کو کافروں میں شمار کیا ہے [2] چنانچہ قرآن مجید نے ابلیس کی خدا سے جو گفتگو نقل کی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ خالق اور پروردگار ہونے میں بھی اللہ کی وحدانیت کا معتقد تھا اور معاد و قیامت پر بھی اعتقاد رکھتا تھا: (قَالَ رَبِّ فَأَنظِرْنِي إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ.قَالَ فَإِنَّكَ مِنَ الْمُنظَرِينَ.إِلَىٰ يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُومِ.قَالَ رَبِّ بِمَا أَغْوَيْتَنِي لَأُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَلَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ [3]) ''شیطان نے کہا کہ اے میرے پروردگارا تو مجھے روز قیامت تک کی مہلت دیدے اور زندہ رکھ خدا نے فرمایا: (قیامت تک کے لئے نہیں بلکہ) وقت مقررہ تک کی تجھے مہلت دی جاتی ہے، شیطان نے کہا :اے میرے پروردگار! چونکہ تونے مجھے راستہ سے دور کردیا ہے، میں بھی ان کے لئے (دنیوی نعمتوں کو) خوب عمدہ کرکے دکھاؤں گا اور ان سب کو ضرور بہکاؤں گا ۔''

معلوم ہوا کہ شیطان بھی اللہ کی خالقیت تخلیقی ربوبیت میں توحید کا قائل تھا اور قیامت پر بھی اعتقاد رکھتا تھا اب دیکھنا یہ ہے کہ اس کے کفر کی وجہ کیا تھی؟ شیطان کے کفر کا سرچشمہ جاننے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے اسلام میں توحید کے نصاب کو جان لیا جائے ،کہ اسلامی لحاظ سے ایک انسان کب موحد یعنی اہل توحید کہلاتا ہے؟ اس کے سب سے پہلے درجے کو سمجھ لیا جائے اور وہ پہلا درجہ یہ ہے کہ خدا کے خالق ہونے، تخلیقی اور تشریعی پروردگار ہونے اور پوری کائنات کے معبود ہونے میں ایک اور اکیلا ہونے کا

---

[1] سورہ لقمان آیت ۲۵۔
[2] سورہ بقرہ آیت ۳۴۔
[3] سورہ حجر آیت ۳۶تا ۳۹۔

عقیدہ ہو یعنی انسان خدا کو ہی تنہا خالق مانے اور اسی کو پروردگار،دنیا کا مختار، اور اصل قانون بنانے اور چلانے والا ماننے کے علاوہ،الوہیت اور عبودیت میں بھی توحید کا اعتقاد رکھے اور صرف خدا کو عبادت کا مستحق مانے، عقیدہ توحید کے نصاب سے واقفیت کے بعد معلوم ہوا کہ شیطان کے کفر کا سر چشمہ خدا وند عالم کی تشریعی ربوبیت کا انکار تھا خدا و ند عالم کی تخلیقی ربوبیت کا انکار نہیں تھا۔

اسی طرح خداوند عالم اپنے رسول کو حکم دیتا ہے کہ اہل کتاب سے بحث کرتے وقت ان کو ان عقائد کی طرف دعوت دیں جن میں آپ اور وہ لوگ مشترک ہیں، اور وہ خدا کی وحدانیت اور عبادت میں لاشریک ہونے کا عقیدہ ہے اس کے بعد خداوند عالم نے ایک جملہ ارشاد فرمایا ہے، جس کا مطلب ہے کہ اہل کتاب کو غیر اللہ کی تشریعی ربوبیت کے عقیدہ سے روکنے کا حکم ہے، کہ جس کی وجہ سے وہ کفر کے دائرہ میں پہونچ چکے ہیں : (قُلْ یَا أَہْلَ الْکِتَابِ تَعَالَوْا إِلَیٰ کَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللّٰہَ وَلَا نُشْرِکَ بِہِ شَیْئًا وَلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللّٰہِ[1]۔) ''(اے ہمارے رسول)آپ (اہل کتاب) سے کہہ دیں کہ اے اہل کتاب!آؤ اس بات کو مان لیں جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے کہ خدا کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کریں گے اور کسی کو اس کا شریک نہ بنائیں گے اور ہم میں سے کوئی خدا کے علاوہ کسی کو اپنا پروردگار نہیں بنائے گا ۔ ''

اس آیت کی تفسیر میں جو روایات وارد ہوئی ہیں ان میں بعض کہتی ہیں کہ اہل کتاب اپنے جیسے دوسرے انسانوں کو اپنا خالق نہیں مانتے تھے بلکہ اپنے احبار (روحانی پیشوا اور راہبوں) کو اپنا تشریعی پروردگار مانتے تھے اور ان کے حکم کو خدا کا حکم سمجھتے تھے اورقرآن مجید نے احبار اور راہبوں کی کسی قیدو شرط کے بغیر اطاعت پروردگار قرار دینے سے تعبیر کیا ہے: ''وَلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللّٰہِ ''یعنی اپنے ارباب کی کسی قید و شرط کے بغیر اطاعت نہ کرو کیونکہ یہ ایک طرح کا شرک ہے لیکن یہ شرک نظام تکوینی کے تحت خالقیت و ربوبیت میں شرک نہیں ہے اور نہ ہی الوہیت وعبودیت میں شرک ہے، کیونکہ وہ لوگ

[1] سورہ آل عمران آیت ۶۴۔

احبار او رراہبوں کی عبادت نہیں کرتے تھے بلکہ ان کا شرک تشریعی ربوبیت میں تھا یعنی خدا کے ساتھ دوسروں کو بھی شارع اورقانون ساز مانتے تھے، کہتے تھے کہ خدا کے علاوہ دوسرے افراد، خود ہم جیسے لوگ بھی قانون بنانے کا حق رکھتے ہیں یعنی ایسا نہیں ہے کہ صرف خداوند عالم کا بنایا ہواقانون معتبر ہو، اور وہ جو بھی کہے اس کی اطاعت کرنا ضروری ہو۔ جس طرح شیطان چونکہ خدا کی تشریعی ربوبیت کا منکر تھا،کہہ بیٹھا : ''أنا خَیرٌ مِنہُ'' (میں اس سے بہتر ہوں) مجھ سے نہیں ہو سکتا کہ میں آدم ؑکو سجدہ کروں جبکہ خدا کا حکم تھا: آدم کا سجدہ کرو،شیطان نے کہا میں آدم کو سجدہ نہیں کروں گا ،کیونکہ میں اس سے بہتر ہوں، یعنی شیطان نے خداوندعالم کے اس حکم کو تسلیم نہیں کیایا دوسرے الفاظ میں یوں عرض کیا جائے کہ شیطان حکمرانی کا حق صرف خدا سے مخصوص نہیں سمجھتا تھا، جس کی وجہ سے کافر ہوگیا، ورنہ وہ خدا اور اس کی ربوبیت کا یاقیامت کا منکر نہ تھا، شیطان کے کفر کا سر چشمہ خدا کی مطلق حکمرانی کا انکار تھااسی طرح اسلام نے جس کفرکی نسبت اہل کتاب کی طرف دی ہے اور جس چیزسے روکا ہے اور توحید کی طرف پلٹنے کی دعوت دی ہے وہ حکم تشریعی میں شرک ہے،جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے :(اتَّخَذُوا أَحبَارَھُم وَرُہبَانَہُم أَربَاباً مِن دُونِ اللّٰہِ وَالمَسِیحَ ابنَ مَریَمَ وَمَا أُمِرُوا إِلاَّ لِیَعبُدُوا إِلٰھاً وَاحِداً)[1] ''ان لوگوں نے تو اپنے خدا کو چھوڑ کر اپنے عالموں کو اور اپنے زاہدوں کو اور مریم کے بیٹے مسیح کو اپنا پروردگار بناڈالاہے حالانکہ انھیں سوائے اس کے اور کوئی حکم نہیں دیا گیا کہ خدائے یکتا کی عبادت کریں۔ ''ان لوگوں نے کبھی بھی اپنے احبار او رراہبوں کو سجدہ نہیں کیا ان کے سامنے سر نہیں جھکایا عبادت نہیں کی، لیکن بغیر کسی قید وشرط کے ان کی اندھی اطاعت کو، پروردگار مان لینے کے برابر سمجھا گیا ہے، درحقیقت وہ لوگ قانون سازی کا حق خداوند عالم سے مخصوص نہیں سمجھتے تھے۔

خالص توحید کا مطلب خالص توحید وہ توحید ہے جواِس طرح کے شرک سے خالی ہو، نہ ابلیسی شرک ہواور نہ ہی اہل کتاب والا شرک، اسلام میں توحید ی نصاب کا دائرہ خالقی وحدانیت، معبود کی وحدانیت اوراس کی تکوینی ربوبیت کے ساتھ ساتھ تشریعی ربوبیت میں

---

[1] سورہ توبہ آیت ۳۱۔

بھی ایک اور اکیلے ہونے کے اعتقاد تک پھیلا ہوا ہے، پس توحید کے یہ چار رکن ہیں اگر ان میں کوئی ایک جز بھی ناقص رہ گیا، تو حقیقی توحید کامل نہیں ہوگی، اگر کسی کا یہ عقیدہ ہو کہ خدا کے خالق ہونے کے علاوہ کوئی اور بھی خالق ہے، یا کوئی اور بھی اس تخلیقی نظام کو چلانے میں شریک ہے جو عالم کے انتظام میں خود مختار ہے، یا دنیا پر حکمرانی کا یا عبادت کئے جانے کا حق رکھتا ہے تو وہ اسلامی توحید سے خارج ہے۔

لہٰذا تشریعی ربوبیت میں توحید کا قائل ہونا اسلامی توحید کا ایک رکن ہے اور تشریعی ربوبیت میں توحید کے عقیدہ کے بغیر اسلامی توحید کامل نہیں ہوسکتی، ممکن ہے کوئی شخص ظاہری طور پر کلمہ شہادتین پڑھ لے اور اس پر طہارت کا حکم بھی جاری ہوجائے لیکن یہ ظاہری احکام ہیں جن کی وجہ سے اس کو صرف اس دنیا میں مسلمان شمار کیا جائے گا چنانچہ اگر فقہا کرام اپنے توضیح المسائل میں لکھتے ہیں کہ کوئی شخص کلمۂ شہادتین پڑھ لے تو وہ مسلمان ہے اس پر طہارت کا حکم جاری ہوگا اور اس سے نکاح کرنا صحیح ہے اور اس کا ذبیحہ حلال ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جس نے کلمۂ شہادتین پڑھ لیا ، وہ جنتی ہوگیا اور عذاب جہنم سے نجات پا گیا بلکہ اس کے ساتھ دوسرے ضروریات اسلام کو ماننا اور اس کا اہتمام اور عمل کرنا ضروری ہے، ورنہ صرف کلمۂ شہادتین پڑھنے سے مسئلہ حل نہیں ہوتا، کیا اگر کوئی معاد کا منکر ہو تو اسے مسلمان کہا جائے گا؟ یا اگر نماز و زکواۃ کا منکر ہو تو اس کو مسلمان کہیں گے؟ معلوم ہوا کہ کلمۂ شہادتین صرف اس چیز کی نشانی ہے کہ اس کا ''ما انزل اللہ'' یعنی جو کچھ بھی خدا نے بھیجا ہے اس پر اعتقاد وایمان ہے اور ظاہراً وہ مسلمان شمار کیا جائے گا۔

لیکن اگر دل سے خدا کا اعتقاد نہ ہو ،یا قیامت کو قبول نہ کرتا ہو،یا ضروریات اسلام کو دل سے قبول نہ کرتا ہو، تو اگر چہ ظاہری طور پر مسلمان ہے لیکن حقیقت میں وہ کافر ہے، بظاہر اس پر اسلامی احکام بھی جاری ہونگے، لیکن ظاہری اسلام اور ہے اور واقعی ایمان جو عذاب اخروی سے نجات کا باعث ہوتا ہے، وہ اور ہے ۔جس وقت یہ کہا جاتا ہے کہ توحید کا ایک معیار تشریعی ربوبیت میں

توحید پر اعتقاد رکھنا ہے تو اس کا مقصد وہ توحید ہے جو سعادت اخروی اور جہنم کے عذاب سے نجات کا باعث ہے ورنہ ظاہری اسلام اور اس کے احکام کے اثبات کیلئے کلمہ شہادتین کا پڑھ لینا کافی ہے۔

قانون سازی کے سرچشمے اور اسلامی حکمرانی اسلامی نظریہ اور تشریعی ربوبیت کی بنیاد پر سمجھ لینا چاہئے کہ قانون سازی کا اصل حق صرف خداوند عالم کو ہے اور خدا کے مقابلہ میں کسی کو بھی قانون سازی کا حق نہیں ہے، اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا کسی بھی طرح کی دوسری قانون سازی جائز نہیں ہے؟ اس کے جواب میں پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ خدا کی قانون سازی کے عرض میں تو نہیں لیکن اس کے تحت طول میں ان لوگوں کو قانون سازی کا حق حاصل ہے کہ جن کو خداوند عالم نے اجازت دی ہے، اور وہ قانون اس صورت میں قابل نفاذ ہے جب خدا کے اذن سے ہو : (وَلاَ تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ أَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هَذَا حَلاَلٌ وَهَذَا حَرَامٌ لِتَفْتَرُوا عَلَى اللهِ الْكَذِبَ.إِنَّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللهِ الْكَذِبَ لاَيُفْلِحُونَ[۱]) ''اور جھوٹ کی بنیاد پر جو تمہاری زبان پر آئے اس کے بارے میں نہ کہا کرو کہ یہ حلال ہے اور وہ حرام، کہ جس کی وجہ سے خدا کی طرف جھوٹ نسبت دینے لگو اس میں کوئی شک نہیں کہ جو لوگ خدا کی طرف جھوٹ کی نسبت دیتے ہیں وہ کبھی کامیاب نہ ہوں گے''

پس اپنی طرف سے نہیں کہنا چاہئے کہ فلاں چیز حلال ہے اور فلاں چیز حرام، حلال و حرام آپ کی نظر اور آپ کے ذوق کا تابع نہیں ہے بس اگر کوئی ایسا سمجھے تو یہ بھی شرک کی ایک قسم ہے، لہٰذا یہ دیکھنا چاہئے کہ خدا کا کہنا کیا ہے؟ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے : (قُلْ ءَاللهُ اَذِنَ لَكُمْ أَمْ عَلَى اللهِ تَفْتَرُونَ[۲]) ''(اے رسولؐ) پوچھئے کہ کیا خدا نے تمہیں اجازت دی ہے یا تم خدا پر بہتان باندھ رہے ہو'' ؟جی ہاں! خدا نے اپنے پیغمبر کو قانون سازی کا اور لوگوں کو حکم دینے یا منع کرنے کی اجازت دی ہے اور فرمایا

---

[۱] سورہ نحل آیت ۱۱۶۔
[۲] سورہ یونس آیت ۵۹۔

ہے:(أَطِیْعُوا للّٰہ وَأَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ.[۱]) ''(اے ایمان والو)خدا کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی اطاعت کرو''

نیز فرمایاہے:(مَن یُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللّٰہ.[۲]) ''جس نے رسول ۖکی اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی''

البتہ رسول خدا بھی اپنی مرضی کے مطابق عمل نہیں کرتے بلکہ آپ کا عمل بھی خدا کی وحی و الہام کے مطابق ہوتا ہے اور جس وقت آیات نازل نہیں ہوتی تھیں ،الٰہی الہام اور غیر قرآنی وحی کے ذریعہ خدا وند عالم کا تشریعی ارادہ ان تک پہونچتا تھا :(مَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوَیٰ إِن ھُوَإِلَّا وَحْیُٗ یُوحَیٰ[۳]) ''اور ہمارا رسول تو اپنی نفسانی خواہش سے کچھ بھی نہیں کہتا، یہ تو بس وحی کہتا ہے جو وحی کی جاتی ہے''

اس بنا پر اگر کسی کو خدا کی طرف سے اجازت ہو تو وہ قانون بنا سکتا ہے اور اس کا بنایا ہوا قانون بھی محترم اور لازم الاجراء ہے اورشیعہ حضرات کا عقیدہ ہے کہ جس طرح پیغمبر اکرم ۖکو قانون بنانے کی اجازت دی گئی ہے، اسی طرح ائمہ معصومین ؑکو بھی خدا کی طرف سے قانون بنانے کی اجازت حاصل ہے البتہ اس بات کی دلیل علم کلام میں واضح طور پر بیان ہوئی ہے،

ان میں سے ایک حدیث ثقلین ہے جس میں ائمہ طاہرین علیہم السلام کو قرآن کا ہم پلہ قرار دیا گیا ہے '':اِنّی تارکُ فیکُمُ الثَّقَلَیْنِ مَا اِن تَمَسَّکتُم بِہِمَا لَن تَضِلُّوا بَعْدِی،کِتَابَ اللّٰہِ وَ عِتْرَتِی''(میں تمہارے درمیان دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جارہا ہوں جب تک تم ان دونوں سے متمسک رہوگے ہرگز میرے بعد گمراہ نہ ہوگے ایک کتاب خدا اور دوسرے میری عترت (اہل بیتؑ) ۔

یہاں شیعہ عقائد کو ثابت کرنا مقصود نہیں ہے، پھر بھی اشارہ کردیں کہ جو لوگ شیعوں کے اس مسلمہ عقیدہ کو تسلیم کرتے ہیں پیغمبر اکرم ۖ کے علاوہ ائمہ معصومین ؑکو بھی اس طرح کی اجازت کا حامل مانتے ہیں، اور اس نظریہ کے خلاف بعض کا نظریہ ہے کہ صرف رسول اکرمۖ صاحب عصمت اور واجب الاطاعت تھے لیکن اس اختلاف نظر سے ہماری بحث میں کوئی خاص فرق نہیں پڑتا، اگر فرض کریں کہ ہم لوگ رسول اکرمۖ کے زمانہ میں ہوتے اور آپؐ ایک شہر کیلئے کسی کو حاکم بنا کر بھیجتے، اور فرماتے کہ لوگ اس حاکم کی اطاعت

[۱] سورہ نساء۵۹۔
[۲] سورہ نساء آیت ۸۰۔
[۳] سورہ نجم آیت ۳،۴۔

کریں، توآیااس حکم کی اطاعت نیز پیغمبر اکرمؐ کی اطاعت کے ذیل میں واجب ہوتی یا نہیں؟ کیا اس کی اطاعت،خدا ورسول کی اطاعت اور خودخدا کی حکمرانی کے خلاف ہوتی؟ ہرگز نہیں؟ کیونکہ وہ شخص اس پیغمبر کا بھیجا ہوا نمائندہ ہے کہ جس کو خدا نے اپنا نبی معین فرمایا ہے۔

ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ ائمہ معصومینؑ بھی یہی اختیار رکھتے ہیں،اور ائمہؑ نے بھی عصر حاضرکیلئے مخصوص اوصاف کے تحت کلی طورپر (نہ کہ معینہ طورپر مخصوص) افراد کو منصوب فرمایا ہے جو ائمہؑ سے مشابہت رکھتے تھے اور تمام افراد کے درمیان سب سے زیادہ اصلح و پرہیز گار تھے ائمہؑ نے ان کو حکومت کی اجازت دی ہے، اوراب یہ نظریہ چاہے عمر ابن حنظلہ کی مقبولہ یا ابو خدیجہ کی مرفوعہ احادیث یا دیگر روایات کے ذریعہ ثابت کیا جائے،یا عقلی دلائل کے ذریعہ ثابت کیا جائے جیسا کہ فقہائے کرام نے مختلف طریقوں سے اس نظریہ کوثابت کیا ہے۔

پس جس طرح پیغمبر اکرمؐ اپنے زمانہ میں کسی کو کسی شہر یا اسلامی علاقہ کا حاکم بناکر بھیجتے تھے، اور ان کی اطاعت وہاں کے رہنے والوں پر واجب ہوتی تھی، یا جس طرح حضرت علیؑ نے اپنی خلافت کے دوران بہت سے لوگوں کو اسلامی ممالک منجملہ بحرین، اہواز، مصر وغیرہ کیلئے والی اور حاکم بنا کر بھیجا، اور ان حضرات کی اطاعت واجب تھی، اس غیبت کے زمانہ میں جو حضرات فقاہت و سیاست میں مالک اشتر کی طرح ہیں اور اسلامی معاشرہ کے چلانے اور حکومت کرنے کی صلاحیت اور توانائی رکھتے ہیں، ولایت فقیہ کے دلائل کے تحت ان کو بھی حکمرانی کی اجازت حاصل ہے اور ان کی اطاعت بھی ہم لوگوں پر واجب ہے،اور یہ خدا کی تشریعی ربوبیت کے ساتھ منافات بھی نہیں رکھتی بلکہ ان کی حاکمیت بھی خدا کی شان ربوبیت کا ہی ایک جلوہ ہے۔ چونکہ خدانے اپنے پیغمبر کو حکم دیا ہے اور پیغمبرؐ نے اس حاکم کو فرمان دیاہے یا امام معصوم نے اپنے خاص یا عام جانشین اور والی کو اجازت دی ہے ان کی اطاعت ہم لوگوں پر واجب ہے دوسرے الفاظ میں والی و حاکم کی اطاعت پیغمبرؐ اور خدا کی اطاعت ہے، اور اس والی و حاکم کی مخالفت پیغمبر اکرمؐ کی مخالفت اور پیغمبر اکرمؐ کی مخالفت خدا کی مخالفت ہے۔

اس طرح ولی فقیہ کی اطاعت، امام معصومؑ کی اطاعت اور امام معصومؑ کی اطاعت پیغمبر کی اطاعت اور پیغمبر کی اطاعت خدا کی اطاعت ہوگی، اور اس کی مخالفت معصومؑ کی مخالفت اور معصومؑ کی مخالفت خدا کی مخالفت ہوگی، یہ بات عمر ابن حنظلہ کی مقبولہ روایت میں واضح طور پر بیان ہوئی ہے جہاں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں ''ینظرُ اِلیٰ مَن کَانَ مِنکُم مِمَّن قَد رَویٰ حدیثَنا وَنَظَرَ فِیْ حَلالِنا وَحَرامِنا وَعَرفَ اَحکَامَنا فَلیَرضَوا بِہٖ حَکَماً فَاِنّی قَد جَعَلتُہُ عَلَیکُم حَاکِماً. فَاِذَا حَکَمَ بِحُکمِنا فَلَم یَقبَلہُ مِنہُ فَاِنَّمَا استَخَفَّ بِحُکمِ اللّٰہِ وَعَلَینَا رَدَّ وَالرَّادُّ عَلَینَا کَالرّادِّ عَلَی اللّٰہِ وَہُوَ عَلی حَدِّ الشّرکِ بِاللّٰہ''[1]۔ ''دیکھو تمہارے درمیان جو کوئی ہماری احادیث کو نقل کررہا ہو اور ہمارے حلال و حرام پر نظر رکھتا ہے اور ہمارے احکام کو جانتا ہے تو اس کے حکم کو قبول کرلینا چاہئے کیونکہ ہم نے اس کو تم پر حاکم قرار دیا ہے،اب اگر اس نے ہمارے حکم کے مطابق حکم کردیا اور کسی نے اس کو قبول نہیں کیا تو گویا اس نے خدا کے حکم کو سبک (ہلکا) سمجھا ہے، اور ہماری بات نہیں مانی ہے اور جس نے ہماری بات نہیں مانی گویا اس نے خدا کی بات نہیں مانی، اور یہ چیز شرک باللہ کی حد تک جاتی ہے'' یہ جو حضرت امام صادق علیہ السلام نے فرمایا ہے: ''علی حد الشرک'' اس کی وجہ ہے کہ آپ نے شرک کو توحید کے مقابلہ میں قرار دیا ہے اور توحید کے ارکان میں سے ایک رکن ''تشریعی ربوبیت'' میں توحید کا عقیدہ بھی ہے اب اگر ہم نے خدا کی حاکمیت اور اس کے تحت پیغمبرؐ، ائمہ معصومینؑ، اور ان لوگوں کی حاکمیت کو قبول کیا ہے کہ جن کو خدا ورسول اور ائمہ نے منصوب کیا ہے، توگویا ہمارا ''تشریعی ربوبیت'' میں توحید پر ایمان ہے اور اگر اس کو نہیں مانا توگویا تشریعی ربوبیت میں شرک کے مرتکب ہوئے ہیں، پس ''الراد علیھم'' کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی نے ان فقہائے کرام کے حکم کو نہ مانا کہ جن کو لوگوں پر حکومت کی اجازت حاصل ہے تو اس نے گویا ائمہ کا انکار کیا ہے یعنی اگر کوئی یہ کہے کہ میں ولایت فقیہ کو نہیں مانتا توگویا وہ اس شخص کے جیسا ہے جو کہے کہ میں امام معصومؑ کو نہیں مانتا، اور اگر کوئی امامؑ کو قبول نہیں کرتا تو اس نے ایک طرح سے خداوند عالم کے سلسلے میں

[1] کافی ج۱ ص ۶۷۔

شرک کیا ہے کیونکہ اس نے خداوند عالم کی تشریعی ربوبیت کے ایک رخ کا انکار کیا ہے البتہ یہ شرک معنوی اور باطنی ہے، اور انسان کی نجاست کا سبب نہیں بنتا۔

لہٰذا ثابت ہوگیا کہ اگر کوئی یہ قبول کرتا ہے کہ در حقیقت، حکومت کا حق خدا سے مخصوص ہے تو اس کے بعد کے مرحلے میں یہ بھی ماننا ہوگا کہ حکومت منجانب اللہ اور رسول اللہ سے مخصوص ہے خدا کی حکمرانی کے تحت رسول اللہ کی حکومت اور اس کے بعد ائمہؑ اور ان کے جانشینوں کی حکمرانی، کیونکہ قانونی اور عملی حیثیت پیدا کرتی ہے، لیکن اگر ہم حکمرانی کی کا جواز کسی اور ذریعے اور واسطے سے مانیں گے تو در حقیقت یہ خدا کی حکمرانی کے بارے میں ایک طرح کا شرک ہوگا، اس بنا پر، اسلامی نظام؛ الٰہی قوانین کی بنیاد پر اس حاکم کے ہاتھ میں ہونا چاہئے جو خدا کی طرف سے حکمرانی کی اجازت رکھتے ہوں اس کی عقلی دلیل خداوند عالم کی ''تشریعی ربوبیت'' ہے، اگر توحید کا صحیح مفہوم سمجھ میں آجائے تو اسی نتیجہ پر پہونچیں گے اور اگر کوئی اس نتیجہ کا انکار کرتا ہے تو دراصل اس کا عقیدۂ توحید کمزور ہے اور اس کی توحید خالص نہیں ہے اس میں شرک کی آمیزش ہے۔

ممکن ہے کوئی سوال کرے کہ معاشرہ کے قوانین الٰہی قوانین ہوں اس میں کون سا فلسفہ کار فرما ہے؟ اگر کوئی خدا اور اس کے قوانین کو قبول نہ کرے اور خود اپنے لئے قوانین بنائے تو کیا معاشرہ کی فلاح و بہبود نہیں ہوسکتی؟ اور اگر ایسا ہے تو پھر کس طرح دنیا کے ان معاشروں میں جو خدا کے قوانین کو تسلیم نہیں کرتے نظام زندگی برقرار ہے؟ یہ وہ شبہ ہے جو بہت سے روشن فکروں نے پیش کیا ہے اور کہتے ہیں کہ قانون کا خدا کی طرف سے ہونا، کیا ضروری ہے؟ ان کا عقیدہ ہے کہ خود عوام اپنی عقل سے کام لے کر اپنے لئے قانون بنا سکتے ہیں اس پر عمل کر سکتے ہیں اور کوئی مشکل بھی پیش نہیں آئے گی۔

قانون سازی کا حق خدا سے مخصوص ہونے کے دلائل

اس شبہ کا جواب واضح ہونے کیلئے اس بات پر توجہ ضروری ہے کہ انسان کا پورا وجود اگر چہ ایک متحد و ہم آہنگ اکائی کی طرح ہے

لیکن اس کے مختلف پہلو اور اعضاء وجوارح ہیں جو پہلو ایک دوسرے سے متصل اور جڑے ہوئے ہیں انسان صرف اقتصادی پہلو نہیں رکھتا کہ اگر کسی نے کوئی اقتصادی قانون بنا دیا اور اس کے معاشرہ کے اقتصادی پہلوؤں کو منظم کر دیا تو اس کا کام آسان ہوجائے گا، کیونکہ اس کا اقتصاد اس کی سیاست سے وابستہ ہے اور اس کی سیاست اس کے شہری اور معاشرتی احکام سے وابستہ ہیں اس کے شہری احکام اس کے عدالتی احکام سے وابستہ ہیں اور یہ سب کے سب بین الاقوامی قوانین سے وابستہ ہیں، اور یہ تمام چیزیں مجموعی طور پر انسان کے روحی، معنوی اور اخلاقی پہلوؤں سے گہرا تعلق رکھتی ہیں، انسان کے دس وجود نہیں ہیں اور نہ ہی وہ دس روحیں رکھتا ہے، انسان کا ایک وجود ہے اور اس کے اندر ایک روح ہے جس کے مختلف پہلو اور گوشہ ہیں لیکن سب ایک دوسرے سے وابستہ ہیں لہٰذا کسی ایک پہلو سے بھی کوئی نقص و کمی رہ جائے تو اس سے دوسرے تمام پہلوؤں کا متاثر ہونا ضروری ہے، وہ خدا جس نے انسان کو پیدا کیا ہے اور اس کو ایک اجتماعی زندگی عطا فرمائی ہے، اجتماعی زندگی کو آسودہ بنانے کے لئے انسانی فطرت میں ایسے عوامل واسباب بھی قرار دیئے ہیں کہ جن کی وجہ سے انسان طبعی طور پر اجتماعی زندگی کی طرف مائل ہوجاتا ہے، معلوم ہوا خداوند عالم نے انسان کی خلقت ایک مقصد کے تحت کی ہے، اور وہ مقصد یہ ہے کہ انسان اجتماعی زندگی کے پرتو میں انسانی کمالات تک پہونچے، اور اس کے وہ تمام تخلیقی پہلو جو اس کے معنوی پہلوؤں کے لئے کام کررہے ہیں اس کی ترقی کی راہ میں کام کریں اور بالآخر انسان منظور نظر انسانی کمالات کی حدوں تک پہونچ جائے، کیونکہ: (مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ[1]) (خدا فرماتا ہے) ''ہم نے نہیں پیدا کیا جن وانس کو مگر یہ کہ وہ ہماری عبادت کریں''

یہ جو کچھ بھی ہم نے عرض کیا ،عبادت کے سایہ میں اس کا توحید اور ربوبیت کے ساتھ گہرا رشتہ ہے،اس کو انجام پانا چاہئے ورنہ انسانی کمال پیدا نہیں ہوگا،یقیناً اس کے علاوہ بھی ممکن ہے معاشرہ میں ظاہری طور پر نظم و ضبط پیدا ہوجائے لیکن یہ بھی بعید نظر آتا ہے،کیونکہ اس طرح کا نظم و ضبط جو آج دنیا کے مختلف ممالک میں قائم ہے کہ جن کا عملی نمونہ امریکہ ہے ہم دیکھ رہے ہیں امریکہ کے وہ تمام اسکول

[1] سوره ذاریات آیت ۵۶.

جو مہذب دنیا کے تمام ممالک کیلئے نمونہ بنے ہوئے ہیں، ان میں پولیس ہر وقت اسلحہ کے ساتھ آمادہ رکھنا پڑتی ہے پھر بھی وہاں ہر روز قتل و غارت گری کی وارداتیں ہوتی رہتی ہیں یہ نظم و ضبط کا وہی نظام ہے جو انسان نے بنایا ہے اور اسی طرح کی دوسری تمام برائیاں ہیں، جن کے بیان کرنے سے بھی انسان کو شرم آتی ہے۔

یہاں تک کہ اگر فرض کرلیں الٰہی قوانین کے نفاذ اور انسان کے معنوی پہلوؤں کو نظر انداز کردینے کے باوجود معاشرہ میں ظاہری طور پر نظم و ضبط قائم ہوسکتاہے، پھر بھی اس طرح زندگی کا اصل ہدف پورا نہیں ہوسکتا ؛ کیا انسان کی زندگی دیمکوں کی سی زندگی ہے؟ یا انسانی معاشرہ شہد کی مکھیوں کی طرح کا معاشرہ ہے جہاں ظاہری نظم وضبط کافی سمجھا جاتاہے، انسان کی زندگی کا تمام نظام، نظم و ضبط، امن و تحفظ، کمالات، ترقیاں، علوم اور ٹکنالوجی صرف اس بات کا مقدمہ ہیں کہ انسان کی روح کمال حاصل کر سکے اور خدا سے نزدیک ہو سکے، کون ہے جو ان روابط کو اچھی طرح سمجھتا ہے؟ کون ہیں جو بتائے کہ کس طرح کا کھانا پینا یا کس طرح کی زندگی انسان کو خدا سے نزدیک کرتی ہے؟کون یہ معین کرسکتاہے کہ سور کا گوشت کھانا اور شراب پینا ہماری سعادت و کامیابی میں موثر ہے یا نہیں؟دنیا کے ڈاکٹر علم طب میں جتنی بھی ترقی کرلیں

ا۔ صرف یہ بتا سکتے ہیں کہ الکحل کا زیادہ استعمال دماغی سلس کو مختل کرسکتا ہے،لیکن یہ نہیں جانتے کہ شراب کے پینے سے آخرت کی زندگی کوکوئی نقصان پہونچتا ہے یا نہیں؟ کیونکہ اس سلسلہ میں کوئی تجربہ نہیں رکھتے اور اس بات کا تجربہ کیا بھی نہیں جاسکتا۔ بہر حال انسانی زندگی کے قوانین اس طرح مرتب ہوں کہ زندگی کے تمام پہلوؤں کی تکمیل ہو سکے، اور صرف جسمانی حفظان صحت یا اقتصادی اور سیاسی فلاح و آسائش پر اکتفاء نہ کی جائے اور نہ ہی ان کو دوسرے پہلوؤں سے جدا سمجھا جائے، بلکہ ان تمام پہلوؤں کو ایک متفق و ہم آہنگ نظام میں ڈھالا جائے، ظاہر ہے ان تمام پہلوؤں کی مکمل آگاہی اور ان کا ایک دوسرے سے ارتباط اور ان کے ذریعہ آخری کمال تک پہنچنے کی راہ خدا کے علاوہ کسی کے علم میں نہیں ہے، اسی لئے ضروری ہے کہ قوانین خود خدا بنائے، اس کے علاوہ کونسا ایسا قانون ساز ہے جو قانون بناتے وقت اپنے ذاتی مفاد ورجحان کو نظر میں نہ رکھتا ہو ؛ ظاہر ہے جو شخص یا گروہ

اقتدار میں ہوکوشش کرے گا کہ اپنے فائدے میں قوانین بنائے، مثال کے طور پر ہماری اسلامی حکومت ہی کو لے لیجئے جب کوئی نئی حکومت اقتدار میں آتی ہے ایسے قوانین اور سرکاری احکام و ضوابط تیار کرتی ہے کہ جس کا بڑا حصہ خود اس کے فائدے میں ہوتاہے،فرق نہیں پڑتا کہ وہ دائیں بازو کی پارٹی ہو یا بائیں بازو کی؛یہ انسان کی خاصیت اورمزاج ہے؛ بہر حال تمام انسان معصوم نہیں ہیں۔

اس شخصی یا جماعتی رجحان سے صرف وہ ذات مبرّا ہوسکتی ہے کہ جس کو ان مسائل سے کوئی ذاتی فائدہ نہ ہو،اوروہ خداوند عالم کی ذات ہے، اگر کوئی بھی دوسرا قانون بنائے گا تو ممکن ہے کہ وہ قوانین اس کے فائدے یادوسرے کے ضرر میں ہوں،لیکن خدا کے بنائے قوانین سے خدا کو نہ کوئی فائدہ ہو سکتا،نہ کوئی نقصان، وہ تو صرف انسانوں کے نفع و نقصان کوسامنے رکھتا ہے، لہٰذا ایک طرف تو خدا کا علم لا متناہی ہے اوردوسری طرف قوانین کے بنانے میں اس کااپنا کوئی فائدہ نہیں ہے؟ جبکہ وہ انسان پر حق ربوبیت بھی رکھتاہے، اور اگر انسان حقیقی کمال تک پہونچنا چاہتاہے تواس کا فریضہ ہے خدا کے حق ربوبیت کو ادا کرے، البتہ یہ ایک الگ بحث ہےاوراس کی مزید وضاحت کی ضرورت ہےاور اس مختصر سے وقت میں اس کا جائزہ لینا ممکن نہیں ہے۔

انسانوں کے ایک دوسرے پر حقوق اوروہ ایک دوسرے کے مد مقابل حقوق سے واقف بھی ہے، مثلاً زمیندار کسان پر حق رکھتا ہے اور کسان زمیندارپر حق رکھتا ہے، یا ایک حاکم رعایا پر حق رکھتا ہے،اور رعایا حاکم پر حق رکھتی ہے لوگ ان حقوق سے آشنا میں، لیکن خدا لوگوں پرجو حق رکھتاہے؟اس کے ادا کرنے کا طریقہ کیا ہے یہ بھی معلوم ہے؟!اسلامی افکار و نظریات،ان تمام حقوق میں سر فہرست خداکا حق ہے، لہٰذا سب سے پہلے خدا کا حق ادا کرنا چاہئے،تاکہ خدا کے حق کے پرتو میں لوگوں کے حقوق ثابت کئے جاسکیں۔

ایسے میں،کیا ممکن ہے ان بنائے جانے والے قوانین میں انسان کے حقوق کا لحاظ کیا جائے لیکن خدا کے حقوق کو نظر انداز کر دیاجائے؟بنیادی طور پر اگر خدا کا حق پیشِ نظر نہ رکھا جائے تو کیا یہ خدا کے حقوق کے سلسلے میں ظلم و ستم نہیں ہے؟ اور کیا اس

ناشکری کے بعد انسان کمال کی منزل تک پہونچ سکتا ہے؟خدا کی ناشکری سے بڑی وہ کون سی ناشکری ہو سکتی ہے؟ کہ جس کے سلسلہ میں قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے :إن الشّرکَ لَظُلمٌ عَظِیمٌ.[۱]) ''بے شک شرک سب سے بڑا ظلم ہے''۔

جی ہاں!سب سے بڑا ظلم شان ربوبیت میں ظلم کرنا ہے، لہٰذا اگر خدا وند عالم کا حق نظر انداز کردیا جائے تو یہ ظلم عظیم ہے، اس صورت میں کس طرح دوسروں کے ساتھ عدل وانصاف برقرار کر سکتے ہیں؟انسان کس طرح عادل وانصاف ور ہو سکتا ہے جبکہ خود اپنے خالق پر ظلم کررہا ہے؟اور جیسا کہ ہم نے عرض کیا شرک کی قسموں میں سے ایک غیر خدا کیلئے قانون سازی کے حق کا عقیدہ قائم کرلینا بھی ہے، لہٰذا اس اعتبار سے بھی کہ خداوند عالم ہمارے تمام نفع و نقصان سے مکمل آگاہی رکھتا ہے اور اس رخ سے بھی کہ خدا کا قانون سازی میں اپنا کوئی فائدہ نہیں ہے،اور اس معنی میں بھی کہ خدا وند عالم انسان پر تشریعی ربوبیت کا حق رکھتا ہے، سب سے پہلے مرحلہ میں خدا کے قوانین کی رعایت ضروری ہے، اس کے بعد ان لوگوں کے احکام پر عمل کیا جائے گا کہ جن کو خدا کی طرف سے قانون سازی کی اجازت ملی ہے اور وہ بھی اسی حد تک کہ جس حد تکخدا نے اجازت دی ہے،تاکہ انسان اس آیت کا مستحق قرار نہ پائے) :قُلْ أرء یتُم ما أنْزَلَ اللّٰہ لَکُم مِن رِزْقٍ فَجَعَلْتُم مِنہُ حَراماً وَحلالاً قُلْ ء اللّٰہُ أذِنَ لَکُم أم عَلَی اللّٰہِ تَفْتَرُونَ.[۲]) (اے رسولؐ) کہہ دیجئے کہ کیا تم نے دیکھاہے کہ خدا نے جو تم پررزق نازل کیا ہے تم نے ان میں سے بعض کو حرام ،بعض کو حلال بنادیا ہے، (اے رسولؐ) پوچھئے کہ کیا خدا نے تمھیں اس کی اجازت دی ہے یا تم خدا پر بہتان باندھ رہے ہو.''(اور اپنی طرف سے حلال وحرام کا تعین کر رہے ہو؟!)اس طرح دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے:(وَلاَ تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ أَلْسِنَتُکُمْ الْکَذِبَ ہَذَا حَلاَلٌ وَہَذَا حَرَامٌ لِتَفْتَرُوا عَلَی اللّٰہِ الْکَذِبَ. إِنَّ الَّذِینَ یَفْتَرُونَ عَلَی اللّٰہِ الْکَذِبَ لاَیُفْلِحُونَ.[۳])(ا) ''خبردار جو کچھ تمہاری زبان پر آئے اس کے بارے میں یہ نہ کہہ دیاکرو کہ یہ حلال ہے اور وہ حرام،تاکہ خدا پر جھوٹ باندھو بیشک جو لوگ خدا پر جھوٹ اور بہتان باندھتے ہیں وہ کبھی کامیاب نہ ہوں گے۔

[۱] سورہ لقمان آیت ۱۳۔
[۲] سورہ یونس آیت ۵۹۔
[۳] سورہ نحل آیت ۱۱۶۔

اس بنا پر، خدا کی تشریعی ربوبیت کا حق اداء کرنے کیلئے ضروری ہے کہ پہلے خدا کے قانون پر نظر ڈالی جائے، اور اس کے بعد تحقیق کریں کہ اس نے کس کو قانون سازی کی اجازت دی ہے، یا کس کو قانون کے نفاذ کی اجازت دی ہے،کیونکہ اگر اس کے قوانین کو اس کی اجازت سے جاری نہ کیا جائے تو بھی خدا کے بندوں پر تصرف ان کے مولا ؤ آقا کی اجازت کے بغیر لازم آئے گا، اسلامی نظریہ کے مطابق خدا کی مرضی کے خلاف دوسروں پر تصرف تو دور کی بات ہے خودآپ کا اپنے اوپر تصرف بھی جائز نہیں ہے، اس وجہ سے انسان کو خود کشی کا حق نہیں ہے۔

ممکن ہے مغرب کے لیبرل نظام میں کہا جائے چونکہ انسان خود اپنا مالک ہے، لہٰذا اس کو خود کشی کا حق حاصل ہے، لیکن اسلام میں ایسا نہیں ہے، کیونکہ انسان خود اپنا مالک نہیں ہے بلکہ خدا اس کا مالک ہے، لہٰذا اس کو خود کشی کا بھی حق نہیں ہے، کیونکہ خدا کی طرف سے اس کو اس کام کی اجازت نہیں ہے، خداوندعالم نے انسان کو جو زندگی عطا کی ہے اس پر صرف خدا کو اختیار ہے، کسی دوسرے کو کوئی اختیار نہیں ہے لہذا جس کو خود اپنی جان تلف کرنے کی اجازت نہ ہو کس طرح وہ کسی غیر کو اپنی جان لینے کی اجازت دے سکتا ہے کہ آؤ میری جان لے لو؟!جب انسان کو اپنا ہاتھ کاٹ ڈالنے یا اپنی آنکھ پھوڑ لینے کا حق نہیں ہے اس لئے کہ ان کا مالک خداہے اور اس نے اس کی اجازت نہیں دی ہے، تو وہ کسی دوسرے کو کہاں سے یہ حق دے سکتا ہے کہ وہ کسی چور کے ہاتھ کاٹ ڈالے یا کسی مجرم کو قید کردے؟ کسی کو بھی اس طرح کا کوئی حق نہیں ہے کیونکہ دوسرے لوگ بھی خدا کے بندے ہیں اور خدا کی اجازت کے بغیر ان پر تصرف نہیں کیا جا سکتا، لہٰذا قانون سازی اور قانون کے نفاذمیں خدا کی اجازت ضروری ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ اس سلسلہ میں اسلام کا سیاسی نظریہ اس بنیاد پر استوار ہے کہ خدا کی تشریعی ربوبیت، توحید کاایک رکن ہے، اور اگر کسی نے اس کی رعایت نہ کی تو پھر وہ شیطان کی طرح کفر کا مرتکب ہوا ہے۔

اٹھارہویں تقریر

قانون سازی کے شرائط اور اسلام میں اس کی اہمیت

گذشتہ مطالب پر ایک نظر گذشتہ تقریروں میں عرض کیا جا چکا ہے کہ اسلام کے سیاسی نظریہ سے متعلق بحث میں دو سوالوں کا جواب د ینا بہت ضروری ہے :

پہلا سوال: یہ ہے کہ معاشرے کے لئے قانون کیوں ضروری ہے؟

دوسرا سوال: یہ ہے کہ کون سا قانون مفید اور مطلوب ہے اور اس کے بنانے اور معاشرہ میں جاری کرنے کا مقصد کیا ہے؟
پہلے سوال کے جواب میں ہم نے عرض کیا تھا کہ دنیا کے تقریبا تمام عقلاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ معاشرے میں اخلاقی قوانین کے علاوہ حکومتی قوانین بھی ہونا ضروری ہیں ،لیکن دوسرے سوال کے جواب میں؟ اختلاف نظر پایا جاتا ہے،ایک نظریہ ہے کہ قانون معاشرہ میں نظم وضبط بر قرار کرنے کے لئے ہے ایک دوسرا نظریہ یہ ہے کہ قانون معاشرہ میں عدل وانصاف قائم کرنے کے لئے ہے، تیسرا نظریہ کہ جو اس وقت مغرب میں رائج ہے اور اس کو لیبرلزم کے طرفداروں نے پیش کیا ہے کہ قانون انسان کی اپنی انفرادی آزادی کی حفاظت کے لئے ہے یعنی انسان کو اپنی مخصوص زندگی میں ہر طرح سے آزاد ہونا چاہئے کہ جو کچھ چاہے انجام دے سکے، لیکن چونکہ اس صورت میں عملی طور پر آپس میں درگیری اور ٹکراؤ کا امکان ہے ، بعض افراد کی آزادی بعض دوسرے افراد کی وجہ سے آزادی خطرہ میں پڑ سکتی ہے ، لہذا قانون وضع کیا گیا ہے کہ سب کی آزادی برقرار رہ سکے ،اور باہمی ٹکراؤ سے روکا جا سکے۔
مذکورہ موضوعات پر گفتگو کے ذیل میں ہم عرض کر چکے ہیں اسلام کے سیاسی نظریہ کے تحت امن وامان اور نظم وضبط کا تحفظ او رعدل وانصاف وغیرہ کی بر قراری درمیانی سطح کے اہداف ہیں، ان اہداف سے بالا تر اسلام میں قانون سازی کا ہدف ہے کہ جس

کو ایک جملہ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ قانون کا مقصد انسانوں کے ماڈی اور معنوی مصالح کی حفاظت کرنا ہے، اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ معنوی مصالح کی اہمیت مادی مصالح کی اہمیت سے کہیں زیادہ ہے، لہٰذا قانون اس طرح کا ہونا چاہئے کہ جس سے انسان کی کمال تک پہونچنے کے لئے راہ ہموار ہو سکے یعنی جو تقرب خداوند متعال کا باعث بنے، لہٰذا جو چیزیں خدا تک رسائی میں رکاوٹ ہوں، انھیں معاشرہ سے ختم ہوجانا چاہئے، مجموعی طور پر قانون کا اصلی مقصد تمام انسانوں کے مادی اور معنوی مفادات کی حفاظت ہو۔

اس کے بعد ایک مسئلے پر گفتگو کرتے ہوئے کہ قانون بنانے کا حق کس کو ہونا چاہئے؟ہم نے عرض کیا کہ اس سلسلے میں بھی مختلف نظریات پائے جاتے ہیں،اجتماعی طور پر سیاست اور حقوق و قانون کے ماہرین اور فلاسفہ کے درمیان مشترکہ طور پر دو شرطوں کو معتبر جانا گیا ہے:

پہلی شرط: قانون ساز وہ ہو جو قانون کے ہدف کو اچھی طرح جانتا ہو۔

وسری شرط: قانون ساز معاشرہ کے مفادات کو اپنے ذاتی مفادات پر قربان نہ کرے،

ان دو باتوں کو تقریباً سبھی لوگ قبول کرتے ہیں، اگرچہ ان کے نزدیک قانون بنانے کے اہداف مختلف ہیں، لیکن ہر ایک یہ مانتا ہے کہ قانون ساز قانون کے اہداف سے بھی اچھی طرح واقف ہو، اور ان اہداف تک پہونچنے کے راستوں سے بھی واقف ہو، تاکہ اس کے بنائے ہوئے قوانین پر چل کر منظور نظر اہداف تک پہونچا جا سکے،اس سے قطع نظر کہ قانون ساز کا علم ایسا ہو کہ وہ قوانین کے اہداف تک پہونچنے کا راستہ معین کر سکے، اور قوانین اسی کے مطابق بنا سکے، قانون ساز کی اخلاقی صلاحیت بھی ایسی ہونی چاہئے کہ معاشرہ کے مفادات کو اپنے مفادات پر قربان نہ کرے۔

قانون سازی کے سارے شرائط خدا وند عالم کی ذات میں منحصر ہیں

اس منزل میں،اسلام نے پوری طرح سے مذکورہ دونوں شرطوں کو پیش نظر قانون ساز کے لئے انسان کی تمام مادی و معنوی مصلحتوں سے واقفیت کو بھی ضروری قرار دیا ہے اور کسی خاص فرد یا کسی خاص گروہ کے مفادات کو معاشرہ کے مفادات پر مقدم نہ کرنے پر زور دیا ہے ۔

اسلام اس نکتہ کا بھی اضافہ کرتا ہے کہ بنیادی طور پر قانون سازی کا حق اسی کو حاصل ہے جو انسانوں کو امر ونہی کر سکتا ہو،اگر کچھ لوگ معاشرہ کی مصلحتوں کا علم رکھتے ہوں اور وہ معاشرہ کی مصلحتوں کو شخصی یا گروہی مصلحتوں پر مقدم رکھ سکتے ہوں پھر بھی انھیں بنیادی طور پر قانون سازی کا حق نہیں ہے؛ کیونکہ ہر قانون میں خواہ ناخواہ امر ونہی کا پہلو پایا جاتا ہے،جیسا کہ ہم نے ''حق اور فریضہ تکلیف ''کی بحث میں عرض کیا تھا کہ ہر قانون میں صراحت کے ساتھ یا اشاروں میں کسی نہ کسی طرح کے امر ونہی کا ہونا ضروری ہے ، مثلاً ایک جگہ کہا جاتا ہے کہ دوسروں کے مال کا احترام کرو اور اس میں زیادتی سے کام نہ لو،یہ امر صریحی او رواضح ہے لیکن کبھی کبھی قانون میں لفظی طور پر امر ونہی نہیں ہوتا ،مثلاً کہہ دیا جاتاہے کہ آپ کے لئے اس طرح کا حق ثابت ہے، اور حق ثابت ہونے کا مطلب یہ ہوتاہے کہ دوسروں پر اس حق کا پاس و لحاظ ضروری ہے تو یہ وہ امر ہے کہ جس کا قانون ضامن ہوتا ہے،اسی طرح کہیں قانون کہتا ہے کہ اس حق کو پامال کرنے کا آپ حق نہیں رکھتے توگویا اس طرح کی نہی میں بھی زیادتی سے روکنیکا پیش خیمہ ہے ۔

لہٰذا قانون سازکو یہ حق ہونا چاہئے کہ دوسروں کو امر ونہی کر سکے اور یہ حق بنیادی طور پر صرف خدا سے مخصوص ہے، اب چاہے شرط اول کے لحاظ سے دیکھا جائے جس میں یہ کہا گیا ہے کہ قانون ساز کو انسانوں کی تمام مصلحتوں سے آگاہ ہونا چاہئیے، یا شرط دوم کے لحاظ سے دیکھا جائے جس میں یہ کہا گیا تھا کہ قانون ساز وہ ہونا چاہئے جو اجتماعی مصلحتوں پر شخصی یا گروہی مصلحتوں کو مقدم نہ کرے یہ شرطیں ہر اعتبار سے کامل طور پر خدا میں موجود ہیں کیونکہ وہ انسانوں کی تمام مصلحتوں کا ہر ایک سے زیادہ جاننے والا ہے،

اور کسی انسان کے شخصی یا گروہی اعمال کا کوئی فائدہ خدا کو نہیں پہونچتا، کہ وہ اس میں زیادتی سے کام لے مثلاً اگر تمام انسان مومن ومتقی بن جائیں تو بھی خدا کا کوئی فائدہ نہیں ہے اور اگر تمام لوگ کافر ہوجائیں تو بھی خدا کا کوئی نقصان نہیں ہے،اسی طرح اگر تمام لوگ قوانین پر عمل کریں تو بھی خدا کا کوئی فائدہ نہیں ہے اور اگر تمام لوگ قوانین کی خلاف ورزی کریں تو بھی خدا کا کوئی نقصان نہیں ہے۔

اب رہی تیسری شرط،توخدا کے علاوہ کسی بھی انسان کو بنیادی طور پر یہ حق نہیں ہے کہ وہ کسی کو امر ونہی کرے، کیونکہ وہی شخص امرونہی کرسکتا ہے جس کا دوسرے پر کوئی حق ہواور لوگوں کا ایک دوسرے پر اس طرح کا کون سا حق ہے؟!خدا کے سامنے تمام انسان برابر ہیں،خدا ان سبھی کا مالک ہے اورتمام انسان اپنے تمام تر وجود کے ساتھ خدا سے وابستہ ہیں، لہٰذا صرف خدا کو انسانوں پر امر ونہی کا حق ہے۔

دوسرے الفاظ میں یوں عرض کیا جائے کہ انسانوں کے لئے ضروری ہے کہ خدا کی ربوبیت کے حق کو پہچانیں اور اس کی ربوبیت کے حق کوادا کریں اور خداوندعالم کی ربوبیت انسانوں کے لئے دو اعتبار سے ظاہر ہے :

۱۔تکوینی ربوبیت،یعنی کائنات کی تخلیق اور نظام کے چلانے کا حق صرف ذات باری تعالیٰ سے مخصوص ہے وہی صرف کائنات کا مدبّر اور ناظم ہے، لہٰذا انسان اس چیز کا عقیدہ رکھے کہ خداوندعالم ہی ہے کہ جس نے کائنات میں تخلیقی نظام و قوانین کو نافذ کر رکھاہے جن کے تحت یہ کائنات رواں دواں ہے، چاند سورج اسی کے حکم سے گردش میں ہیں، کائنات کا ذرہ ذرہ اسی کے اشارہ پر چلتا ہے،لہٰذا اس کائنات کا تکوینی طور پرمالک و مختار اور انتظام چلانے والا صرف خدا وند وحدہ لاشریک ہے، اسی طرح یہ عقیدہ بھی ضروری ہے کہ اس کائنات میں تشریعی ربوبیت بھی خدا وندعالم سے مخصوص ہے،اور اس سلسلہ میں گفتگو ہوچکی ہے کہ تشریعی ربوبیت بھی خداہی کا حق ہے اور تشریعی ربوبیت کے دائرے میں توحید کا عقیدہ اس بات کا تقاضا کرتاہے کہ انسان فقط خدا سے

احکامات حاصل کرے اور اسی کے قانون پر عمل کرے، اور قانون کا نفاذ کرنے والے افراد بھی خدا کی اجازت ہی سے معاشرہ میں قانون جاری کر سکتے ہیں۔

کئی قانون سازوں کی ضرورت اور ایک شبہ اس منزل میں کچھ شبہات پیدا کئے گئے ہیں: (گذشتہ گفتگو میں اس طرح کے کچھ شکوک و شبہات کی طرف ایک اشارہ ہو چکا ہے، لیکن چونکہ اخبارات اور کبھی کبھی بعض تقریروں یا سیمناروں میں کچھ باتیں اس طرح کی جاتی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یا تو ان لوگوں نے ہماری باتوں پر توجہ نہیں کی یا یہ کہ یہ بحث ان سے ہضم نہیں ہو سکی ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ اس سلسلہ میں مزید وضاحت کر دی جائے) ان شبہات میں سے ایک یہ ہے : کہ آپ کہتے ہیں: قانون بنانے کا حق صرف خدا کو ہے اور توحید کے دائرے میں تشریعی ربوبیت اسی بات کا تقاضا کرتی ہے،

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ معاشرے میں ایسے قوانین کی ضرورت پڑتی ہے کہ جو خدا نے نہیں بنائے ہیں بلکہ خود لوگوں نے وہ قوانین بنائے ہیں، اور اگر ان کو نہ بنایا جاتا تو معاشرہ کے امور ٹھپ ہو جاتے، مثلاً وہ بہت سے قوانین جو ہمارے اسلامی معاشرہ میں اسلامی پارلیمینٹ بناتی ہے اور اس کو پاس کرتی ہے، ان قوانین کی ہمارے معاشرہ کو ضرورت ہے، لیکن ان کو خدا و پیغمبرؐ نے نہیں بنایا ہے، اور اس کا سب سے واضح نمونہ ٹریفک کے قوانین ہیں، چنانچہ اگر یہ قوانین نہ ہوتے تو نہ جانے کتنے حادثے ہوتے، کتنے لوگوں کی جان خطرہ میں پڑ جاتی اور کتنا مال برباد ہوتا۔

پس ایک طرف تو معاشرہ کو اس طرح کے قوانین کی ضرورت ہے اور دوسری طرف خدا کی طرف سے ایسے قوانین نہیں پیش کئے گئے ہیں، نہ تو قرآن مجید میں ٹریفک کے یہ قوانین پائے جاتے ہیں اور نہ ہی رسول اکرمؐ اور ائمہ معصومینؑ کے اقوال میں یہ قوانین ملتے ہیں، پس آپ کس طرح کہتے ہیں کہ تمام قوانین کا خدا کی طرف سے ہی ہونا لازم ہے اور صرف خدا کو ہی قوانین بنانے کا حق ہے؟! اور اگر عام قوانین بھی جو قانون ساز انسانوں کے ذریعہ بنائے گئے ہوں معتبر ہوں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ قانون بنانے کے

دو سرچشمے ہوں ایک خدا اور دوسرے خود انسان، تو اس کا لازمہ آپ کے بیان کے مطابق تشریع میں شرک ہے، یہ ایک قابل توجہ اعتراض ہے جو مختلف طریقوں سے بارہا اٹھایا گیا ہے البتہ اس کا جواب بھی دیا جا چکا ہے لیکن افسوس کہ جیسا چاہئے تھا لوگ جواب کو صحیح طور پر ہضم نہیں کر سکے ہیں۔

اس شبہ کا ازالہ گذشتہ اعتراض کے جواب میں دو نکتوں پر توجہ ضروری ہے، پہلا نکتہ تو یہ ہے کہ قانون کے لئے مختلف اصطلاحیں استعمال ہوتی ہیں، کبھی صرف کلی قواعد کو قانون کہا جاتا ہے، جزئی قواعد، دستور العمل اور نفاذ کے طریقوں کو اس میں شامل نہیں کیا جاتا ،اور کبھی قانون کی اصطلاح کو اتنی وسعت دی جاتی ہے کہ اس میں وہ اصول و مقررات بھی شامل کر دیئے جاتے ہیں جو ایک ادارہ کا سربراہ اپنے ماتحت کارکنوں کے لئے جاری کرتا ہے،البتہ یہ اطلاق بھی غلط نہیں ہے دوسرے الفاظ میں،یوں کہا جائے کہ قانون کی ایک اصطلاح خاص اور ایک عام ہے،اور دونوں صحیح ہے، دوسرا نکتہ یہ ہے کہ اسلام میں بہت سے ایسے مسلمہ اور مقررہ قوانین ہیں، جو کسی بھی حالت میں تبدیل نہیں ہو سکتے ،ہر زمانہ میں،تمام لوگوں کے لئے ایک اور اٹل ہیں اور اسلام کے کچھ قوانین افراد نیز زمان و مکان کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں اوران قوانین و ضوابط کو فقہأ و مجتہدین اور جن کو دین کی صحیح شناخت و معرفت حاصل ہے اسلام کے بیان کروہ کلی اصولوں تحت تظیم و ترتیب دیتے ہیں۔

ہم جس چیز پر زور دیتے ہیں وہ یہ کہ مقررہ ناقابل تبدیل قوانین صرف اور صرف خدا کی طرف سے ہوں اور متغیر قوانین کے لئے مخصوص دائرے معین ہوں، ورنہ ممکن ہی نہیں ہے کہ تمام متغیر اور غیر متغیر قوانین کسی ایک قانون ساز کے ذریعہ ہی بنائے جائیں، اور لوگوں تک پہونچا دیئے جائیں، مختلف معاشروں کے لئے لازم متغیر قوانین اپنے اپنے زمانوں اور جگہوں کے اعتبار سے بے شمار ہو سکتے ہیں،اور ان کی کوئی حد معین نہیں، اور انسانی ذہن وفکر دنیا کے آغاز سے لے کر انجام تک بنانے والے متغیر قوانین کے احصا سے عاجز ہے، لہذا ایسے قوانین کے ہر حصے زمان ومکان کے اعتبار سے ضروری تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے بنائے جاتے ہیں، مثال کے طور پر صدر اسلام میں جب کسی بھی طرح کی موٹر گاڑیاں نہیں تھیں اگر ڈرائیونگ اصول بیان کئے جاتے اور یہ

کہا جاتا کہ گاڑیوں کو دائیں طرف چلنا چاہئے یا بائیں طرف، تو کیا اس وقت کے لوگ اس قانون کو سمجھ سکتے، اور اس قانون کو درک کر سکتے تھے؟ لہٰذا اس طرح کے متغیر قانون کو اس کے زمانہ کے لحاظ سے ہی بننا چاہئے۔

البتہ غیر متغیر قوانین کے بھی کچھ خاص دائرے ہیں جو پہلے ہی خدا نے معین کردیئے ہیں، اور جو لوگ ان قوانین کو مرتب کریں ان کے لئے ضروری ہے کہ ان دائروں کا لحاظ کریں کچھ اقدار ومعیارات ہیں جن کو بہر حال نظر انداز نہیں کرنا چاہئے، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ قوانین وہی حضرات بنا سکتے ہیں جو متغیر قوانین اور غیر متغیر قوانین کے دائروں کو بہتر طریقہ سے پر جانتے ہوں۔

پس ہم جو یہ کہتے ہیں کہ قوانین خدا کی طرف سے ہونا چاہئے، ایک تو اس سے مراد غیر متغیر دائمی قوانین ہیں دوسرے یہ کہ متغیر قوانین کے لئے بھی تمام دائرے خدا کی طرف سے معین ہیں، جن متغیر قوانین کی صحت کے لئے میزان قرار دیا گیا ہے، اس سلسلہ میں قرآن مجید میں ایک قابل رسا تعبیر موجود ہے: (وَوَضَعَ الْمِيزَانَ أَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ[۱]) ''اور (بندوں کے درمیان) ترازو قائم کیا تاکہ تم لوگ تولنے میں حد سے تجاوز نہ کرو''

الٰہی اور توحیدی طرز فکر میں جس بات پر زور دیا گیا اور جس چیز کا تقاضا کیا گیا ہے ایک تیسرا نکتہ ہے جس کا ہم نے قانون بنانے کے سلسلہ میں ذکر کیا، اور وہ یہ ہے کہ قانون چونکہ امر ونہی پر مشتمل ہوتا ہے، قانون بنانے کا اسی کو حق حاصل ہے جو امر ونہی کا حق رکھتا ہے، اور یہ حق خدا کے علاوہ کوئی نہیں رکھتا، خود انسان ذاتی طور پر ایک دوسرے پر امر ونہی کا حق نہیں رکھتے لہٰذا اپنی طرف سے قانون بھی نہیں بنا سکتے اور نہ ہی اس کو جاری کر سکتے ہیں، لہٰذا اگر زمانہ اور جگہ کے لحاظ سے غیر مقررہ قوانین بنانا طے پا جائے

[۱] سورۂ الرحمن آیت ۷،۸۔

تو اس کی اجازت بھی خدا کی طرف سے ہونا ضروری ہے، کیونکہ بنیادی طور پر صرف وہی ہے جسے امر ونہی کا حق ہے،اور وہی دوسروں کو یہ حق عطا کر سکتا ہے تاکہ ان کے بنائے ہوئے قوانین معتبر ہو سکیں۔

دوسرا شبہ قانون سازی میں خدا کی اجازت کا غیر موثر ہوناایک دوسرا شبہ یہ پیدا کیا جاتا ہے کہ قانون سازی میں خدا کی اجازت کا معتبر ہونا چند لفظوں کے سوا اور کوئی اثر مرتب نہیں کرتا ایسا نہیں ہے کہ اس شرط سے حقائق یاقانون سازی کے عمل میں کوئی تغیر وتبدل ایجاد ہو، یہ صرف الفاظ کا کھیل ہے، مثلاً اسلامی پارلیمنٹ میں کچھ نمائندے جمع ہوکر مشورہ کرتے ہیں کہ عصر حاضر میں بدلتے ہوئے فلاں سماجی مسئلہ میں کیا قانون بنایا جائے،اور اس کے بعد ایک مخصوص قانون بنا دیتے ہیں،ایسے میں کیا فرق پڑتا ہے کہ خدا نے اجازت دی ہے یا نہیں؟ یہ صرف ایک لفظی بات ہے جس کا ہم استعمال کرتے ہیں ورنہ اس کا کوئی اثر نہیں ہے، معلوم ہوا کہ قانون کا معیار صرف یہ ہے کہ کچھ ماہرین فائدے اورنقصان کا جائزہ لیں اور مصلحتوں کی تحقیق کے بعد ایک قانون بنادیں، اب اس سے کیا فرق پڑتاہے کہ یہ قانون ان لوگوں نے بنایا ہے کہ جنھیں قانون سازی کی اجازت حاصل یاعام قانون دانوں کے ذریعہ قانون بنادیا گیاہے، (ظاہر ہے یہ شبہ بھی خود اپنی حد میں اہم اور قابل توجہ ہے)۔

دوسرے شبہ کا جواب اس غلط فہمی کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ ہم جس اجازت کو معتبر جانتے ہیں، اصطلاحی طور پر ایک اعتباری چیزہے،اور دوسرے کوکسی کام کی اجازت دیدینے سے اصل کام کی حقیقت نہیں بدلتی، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا انسان کی سماجی زندگی ان اعتبارات کے بغیر حل ہو سکتی ہے؟ فرض کیجئے کسی شخص نے اپنی کارایک جگہ کھڑی کررکھی ہے او رآپ کواپنے نجی کام کے لئے اس کار کی ضرورت محسوس ہوئی تو کیا آپ دوسرے کی کارکو اس کی اجازت کے بغیر اپنے کام کے لئے لے جا سکتے ہیں؟ ہوسکتا ہے کہ کار کا مالک آپ کو اجازت بھی دیدے، لیکن جب تک اس کی اجازت نہیں ہے کیا آپ کو یہ حق ہے کہ اس کی کار لے جائیں؟ یا ڈرائیونگ کریں؟

بلا شبہ اگر مالک آپ کو اجازت دیدے تو آپ اس کو لے جا سکتے ہیں، لیکن جب تک مالک کی اجازت نہیں ہے اگر آپ کار میں بیٹھ کر کہیں جائیں گے آپ کا کام غیر قانونی ہوگا اور کار کا مالک شکایت کر سکتا اور آپ پر مقدمہ چلا سکتا ہے اور آپ کو سزا ہو سکتی ہے کیونکہ اس نے آپ کو اجازت نہیں دی تھی۔

یا دوسری مثال میں، تصور کیجئے ،ایک مرد ایکعورت آپس میں شادی کرنا چاہتے ہیں، کافی مدت سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں مثلاً عرصہ سے ایک ہی ادارے میں کام کرتے رہے ہیں اور ایک دوسرے کی عادتوں سے بھی واقف ہیں، ایک دوسرے کے گھر والوں کو بھی جانتے ہیں دونوں مومن دیندار ہیں، اور شادی کی تمام تیاریاں پوری ہو چکی ہیں؛ پھر بھی جب تک عقد نکاح نہ ہو جائے یا ان کے آئین و مذہب کے مطابق شادی کے رسم ورواج انجام نہ پا جائیں ،ان کے ازدواجی تعلقات جائز و مشروع نہیں ہوں گے، ٹھیک ہے عقد نکاح چند الفاظ کی ادائیگی کے علاوہ کچھ نہیں ہے جو دونوں کی مرضی سے جاری کئے جاتے ہیں،

لیکن یہ وہ الفاظ ہیں جن سے ہزاروں حرام چیزیں حلال ہو جاتی ہیں، اور ہزاروں حلال چیزیں حرام ہو جاتی ہیں،انسان کی اجتماعی زندگی ان ہی اعتباروں پر چلتی ہے، اور بنیادی طور پر سماجی زندگی ان ہی اجازتوں، دستخطوں، یا قبول وانکار کرنے پر موقوف واستوار ہے۔

ایک اور تیسری مثال : فرض کیجئے کسی کو آپ کے شہر کا ڈی ایم (D.M) معین کیا جانا طے پا چکا ہے لیکن ابھی اس کا حکم جاری نہیں ہوا ہے اور اس کو اس عنوان سے تعینات نہیں کیا گیا ہے، تو کیا اس کو حق حاصل ہے کہ وہ (D.M) کے دفتر میں جا کر بیٹھ جائے اور احکامات صادر کرے، ظاہر ہے اس کو یہ حق نہیں ہے،اگر اس نے ایسا کیا دوسرے ملازمین اس کو وہاں سے نکال باہر کریں گے، اور کہیں گے کہ یہ ڈی ایم کی کرسی ہے!اب اگر وہ کہے کہ مجھ سے بات ہو چکی ہے یہ طے پا چکا ہے کہ مجھے ایک مہینہ کے بعد اس شہر کا ڈی.ایم بنا دیا جائے گا، تو جواب دیں گے کہ جس وقت آپ کے نام حکم جاری ہو گا آپ ہمارے ڈی ایم ہونگے،

لیکن اگر وہ اصرار کرے کہ صرف ایک دستخط ہی تو باقی ہے، کیا فرق پڑتا ہے دستخط بعد میں ہو جائے گا تو کہیں گے جناب وہی ایک دستخط تو آپ کے اعتبار کی دلیل ہے، معلوم ہوا کہ تمام اجتماعی امور صرف ایک دستخط کے ذریعے قانونی حیثیت حاصل کرتے ہیں، قانون سازی بھی اسی طرح ہے،چونکہ قانون سازی خدا کا حق ہے،اس لئے صرف اسی کی اجازت سے دوسروں کے بنائے ہوئے قانون معتبر ہو سکتے ہیں،

اس کے بغیر یہ قوانین معتبر نہیں ہو سکتے:(قُلْ ءاللّٰہُ أَذِنَ لَکُمْ أَمْ عَلَی اللّٰہِ تَفْتَرُونَ[1])(۱)''(اے رسولؐ) آپ کہہ دیں کہ کیا خدا نے تمہیں اجازت دی ہے یا تم خدا پر بہتان باندھ رہے ہو''اگر خدا نے تم کو اجازت نہیں دی ہے تو تمہیں کیا حق ہے کہ تم کسی چیز کو حلال کہو یا حرام؟ جائز کہو یا ناجائز قانون بنانا یعنی یہی کہ یہ کام جائز ہے اور وہ کام جائز نہیں ہے، یا شرع کی زبان میںیہ کام حلال ہے اور وہ کام حرام ہے، جب تک آپ کو خدا کی طرف سے اجازت نہ ہوآپ کو اس طرح کے احکام صادر کرنے کا کیا حق ہے؟ جمہوری اسلامی ایران کی اسلامی پارلیمنٹ اور شاہ کے زمانہ کی قومی پارلیمنٹ میں صرف اسی ایک کلمہ کا فرق ہے کہ یہ پارلیمنٹ اس کے حکم سے کام کرتی ہے جو خدا کی طرف سے اجازت یافتہ ہے، یعنی ولی فقیہ کو متغیر قوانین بنانے کی اجازت حاصل ہے اور اس کی اجازت سے اس حکومت کے پارلمانی بلوں کو اعتبار حاصل ہوتا ہے۔

جب ولی فقیہ کوامام زمانہ (عج) کی طرف سے یہ حق حاصل ہے تو پھر دوسروں کو یہ حق نہیں دیا جا سکتا، جس طرح امام زمانہ (عج) کو خدا کی طرف سے یہ حق حاصل ہے اور کسی دوسرے کو یہ حق حاصل نہیں ہے؛ معلوم ہوا جس شخص کوبراہ راست یا بالواسطہ طور پر خداوندعالم کی طرف سے اجازت حاصل ہے وہ دوسروں کے امور میں تصرف اور دوسروں کو امر ونہی کرسکتا ہے، لیکن جس کو خدا کی طرف سے اجازت نہیں ہے وہ امر ونہی کا کوئی حق نہیں رکھتا چنانچہ اس کی امر ونہی بے فائدہ ہے۔

---

[1] سورۂ یونس آیت ۵۹۔

(ہم اپنی نظری اور تھیوری بحث میںیہ نہیں چاہتے کہ دوسرے افراد کے اقوال کو سند قرار دیں، لیکن امام خمینیؒ کو دوسرے افراد کی فہرست میں نہیں رکھا جا سکتا، ان کی گفتگو قرآن وحدیث سے ماخوذ ہوتی تھی، لہٰذا میں سمجھتا ہوں ان کی گفتگو سے سند پیش کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے) امام خمینیؒ اپنی ایک تقریر میں صاف طور پر فرماتے ہیں: ''یہاں تک کہ اگر صدر جمہوریہ بھی ولی فقیہ کی طرف سے منصوب نہ ہو تو طاغوت ہے اور اس کی اطاعت جائز نہیں ہے[1]'' صدر جمہوریہ کو خود عوام اپنے ووٹوں کے ذریعہ انتخاب کرتے ہیں لیکن اگر ولی فقیہ کی طرف سے اجازت حاصل نہ ہو تو امام خمینیؒ کے فرمان کے مطابق طاغوت ہے، اور اس کا امر ونہی معتبر نہیں ہے، اور اس کی اطاعت بھی جائز نہیں ہے۔

حضرت امام خمینیؒ نے تمام صدر جمہوریہ کو منصوب کرتے وقت اپنے تمام فرامین میں فرمایا ہے کہ میں آپ کو منصوب کرتا ہوں، (بعض مواقع پر آپ نے وضاحت کے ساتھ فرمایا ہے کہ جو الٰہی ولایت رکھتا ہوں اس کی بنیاد پر آپ کو عہدہ صدارت پر منصوب کرتا ہوں) حالانکہ لوگوں نے ان کو ووٹ دیا تھا اور ان کی ووٹنگ بھی صحیح تھی اور اس کی تائید بھی ہو گئی تھی۔ یقینا عوام کو اجتماعی کاموں میں شرکت کرنا چاہئے اور ان کا یہ ایک شرعی وظیفہ ہے کہ انتخابات میں شرکت کریں، اسی وجہ سے جس وقت انتخابات ہوتے تھے امام خمینیؒ فرماتے تھے: انتخابات میں شرکت ایک شرعی فریضہ ہے اور تمام لوگوں کا شریک ہونا ضروری ہے؛ لیکن بالآخر ہر قانون ساز وصاحب منصب کے کام کو شرعی و قانونی اعتبار خدا کی طرف سے حاصل ہوتا ہے، کیونکہ وہی دنیا کا مختار وصاحب اختیار ہے، خدا ہی نے پیغمبرؐ اور ائمہ معصومین علیہم السلام کو حکومت وقانون سازی کی اجازت دی ہے، اور پیغمبرؐ وائمہ معصومین علیہم السلام کی طرف سے ولی فقیہ کے مانند ایک تیسرے شخص کو حکم عمومی کے تحت یہ اجازت حاصل ہے جیسے کہ ائمہؑ کے زمانے کے عمال اور والی شہر خود ان کے حکم سے معین ہوتے تھے، امام معصوم کی اجازت اور دستخط سے ہی شرعی جواز پیدا کرتے تھے اور جب ان کو اجازت دی جاتی تھی وہ قانونی حیثیت اور اعتبار حاصل کرتے تھے۔

[1] صحیفہ نور ج۹ص ۲۵۱۔

پس اس شبہ کا جواب کہ اجازت ہونے یا نہ ہونے اور دستخط کرنے یا نہ کرنے سے کیا فرق پڑتا ہے، تو ہم کہیں گے کہ اس سے وہی فرق پڑتا ہے کہ جس کو آپ تمام اجتماعی امور میں لحاظ کرتے ہیں، جس ڈی ایم کو دفتر جوائن کرنے کا ابھی حکم نہیں آیا ہے وہ دوسروں سے کیا فرق رکھتا ہے؟کسی تعلیمی شعبہ کے ڈائریکٹر کو ڈیوٹی جوائنگ کا آرڈر صادر نہیں ہوا ہے آیا دوسروں سے کیا فرق رکھتا ہے؟جیسا کہ طے پا چکا ہے کہ جلد ہی ان کا جوائننگ آرڈر آجائے گا.

لیکن جب تک حکم صادر نہیں ہو ا ہے اس کو کسی طرح کی فعالیت کی اجازت نہیں ہے،جس وقت بھی حکم آ جائے گا سرکاری حیثیت حاصل ہوجائے گی،اور وہ صرف ایک دستخط سے لوگوں کے اموال میں تصرف کر سکتا ہے، ممکن ہے کوئی شخص اپنی لاکھوں کی دولت آپ کے سپرد کردے یا آپ کو بخش دے اور آپ کو اجازت دیدے کہ جس کام میں بھی چاہیں خرچ کریں یا کوئی اپنا مال ومنال وقف عام کردے یا کسی خاص آدمی کو بخش دے،بہر حال صرف ایک جملہ میں کہ ''میں نے اپنا مال تمہیں بخش دیا''کام تمام ہوجاتا ہے اور اس کے مال میں دخل وتصرف حلال ہوجاتا ہے،لیکن اگر اس کی اجازت نہ ہو اور اس نے نہ بخشا ہو،اس کے مال میں تصرف حرام ہے اور اگر کوئی اس کے مال میں اس طرح کا تصرف کرے تو وہ مجرم قرار دیا جا سکتا ہے۔

مختصر یہ کہ تمام اجتماعی مسائل اسی طرح کے اعتبارات پر قائم ہیں اور جب تک یہ اذن واجازت نہ ہو اجتماعی امور میں کوئی چیز قانونی حیثیت حاصل نہیں کرتی، تو پھر کس طرح کہا جاسکتا ہے کہ ایک شخص کو خدا کی طرف سے حکومت اور امر ونہی کرنے کے لئے اجازت کی ضرورت نہیں ہے؟!کیا خدا کی اجازت کے بغیر اس کے بندوں پر حکومت کی جا سکتی ہے؟ لوگ ہمارے غلام اور بندے تو ہیں نہیں کہ ہم کو ان پر حکومت کا حق حاصل ہو،وہ سب خدا کے بندے ہیں حاکم ورعایا سب خدا کی نظر میں برابر ہیں اور جب تک خدا اجازت نہ دے رہبر اورامت، حکام اور عوام الناس سب برابر ہیں اور جب خدا اجازت دیدے تب دوسروں پر اس کا امر ونہی معتبر اور قانونی ہوتا ہے۔

انسان کی خود اپنی سر نوشت پر حاکمیت ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ '' انسان اپنی تقدیر کا خود مالک ہے آپ کو اس سے کیا مطلب ہے اگرچہ پہلے بھی ہم نے اس موضوع پر گفتگو کی ہے لیکن چونکہ دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض اخباروں،رسالوں حتی بعض ممتاز افراد کی تقریروں میں بھی یہ بات اٹھائی گئی ہے نیز ریڈیو اور ''ٹی.وی'' سے نشر شدہ بعض گول میز کانفرنسوں میں بھی اس پر بحث کی جاتی رہی ہے کہ لوگوں کی آزادی محترم ہے،چونکہ ایران کے آئین میں بھی کہا گیاہے کہ لوگ اپنے تقدیر ساز فیصلوں پر خود حاکم ہیں،لہذا ضروری ہے کہ اس سلسلہ میں مزید وضاحت کردی جائے: حکمرانی کی اصطلاح، قانونی دائرے میں دو جگہ استعمال کی جاتی ہے(البتہ چونکہ الفاظ ایک دوسرے کے مشابہ ہیں، جن لوگوں کو پوری واقفیت نہیں ہے وہ ان الفاظ کوایک دوسرے کی جگہ استعمال کردیتے ہیں)

ایک یہ کہ عمومی اوربین الاقوامی حقوق کے ذیل میں کہا جاتا ہے کہ ہر قوم وملت اپنی تقدیر کے حوالے سے خود حکمرانی کا حق رکھتی ہے، یہ اصطلاح ایک مسلمہ اصول کے طور پر بین الاقوامی حقوق کے ذیل میں بیان ہوتی ہے،جو مختلف ممالک کے آپسی روابط اور ایک دوسرے کے مقابل ان کے موقف اورسامراجی طاقتوں سے مقابلہ آرائی جیسے مباحث میں افادیت رکھتی ہے. ۱۸ویں اور ۱۹ویں صدی عیسوی کے دوران خصوصاً مغربی ممالک میں سامراجیت کا دور دورہ تھاچنانچہ جس کے پاس بھی طاقت ہوتی تھی اسلحے کے زور پر یا حیلہ و فریب کے ذریعہ سر زمینوں پر قبضہ کرلیتا تھا،یااپنے کسی آلہ کار کو حکومت سونپ دیتا تھا یا خود اپنی طرف سے کسی نمائندہ کوحاکم معین کردیتا تھا جو وہاں حکومت کرتا تھا،یعنی ایک ملت کی سرنوشت اور تقدیروں کے فیصلے دوسروں کے ہاتھوں میں ہوتے تھے یاایک دوسرا ملک ان کا قیم اورمالک بن جاتا تھا،

اصل ''قیمومیت'' ان موضوعات میں سے ہے جس کا بین الاقوامی حقوق میں بیان کیا جاتا ہے، چنانچہ جب لوگ اس عالمی ظلم کی طرف متوجہ ہوئے اور اپنے حقوق کی بحالی کے لئے کھڑے ہوگئے تو قوموں کی حکمرانی کا مسئلہ اٹھایا گیا، اورآہستہ آہستہ اس نے بین الاقوامی حقوق میں اپنی جگہ بنالی، اور کہا جانے لگا کہ ہر قوم اپنی سرنوشت پرخود حاکم ہے؛ یعنی بڑی طاقتوں کوسامراجیت اور

قیمومیت کا حق نہیں ہے، ''قومی حاکمیت '' یعنی ہر قوم وملت دوسری قوم وملت کے مقابلے میں مستقل وخود مختار ہے اور اپنی تقدیر اس سر نوشت طے کرنے کے سلسلہ میں خود حاکم ہے اور کسی ملت کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ دوسری تمام ملتوں کا اپنے کو قیم وحاکم سمجھے، کسی بھی حکومت کو حق نہیں ہے کہ وہ کسی دوسرے ملک میں اپنی حکمرانی چلائے، پس یہ ایک ایسی اصطلاح ہے جو بین الاقوامی روابط کے دائرے میں استعمال ہوتی ہے۔

حکمرانی کی دوسری اصطلاح خود معاشرہ سے متعلق ہے، اور یہ اصول بنیادی حقوق سے مربوط ہے، یعنی ایک معاشرہ کہ جس میں مختلف گروہ اور مختلف اقوام رہتی ہے، (قطع نظر اس سے کہ اس معاشرہ کا دوسرے ملکوں اور معاشروں سے کیا رابطہ ہے) خود ان کے درمیان کسی قوم یا گروہ کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ خود سے دوسروں پر حکمراں بن جائے، ٹھیک اس طبقاتی نظام کے برخلاف جو دنیا کے بہت سے ملکوں میں پایا جاتا تھا، اور اس وقت کے رائج طبقاتی نظام کے تحت حکمراں طبقہ ایک مخصوص قوم اور ذات سے تعلق رکھتا تھا۔ ایک خاص نسل و خاندان اور خاص طبقے کے لوگ ہی حاکم ہوا کرتے تھے یہ اصول جس میں اپنی تقدیر پر ہر شخص کی حکمرانی کا بیان لوگوں پر ایک مخصوص طبقے،ایک مخصوص نسل اور خاندان یا مخصوص شخص کی حکمرانی کی نفی کرتا ہے اور اس اصول کے تحت کوئی بھی شخص اور کوئی بھی گروہ اور نسل و خاندان خود کو کسی اور قوم و قبیلے کا حکمراں نہیں کہہ سکتا، پس کسی بھی معاشرہ کے اندر کوئی فرد اپنے آپ یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں فلاں افراد یا فلاں قبیلہ کا حاکم ہوں،جی ہاں یہ بھی ایک اصول ہے۔

ہم نے یہ جو کچھ عرض کیا ،اس سے مراد اس بات کی طرف توجہ دلانا تھا کہ اس اصول کا اصل محور انسانوں کے باہمی تعلقات میں چاہے وہ پہلا اصول ہو جس کا تعلق عام بین الاقوامی حقوق سے ہے ،اور جو قوموں، ملکوں اور حکومتوں کے درمیان آپسی رابطہ کا تعین اور اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ ہر ملت اپنی سر نوشت اور تقدیر پر خود حاکم ہے اور کسی دوسرے ملک کو ان پر حکمرانی کا حق نہیں ہے، اور اس بنیاد پر یہ اصول پورے عالم بشریت پر، حتی جو لوگ دوسرے معاشروں سے تعلق رکھتے ہیں ان پر بھی نظر رکھتا

ہے چاہے ان کا ایک ملک کے افراد کے بنیادی حقوق ہی سے تعلقکیوں نہ ہو اور جس کے مطابق ہر شخص اپنی تقدیر کے فیصلے خود کرتا ہے اور اپنی سرنوشت پر خود حاکم ہے، یعنی دوسرے کسی انسان کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اس پر حکومت کرے۔

بہر حال یہ تمام حقوق واصول انسانوں کے باہمی تعلقات اور رابطہ سے مربوط ہیں ان کا انسان اور خدا کے رابطہ سے کوئی تعلق نہیں ہے، جن لوگوں نے اس اصول کو بیان کیا ہے (چاہے کسی دین کو مانتے ہوں یا نہ مانتے ہوں) انھوں نے انسان اور خدا کے رابطہ کو کبھی سامنے نہیں رکھا ہے تاکہ یہ کہہ سکیں: خدا بھی انسانوں پر حکمرانی کا حق نہیں رکھتا، وہ یہ بیان کرنا نہیں چاہتے تھے بلکہ وہ انسانی یا حکومتی روابطوں کو بیان کرنا چاہتے تھے، مثلاً یہ کہ کیا عالمی سطح پر ایک سامراجی ملک کو یہ حق ہے کہ وہ قیم وحکمراں کی حیثیت سے کسی دوسرے ملک پر قبضہ کرے یا نہیں؟ یا ملکی سطح پر ایک گروہ ایک قبیلہ یا ایک طبقے کو یہ حق ہے کہ وہ دوسروں پر اپنے اختیار سے حکومت کرے اور ان کی سرنوشت اور تقدیر کا فیصلہ خود کرلے یا نہیں؟ وہ اس کا حق نہیں رکھتے؟!

انسان اپنی سرنوشت پر خود حاکم ہے اس کے معنی یہی ہیں کہ کسی دوسرے انسان کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اس پر اپنی آقائی اور حکمرانی مسلط کرے، نہ یہ کہ یہ حق خدا کو بھی نہیں ہے، اب اگر فرض کریں کہ وہ تمام لوگ کہ جنھوں نے ان قوانین کو بنایا اور ان اصولوں کو بیان کیا وہ سب کے سب بے دین تھے اور خدا کو نہیں مانتے تھے، پھر بھی جب اسلامی جمہوریۂ ایران کا آئین بن رہا تھا اور اس میں لکھا گیا تھا کہ ہر انسان اپنی سرنوشت پر خود حاکم ہے تو کیا یہاں بھی خدا کو نظر انداز کر دیا گیا تھا کیا اس کا مطلب یہ سمجھ لیا جائیکہ خدا کو بھی حق نہیں ہے کہ وہ انسانوں کو کوئی حکم دے؟ یا یہ کہ اس اصول کا مطلب وہی ہے جو اس وقت دنیا میں رائج ہے، جس کی بنیاد پر ایک انسان کو اپنے اختیار سے دوسرے انسان پر حکومت کرنے کا حق نہیں ہے کوئی انسان دوسروں کی سرنوشت پر حکمراں نہیں ہیں؟ ہرگز وہ یہ کہنا نہیں چاہتے تھے کہ خدا بھی حق حکمرانی نہیں رکھتا اور اس بات پر شواہد کے لئے دسیوں شقیں ہیں جو آئین میں موجود ہیں اور اس بات کو واضح طور پر بیان کرتی ہیں کہ معاشرہ میں الٰہی قوانین کا نفاذ ضروری ہے، ان اصولوں کی موجودگی کے

ہوتے ہوئے کس طرح یہ ممکن ہے کہ کوئی یہ سوچے کہ حکمرانی کا حق جو انسانوں کے لئے مقرر کیا گیا ہے اس میں خدا کی حکمرانی کی نفی کی گئی ہے، !کیا کوئی عقلمند انسان اسلامی جمہوریہ ایران کے آئین سے یہ نتیجہ نکال سکتا ہے؟!

انسان کی حکمرانی کا خدا کی حکمرانی کے ساتھ کوئی ٹکراؤ نہیں

ہم اپنی یہ بات اور زیادہ واضح کرنے کے لئے کچھ دوسرے علوم سے بھی مثالیں پیش کرتے ہیں تاکہ ہر ایک کو اچھی طرح سمجھ میں آجائے، اور شیطانی شکوک وشبہات اور سوء استفادہ کے لئے کوئی جگہ باقی نہ رہے: ''خود اعتمادی'' ایک ایسا مسئلہ ہے جس سے آج نہ صرف ہماری ملت بلکہ دنیا کے تمام لوگ پوری طرح واقف ہیں (کیونکہ یہ مفہوم آج عالمی تمدن کا ایک جز بن چکا ہے) یہ مسئلہ ''علم نفسیات'' سے مربوط ہے اور کہا یہ جاتا ہے کہ انسان کو اپنے آپ پر اعتماد ہونا چاہئے، یہ جملہ بار بار سننے میں اور کتابوں میں بھی بہت کثرت سے پڑھنے میں آتا ہے، اور ریڈیو اور ٹی وی پر تقریباً تمام بحثوں میں جس مسئلے پر بہت زور دیا جاتا ہے خصوصاً تربیتی اور خاندانی مسائل پر کی جانے والی گفتگو خود اعتمادی سے ہی مربوط ہوتی ہے، اکثر کہا جاتا ہے کہ بچوں کی اس طرح تربیت کی جائے کہ ان میں اپنے نفس پر اعتماد پیدا ہو، او رجوانوں کے ساتھ ایسا برتاؤ کریں کہ وہ خود پر اعتماد کرنا سیکھیں، اسی طرح اخلاقی مسائل میں اس بات پر بہت توجہ دی جاتی ہے کہ لوگوں کو اپنے نفس پر اعتماد کرنا چاہئے، دوسروں کے سہارے کا عادی نہیں بننا چاہئے دوسری طرف اسلام میں ایک اور چیز ''توکل'' اور خدا پر بھروسے اور اعتماد کے عنوان سے بیان ہوتی ہے کہ انسان کو خدا کے مقابلہ میں اپنے کو کچھ نہیں سمجھنا چاہئے، تمام چیزوں کو اسی سے طلب کرنا اور صرف اسی کو مالک و مختار ماننا چاہئے۔

(وَإِن يَمْسَسْكَ اللّهُ بِضُرٍّ فَلاَ كَاشِفَ لَهُ إِلاَّ هُوَ وَإِن يُرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلاَ رَآدَّ لِفَضْلِهِ يُصَيبُ بِهِ مَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَهُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ[1])

''(یاد رکھو) اگر خدا کی طرف سے تمہارے لئے کوئی ضرر و تکلیف مقرر کردی گئی تو پھر اس کے سوا کوئی اس کا دفع کرنے والا نہیں ہے، اور اگر وہ تمہارے ساتھ بھلائی کا فیصلہ کرلے تو پھر اس کے فضل وکرم کا پلٹانے والا بھی کوئی نہیں ہے وہ اپنے بندوں

[1] سورہ یونس آیت ۱۰۷۔

میں سے جسے چاہتا فائدہ پہونچاتا ہے او روہ تو بڑا بخشنے والا مہربان ہے‘‘نفع ونقصان اس کی طرف سے ہے اور خدا کے مقابلہ میں انسان کا ارادہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا ،انسان خدا کی عظمت کے مقابلہ میں بہت ہی حقیر ہے، اسلامی اور قرآنی تعلیمات میں کوشش کی گئی ہے کہ انسان کی اس طرح تربیت ہو کہ وہ اپنے کو خدا کے مقابلہ میں بہت ہی حقیر اور ناچیز تصور کرے، چنانچہ اسلام میں تربیت کی بنیاد ہی انسان کی بندگی اور اللہ کی ربوبیت پر استوار ہے۔

ایسے میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ دونوں باتیں کس طرح ممکن ہیں؟ ایک طرف تو انسان اپنے نفس پر اعتماد رکھے اور دوسری طرف خدا کے مقابلہ میں اپنے کو ناچیز بھی تصور کرے؟ کیا خود کو خدا کے مقابلہ میں ناچیز تصور کرنا خود اعتمادی کے ساتھ میل کھاتا ہے؟ اور کیا علم نفسیات میں اپنی شخصیت کا احساس کرنے اور شخصیت کے پروان چڑھانے کی مانند مفاہیم کے ساتھ جو خاص طور پر تربیت کے دائرے میں ماہرین نفسیات بیان کرتے ہیں، خدا پر توکّل کا یہ تصور مناسب کہا جا سکتا ہے؟ یہ تصور بھی اسی شبہ کی طرح ہے جو حکمرانی کے بارے میں اٹھایا جاتا ہے، وہ سیاسی مسائل کے دائرے میں ایک انسان پر دوسرے انسان کی حکمرانی کے مسئلے سے مربوط ہے اور یہ شبہ علم نفسیات کے اخلاقی وتربیتی مسائل سے تعلق رکھتا ہے. ہم نے یہاں ان دونوں مسائل کا ایک ساتھ موازنہ کیا ہے، کیونکہ یہ دونوں مسئلے آپس میں جو اشتراک رکھتے ہیں حقیقت کو سمجھنے کے لئے ذہنوں کو آمادہ کرتے ہیں، علم نفسیات کے اس مسئلہ میں دوسرے انسانوں پر اعتماد کرنے کے بجائے خود اپنے نفس پر اعتماد کی تاکید ہے، اور کہا گیا ہے کہ بچوں کی اس طرح تربیت کی جائے کہ وہ اپنے ماں باپ، عزیزو اقارب، دوستوں اور پڑوسیوں پر اعتماد و بھروسہ نہ کریں، تاکہ خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکیں، نہ یہ کہ اپنے کو خدا کا بھی محتاج نہ مانیں۔

دراصل ایک دوسرے انسانوں کے ساتھ انسانی رابطہ کے متعلق گفتگو ہے ’’خود اعتمادی‘‘کا مطلب یہی ہے کہ اپنے عمل وکردار کو اتنا مستغنی کر لو اور ارادے کو اس قدر محکم بنا لو کہ کسی دوسرے پر اعتماد نہ کرنا پڑے یہ وہ دستور ہے، اسلام میں بھی جس کی تاکید ہوئی ہے، حضرت رسول اکرمؐ او رائمہ معصومین علیہم السلام کی سیرت میں بھی اس بات پر زور دیا گیا ہے، لیکن افسوس! ان مسائل پر اتنی

کم توجہ دی گئی ہے کہ ہم سمجھنے لگے ہیں کہ اس طرح کے مسائل مغربی ممالک کی جدت طرازی ہے،آنحضرتؐ کے زمانہ میں آپ کے اصحاب کی اس طرح تربیت کی گئی تھی کہ اگر کوئی گھوڑے پر سوار کہیں جارہا ہوتا اور اس کے ہاتھ سے تازیانہ نیچے گرجاتا تھاتو وہ اپنے کسی دوست سے جو اس کے پہلو میں چل رہا ہوتا تھازیانہ اٹھانے کی فرمائش نہیں کرتا تھا ،بلکہ خود گھوڑے سے اتر کر اٹھاتا،او رپھر گھوڑے پر سوار ہوجاتا تھا !یہ اسلامی تربیت ہے جو خود اعتمادی کے باب میں ہم سے یہ مطالبہ کرتیہے کہ اپنے پیروں پر کھڑے ہوں،اپنا بوجھ خود اٹھائیں،او رخود کو دوسروں کا محتاج نہ بنائیں،اور دوسروں کوحرص کی نگاہ سے نہ دیکھیں، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خدا کے مقابلہ میں بھی اپنے کو بے نیاز سمجھیں:(یَا أَیُّہَا النَّاسُ أَنْتُمْ الْفُقَرَاءُ إِلَی اللهِ وَاللهُ ہُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیدُ[۱]) ''لوگو!تم سب کے سب خدا کے(ہروقت)محتاج ہو اور (صرف)خدا ہی (سب سے) بے نیاز، سزاوار حمد (وثنا) ہے''

کیا یہ سر سے پاؤں تک فقر ومحتاجی میں غرق انسان اپنے کو خدا سے بے نیاز سمجھ سکتا ہے ؟خدا کے مقابلہ میں بے نیازی کا اظہار بھی شرک ہے، لہٰذا خود اعتمادی کے یہ معنی نہیں ہیں کہ خدا پر بھی بھروسہ نہ رکھا جائے،اور اگر کوئی یہ کہے کہ خدا پر بھی اعتماد نہ کرو، تو یہ قرآن کریم کی تعلیمات اوراسلام کی روح کے بالکل خلاف ہے، سیکڑوں آیات وروایات اس سلسلہ میں موجود ہیں کہ انسان خدا کے مقابلہ میں اپنے کو ہیچ سمجھے، اور تمام چیزیں خدا سے طلب کرے، اور اس بات کا خود اعتمادی کے مسٔلے سے کوئی تعلق نہیں ہے،کیونکہ خودپر اعتماد کا مسٔلہ خود انسانوں کے درمیان رابطہ کو بیان کرتا ہے کہ اپنے جیسے دوسرے انسانوں پر تکیہ نہیں کرنا چاہئے کیونکہ کوئی کسی دوسرے پر کچھ امتیاز نہیں رکھتا ۔

لہٰذا اس بات کے جواب میں کہ خود اعتمادی اور خدا پر توکل وبھروسہ دونوں ایک ساتھ کیسے جمع ہو سکتے ہیں، یہ کہا جا سکتا ہے کہ خود اعتمادی کا تعلق خودانسانوں کے باہمی رابطہ سے ہے، کہ وہ ایک دوسرے پر بھروسہ نہ کریں اور کسی کوبلاوجہ دوسروں سے بالاتر نہ

[۱] سورۂ فاطر آیت ۱۵۔

سمجھیں نہ یہ کہ خدا پر بھی اعتماد اور بھروسہ نہ کریں چنانچہ سیاسی مسائل کے دائرے میں، انسان کی شخصی حاکمیت اور قومی حاکمیت کا مسئلہ بھی اسی طرح کا ہے،قومی حکمرانی کا مطلب ہے کہ ہر ملت خود اپنے پیروں پر کھڑی ہو اور دوسروں کو بھی یہ حق نہیں ہے کہ ان پر حکمرانی جتائیں اور تسلط اختیار کریں. انسان کی خودپر حکمرانی کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی دوسرا انسان اپنے آپ خود کو دوسروں کا حاکم تصور نہ کرے اور حکومت پر قابض نہ ہو نہ یہ کہ خداوندعالم بھی کسی پر حکمرانی کا حق نہیں رکھتا،دوسرے الفاظ میں یوں کہا جائے کہ انفرادی اورقومی حاکمیت کا حق خدا کی حاکمیت کے تحت طول میں ہے اس کے عوض میں نہیں ہے یعنی اصل میں حاکمیت کا حق خدا سے مخصوص ہے،اور اسی کے حکم کے تحت طول میں جن کو خدا نے حکومت کی اجازت دی ہے،اسی سطح اور دائرے میں جو خدانے معین کر دیا ہے انھیں حکومت کا حق حاصل ہے،اگر خدا کی طرف سے اجازت نہ ہو تو کسی انسان کو دوسرے انسان پر حکومت کا حق نہیں ہے۔

انیسویں تقریر

حکومت اور سیاست کے دائرہ میں اسلام کی خصوصیت

گذشتہ مطالب پر ایک نظرگذشتہ گفتگو میں ہم نے عرض کیا کہ بعض لوگ اسلامی حکومت کی بر قراری پر اعتراض کرتے ہیں ان کی نظر میں اسلامی حکومت کے نفاذ کا لازمہ یہ ہے کہ انسان کی انفرادی آزادیاں محدود ہوجائیں، اور چونکہ یہ آزادیاں ہرانسان کا فطری حق ہیں، اسلامی حکومت حق نہیں رکھتی کہ وہ ان آزادیوں کو محدود کرے ، چنانچہ اس طرح کی حکومت قبول نہیں کی جاسکتی. اس کے جواب میں ہم نے عرض کیا تھا کہ قانون کی اصل وبنیاد یہ ہے کہ وہ آزادی کے دائرے معین کرتا ہے،چونکہ انسان اپنے فیصلوں میںآزاد ہے اور انتخاب کی قوت رکھتا ہے اپنی مختلف اور بعض وقت متضاد خواہشات کا جائزہ لے کران کے درمیان سے اپنے لئے بہتر ایک یا چند خواہشوں کا انتخاب اور تعین کرتا ہے ایسے میں اس بات کا امکان ہے کہ یہ انتخاب بعض اوقات، معاشرہ یا خود اسی کے لئے ضرر ونقصان پر تمام ہو؛ لہٰذا ان آزادیوں کے لئے کوئی ایک قانونی دائرہ معین ہونا چاہئے. لہٰذا یہ خیال کہ آزادی پوری طرح، اور ہر حال میں مطلوب ہے سراسر نامناسب اور باطل ہے، اور فکر ونظر کی دنیا میں ہم کسی ایسے شخص کونہیں جانتے جو کسی بھی قسم کی محدودیت کے بغیر آزادی مطلق پر یقین رکھتا ہو،بلکہ تمام دانشورں کا کہنا ہے کہ وہ آزادی جو مقصود و مطلوب ہے شرعی اور قانونی دائرے میں ہونا چاہئے، کیونکہ اگر آزدای کے دائرے معین نہ ہوں تو معاشرے میں افرا تفری پھیل جائے گی اوریہ چیزانسانیت کے لئے نقصان دہ ہوگی ۔

ہمارے ملک کے آئین میں جائزآزادیوں کو قبول کیا گیا ہے، اور شرعی اصطلاح کے مطابق، جائز آزادیاں وہ آزادیاں ہیں جن کو شرع مقدس نے جائز قرار دیا ہے، اور مروجہ عرف کے مطابق یہ قانونی آزادی کے معنی میں ہے، اور چونکہ ہمارے ملک میں وہ قوانین معتبر ہیں جو اسلامی اصولوں کے مطابق ہیں،لہٰذا اسلامی حکومت میں الٰہی آزادیاں معتبر ہیں جو اسلام کی نگاہ میں شرعی اور

جائز ہیں،البتہ یہ جواب ان لوگوں کی نظر میں قابل قبول ہے جو اسلامی نظام او ر اسلامی جمہوریۂ ایران کے آئین کو قبول کرتے ہوں،اب ممکن ہے کوئی اسلامی نظام اوراس کے آئین کو قبول نہ کرتا ہو ،او ر اسلام اورایران کے آئین سے صرف نظر کرتے ہوئے یہ بنیادی اور اساسی قسم کا سوال اٹھائے اور کہے کہ کس دلیل کے تحت آزادی پر وہ حد بندیاں لگائی جا سکتی ہیں جو اسلام نے قبول کی ہیں؟! اسلام کی تجویز کردہ آزادی کی حد بندیوں سے کیوں آگے نہیں بڑھا جاسکتا؟ اس سوال کے جواب کے لئے کچھ مقدمات بیان کردینا ضروری ہیں،البتہ ان میں سے بعض باتیں تسلیم شدہ اصول کے لحاظ سے قبول کرنا پڑیں گی، کیونکہ یہ دوسرے علوم، مثلاً کلام، فلسفہ اور الہٰیات سے تعلق رکھتی ہیں کہ جن کو ہمیں تسلیم کرکے ہی چلنا ہوگا، کیونکہ اگر ہم ان بحثوں کی تفصیل میں جاتے ہیں تو اصل گفتگو سے دور ہوجائیں گے، البتہ ان میں بعض تمہیدی باتیں ذہن سے قریب ہیں جن پر یہاں بحث کی جاسکتی ہے۔

حکومت سے مخصوص کاموں کے بارے میں تین نظریے جس وقت ہم کہتے ہیں کہ حکومت کا کام معاشرہ میں قانون کا نفاذ کرنا ہے یا دوسرے لفظوں میں حکومت کے دواہم اور بنیادی رکن ہیں قانون سازی اور قانون پر عمل در آمد ؛تو اب ان قوانین کے لئے کوئی معیار وضابطہ ہونا چاہئے جن کی روشنی میںیہ قوانین بنائے جائیں.چنانچہ وہ معیارات وضوابط جن کوملحوظ رکھا جاتا ہے اس بات سے تعلق رکھتے ہیں کہ حکومت کی تشکیل اور قوانین بنانے کاہدف او رمقصد کیا ہوسکتا ہے؟اسی وجہ سے فلسفۂ سیاست میں اس بنیادی سوال پر بحث ہوتی ہے کہ حکومت کی تشکیل کا مقصد کیا ہے؟جیسا کہ اس سلسلہ میں ہم نے گذشتہ بحثوں میں مختصر طور پر اشارہ کیا تھا ، لیکن اس جگہ تفصیلی طور پر اس بات کا جائزہ لینے کی کوشش کریں گے. (پہلے تو ہم حکومت کی تشکیل کے مقاصد کے بارے میں فہرست وار تین نظریے بیان کردیں تاکہ گفتگو کے باہمی تعلق کو بہتر طور پر سمجھا جا سکے پھر تفصیلی بحث میں داخل ہونگے):

۱۔یورپ میں بیداری کی تحریک رنسانس کا دور گزرجانے کے بعد بعض سیاسی فلاسفہ مثلاً ''ہابز'' نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ حکومت کا ہدف او ر ذمہ داری فقط معاشرہ میں نظم اورامن و تحفظ کو بر قرار کرنا ہے؛ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جائے : حکومت کا کام ملک کے اندر اور باہر امن و تحفظ قائم کرنا ہے،یعنی حکومت کی اصل ذمہ داری یہ ہے کہ ایسے اصول و قوانین جاری کرے ، جو

معاشرہ میں نا امنی اورافراتفری پھیلینسے روکے،اور غیر ملکیاوربیرونی خطرات سے حفاظت کے لئے دفاعی قوت تشکیل دے ،تاکہ ملک اوراس کے اصل وجود کی حفاظتھو سکے۔

۲۔بعض لوگوں کا کہنا ہے: حکومت کی ذمہ داری معاشرہ میں نظم اور امن و تحفظ کی برقراری کے ساتھ عدل وانصاف قائم کرنا بھی ہے .

یہیں سے قانون،انصاف اورآزادی کے بارے میں ایک گہری بحث (خصوصاً سیاسی سماجیات کے ماہرین کے درمیان) شروع ہوئی ہے اورانھوں نے اس سلسلہ میں بہت سی کتابیں بھی لکھی ہیں کہ آزادی ،قانون اور انصاف کے درمیان کیا رشتہ ہے؟ اب اگر ہم قبول کریں کہ حکومت کی ذمہ داری معاشرہ میں امن وتحفظ کی برقراری کے ساتھ عدل وانصاف قائم کرنا بھی ہے، تو یہ سوال پیدا ہوگا کہ خود عدل وانصاف کے کیا معنی ہیں؟ عدل وانصاف کی حقیقت اور اس کے بنیادی اصولوں کے بارے میں، مسلم وغیر مسلم دانشوروں نے بہت سی تفسیریں بیان کی ہیں، اور متفقہ طور پر عدالت کے سلسلے میں ایک جامع مفہوم کے عنوان سے جس بات کو سبھی قبول کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ ''ہر ایک کو اس کا حق دیا جانا چاہئے''

اگر چہ انصاف کے اس مفہوم کو تقریباً سبھی دانشوروں نے قبول کیا ہے؛ لیکن خود حق کی تعریف اور اس کے حدود کے تعین میں اختلاف ہے. اب چونکہ انصاف کی تعریف میں لفظ ''حق'' کا استعمال کیا گیا ہے، ہم یہاں ایک اور بحث چھیڑنے پر مجبور ہیں اور وہ یہ کہ آزادی، حق،قانون اور انصاف کے درمیان کیا رشتہ ہے تاکہ معلوم ہو سکے حق وانصاف میں باہم کیا رابطہ ہےچنانچہ بحث اگر یہاں ختم ہوتی ہے کہ ہر انسان کا ''حق'' یہ ہے کہ اس کے فطری منافع اور مصالح پورے ہوں چنانچہ وہ قانون عادلانہ ہے جس کے ذریعہ لوگوں کے حقوق یعنی وہ سب کچھ کہ جن کا انسان کی فطری ضرورتیں تقاضا کرتی ہیں،اجتماعی زندگی کے پرتو میں فراہم ہوں۔ اب چونکہ حق کی بات آگئی ہے، یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اجتماعی زندگی میں کون لوگ صاحب حق ہیں؟ کیا اجتماعی زندگی میں تمام لوگ صاحب حق ہیں یااجتماعی زندگی میں صرف ان ہی لوگوں کو حق حاصل ہے جو معاشرتی کارناموں میں حصہ دار ہیں؟ واضح طور پر یہ بات

عرض کردی جائے کہ وہ لوگ جو معذوراوراپاہج ہیں اور معاشرہ کی کوئی بھی خدمت انجام نہیں دے سکتے اسپتالوں یا آسائشگاہوں[1] (۱) میں رہتے ہیں اور اجتماعی زندگی اور کارناموں میں ان کا کوئی کردار نہیں ہوتا،کیا وہ بھی معاشرہ کے اندر حق رکھتے ہیں یا نہیں؟اگر حق اس خدمت کی وجہ سے ہوتاہے جو مختلف افراد معاشرہ میں انجام دیتے ہیں، تو ایسے افراد کا کوئی حق نہیں ہونا چاہئے؛کیونکہ یہ لوگ تو صرف دوسروں کی زحمتوں کے پھل سے فائدہ اٹھانے کے علاوہ معاشرہ کو کوئی فائدہ نہیں پہونچاتے!!۔

البتہ ممکن ہے جسمانی طور پر بعض معلول افراد اپنی فکر سے معاشرہ کی مدد کریں، لیکن ہماری گفتگو ایسے اپاہج لوگوں کے سلسلہ میں ہے جو پیدائش سے ہی جسمانی اور ذہنی طور پرتمام توانائیوں سے محروم ہیں اورمعاشرہ کوکسی بھی قسم کی جسمانی اور ذہنی خدمات سے فائدہ نہیں پہونچا سکتے،کیا ایسے لوگ بھی معاشرہ میں کسی قسم کا حق رکھتے ہیں؟!یا ایسا شخص جس نے صحت وسلامتی کے زمانہ میں اپنے معاشرہ کی خدمت کی اور پھر کام کرنے کے لائق نہیں رہا بوڑھا اور لاغر ہوگیا اور معاشرہ کی کوئی خدمت نہیں کرسکتا کیا ایسا شخص بھی معاشرہ میں حق رکھتا ہے یا نہیں؟سماجیات کے بعض ماہرین کے یہاں یہ رجحان بھی ملتا ہے کہ ایسے لوگوں کا معاشرہ میں کوئی حق نہیں ہے، اور حکومت کی ان کے تئیں کوئی ذمہ داری نہیں ہے، سویت یونین روس کی سابق مارکسسٹ حکومت میں ایسے افراد کوجن سے معاشرہ کوکوئی فائدہ نہیں تھا، کسی نہ کسی بہانہ سے ختم کردیا جاتا تھا۔

بعض دوسرے معاشروں میں بھی اس طرح کا رجحان موجود ہے. کیا معاشرہ میں حق پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے بدلے معاشرہ کی خدمت کی جائے؟کیا وہ اپاہج اور ناتواں افراد جو معاشرہ میں کوئی خدمت انجام نہیں دے سکتے اس حیثیت سے کہ وہ بھی انسان ہیں اور انسانوں میں پیدا ہوئے ہیں اور انسانوں میں زندگی گذار رہے ہیں، معاشرہ پرکوئی حق نہیں رکھتے؟افسوس ہے جو افراد یہ کہتے ہیں کہ حق معاشرہ میں خدمت کرنے سے حاصل ہوتا ہے ،ان لوگوں کے لئے کسی حق کے قائل نہیں ہیں کہ جو معاشرے کی کوئی خدمت نہیں کر سکتے اگر کچھ لوگ رحم و محبت کی وجہ سے ان لوگوں کی خدمت کرنا چاہتے ہیں اور ان کی رہائش

[1] وہ جگہ جہاں بوڑھوں اور لا وارث معذوروں کو رکھا جاتا ہے۔

کے لئے آسائشگاہ اور خیرات خانے بنواتے ہیں ،تو ٹھیک ہے بنوائیں، ورنہ کوئی ان کی زندگی اور موت کا ذمہ دار نہیں ہے!

۳۔ حکومت کی تشکیل کے ہدف کے بارے میں تیسرا نظریہ اسلامی ہے جس میں تمام مادی ضروریات کی تکمیل اور عدل وانصاف اور تحفظ کی برقراری کے علاوہ معاشرے کے معنوی اور روحانی ضرورتوں کو بھی پورا کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے۔

اسلامی اور غیر اسلامی حکومتوں کے کاموں میں ایک بنیادی فرق اسلام میں اس سے قطع نظر کہ ،امن و تحفظ،بیرونی دشمنوں کے مقابلہ میں ملک وقوم کا دفاع ،عدل وانصاف کی برقراری نیز معاشرہ کی خدمت کرنے والوں کے حق کی ادائیگی حکومت کی ذمہ داریوں میں شمار ہوتی ہے، احسان،یعنی معاشرہ کے ضعیف وکمزور افراد جو توانائی نہ ہونے کے سبب کسی بھی قسم کی خدمت انجام نہیں دے سکتے ان لوگوں کی خدمت بھی حکومت کے فرائض میں ہے؛ جیساکہ خداوندعالم قرآن مجید میں فرماتا ہے:(إن اللّٰہ یأمُرُ بالعَدْلِ وَالْاِحسانِ[1])(۱) ''بے شک خدا انصاف اور (لوگوں کے ساتھ) نیکی کرنے کا حکم کرتا ہے''

مسلمانوں کی ذمہ داری صرف عدل وانصاف قائم کرنا نہیں ہے بلکہ اس سے بڑھ کر بعض امور میں احسان بھی ضروری ہے، وہ نادار و ناتواں جو کوئی کام نہیں کر سکتے یا وہ اپاہج اورمعذور افراد جو معاشرہ میں کوئی خدمت نہیں کر سکتے،اس لحاظ سے کہ وہ انسان ہیں انسانی معاشرہ میں حق رکھتے ہیں اوراسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے کہ ان کی روز مرہ کی ضرورتوں کوپورا کرے۔

مذہب اسلام کا دوسرے مذاہب و مکاتب کے ساتھ ایک دوسرا فرق یہ بھی ہے کہ اسلام انسان کی ضرورتوں کو صرف اس کی مادی اور جسمانی ضرورتوں میں منحصر نہیں سمجھتا بلکہ معنوی اور اخروی ضرورتوں کو بھی پیش نظر رکھتا ہے؛ اسی وجہ سے اسلامی حکومت کی ذمہ داری ،لیبرل حکومتوں سے کہیں زیادہ سخت و سنگین ہے: لبرال حکومتیں منطقی طور پر صرف ان لوگوں کی جو معاشرہ میں خدمات انجام دیتے ہیں مادی ضرورتوں کوپورا کرنے کے علاوہ کوئی اورذمہ داری نہیں رکھتی،لیکن اسلامی حکومت کے لئے معاشرہ کی خدمت کرنے والوں کی مادی ضرورتوں کو پورا کرنے کے علاوہ اپاہج اورناتواں افراد کی امداد بھی لازم ہے، اس

---

[1] سورہ نحل آیت ۹۰۔

کے علاوہ انسانوں کی معنوی وروحانی احتیاجات کو پورا کرنا بھی اس کے فرائض میں شامل ہے ،اسی وجہ سے اسلامی حکومت کی ذمہ داری بہت بڑھ جاتی ہے ، اس بناپر اسلامی حکومت میں ایسے قوانین بنائے جانے ضروری ہیں کہ جن سے انسان کی تمام انفرادی اوراجتماعی، مادی او رمعنوی، دنیاوی اور اخروی مصلحتوں کو پورا کیا جا سکے، نہ صرف یہ کہ معاشرہ کے فعال افراد کے مادی مفادات اور ضرورتوں کی فکر اور حمایت کی جاتی رہے اور بس۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی نظریہ کے صحیح ہونے کی دلیل کیا ہے؟اور کہاں سے معلوم ہو کہ دوسرے نظریات صحیح نہیں ہیں؟ (توجہ رہے کہ ہماری یہ بحث صرف دینی بھائیوں سے نہیں ہے کہ ہم فقط آیات وروایات کے ذریعہ دلیل قائم کردیں،اگرچہ ہم نے جہاں آیات وروایات سے استدلال کا موقع آیا ہے، آیات وروایات سے بھی بحث کی ہے) سوچنے کا مقام ہے کہ کیا واقعاً انسانی معاشروں میں اس کے تمام مادی ومعنوی مفادات کا پورا کیا جانا ضروری ہے یا صرف مادی منفعتوں کا پورا ہونا کافی ہے؟ دوسرے الفاظ میں جیسا کہ ہم نے قانون اور حکومت کی تشکیل کے مقاصد کے ذیل میں عرض کیا آیا حکومت اور قانون کا مقصد صرف امن وتحفظ کی برقراری اورافراتفری کو روکنا ہے یا حکومت کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ انسان کی معنوی مصلحتوں پر توجہ دے؟ اس مسئلہ کو حل کرنے اور مذکورہ سوال کا جواب دینے کیلئے ضروری ہے کہ ایک قدم اور پیچھے ہٹیں اور اس سوال پر توجہ دیں کہ بنیادی طور پر انسانی معاشرہ کی تشکیل کا کیا ہدف ہو سکتا ہے؟

انسانی معاشرہ کی حقیقت اسلام کی نگاہ میں

انسانی معاشرہ کی تشکیل کے ہدف پر گفتگو سے پہلے،ضروری ہے کہ اس بات پر بحث ہو جائے کہ کیا انسان ذاتی طور پر شہد کی مکھی یا چیونٹی کی طرح کاایک اجتماعی وجود ہے ؟یا یہ کہ اجتماعی زندگی وہ چیز ہے جس کا انسان نے خود انتخاب کیا ہے؟اس سلسلہ میں بھی بہت سی بحثیں ہیں ہم تفصیل میں جانا نہیں چاہتے، صرف اس سلسلہ میں دو اہم نظریات کی طرف اشارہ کرتے ہیں:ایک نظر تو یہ ہے کہ اجتماعی زندگی کے لئے خود اپنے ارادۂ وختیار سے کوئی انسانی مقصد تسلیم کیا جائے۔

دوسرا نظریہ یہ ہے کہ نہیں اجتماعی زندگی کا کوئی مقصد نہیں ہے.جیسا کہ یہ نہیں کہا جاتا کہ کیوں شہد کی مکھیاں اجتماعی زندگی گذارتی ہیں، اور اس اجتماعی زندگی سے ان کا کیا مقصد ہے؟ ظاہر ہے شہد کی مکھیاں ایک فطری اور طبعی ہدف رکھتی ہیں اور وہ یہ کہ شہد بناتی رہیں اور اپنی عمر اسی میں گذارتی رہیں،اس کے علاوہ ان کی اجتماعی زندگی کا کوئی ہدف نہیں ہے،یقیناًخداوندعالم کی نظر میں شہد کی مکھیوں کے پیدا کرنے کے بھی اہداف ومقاصد ہیں جن میں سے ایک اہم مقصد انسانوں کی خدمت ہے،لیکن الٰہی اہداف سے قطع نظر خود شہد کی مکھیاں اپنی اجتماعی زندگی کا کوئی مقصد نہیں رکھتیں، تو کیا انسان کی اجتماعی زندگی بھی اسی طرح کی ہے اور فطرت کے ہاتھوں خود بخود یہ اجتماعی صورت حال پیدا ہوگئی ہے اور انسانوں کا اپنا کوئی ہدف نہیں ہے؟ یا یہ کہ نہیں انسان کی اجتماعی زندگی ایک خاص ہدف کے تحت ہے جس کا لازمہ ایک دوسرے سے رشتہ استوار کرنا ہے اور یہ رشتہ ایک خاص قوانین کا تقاضا کرتا ہے؟ اسلامی اورالٰہی نظریہ کے مطابق،انسان کی اجتماعی زندگی کا ایک ہدف اورایک مقصد ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان اجتماعی زندگی کے سایہ میں پلے بڑھے،ترقی کرے اور اپنے انسانی مقصد سے قریب ہو جائے. اس وقت سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان کی خلقت کا ہدف ومقصد کیا ہے؟ الٰہی طرز فکر کی بنیاد پر خصوصاً حضرت امام خمینیؒ اور دوسرے علماء کرام نے انقلاب کے دوران اور اس کے بعد لوگوں کے سامنے جو بیانات دئے ہیں اور ہم کو اسلامی معارف سے جس طرح آشنا کیا ہے، یہ بات ہمارے معاشرہ کے لئے روشن ہے کہ انسان کا آخری اور انتہائی مقصد خدا سے قریب ہونا ہے اور یہ انسانی کمال کی انتہا ہے۔

یقیناًیہ بات میں ابھی کچھ تک مبہم ہےاو رمزید وضاحت کی ضرورت ہے،لیکن ہمارے لئے یہاں اس مسئلے کو تفصیل سے بیان کرنے کا موقع نہیں ہے، اجمالی طور پر :جیسا کہ ہم نے عرض کیا اس بات کو سب قبول کرتے ہیں کہ انسان کی اجتماعی زندگی اپناایک مقصد رکھتی ہے،اب اگر ہم اس بات کو قبول کرلیں کہ انسان کی خلقت کا ہدف ومقصد وہ کمال ہے جو صرف خدا کے تقرب کے سایہ میں حاصل ہوسکتا ہے،تواجتماعی زندگی اس مقصدتک پہونچنے کیلئے ایک وسیلہ قرار پائے گی کہ انسان بہتر سے بہتر طورپر اس کمال تک پہونچ سکے،اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر اجتماعی زندگی نہ ہو تو انسان نہ توضروری معرفت حاصل کرسکتا اور نہ ہی ضروری عبادت انجام

دے سکتا اور نتیجہ میں وہ آخری کمال تک بھی نہیں پہونچ سکتا پس اجتماعی زندگی ہی وہ وسیلہ ہے جس کے تحت انسان تعلیم و تعلم سے گزرتا اورزندگی کے راستہ کو بہتر طور پر پہچان سکتا ہے، او راس کو طے کرنے کے لئے مواقع فراہم کرتاہے اور اس کے نتیجہ میں کمالات سے زیادہ نزدیک ہوتا ہے، اگر ان استدلالی بنیادوں کو اپنے مقام پر،جو ثابت کی جاچکی ہیں او رجن پر دلائل بھی موجود ہیں ہم قبول کرلیں تو نتیجہ یہ نکلتاہے کہ اجتماعی زندگی کا ہدف ومقصد انسانی کمال وارتقاء تک پہونچنا ہے البتہ یہ کمال صرف مادی پہلوؤں سے مخصوص نہیں ہے، بلکہ انسان کے تمام وجودی پہلوؤں کو کامل کرنے کا موقع ملنا چاہئے۔

معلوم ہواکہ اجتماعی زندگی کا ہدف ومقصد تمام انسانوں کے دنیوی اوراخروی ،مادی اور معنوی مفادات کو فراہم کرناہے، اور چونکہ تمام انسانوں کا یہی ہدف ہے لہٰذا تمام انسانوں کا اس زندگی میں حق ہے،اوراب جبکہ یہ ثابت ہوگیا کہ انسان کی اجتماعی زندگی کا ہدف صرف مادی منفعتوں کا پورا ہونا نہیں ہے ،اور قانون کا ہدف بھی صرف امن و تحفظ برقرارکرنا نہیں ہے تو امن و تحفظ سے بالاتر دوسرے اہداف کی جستجو بھی ہونا چاہئے ،دراصل امن و تحفظ اور آرام و آسائش اور مادی احتیاجات کی تکمیل اسی آخری کمال یعنی تقرب الٰہی تک پہونچنے کے لئے ایک مقدمہ ہے۔

بہر حال، اس نظریہ اور طرز فکر کی بنیاد پر انسان کی خلقت کا اصلی ہدف یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کے تمام پہلوؤں سے کمال وارتقاء اور تقرب الی اللہ کی منزلوں پر فائز ہو جائے، چونکہ انسانی وجود کے کئی پہلو ہیں اور ہر پہلو تہہ در تہہ متعدد پہلوؤں کا حامل ہےاور انسان ان تمام پہلوؤں سے تشکیل پایا ہے،اس بناپر تمام پہلوؤں میں ترقیپانے کی وجہ سے ،انسان کی حقیقی ترقی ممکن ہے، صرف مادی کمال، اجتماعی اوراقتصادی کمال یا ٹکنیکی ترقیاں ہی کافی نہیں ہے،مادی پہلوؤں اور معنوی پہلو مل کر انسان کی مجموعی حقیقت کو تشکیلدیتے ہیں ،اور اجتماعی زندگی کا ہدف ہمہ جہت تمام پہلوؤں سے انسانی ترقی کے مواقع فراہم کرناہے ،اس لئے سب سے اچھا قانون وہ قانون ہے کہ جس میں انسان کی تمام پہلوؤں سے ترقی کے لئیاسباب فراہم ہوں اور ان چیزوں کو مقدم رکھا گیا ہوکہ جن کے ذریعہ آخری ہدف یعنی قرب الٰہی تک پہونچا جا سکے۔

قانون ساز کے لئے لازم خصوصیات اسلامی حکومت یہ نہیں کہہ سکتی کہ ہماری ذمہ داری فقط معاشرہ میں امن و تحفظ قائم کرنا ہے، یہ تو ''ہابز'' کا نظریہ ہے جو کہتا ہے کہ تمام انسان بھیڑئے کہ طرح ہیں، جو ایک دوسرے کی جان کے درپے ہیں لہذا ایک طاقت ہونا چاہئے جو ان کو کنٹرول کر سکے. ان کو چاہئے کہ اپنا اختیار کسی ایسے شخص یا گروہ کے ہاتھ میں دیدیں جو ان کو کنٹرول کر سکے اور ایک دوسرے کے ظلم وستم سے بچا جا سکے، پس حکومت کی ذمہ داری امن و تحفظ کی برقراری بد نظمی کی روک تھام کے علاوہ کچھ نہیں ہے ،بے شک یہ نظریہ لا علمی پر مبنی انسان کے صرف ایک مادی پہلو کو سامنے رکھ کر پیش کیا گیاہے اور جانوروں کی اجتماعی زندگی کے لئے مناسب ہے نہ کہ انسانی معاشرے کے لئے جس کے افراد اپنے وجود کے لحاظ سے اشرف المخلوقات ہیں اور بہت سی صلاحیتوں کے مالک ہیں،اور ان کا ہدف بہت بلند وبالا ہے۔

اسلامی حکومت کو ایسے قوانین نافذ کرنا چاہئے جو انسان کے تمام وجودی پہلوؤں کو سمیٹ لے اور انسانی مصلحتوں کو تمام پہلوؤں سے پورا کر سکے،اور یہ چیز اسلامی پرچم کے زیر سایہ ہی عملی ہوسکتی ہے؛ ایسے قوانین کے لئے انسان کے تمام پہلوؤں کا پورا علم ہونا چاہئے.جن انسانوں کو ہم جانتے ہیں وہ سب کے سب انسانی وجود کے صرف بعض پہلوؤں کا مہارت کی حد تک علم رکھتے ہیں.عام انسانوں میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے کہ جسے انسان کے تمام پہلوؤں کا علم ہو.ہاں زمانہ قدیم میں ایسے فلاسفہ پائے جاتے ہیں جو اس طرح کا دعویٰ کرتے تھے.لیکن آج کے زمانہ میں انسان کا جہل،جتنا لوگ سوچتے تھے اس سے کہیں زیادہ واضح وآشکار ہوچکا ہے. انسانی وجود کے مختلف پہلو اس کے وجود میں اس طرح مخفی اور پیچیدہ ہیں کہ کوئی بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں انسان کے تمام پہلوؤں پر احاطہ رکھتا ہوں اور انسان کی تمام ضرورتوں کو بتا سکتا ہوں، اس کے علاوہ ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ کبھی کبھی انسان کی ان ضرورتوں کی تکمیل ایک دوسرے سے ٹکراتی ہے، ممکن ہے بعض اوقات معاشی ترقیاں ،الٰہی اور معنوی ترقیوں کی راہ میں رکاوٹ ہوں،یقیناً ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ کے نظام احسن میں تمام انسانی مصلحتوں کاپورا خیال رکھا گیاہے، لیکن ممکن ہے ایک معاشرہ میں کسی خاص زمانہ اور کسی خاص مقام پر انسانی مصلحتوں کے درمیان ٹکراؤ پیدا ہو اور مجبور ہو کر ان مصالح کی طبقہ بندی کی بنا پر ہمیں بعض

چیزوں کی اولیت کا قائل ہونا پڑے ،تاکہ اگر دو مصلحتوں میں ٹکراؤ کی صورت پیدا ہو تو ذمہ دار افراد کو معلوم ہو کہ کس کو کس پر مقدم کیا جائے؟ لہٰذا قانون ساز کا فریضہ ہے کہ ان ترجیحات کو بھی مشخص کرے اور یہی وہ منزل ہے جہاں انسان کی ناتوانی او رزیادہ ظاہر ہوجاتی ہے،کیونکہ اس طرح کے قوانین کا تعین انسان کے بس میں نہیں ہے۔

انسانی وجود کے تمام پہلوؤں پر احاطہ کے علاوہ ،قانون ساز کے لئے ایک اس سے بھی زیادہ اہم نکتہ یہ ہے کہ اس کو اپنی ذاتی او رجماعتی خواہشات سے منزہ اور بالاتر ہونا چاہئے تاکہ وہ معاشرہ کے مفادات کو اپنے یا اپنے گروہ اور جماعت کے مصالح پر مقدم کرے اور یہ کام ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے.اس کے لئے ایک متقی وپرہیزگار انسان کی ضرورت ہے جواپنے اور معاشرہ کے مفادات کے ٹکراؤ کے وقت ، معاشرہ کے مفادات کو مقدم کرے او راپنے یا اپنے گروہ کی مفادات سے چشم پوشی کرلے جوآزادانہ طور پر معاشرہ کی مصلحتوں کو اپنی مصلحتوں پر ترجیح دے سکتا ہو، لیکن معاشرہ میں ایسے افراد کا ملنا نہ صرف مشکل بلکہ تقریباً محال ہے. پس نتیجہ یہ نکلا کہ قانون ساز کے یہاں تمام مصلحتوں سے آگاہی کے ساتھ ساتھ یہ قوت و صلاحیت بھی ہونا چاہئے کہ وہ اپنے منافع پر معاشرہ کے منافع کو مقدم کر سکے ۔

یہی وہ مقام ہے جہاں الٰہی قانون کی برتری تمام انسانی قوانین پر پوری طرح واضح وروشن ہوجاتی ہے، کیونکہ اولاً خداوندعالم تمام لوگوں سے بہتر طور پرانسانی مصلحتوں کو جانتا ہے دوسرے یہ کہ خدا صرف انسانی مصلحتوں کو سامنے رکھتا ہے، اس کو انسانی اعمال کی کوئی ضرورت نہیں ہے،کہ اس کے اعمال سے اپنے لئے کسی مصلحت او رفائدہ کی بات سامنے رکھے اور نتیجہ میں مفاد کا ٹکراؤ پیدا ہو: خدا کوانسان کے کاموں سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتاکہ اس کا فائدہ دوسروں کے فائدے سے ٹکرائے.اور وہ اپنے فائدے میں فیصلہ کرے ۔

یہ تمام باتیں اس وقت ہیں کہ جب ہم انسانوں کے فوائد خدا کے حق ربوبیت سے الگ سمجھیں، لیکن اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق ان تمام چیزوں سے بالاتر ایک بلند مرتبہ کمال پایا جاتاہے جس تک انسان کو پہونچنا ہے، اورہم اسی بنیاد پر کہتے ہیں کہ بالفرض اگر انسان

کی مادی زندگی اور اجتماعی روابط سے متعلق تمام مصلحتویہاں تک کہ اس کی نفسیاتی اور روحانی مصلحتیں پوری ہوجائیں، پھر بھی یہ ایک مثالی معاشرہ نہیں ہو سکتا. اس طرح انسان او رمعاشرہ آخری ہدف تک نہیں پہونچ سکتا،کیونکہ منتہائے کمال خدا کی قربت میں ہے، اور یہ قربت خدا کی عبادت واطاعت اوربندگی سے ہی حاصل ہوسکتی ہے۔

اگر صحت وسلامتی، نظم و نسق،امن وسکون، اوردشمن سے مقابلہ اور دفاع کی قوت اور عدل وانصاف،دوسرے لفظوں میں انسان کے تمام تر اجتماعی حقوق فراہم ہوں، لیکن اس کی زندگی میں خدا کی عبادت کے لئے کوئی جگہ نہ ہو، تو سمجھئے ایسے انسان کمال کی آخری منزل تک نہیں پہونچ پائے او رخدا کی رضا وخوشنودی کے مستحق نہیں ہیں. اسلامی نظریہ کے مطابق ، یہ تمام چیزیں انسان کے لئے خدا سے رابطہ کا مقدمہ ہیں، انسان کا حقیقی کمال اسی رشتے سے وابستہ ہے جو خدا سے قائم ہوتا ہے.جب تک خدا سے رشتہ نہ ہو حقیقی انسان وجود میں نہیں آتا.نتیجہ یہ نکلا کہ انسان کا حقیقی کمال خدا سے تقرب میں ہے. خدا کاتقرب کوئی نعرہ نہیں ہے بلکہ ایک حقیقت اور معنوی رشتہ ہے جو خدا اور انسان کے درمیان برقرار ہوتا ہے،اورتمام انسان کمال و ارتقاء کے اس سفرمیں وجود کے مدارج کو طے کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں تاکہ اس بلند مقام تک پہنچ جائیں. اس بلند مقام کی پہچان عام انسانوں کے بس کی بات نہیں ہے،کیونکہ ان کو نہیں معلوم کہ انسان کے لئے اتنا عظیم مرتبہ بھی ہے،کہ جس کی وجہ سے وہ دنیا کی مادی خواہشات کی تکمیل کے ساتھ اس روحانی ومعنوی کمال تک پہنچنے کی بھی کوشش کرتے۔

اب سوال یہ ہے کہ جب خداوند عالم کو ہماری عبادت کی کوئی ضرورت نہیں ہے، تواس نے انسان کو عبادت کے لئے کیوں پیدا کیا اورکیوں اعلان کیا ہے ؟!(مَا خَلَقْتُ الجِنَ وَالاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُونِ[1]) ''اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اسی غرض سے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں''،جواب یہ ہے کہ انسان اپنے آخری کمال تک عبادت کے بغیر نہیں پہنچ سکتا، لہٰذا خدا کو پہچاننا اور اس کی اطاعت کرنا ضروری ہے تاکہ انسان اپنے حقیقی کمال تک پہنچنے کی راہ طے کر سکے.ان مقدمات کے پیش نظر ہم کہہ سکتے ہیں

[1] سورہ نحل آیت ۹۰۔

کہ وہ ہی قانون مناسب و مطلوب ہے جو معاشرہ کے فعال و سرگرم افراد کی مادی ومعنوی احتیاجات کو پورا کرنے کے ساتھ، ان مفلوج و اپاہج، بیکار وناتواں لوگوں کی احتیاجات بھی پورا کرے جو معاشرہ میں کسی بھیطرح کی فنی اور ہنری خدمت انجام نہیں دے سکتے، کیونکہ ان کے بھی حقوق ہیں۔

اسلامی حکومت کا فریضہ ہے کہ ان لوگوں کے حقوق بھی فراہم کرے، اور فقراء ومساکین اور مجبورولاچار نیز اپاہج لوگوں کی ضرورتوں کوپورا کرے کہ جو کچھ نہیں کر سکتے کیونکہ یہ بھی خدا کے بندے ہیں اور اسی انسانی معاشرہ میں پیدا ہوئے ہیں اور جب تک زندہ ہیں اور سانس لے رہے ہیں ان کے معاشرتی حقوق اور ضرورتیں پوری ہونی چاہئے. لہٰذا ضروری ہے معاشرہ میں وہ قوانین جاری ہوں کہ جن میں تمام لوگوں کے حقوق کو مدّ نظر رکھا گیا ہو، اسی وجہ سے قرآن نے عدل و انصاف کے علاوہ احسان پر بھی توجہ دلائی ہے، ارشاد ہوتا ہے:(إِنَّ اللّٰہَ یَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ[1]) ''بے شک خدا انصاف اور (لوگوں کے ساتھ) نیکی کرنے کا حکم دیتا ہے''

خدا وندعالم کے احکام صرف اخلاقی احکام نہیں ہیں،بلکہ وہ قوانین ہیں جن پر عمل کرنا واجب ہے، اور اگر صرف عدالت کی رعایت ضروری ہوتی تو پھر احسان کا اضافہ کرنے کیا ضرورت تھی؛ پس جس طرح معاشرہ میں عدل وانصاف قائم کرنا ضروری ہے، اسی طرح احسان یعنی حسن سلوک کی رعایت بھی واجب ہے اس معنی میں کہ معاشرہ میں صرف خدمات انجام دینے کے عوض حقوق ثابت نہیں ہوتے، بلکہ کچھ ایسے حقوق بھی ہیں جو خداوندعالم نے انسانی معاشرے کی ایک فرد کی حیثیت سے ہر انسان کے لئے مقرر فرمائے ہیں، یہاں تک کہ ان افراد کے لئے بھی حقوق میں ہیں جو اس دنیا میں، بدترین حالات میں، زندگی گذار رہے ہیں اورہاتھ پیریا آنکھ اور کان سے محروم ہیں اور فقط سانس لے رہے ہیں اور زندہ ہیں، حق رکھتے ہیں اور اسلامی حکومت کا فریضہ ہے کہ وہ ان کے حقوق کی رعایت کرے. لہٰذا اس طرح کے قوانین پر حکومت اسلامی کو توجہ دینا چاہئے، یہ نہیں سوچنا چاہئے کہ حکومت

[1] سورہ نحل آیت ۹۰۔

کی ذمہ داری فقط اتنی ہی ہے جتنی کی ہابز اور ''روسو'' یا دوسرے مغربی دانشوروں نے بتائی ہے، اس کی وجہ یہ ہے یا تو انہیں انسانی وجود کے بلند مراتب کی طرف توجہ نہیں تھی یا انسان کو ایک بھیڑیا صفت درندہ یا شہد کی مکھیوں اور چیونٹیوں کی طرح کا جانور مانتے تھے، لیکن اسلام کی نظر میں انسان اس طرح کے حیوانوں کی حد سے، اگرچہ وہ حیوان اجتماعی زندگی بھی رکھتے ہیں کہیں زیادہ بلند وبرتر ہے۔

پس قانون ایسا ہونا چاہئے جو انسان کی ان تمام مادی اور معنوی ضروتوں کو پورا کرے جو اس کے آخری کمال تک پہونچنے کے لئے کار آمد ہیں، اب اگر یہ مان لیا جائے کہ قانون میں انسان کی تمام مادّی ومعنوی مصلحتوں کی رعایت ضروری ہے تو کیا انسان کو ہر طرح کی آزادی دے جاسکتی ہے؟ انسان کو اگر اس منزل کمال تک پہونچنا ہے تو پھر اس کی خواہشوں کو محدود اور منظم کرنا پڑے گا، انسان کو ایک خاص راستہ پر چلنا ہوگا تاکہ اس بلند مقصد تک پہونچ سکے ورنہ کیا انسان کسی بھی راستہ پر چل کر اس بلند ہدف تک پہونچ سکتا ہے؟ وہ لوگ کہ جنھوں نے خدا کو نہیں پہچانا یا خدا کا انکار کردیا ہےنیز خدا اور اس کے ماننے والوں سے برسرپیکار ہیں کیا انسانی کمال تک پہونچ سکتے ہیں؟ کیا انہیں کمال تک پہونچنے کے لئے خدا کی عبادت کرنا ضروری نہیں ہے ؟ تو پھر کس طرح وہ لوگ جو خدا اور خدا کے مخالف ہیں انسانیت کے حقیقی کمال تک پہونچ سکتے ہیں؟ اگر اسلامی حکومت کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ انسانی ترقی کے تمام پہلوؤں خصوصاً اس کے الٰہی اور معنوی پہلو کے اجاگر ہونے کے لئے راہ ہموار کرے تو پھر انسانی خواہشوں کو ایک خاص دائرے میں تربیت اور پروان چڑھانے پر مجبور ہے اور اس طرح کے قوانین بنانا ضروری ہوں گےجو انسان کے لئے ان کمالات عالیہ تک پہونچنے میں کوئی رکاوٹ نہ بنیں۔

اسلامی قوانین اور لبرل قوانین میں اختلاف

مذکورہ مطالب کو اگر پیش نظر رکھیں تو اسلامی قوانین اور انسان کے خود ساختہ قوانین، خصوصاً لبرل معاشروں کے قوانین، کہ جو افراد کے لئے صرف ان کے معاشرتی خدمات کی وجہ سے ان کے حق کے قائل ہیں، میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے،

چنانچہ ہم اس سلسلہ میں چند نکات بیان کرتے ہیں۔

الف : لبرل معاشرے خود اپنی نظر کے مطابق ،ان لوگوں کے لئے جو اپنی کسی سماجی محرومی یا طبعی معذوری کی وجہ سے معاشرہ کی کوئی خدمت نہیں کر سکتے یا معاشرے کے لئےکوئی افادیت نہیں رکھتے کسی بھی طرح کے حق کے قائل نہیں ہیں،لیکن اسلام ان کے لئے بھی حقوق کا قائل ہے، ظاہر ہے اس صورت میں ان کے حقوق کی پاسبانی کے لئے کچھ اسباب و ذرائع بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہوں گے کیونکہ جب ایسے لوگوں کی ضرورتوں کو پورا کرنا ہے جو معاشرے کے محروم و معذور افراد ہیں اور خود اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے سے قاصر ہیں، معاشرے کی کسی بھی عنوان سے کوئی خدمت نہیں کر سکتے تو اس طرح کا کوئی ادارہ ہونا ضروری ہے ،جو ان کی ضرورتوں کو پورا کرے اور اس کام کے لئے لازم ہے کہ ہم دوسروں کی خواہشوں کو محدود کریں یعنی معاشرہ کے اصول کا ایک حصہ ان لوگوں سے مخصوص کیا جائے، جبکہ سب لوگ اس کو نہیں پسند کریں گے، لہذا ان کی خواہشات کو مہمیز اور محدود کرنا پڑے گا۔

ب : اجتماعی زندگی میں معاشرہ کے کچھ ایسے اجتماعی حقوق ہیں جب لوگوں کے انفرادی حقوق معاشرے کے اجتماعی حقوق سے ٹکراتے ہیں تو انہیں معاشرے کے اجتماعی حقوق کو مقدم کرنا پڑتا ہے اب یہ کہ معاشرے کے اجتماعی حقوق اور انفرادی حقوق میں ٹکراؤ کی صورت میں، معاشرے کے حقوق کو مقدم کیا جائے یا افراد کے ؟اس کا فیصلہ اس طرز فکر پر موقوف ہے جو شخصیت پرستی یا اجتماع پرستی کی حدتک مختلف معاشروں میں پایا جاتا ہے اور آج بھی کم بیش تمام مغربی معاشروں میں یہ رجحان موجود ہے البتہ مغربی دنیا میں شخصیت پرستی کے نظریہ کو زیادہ رجحان حاصل ہے اگر چہ اجتماع پرستی یا سوشلزم (Socialism) کا رجحان بھی دنیا میں کم وبیش پایا جاتا ہے جیسا کہ آپ اکثر دیکھتے ہیں کبھی کبھی سو شلسٹ حکومتیں یا سوشل ڈیموکریٹ طرز فکر حکومتیں دوسروں پر فوقیت حاصل کر لیتی ہیں ۔

بہر حال لبرل (Liberal)معاشروں میں لوگوں کے انفرادی حقوق کو اہمیت دیئے جانے کے مقابلے میں اسلام کے اندر معاشرتی حقوق کو انفرادی حقوق پر برتری حاصل ہے یعنی جس جگہ معاشرہ اور افراد کے شخصی حقوق میں ٹکراؤ پیدا ہوجائے خصوصاً اگر یہ ٹکراؤ بنیادی قسم کا ہو تو معاشرہ کے حقوق کو اسلام مقدم مانتا ہے۔ لبرل حکومتیں صرف اس وجہ سے کہ بازار کا ریٹ نہ خراب ہو اور سرمایہ داروں کا نقصان نہ پہونچے لاکھوں ٹن کھانے پینے کے سامان جلادیتے ہیں یا دریا میں بہا دیتے ہیں، دسیوں لاکھ انسانوں کا بھوک سے مرجانا ان کو منظور ہے لیکن ان کے مادی مفادات کا نقصان نہ ہونے پائے، جب کہ اسلام ہرگز اس طرح کے کام کی اجازت نہیں دیتا، اسلام کی نظر میں ایسے افراد کی خواہشوں اور آرزؤں کو محدود کیا جاتا ہے۔ لہٰذا ایسا نہیں ہے کہ اقصادی معاشی آزادی جس شکل میں بھی ہو فراہم کی جانی چاہئے بلکہ اس آزادی پر پابندی لگنا چاہئے۔پس جس طرح معاشرہ کے معذور و محروم افراد کے مفادات کی حفاظت کے لئے معاشرہ کے منافع کو محدود کرنا ضروری ہے اسی طرح معاشرہ کی مجموعی مصلحتوں کی خاطر افراد کی انفرادی خواہشوں کو محدود ہونا چاہئے تاکہ معاشرے کے اجتماعی مفادات اور مصلحتوں کو پورا کیا جا سکے۔

ج: اسلامی معاشرہ میں کچھ ایسے مسائل بھی ہیں جو بنیادی طور پر خود شخص سے تعلق رکھتے ہیں لیکن چونکہ ان کا اثر معاشرہ پر پڑتا ہے،لہٰذا وہ اجتماعی مسائل میں شمار ہوتے ہیں۔مثال کے طور پر اگر کوئی شخص اپنے گھر میں تنہا جہاں اس کو کوئی نہ دیکھ رہا ہو کسی گناہ کا مرتکب ہورہا ہے تو بے شک اس کا یہ گناہ فردی ہے اور جو قوانین اس طرح کی حرکتوں پر پابندی لگا تے ہیں ان کو ''اخلاقی قوانین'' کہتے ہیں (قطع نظر اس چیز سے کہ یہاں ''اخلاقی ''کی اصطلاح صحیح ہے یا نہیں)مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص تنہائی میں کسی گناہ کا مرتکب ہو اور دوسروں سے اس کا کوئی تعلق بھی نہ ہو تو حکومت کو اس میں مداخلت کا کوئی حق نہیں ہے اس بات کو تقریباً تمام سیاسی فلسفوں میں قبول کیا گیا ہے یعنی حکومت کا دائرہ معاشرہ سے تعلق رکھتا ہے نہ کہ اشخاص سے، لیکن یہاں ایک مسئلہ ہے جس پر اختلاف پایا جاتاہے کہ وہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ایسا کوئی کام انجام دے کہ وہ کم وبیش دوسروں میں سرایت کر جائے یا کم سے کم دوسرے لوگوں کو اس گناہ کی طرف مائل کرے تو کیا یہ کام اجتماعی پہلو پیدا کرے گا یا نہیں؟

اگر کوئی شخص سڑک پر یا کسی ایسی جگہ جہاں خاندان کے سبھی دوسرے لوگ اس کو دیکھ رہے ہوں کوئی گناہ کرتا ہے ،اور اس کو دیکھ کر دوسروں میں گناہ کی جرئت پیدا ہوتی ہے یا گناہ کا رجحان پیدا ہوتا ہے، تو ظاہر ہے اس کا یہ کام انفرادی حالت سے نکل کر اجتماعی شکل پیدا کرلیتا ہے ؛ توکیا ہمیں حق نہیں ہے کہ اس کام میں مداخلت کریں کیونکہ اس گناہ کا ضرر ونقصان خود اسی کو پہونچے گا ؟!

اسلام اس چیز کی اجازت نہیں دیتا، اسی وجہ سے تظاہر بہ فسق (کھلے عام گناہ کرنا) ایک اجتماعی مسئلہ شمار ہوتا ہے. اگر کوئی شخص دوسروں کے سامنے گناہ کا مرتکب ہوتا ہے تو یہ گناہ (اخلاقی خلاف ورزی کے مقابلہ میں) قانونی جرم ہے اور حکومت اس میں مداخلت کر سکتی ہے. وہ قانون جو اس طرح کے گناہوں سے منع کرتا ہے سرکاری قانون ہے جس پر عمل در آمد کی حکومت کی ذمہ داری ہے۔

لہٰذا اگر تنہائی میں کوئی گناہ انجام پائے او رکسی کو پتہ بھی نہ چلے تو اس سے حکومت کو سروکار نہیں ہے اور کسی عدالت کو حق نہیں ہے کہ اس پر مقدمہ چلائے، لیکن جیسے ہی کوئی گناہ اجتماعی صورت پیدا کرے گا اور دوسروں کی شمولیت کا باعث بنے گا قانونی او راجتماعی پہلو پیدا ہوجائے گا او رحکومت کی ذمہ داری ہوگی کہ ایسے گناہوں کی روک تھام کرے۔

د : گناہ کرنااور معاشرے کو ضرر پہونچانا صرف مادّی چیزوں میں منحصر نہیں ہے بلکہ حیثیت اور آبرو کو ضرر پہونچانا بھی گناہ اورجرم شمار ہوتا ہے. کسی بھی معاشرہ میں دوسروں کی بے عزتی او رتوہین کرنا چاہے جسمانی جارحیت (ہاتھا پائی وغیرہ) نہ ہو(صرف بد کلامی توہین آمیز جملے اور مذاق اڑانے کی حد تک ہو تو بھی) گناہ سمجھا جاتا ہے،او رچونکہ اس کادوسروں سے تعلق ہے حکومت کو اس سلسلہ میں تحقیق اور سزا دینے کا حق حاصل ہے،اسلامی معاشرہ میں دینی مقدسات کی توہین مسلمانوں کے حقوق کے ساتھ سب سے بڑی زیادتی ہے،او رجو کوئی اس طرح کی توہین کرتا ہے سخت ترین سزا کا مستحق سمجھا جاتا ہے،چونکہ اسلامی معاشرہ میں دینی مقدسات سے بڑھ کرکوئی چیز نہیں ہے،اس کے لئے اہل اسلام سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں. لہٰذا دینی

مقدسات کی توہین سب سے بڑا جرم ہے۔چنانچہ اس طرح کے جرم کی سزا بھی سب سے سخت سزا ہونی چاہئے،اسی روشنی میں ارتداد کے احکام قابل فہم ہیں کہ اگر کوئی مرتد ہوجائے اور اسلامی مقدسات کی توہین کرے تو اس سے کوئی معاملہ نہیں کیا جاسکتا،اگر کوئی پیغمبر اکرمؐ یا دوسرے کسی بھی قسم کے مذہبی مقدسات کی توہین کرے تو اسلام کی نظر میں اس کی سزا پھانسی ہے؟کیونکہ اس نے اسلام کے سب سے بڑے جرم کا ارتکاب کیا ہے، مسلمانوں کے نزدیک مذہبی مقدسات سے زیادہ مقدس کوئی چیز نہیں ہے اور ان مقدسات کی توہین سب سے بڑا جرم ہے۔

لہٰذا اس کی سزا بھی سب سے بڑی یعنی پھانسی ہے اور یہ بھی ایک بنیادی اختلاف ہے جو اسلام اور لبرل نظریات میں پایا جاتا ہے۔وہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر کسی نے آپ کو گالی دی ہے تو آپ بھی گالی دیدیں، یہ کوئی جرم نہیں ہے؛ زبان کچھ بھی کہنے میں آزاد ہے! مثلاً اگر کسی نے آپ کے پیغمبر کو برا کہا ہے تو آپ اس کے پیغمبر کو برا کہہ دیں. لیکن اسلام کا نظریہ یہ نہیں ہے،اسلام میں اسلامی مقدسات کی توہین سب سے بڑا جرم ہے اوراس کے لئے سخت ترین سزا معین کی گئی ہے صرف قانونی پہلو نہیں رکھتی بلکہ جرم او رسزاکا پہلو بھی رکھتی ہے، اس طرح کی توہین صرف ایک فرد کی بے احترامی نہیں ہے بلکہ پورے اسلامی معاشرہ کی بے حرمتی ہے. قانونی مسائل افراد کے درمیان ایک دوسرے تعلقات سے مربوط ہوتے ہیں: اگر کسی نے کسی کو طمانچہ مارا ہے تو اسے بھی بدلا لینے کا حق ہے، وہ اس کی شکایت عدالت میں بھی کرسکتا ہے او رممکن ہے اس کو جیل بھیج دیا جائے یا مالی جرمانہ دینا پڑے؛ لیکن اگرمدعی معاف کردے تو قضیہ تمام ہوجاتا ہے عدالت بھی اس کے خلاف کچھ نہیں کر سکتی، لیکن جرائم کے احکام میں ایسا نہیں ہے،یہاں تک کہ اگر شکایت کرنے والا بھی اپنے حق سے دست بردار ہو جائے اور اسےمعاف کردے تو سرکاری وکیل کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس مسئلہ کی قانونی چارہ جوئی کرے، کیونکہ یہ بے احترامی پورے معاشرے کی بے احترامی ہے،اور سرکاری وکیل اس پرمقدمہ کی فرد جرم عائد کرسکتا ہے۔

اسلامی مقدسات کی توہین ایک فرد کی توہین نہیں ہے کہ کسی خاص فرد کی شکایت کی ضرورت پڑے اور اگر شکایت کرنے والے مدعی نے معاف کردیا تو مسئلہ تمام ہوجائے گا، عدالت کو بھی اس کی پیروی کی اجازت نہیں ہے. چنانچہ اگر کوئی تحریر یا تقریر کے ذریعہ اسلامی مقدسات کی توہین کرے توقانون اسلام کی نظر میں وہ مجرم ہے اور اسلامی عدالت اس کو پکڑے گی؛ کیونکہ اس نے اسلامی معاشرہ اور مسلمانوں کے حقوق کو پامال کیا ہے کوئی شخصی یا انفرادی مسئلہ نہیں ہے بلکہ جرم وسزا کا مسئلہ ہے اورکوئی اس جرم کو معاف نہیں کرسکتا،

کیونکہ یہ ایک ایسا حق ہے جو تمام مسلمانوں سے تعلق رکھتا ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ وہ حق ہے جو خدا سے مربوط ہے، یہ ایسے مسائل ہیں جن کے بارے میں مسلمان دانشوروں خصوصاً ہماری یونیورسٹیوں کے عزیز طالب علموں کو توجہ کرنی چاہئے وہ خیال نہ کریں کہ اسلام کے سیاسی وقانونی مسائل مغربی طرز فکر کے تابع صرف ایک پہلو کے حامل ہیں،اور اس دنیا کے صرف مادی ودنیوی مسائل سے مربوط ہیں. اسلام کی نظر میں معاشرہ کے حقوق شخصی حقوق پر مقدم ہیں،

اور صرف خدمت کرنے کے عوض کسی کا حق نہیں ہوتا بلکہ ہر وہ شخص جو اسلامی معاشرہ میں زندگی گذارتا ہے حق رکھتا ہے اور یہ حق کسی خاص گروہ سے تعلق نہیں رکھتا ؛ اور جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ معاشرہ کے بھی حقوق ہیں جو افراد کے شخصی حقوق پر مقدم ہیں اور یہ حقوق صرف مادی حقوق میں محدود نہیں ہیں بلکہ ان میں معنوی حقوق بھی شامل ہیں، اور صرف دنیاوی فوائد اور مصلحتوں سے مربوط نہیں ہیں بلکہ اس میں الٰہی حقوق اور انسانوں کی اخروی اور معنوی مصلحتوں کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے ۔

اب تک جو کچھ ہم نے عرض کیا اس کو سامنے رکھ کر اسلامی قوانین کے دوسرے قوانین سے امتیازات کا جائزہ لیا جاسکتا ہے ،اورپھر ہم سمجھ سکتے ہیں کہ کیوں اسلامی معاشرہ میں انسانوں کے انفرادی خواہشات دوسرے سیکولر،لائک اور لبرل معاشروں کی نسبت کیوں زیادہ محدود ہے،

اس کی وجہ یہ ہے کہ ان معاشروں میں صرف وہی چیزیں خواہشات پر پابندی لگا سکتی ہے جس سے مادی اور شخصی مفادات وابستہ ہوں. لیکن اسلام اور اسلامی حکومت میں معنوی واخروی پہلوؤں کو بھی ملحوظ رکھا جاتا ہے، اور ان تمام مصلحتوں کے تحفظ میں خاص محدودیت کی ضرورت پڑتی ہے جس کا لازمہ یہ ہے کہ اسلامی معاشرہ میں شخصی آزادی ، لائک اورلبرل معاشروں کی نسبت زیادہ محدود نظرآتی ہے، اوریہ وہ چیزیں ہیں کہ جس کا اسلامی حکومت کے مذہبی اعتقادات تقاضا کرتے ہیں اور ہم کمال وضاحت اور شجاعت کے ساتھ اس کا دفاع کرتے ہیں۔

بیسویں تقریر

قانون اور حکومت کی ایک نئی تصویر

پورے معاشرہ کو ایک پیکر تصور کرنا

گذشتہ تقریروں میں ہماری بحث کا بڑا حصہ اسلام کے حکومتی اور سیاسی نظام میں قانون سازی کے بارے میں تھا، اب ہم معاشرہ خصوصاً اسلام میں سیاسی اور حکومتی ڈھانچہ کی کیا اہمیت ہے، اس کی وضاحت کے لئے ایک تقابل اور تشبیہ سے سہارا لیں گے تاکہ اصل موضوع کو سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہ آئے۔

زمانۂ قدیم کے دانشوروں نے معاشرہ کو انسانی پیکر سے تشبیہ دی ہے ان کا کہنا ہے کہ: جس طرح انسان کا بدن مختلف اعضاء وجوارح سے مل کر بنا ہے، اسی طرح معاشرہ بھی مختلفگروہ اور اداروں سے وجود میں آتاہے او ران میں سے ہر ایک حصہ اپنی جگہ کئی حصوں پر مشتمل ہوتا ہے اور ہر حصہ کچھ مخصوص افراد پر مشتمل ہوتا ہے جو انسان کے بدن میں موجود خلیوں کی حیثیت رکھتے ہیں. البتہ بعض اوقات اس تشبیہ میں افراط وتفریط سے کام لیا جاتا ہے، اور صحیح طریقہ سے استفادہ نہیں ہوپاتا۔

عموماً علمی اور عملی سرگرمیوں میں افراط وتفریط پیش آتی رہتی ہے،اور توازن سے کام لے کر صحیح راستہ کا تعین مشکل ہوجاتا ہے، اسی بنیاد پر بعض افراد نے مذکورہ تشبیہ کے بارے میں کہاہے: جس طرح انسان کا بدن مختلف قسم کے اعضاء سے مل کر بنا ہے،اور یہ اعضاء اپنی ساخت و بناوٹ میں طبعیطور پر ایک دوسرے سے مختلف ہیں،اور ان میں سے ہر ایک جز اپنی جگہ صرف ایک خاص ذمہ داری انجام دے سکتا ہے، اسی طرح معاشرہ کے اعضاء بھی اپنی خلقت میں مختلف ہیں اور ان کا ہر حصہ ایک خاص کام کے لئے بنا ہے او رصرف اس کام کو ہی انجام دے سکتا ہے،اوران کو نہیں چاہیے کہ اپنے حدود سے قدم باہر نکالیں۔ مثال کے طور پر ،ہم جانتے ہیں کہ انسانی جسم کے تمام خلیے شروع میں ایک ''خلیہ (Cellule) سے ، وجود میں آتے ہیں، او ر

اسی ایک خلیے کی تقسیم سے طرح طرح کے زندگی ساز خلیے بدن میں بنتے ہیں،بعض خلیے بہت ہی لطیف وظریف ساخت کے حامل ہوتے ہیں جن سے آنکھ یا مغز وغیرہ تشکیل پاتے ہیں،اور بعض خلیے اپنی ساخت میں مضبوط و محکم ہوتے ہیں جن سے ہڈی بنتی ہے، اور یہ کبھی نہیں ہوسکتا کہ آنکھ کے خلیے ہڈی کے خلیے کی جگہ اور ہڈی کے خلیے آنکھ کے خلیے کی جگہ استعمال کئے جائیں، یا آنکھ سے ہڈی کا کام لیا جائے اور اور ہڈی سے آنکھ کا کام لیا جائے، جبکہ یہ تمام خلیے ایک ہی خلیے سے وجود میں آئے ہیں، تقسیم کے وقت ان خلیوں میں اتنا فرق و اختلاف ہو جاتا ہے کہ ان کا ہر گروہ طبعی طور پر ایک معین شدہ کام ہی انجام دے سکتا ہے، لہٰذا ان کو ایک دوسرے کی جگہ نہیں رکھا جاسکتا۔

یہ لوگ کہتے ہیں کہ معاشرہ کے افراد بھی فطری طور پر مختلف مزاجوں کے ساتھ خلق ہوئے ہیں اور مختلف افراد کے لئے الگ الگ کام معین ہیں اوروہ صرف اپنا ہی کام انجام دے سکتے ہیں، قدیم زمانہ سے جو فلاسفہ اور دانشور معتقد تھے کہ معاشرہ کی مختلف نسلوں اور ان کے مختلف طبقات کے لئے ایک مخصوص حد معین ہے اورپیدائشی طور پر ہر ایک کا کام الگ الگ ہے ،مثلاً سیاہ فام نسلیں سخت اور محنتی کاموں کے لئے پیدا کی گئی ہیں او رسفید پوست یا زرد فام نسلیں فکری کاموں کے لئے پیدا ہوئی ہیں،یہ لوگ اسی تشبیہ سے استفادہ کرتے تھے.ان لوگوں کا ماننا تھا کہ انسانوں کے رنگوں کا اختلاف، نسلوں کا اختلاف اور خون کا اختلاف ہی سبب بنتا ہے کہ ان کے ہر گروہ کے امور اور فرائض بھی الگ الگ ہوں،لیکن انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ یہ تشبیہ یہ اور موازنہ افراط اورزیادہ روی موقوف ہے، علم وفلسفہ اور دین کی رو سے کوئی بھی اس نظریہ سے متفق نہیں ہے۔

اسلامی دائرۂ فکر میں معاشرہ کو ایک پیکر سمجھنا اسلامی نظریہ کے مطابق تمام انسان اپنے بدن اور روح کی ساخت کے اعتبار سے معاشرہ میں مختلف کام انجام دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں. البتہ انسانوں کی قابلیت وصلاحیت میں فرق ہے او رسب کی سطح ایک جیسی نہیں ہے، لیکن ایسا ہر گز نہیں ہے کہ دو رنگوں اور نسلوں کے درمیان کوئی ایسی حدبندی ہو کہ وہ ایک دوسرے کے کاموں کوانجام نہ دے سکیں، کالے گوروں کا کام نہ کرسکیں یا گورے کالوں کا کام نہ کرسکیں، اسلامی نظریہ کے مطابق، اگرچہ انسانی پیکر اور

معاشرہ کے درمیان ایک طرح کی شباہت پائی جاتی ہے، کہ جس سے گروہ اور افراد کی موقعیت کو بیان کرنے کے لئے اس تشبیہ کا سہارا لیا جا سکتا ہے،لیکن معاشرہ کا ،اعضائے بدن سے تشبیہ دینا جوطبعی طور پر اپنی ساخت اور بناوٹ میں ایک دوسرے سے متفاوت ہیں،او راس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ معاشرہ کے افراد بھی اپنی فطرت اور مزاج میں ایک دوسرے سے مختلف اور علیحدہ ہیں صحیح نہیں ہے،اس زمانے میں بھی سماجیات کے بعض ماہر ینہیں جویہ کہتے ہیں کہ معاشرہ بھی ایک زندہ ڈھانچہ (Organism) ہے اور معاشرہ کے مختلف گروہ اور طبقات ایک پیکر کے مختلف اجزاء کے مانند ہیں جیسے کہ انسان کے جسم کے اعضاء وجوارح ہیں او ران کا باہمی رابطہ بھی اعضاء بدن کے رابطہ کی طرح ہے۔

یہی رابطہ افراد کوایک دوسرے سے جوڑتا اور متصل کرتا ہے، ہماری نظر میں یہ نظریہ بھی افراط پر مبنی ہے۔کیا ایک معاشرہ کے مختلف افراد کا آپسی رشتہ بھی بالکل انسانی بدن کے خلیوں کے رابطہ کی طرح ہے یا اس طرح کا کوئی حقیقی رابطہ بدن کے خلیوں اور معاشرہ کے افراد کے درمیان نہیں پایا جاتا؟!معاشرہ کے افرادکے درمیان بھی اس طرح کارابطہ ہو اس چیز کوثابت کرنا بہت مشکل ہے؛ایک ایسا رابطہ جو مثال کے طور پر آنکھ کے خلیوں کے درمیان کہ جو ایک عضو کو تشکیل دیتے ہیں،ان میں ایک خاص قسم کا رابطہ ہے اور دیگر تمام اعضاء وجوارح کے ساتھ ایک فطری تعلق اور ہم آہنگی کے تحت وہ انسان کے جسم کو تشکیل دیتے ہیں۔

یکن جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ انسانی پیکر اور معاشرہ میں ایک طرح کی شباہت ضرورپائی جاتی ہے اور ان شباہتوں سے افراد انسانی کی اجتماعی حیثیتوں کو پہچانا جا سکتاہے،

جیسا کہ مرحوم سعدی شیرازی نے اپنے مشہور ومعروف اشعار میں اس شباہت کی طرف اشارہ کیا ہے

بنی آدم اعضاءیکدیگر اند　　　　که در آفرینش زیک گوهر اند

چو عضوی به درد آورد روزگار　　　　دگر عضوها را نماند قرار

''تمام انسان ایک ہی بدن کے مختلف اعضاء کی طرح ہیں کیونکہ ان کی خلقت ایک ہی جوہر سے ہوئی ہے''

''جب بدن کے کسی ایک حصہ کو تکلیف ہوتی ہے تو دوسرے اعضاء بھی بے قرار ہوجاتے ہیں'' بے شک یہ تشبیہ جومعاشرہ کے افراد کے درمیان باہمی محبت وتعاون کو ظاہر کرتی ہے، انسان کے دل میں محبت وعطوفت کا احساس پیدا کرتی ہے تاکہ انسان ایک دوسرے کے ساتھ الفت و ہمدردی کا رشتہ قائم کرنے کی کوشش کرے اور اس طرح سے وہ ایک دوسرے سے جوفائدہ اٹھا سکتے ہیں ان سے محروم نہ رہیں، یہ ایک معقول تشبیہ ہے جس سے بہت سے مطالب استفادہ کئے جا سکتے ہیں،او ریہ تشبیہ حضرت رسول خداء،او رامام جعفر صادق علیہ السلام کی احادیث سے کسب کی گئی ہے،

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں '': اَلمُؤمنُون فی تَبارّہمْ وَتَرا حُمِھِم وَتَعا طُفِھم کَمَثَلِ الجَسَدِ اِذَا اشْتَکیٰ منہ عضوتَداعیٰ لَہ سَایِرُہ بِالسَھرِ وَالحُمّیٰ'' [1] ''مومنین ایک دوسرے کے ساتھ محبت وپیار اور ہمدردی میں ایک ایسے پیکر کی طرح ہیں کہ جب ان میں سے کسی عضو کو تکلیف ہوتی ہے تو دوسرے اعضاء بھی بے چینی اور اضطراب میں اس کے ساتھ ہوجاتے ہیں''

یقیناً جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا امام جعفر صادق علیہ السلام نے اسلامی معاشرہ اور مومنین کو ایک پیکر کے عنوان سے بیان کیا ہے، اور سعدیؒ نے اسی کو وسعت دیدی ہے، اورپورے انسانی معاشرہ کو ایک پیکر کی طرح پیش کیا ہے،البتہ توجہ رہے کہ تشبیہ کا کام یہی ہے کہ ایک پہلو کو جو دو موجود کے درمیان مشترک ہے اوروہ پہلو ایک میں زیادہ نمایاں او رمشہور ہو ہے دوسرے میں وہ پہلو جتنا ہونا چاہئے شناختہ شدہ نہ ہو، لہذا تشبیہ کی وجہ سے اس کو پہنچوایا جاتا ہے،

اسی بناپر جس کی جس کی طرف تشبیہ دی جائے اس کے تمام خصوصیات اور صفات ''مشبہ'' میں نہیں تلاش کرنا چاہئے، مثلاً اگر کسی بہادر انسان کو شیر کہا جائے، تو اس تشبیہ سے صرف اس کی بہادری کو بیان کرنا مقصود ہے ،ایسا نہیں ہے کہ اگر شیر کی گردن پر بال

[1] مستدرک الوسائل ج۱۲ص۴۲۴۔

ہوتے ہیں تو اس کی گردن پر بھی بال ہوں، یا یہ کہ اگر شیر چاروں ہاتھ پیر سے چلتا ہے تو یہ بھی اسی طرح چلتا ہو! شیر درندہ ہے تو انسان بھی درندہ بن جائے ۔

انسانی پیکر سے معاشرہ کی شباہت کے اسباب معاشرہ اور انسانی پیکر میں جو شباہتیں بیان کی جا سکتی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انسان کے بدن میں مختلف اقسام کے سسٹم اور نظام موجود ہیں، جو ایک دوسرے سے تعاون اور وابستگی رکھتے ہیں، اور انسانی حیات او رنشو ونما میں مؤثر ہوتے ہیں، اسی طرح معاشرہ بھی مختلف ڈھانچے اور دھڑتے ہیں جن کا ظہور مختلف اداروں اور مرکزوں کی شکل میں ہوتا ہے جو مجموعی طور پر باہمی تعاون سے معاشرہ کی زندگی کو آسان بناتے ہیں، مثال کے طور پر انسان کے بدن میں ایک سسٹم ہے جس کا کام خون کو پورے بدن میں پہنچانا ہے اور اس کا مرکز دل ہے. دل اس خون کو جو معدہ ،جگر اور ہاضمے کے نظام کی ہم آہنگی اور فعالیت سے بنتا ہے گردش میں لاتا اور چھوٹی بڑی رگوں کے ذریعہ تمام خلیوں تک پہونچاتا ہے، جس کے نتیجہ میں انسان کی حیات رواں دواں رہتی ہے۔

خون کو تمام خلیوں تک گردش دینے والی مشینزی خود بدن کے کئی حصوں سے مل کر کام کرتی ہے مثلاً دل کا کا م خون کو پمپ کرنا ہے اور دوسری رگیں اوربدن کے ریشے خون کو پورے بدن میں پہونچاتے ہیں، اسی طرح بدن کے کچھ اور اجزاء اور نظام ہیں جو خون کو گردش دینے والی مشینزی سے وابستہ ہیں وہ خون جو رگوں میں حرکت کرتا ہے اس میں اکسیجن ہونا چاہئے تاکہ بدن کے خلیے زندہ رہیں، اسی وجہ سے پھیپھڑے اور سانس لینے کی مشینزی بدن کو اکسیجن فراہم کرتی ہیں،

اور یہ اکسیجن خون کے ساتھ تمام بدن میں پھیل جاتی ہے، اسی طرح غذائی مواد بھی خون کے ساتھ ہی تمام بدن میں پہنچتے ہیں اور یہ غذائی مادے ہاضمے کی مشینزی میں تیار ہوتے ہیں، پس یہ تین مشینزیاں گردش خون کا نظام، تنفس کا نظام اورہاضمے کا نظام آپس میں مل کر باہمی تعاون سے فعالیت انجام دیتی ہیں اور انسان کی حیات کو ممکن بناتی ہے، ان کے علاوہ بھی بدن میں دوسری مشینزیاں ہیں جو

ہاضمے کے نظام کی کار کردگی کو کنٹرول میں رکھتی ہے، مثلاً بدن میں غدود کا ایک سلسلہ ہے جن کا ایک خاص کام ہے اور اعصاب کا ایک سلسلہ ہے جو دماغ کے حکم کے مطابق کام کرتا ہے،اوربدن کے اعضاء میں حرکت کو آسان بناتاہے منجملہ معدہ او راس سے وابستہ دوسرے اعضاء،اعصابی نظام کے ذریعہ ہی فعالیت انجام دیتے ہیں۔

جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایاکہ زندگی کاقوام و استحکام نیزنظام کی پائداری بدن کے مختلف سسٹموں کی کار کردگی کے ساتھ وابستہ ہیں جو مخصوص نظم و ترتیب کے ساتھ اپنا اپنا کام کرتے ہیں،پھربھی ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہوکر عمل کرتے ہیں،اس طرح ہم معاشرہ کے مختلف حصوں اورڈھانچوں کی انسانی بدن کے مختلف اعضاء اور مختلف کار فرما نظام سے تشبیہ دے سکتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کے لئے معاشرہ میں ایک مشابہ نمونہ کی عکاّسی کر سکتے ہیں :مثلاً جس وقت ہم انسان کے ہاضمے کے نظام کی کار کردگی او رتمام بدن تک غذا پہنچانے والی مشینری کو دیکھتے ہیں ؛یعنی بدن میں غذا کی فراہمی اور تقسیم کے عمل پر نگاہ ڈالتے ہیں اور اس کے بعد معاشرہ پر نظر ڈالتے ہیں،تو معاشرہ کے اقتصادی اور معاشی ڈھانچے کی کار کردگی اسی سے ملتی جلتی نظرآتی ہے،معاشی ڈھانچوں کا خصوصی کام معاشرہ کے لئے ضروری چیزوں کی پیداوار، تقسیم کے شعبوں کے ذریعہ لوگوں تک پہونچانا ہوتا ہے. جس طرح سے خون بدن میں بنتا ہے او رپھر دل اور رگوں کے ذریعہ دوسرے اعضاء تک پہونچتا ہے۔

اگر خون کوگردش دینے والی مشینری میں کچھ خلل پیدا ہوجائے مثلاً کسی رگ کے بند ہوجانے کے سبب خون کی حرکت بند ہوجائے، تواس صورت میں انسان بیمار ہوجاتا ہے کبھی کبھی کسی عضوتک غذا نہیں پہونچتی تو وہ بے کار ہوجاتا ہے،او رممکن ہے بعض اوقات اس حصہ کوبدن سے کاٹ کر الگ کردینا پڑے،اور کبھی ممکن ہے خون میں گردش کی خرابی کی وجہ سے انسان مرجائے.

لہٰذا انسان کی تندرستی اور زندگی کیلئے ضروری ہے کہ خون معمول کے ساتھ تمام رگوں میں ہر وقتحرکت کرتا رہے،اسی طرح معاشرہ میں بھی ہر وقت ضروری اشیاء اورسامان پہونچنا ضروری ہے،اور اگر یہ ضروری سامان کسی ایک جگہ ذخیرہ کرلیا جائے اور لوگوں تک نہ

پہونچایا جائے اوراگر معاشی نظام میں، جس میں تمام زراعتی اور صنعتی اشیاء کی پیداوار اور تقسیم اور اداری خدمات شامل ہیں، کچھ خرابی ہوجائے اورمعاشرے کی رگوں میں کھانے پینے کے ضروری سامان صحیح طریقہ سے نہ پہونچ سکے تو پھر یہ معاشرہ خواہ مخواہ بیمار ہوجائے گا، لہٰذا یہ تشبیہ صحیح اور بجا ہے کہ جس میں معاشرے کے اقصادی ڈھانچے کی مثال گردش خون کی مشینری سے دی گئی ہے۔

اسی طرح معاشرہ کے حکومتی ڈھانچے کی اعصابی مشینری سے تشبیہ دی جاسکتی ہے کہ جس کا کام بدن پر حکم چلانا ہے،اور یہ اعصابی نظام دوحصوں (حس اور حرکت) سے تشکیل پاتا ہے. چنانچہ حکومت کی مشینری معاشرے کے اعصابی سسٹم کے مثل قرار دی گئی ہے ، معاشرہ کوبھی بدن کی طرح ایک دماغ کی ضرورت ہے جو اس کو حکم دے سکے اورفیصلے کر سکے اسی طرح اس کے حکم کو معاشرہ کے اعضاء درمیان اجرا اور نفاذ کے لئے کچھ ماتحتوں کی ضرورت ہے . اسی بنیاد پر حکومت کے بھی دوبنیادی حصے ہیں:

ا۔ قانون سازی کا شعبہ کہ جس کا کام معاشرہ کی منفعتوں کی تشخص اور ان کی فراہمی کے راستہ معین ہو جانے کے بعد ضروری اصول و ضوابط مقرر کرنا ہے۔

٢۔ عمل درآمد کا شعبہ جو معاشرہ میں ان قوانین کو جاری کرتا ہے۔ ہمارے حسی اعضاء شناخت کی راہ فراہم کرتے ہیں اور بدن میں تحرک پیدا کرنے والے اعضاء احکام پر عمل درآمد کی راہ فراہم کرتے ہیں، مقدماتِ حسی کو اعصاب فراہم کرتے ہیں۔ دماغ جو کہ فکر واحساس کاوسیلہ ہے، اگرچہ حقیقت تفکر انسان کی روح سے وابستہ ہے، لیکن دماغ اس کا وسیلہ ہے ہمارے ذہن میں فکری و نظری عمل انجام پاتا ہے اور اس کے بعد اعصاب متحرکہ کے ذریعہ اجرا و نفاذ کا عمل انجام دیا جاتا ہے. نفس انسانی میں ایک قوت علمیہ ہے جس کا کام علم ومعرفت کی حاصل کرنا ہے اور دوسری قوت قوت محرکہ ہے جو اعصاب کو حرکت میں لاتی ہے،

اور یہ دونوں قوتیں دماغ کے حکم پر کام کرتی ہیں. یہ نظام جو بدن کے تمام اعضاء پر نظر رکھتا ہے اور ضروری علم وشناخت حاصل کرکے ماتحتوں کو ان پر عمل درآمد کے لئے احکامات جاری کرتا ہے جس کے سبب سبھی اعضاء کام کرتے ہیں، اس سسٹم کو دماغ اور

اعصاب کے سسٹم کا نام دیا گیاہے، اور اس سسٹم کو سامنے رکھ کر معاشرہ میں حکومت کی اہمیت کو پہچانا جاسکتا ہے۔

معاشرہ کے پیکر میں حکومت کی جگہ

جس وقت ہم اپنے بدن کے اعضاء، ان کی ہم آہنگی اور منظم کارکردگی کو ملاحظہ کرتے ہیں تو یہ بات مکمل طور پر واضح ہوجاتی ہے کہ ان اعضاء کے بنانے اور منظم انداز سے کام کرنے میں ہمارا کوئی دخل نہیں ہے، علمی اصطلاح میں!فطرت نے ان کو بنایا اور منظم طور پر چلنا سکھایا ہے. لیکن دینی اصطلاح میں کہیں گے کہ خدا وندعالم نے ان اعضاء و جوارح کو مخصوص قوتوں اور صلاحیتوں کے ساتھ پیدا کیا ہے،یہ کمال اسی کے اندر پا یاجاتا ہے کہ ایک انسانی پیکر میں اس نے اتنی عظمت و پیچیدگی اور ظرافت و باریکی جمع کر دی ہے،جب کہ اس سے بھی بالاتر ہماری روح کی خلقت ہے جو بدن کی ساخت سے کہیں زیادہ با عظمت،وسیع اور پیچیدہ تر ہے۔

خداوندعالم نے جب ہم کو بدن اور اعضاء کی نعمتیں مرحمت فرما دی ہیں تو پھر ہم کو بھی ان سے صحیح طریقہ سے استفادہ کرنے کی معرفت پیدا کرنا چاہئے تاکہ اپنے اعضاء سے اس طرح فائدہ اٹھائیں کہ صحت و سلامتی اور خوشی کے ساتھ ایک طویل عمر نصیب ہو؛ ایسا نہ ہو کہ جس طرح بھی چاہیں ان سے کام لینا شروع کردیں، اگر جو کچھ بھی ہمارے ہاتھ لگا ،کھالیا، جو ملا پی لیا، جس کام کی خواہشوئی اس میں مشغول ہوگئے ،نامناسب غذا یا خدا نخواستہ نشہ آور مشروبات اور منشیات کے استعمال سے پرہیز نہ کیا،تو کیا ہم یہ امید کر سکتے ہیں کہ ہمارا بدن صحیح وسالم رہ جائے گا،

اور ہم کو صحت و سلامتی کے ساتھ جو ایک طولانی عمر کے خواہشمند میں فراہم ہو سکے گی؟ظاہر ہے ایسا نہیں ہو سکتا. بلا شبہ، حفظان صحت کے اصولوں کی رعایت کئے بغیر ہم اپنی طولانی عمر صحت و سلامتی کے ساتھ نہیں طے کر سکتے.یعنی ہمیں اپنی آزادی عمل جو خواہشوں کی غلام ہے محدود کرنی پڑے گی اور اپنی خواہش کے مطابق ہر چیز نہیں کھالینی چاہئے، غذا کی کیفیت کا بھی خیال کریں اور

اس کی مقدار پر بھی توجہ دیں، اسی طرح غذا کی نوعیت اور اس کے اوقات میں بھی حفظان صحت کے اصولوں کی رعایت کریں، کیونکہ اگر ان چیزوں کی رعایت نہیں کریں گے، مثلاً سڑا گلا کھانا کھائیں گے تو بیمار ضرور پڑیں گے،اور ہوسکتا ہے کہ جان بھی چلی جائے۔

حفظان صحت کے قوانین و ضوابط وہ صحیح اور فطری اصول ہیں جن کی ہمارے بدن کی ساخت اور طبیعت کو ضرورت ہے یہ قوانین بہت سے ماہرین اور دانشمندوں کی مسلسل کوششوں کے بعد کشف ہوئے ہیں اور دوسروں کے اختیار میں دئے گئے ہیں تاکہ صحیح وسالم طریقہ سے خوشحال زندگی گزار سکیں۔

بدن کے منظم ومرتب ڈھانچے اور اس پر حکمراں حفظان صحت کے قوانین کی پابندی کے سلسلہ میں ہم نے جو کچھ عرض کیا اس کے پیش نظر اگر کوئی ڈاکٹر یہ کہے کہ فلاں غذا نہ کھاؤ، مشروبات اور مٔنشیات کا استعمال نہ کرو، کیونکہ اس کے کھانے اور پینے سے تمہارا اعصابی نظام درہم وبرہم ہوجائے، یا یہ کہ ان چیزوں کا استعمالتمہارے پھیپھڑے گردے اور جگر کے لئے نقصان دہ ہے تو اس پر ہمارا کیا رد عمل ہوگا ؟! اس کا شکریہ ادا کریں گے کہ اس نے ہماری راہنمائی کی ہے اور ہم کو سلامتی کی راہ دکھائی ہے ، یا اس پر اعتراض کریں گے کہ آپ سے کیا مطلب ہم کچھ بھی کھائیں؟! جن لوگوں نے ہماری سلامتی کے لئے حفظان صحت کے اصول ہمارے حوالے کئے ہیں معاشرہ کی بہت بڑی خدمت کی ہے سلامتی و کامیابی کی راہ دکھائی ہے ،لہٰذا ہمیں ان کے ہاتھوں کا بوسہ لینا چاہئے۔

جس وقت ہم بیمار پڑتے ہیں، بڑے بڑے ڈاکٹروں کے پاس جانے کے لئے کئی کئی دن پہلے سے وقت لیتے ہیں اور بڑی منت وسماجت سے کہتے ہیں کہ ہمارا طبی معائنہ کرلیجئے، اور اس کے بعد ڈاکٹر کی تجویز کردہ دواؤں کی تلاش میں نسخہ لئے پورے شہر کا چکر لگاتے ہیں اور یہ سب اس لئے ہے کہ دوائیں کھائیں،اور ٹھیک ہوجائیں، ہم ان تمام زحمتوں کو صرف صحت وسلامتی اور تندرستی کے لئے برداشت کرتے ہیں، کیونکہ ہماری زندگی کا ایک مقصد ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ ہماری عمر صحت وسلامتی کے ساتھ بسر ہو،اور

اس مقصد کی تکمیل کے لئے ڈاکٹری اصولوں کی پابندی کرنا ضروری ہے،اور ان ضروری پابندیوں کی وجہ سے عملی طور پر ہماری آزادیاں محدود ہوجائیں گی اور جو کچھ بھی مرضی ہو اس پر عمل نہیں کرسکیں گے ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ان پابندیوں پر عمل کرنا، صحت وسلامتی کی ضمانت ہے نہ کہ خوشی میں رکاوٹ، ہمیں ان لوگوں کا شکریہ ادا کرنا چاہئے، جنھوں نے ہمیں صحت وسلامتی کا راستہ دکھایا ہے،اور حفظان صحت کے اصول وضوابط معین کر کے زندگی کی بقا کے مواقع فراہم کئے ہیں کیا دنیا کے عقلمند انسان حفظان صحت کے قوانین کو ہماری زندگی میں بے جا مداخلت کہیں گے،؟ یا اس کو معاشرہ کی بہترین خدمت کے عنوان سے یاد کیا جاتا ہے؟

ہم نے اب تک جو کچھ عرض کیا وہ انسان کی ذاتی اور انفرادی زندگی سے متعلق تھا، معاشرہ کے سلسلہ میں بھی بالکل اسی طرح ہے، اگر کوئی کہے کہ میری نگاہ میں زندگی بے معنی ہے میں نہیں چاہتا کہ زندہ رہوں، اور میرے لئے زندہ رہنے یا مرجانے میں کوئی فرق نہیں ہے تو ظاہر ہے ایسے شخص کو کوئی عقلمند نہیں کہہ سکتا. اگر وہ ان قوانین کی پابندی نہیں کرتا تو اس عالم فطرت میں جو اسباب ومسبباب کے مطابق چلتی ہے کوئی بھی حادثہ رونما ہوسکتا ہے اگرچہ طبعی امور میں انسان کو کوئی دخل نہیں ہے۔

لیکن وہ طبعی امور اپنے اثرات انسان پر مرتب کرتے ہیں، اور اس کا نتیجہ اس کی بیماری یا موت کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے. اگر کوئی اپنی زندگی کے لئے کوئی ہدف نہ رکھتا ہو، جو چاہے کھائے پیئے اور جو کام بھی چاہئیا نجام دے تو اس کے کاموں کا انجام بہر حال بیماری پر جا کر تمام ہوگا اور موت اس کو اپنی آغوش میں لے لیگی۔

لیکن اگر کوئی اپنی زندگی کا ہدف رکھتا ہے او رصحت و سلامتی کے ساتھ جینا چاہتا ہے کہ اس سلامتی سے ترقی وکمال خصوصاً معنوی ترقی کی راہ میں استفادہ کرے تو وہ حفظان صحت کے قوانین کی طرف سے بے توجہی نہیں کرسکتا یعنی ماہرین کے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق اس کو اپنی آزادی کو محدود کرنا ہوگا ۔

اگر معاشرہ کو بھی اس بے ہدف شخص کی طرح فرض کرلیا جائے کہ جس کے نزدیک زندگی و موت برابر ہے، جسے نہ اپنی بقااور عزت و وقار کی فکر ہے اور نہ ہی اپنے لئے ترقی و خود مختاری کا خیال ہے نہ تواپنی شخصیت اور پہچان کے قائل ہیں نہ ہی اپنے لئے آخرت ومعنویت چاہتے ہیں، مسلمہ طور پرایک ایسا معاشرہ جو بھی چاہے کرسکتاہے پوری طرح آزاد ہے کسی بھی قانون کی رعایت ضروری نہیں ہے؛ بالکل اس شخص کی طرح جس کے لئے زندگی و موت برابر ہے۔

انسان کو صرف اس وقت کسی قانون وضابطے کی ضرورت نہیں ہوتی جب موت وزندگی اس کی نظر میں مساوی ہو، زندہ رہنا یا مرجانا اس کے لئے کوئی فرق نہیں ہے تبھی وہ کہہ سکتا ہے، اس کو کسی بھی قانون کی پابندی کی ضرورت نہیں ہے ورنہ اگر موت بھی چاہتاہے تو اس کے لئے اس کو مخصوص قوانین کی پابندی کرنا پڑے گی،اور اس کو معلوم کرنا ہوگا کہ کن کاموں کے انجام دینے سے موت آسکتی ہے، معلوم ہوا کوئی بھی بامقصد کام بغیر کسی قانون کے ممکن نہیں ہے، مطلق آزادی کے ساتھ کسی بھی مقصد تک نہیں پہنچا جا سکتاہے، اگر کوئی ہدف ومقصد ہے تو اس کے لئے محدودیت کا قائل ہونا ہی پڑے گا، اور ہر کام کے مقدمات کا اس کے قوانین وضوابط کے تحت انجام پانا ہے، حتی اگر ہدف موت ہی کیوں نہ ہو۔

معاشرہ اگر ہدف رکھتا ہے تو اس کے لئے قانون کی پابندی کرنا ضروری ہے،یعنی اپنی آزادی کو کم کرے یا اپنی بعض خواہشات سے صرف نظر کرے۔اگر جو دل چاہے کرتا رہے تو کسی ہدف تک نہیں پہنچ سکتاہاں اگر کوئی ہدف نہ ہو، تو کسی قانون کی ضرورت نہیں ہے،ایسے معاشرہ کی مثال اسی شخص کی ہوگی جس کا کوئی ہدف نہیں ہے کچھ ہی دنوں بعد اسے نہ چاہی ہوئی موت کے گھاٹ اتر جانا ہے، اس بناپر ، اگر کوئی معاشرہ بقاؤدوام اور ترقی وکمال چاہتا ہے او رہمیشہ کی سعادت وعزت درکار ہے تو اس کودقیق قوانین کی ضرورت ہوگی۔

اب بحث اس میں ہوگی کہ معاشرہ کے لئے یہ قوانین کیسے بنائے جائیں؟ کون بنائے؟آیاان قوانین کی کوئی واقعیت اور حقیقت ہے کہ جن کا کشفھونا ضروری ہے، یا صرف مل جل کر طے کر لینے والی کچھ اعتباری چیزیں ہیں کہ جن کا اعتبار کر لیا گیا ہے؟ یہ مسئلہ فلسفۂ حکومت میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔

ہم عالم فطرت اورانسان کی شخصی زندگی میں کچھ ایسے حقیقی قوانین کا مشاہدہ کرتے ہیں، کہ جسے دانشمندوں نے کشف کئے ہیں جیسے فلاں جراثیم فلاں بیماری کا سبب بنتا ہے یہ ایک فطری رابطہ ہے جو عالم فطرت میں حقیقی علت ومعلول کے درمیان پایا جاتا ہے اور دانشوروں نے اپنے تجربوں سے ان حقیقتوں کوکشف کیا ہے اور کرتے رہتے ہیں اور حفظان صحت کے اصولوں کے عنوان سے لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں کہ: فلاں بیماری سے بچنے کے لئے فلاں قسم کے جراثیم سے بچنا ضروری ہے،یا اگر فلاں بیماری پھیل جائے تو اس بیماری سے محفوظ رہنے کے لئے فلاں ٹیکا لگوانا ضروری ہے. معاشرہ کو بھی اگر صحیح وسالم زندگی گذارناہے توکچھ قوانین کی پابندی کرنا ہوگی توکیا یہ قوانین واقعاً عالم فطرت میں موجود ہیں کہ کچھ لوگ ان کو کشف کریں؟ یا یہ باہمی مفاہمت کے طے شدہ فرضی قوانین ہیں، اور لوگوں کو راضی رکھنے کے لئے ان کی خوشی سے کچھ عرصے بعد ان کو بدلا بھی جاسکتا ہے، کیونکہ یہ قوانین اکثریت کی مرضی کے پابند ہوتے ہیں.

واقعاً یہ ایک بہت ہی اہم اور بنیادی مسئلہ ہے اور اس کا ایک پہلو فلسفہ سے تعلق رکھتاہے، ایک پہلو انسانی علوم سے وابستہ ہے اور ایک پہلو معرفت شناسی سے تعلق رکھتا ہے اور ان سب کے اپنے مخصوص قسم کے کچھ پیچیدہ مسائل ہیں جن کے لئے یونیورسٹیوں میں یاان کے مخصوص شعبوں میں تحقیق کرنی چاہئے، ظاہر ہے ان تمام مطالب کو بیان کرنا اس گفتگو میں ہمارے لئے ممکن نہیں ہے، ہم صرف عمومی استفادہ کے حامل کچھ منتخب مسائل ہی یہاں بیان کر سکتے ہیں۔

مصالح و مفاسد قانون کا پیش خیمہ ہیں کیا واقعاً امن و تحفظ اور چوری کی روک تھام کے درمیان کوئی رابطہ پایا جاتا ہے؟یعنی اگر امن و تحفظ چاہتے ہیں تو چوری نہیں ہونی چاہئے؟ یا نہیں ،ان کے درمیان صرف ایک قراردادی رابطہ ہے،امن و تحفظ بھی قائم ہو سکتا ہے اور چوری بھی انجام پا سکتی ہے. کیا قتل و غارت اور ناامنی کے درمیان کوئی حقیقی رابطہ پایا جاتا ہے؟یعنی اگر کسی کو حق مل جائے کہ جس کو بھی قتل کرنا چاہے قتل کردے تو واقعاً اس سے ناامنی پھیلے گی یا نہیںیا یہ کہ صرف ایک قراردادی رابطہ ہے؟آیا جنسی آزادی واقعاًگھروں کی تباہی اور اجڑنے کا سبب ہے یا نہیں یہ صرف ایک قرار دادی مسئلہ ہے؟ایک دن معاشرے میں لوگوں کی پسند کی بنیاد پر جنسی رابطہ کوآزاد قرار دیا جا سکتاہے توایک روزلوگوں کے پسند کے تحت اس پرپابندی لگائی جا سکتی ہے۔

کیونکہ لوگوں کی اکثریت اس کو پسند نہیں کرتی ہے، توکیا یہ قانون کہ جنسی تعلقات آزاد ہوں یا نہ ہوں، صرف ایک قراردادی مسئلہ ہے؟ یعنی یہ صرف ایک سلیقہ اور طرز فکر کی بات ہے کہ لوگ اس سے خوش ہوتے ہیں یا ناراض ہوتے ہیں !! ان کی مرضی کے مطابق قانون بنا چاہئے؟ یا نہیں ،یہ ایک حقیقی رابطہ اور رشتے پر استوار ہے،اور وہ یہ کہ اگرلوگ جنسی تعلقات میںآزاد ہوجائیں تو معاشرہ میں جسمانی اور نفسیاتی بیماریاں پھیل جائیں گی،اور لوگوں کے گھروں کی شرافت اور خاندان کی اصالت ختم ہو جائے گی، عورتوں اور مردوں میں نفسیاتی بیماریاں عام ہو جائیں گی، بچے بے تربیت اپاہج ، مفلوج اور معلول پیدا ہوں گے اوردوسری تباہیاں پھیل جائیں گی۔

بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ اجتماعی قوانین ، حقیقی مصالح ومفاسد کے تابع ہیں، ایسا نہیں ہے کہ یہ قوانین لوگوں کی مرضی اور ان کے ذوق اورسلیقہ کے پابند ہوں،بلکہ جس طرح شراب پینے کی رواج اعصابی تکالیف اور قلبی اور تنفسی بیماریوں میں اضافے کا باعث ہے یا بیڑی سگریٹ کا رواج بہت سی متعلقہ بیماریوں کا پیش خیمہ ہے ،اجتماعی مسائل بھی اسی طرح ہیں: اگر عورت مردکے تعلقات آزادانہ طور پر کسی قید و شرط کے بغیر تمام پابندیوں سے عاری ہوں تو معاشرے میں اس کے اثرات خطرناک ثابت ہونگے جس کے بے پناہ نمونے مغربی ممالک میں،(جہاں ناجائز تعلقات کافی حد تک عام ہیں)قابل ملاحظہ ہیں،

لہٰذا قانون بناتے وقت ان کے حقیقی آثار کو بھی مد نظر رکھنا چاہئے، نہ یہ کہ لوگوں کی خواہشات کے مطابق عمل کریں اور صرف یہ دیکھیں کہ لوگوں کی اکثریت جنسی آزادی کو پسند کرتی ہے یا ناپسند کرتی ہے؟ لوگوں کی اکثریت منشیات کا استعمال آزاد کردینے کی خواہاں ہے یا ممنوع کردینے کی قائل ہے ؟آیا قانون بنانے کا طریقہ یہ ہونا چاہئے یا یہ کہ نہیں، پہلے معلوم کریں کہ واقعاً منشیات کے استعمال سے کیا کیا نقصانات ہیں اور پھر اکثریت کی رائے اس کے موافق کیوں نہ ہو اس کے مطابق قانون بننا چاہئے؟

آپ کی نگاہ میں کون سا راستہ صحیح ہے؟ قوانین اکثریت کی رائے کے مطابق ہوں یا واقعی نفع ونقصان کی بنیاد پر بنائے جائیں ؟ یعنی ایک کی نظر میں اجتماعی مصالح ومفاسد حقیقت و واقعیت رکھتے ہیں یا صرف اعتباری چیزیں ہیں کہ جس کو کچھ لوگوں نے اپنے ذوق کے تحت طے کرلیا ہے؟

''ہیوم'' کے زمانہ کے بعد مغربی ممالک میں معرفت شناسی کے ذیل میں یہ بحث شروع ہوئی کہ کیا ہونا چاہئے اور کیا نہیں ہونا چاہئے اورکی مانند معیاری مفاہیم ،کوئی خارجی واقعیت نہیں رکھتے ان کو عقل اور استدلال کے ذریعہ ثابت نہیں کیا جا سکتا. ''خوبی وبدی'' بھی ذاتی ذوق کی چیز ہے جس طرح رنگوں کے سلسلے میں الگ الگ ذوق ہیں، کسی کو ''گلابی رنگ'' پسند ہے تو کسی کو سبز، یہ سوال نہیں کیا جا سکتا کہ آپ کو یہ رنگ کیوں پسند ہے؟

اپنے اپنے ذوق کی بات ہے کسی کو کوئی رنگ پسند ہے تو کسی کوئی اور رنگ پسند نہیں ہے!! تو کیا اجتماعی مسائل بھی رنگوں کی کی پسند و ناپسند کی طرح ہیں ؟ یا نہیں، اجتماعی مسائل، حقیقی مصالح ومفاسد کے تابع ہیں ؟ انسانی اعمال وکرداراور اس کی انفرادی، اجتماعی، مادی اور معنوی زندگی پر جو اثرات پڑتے ہیں ان کے درمیان ایک حقیقی رابطہ ہے ،یعنی در حقیقت ان میں علت و معلول کا رابطہ پایا جاتاہے،اور اجتماعی یا انفرادی زندگی میں انسانی رفتاروکردار سعادت یا شقاوت میں موثر ہیں، لہٰذا یہ دیکھنا ضروری ہے کہ کون سے امور سعادت کا باعث ہیں تاکہ وہ جائز ہوں،اور کون سے امور شقاوت وبد بختی کا سبب ہیں تاکہ وہ ممنوع قرار پائیں.

اب جبکہ یہ ثابت ہوگیا کہ انسانی کردار اور اس کی بھلائی اور برائی کے درمیان ایک واقعی اور حقیقی رابطہ ہے تو ضروری ہو جاتا ہے کہ ان روابط کی شناخت پیدا کی جائے اور ان ہی کی بنیاد پر قوانین بنائے جائیں. ایسے میں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان مصالح ومفاسد کو کون بہتر طور پر جانتا ہے؟ ہم مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ خدا ان کو بہتر جانتا ہے۔

اس لئے قانون سازی کے دائرے میں اسلام کا نظریہ ہے کہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے اعمال وکردار اور اس کی دنیوی اور اخروی سعادت وشقاوت میں علّی اور معلولی کا رابطہ ہے جن کو بھلائی اور خرابی کے عنوان سے یاد کیا جاتا ہے، لہٰذا ان بھلائیوں خرابیوں کی پہچان ضروری ہے تاکہ ان ہی کی بنیاد پر قوانین بنائے جائیں، نہ یہ کہ لوگوں کی اکثریت کی مرضی کے مطابق قوانین بنائے جائیں۔

اکیسویں تقریر

اسلام اور جمہوریت

گذشتہ مطالب پر ایک نظر ہم نے گذشتہ بحث کے دوران اسلام کے سیاسی نظریہ کا دو حصوں قانون سازی اور قانون پر عمل در آمد کے عنوان سے جائزہ لیا ہے ،اور اس سلسلہ میں اٹھائے گئے بعض اعتراضات کے جوابات بھی دئے ہیں، نظریہ کا محور یہ تھا کہ بنیادی طور پر ایک نظام کی سرگرمیوں. منجملہ اسلامی حکومت کی فعالیت دو حصوں اور دو شعبوں میں انجام پاتی ہے ، (البتہ بعض دوسرے زاویوں کے تحت اس کے تین یا چار حصے بھی قرار دیئے جا سکتے ہیں) پہلا دائرہ کار قانون سازی کا ہے اور دوسرا دائرہ کار قوانین کے نفاذیا عمل در آمد کا ہے ،قانون اور قانون سازی کے دائرے میں اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ معاشرہ میں وہ قوانین حاکم ہوں جن کے ذریعہ معاشرہ کی مادّی اور معنوی مصلحتوں کو پورا کیا جا سکے،

اور اس بنیاد پر معاشرہ کے لئے مکمل قانون وہی بنا سکتا ہے جو انسان کے تمام مادی اور معنوی پہلوؤں اور اجتماعی زندگی کی مختلف شرائط سے باخبر ہو ،اور وہ قوانین اس طرح بنایا جائے کہ وہ عالم آخرت میں انسانی سعادت فراہم کر سکے، اور ظاہر ہے خداوندعالم یا خدا وند عالم کے منتخب بندوں کے علاوہ کوئی اس طرح کے علم ودانش کا مالک نہیں ہے۔

اس کے علاوہ، خداوندعالم کی تشریعی ربوبیت میں توحید کاتقاضا یہ ہے کہ خداکے بندے خدا کے احکامات کی اطاعت کریں اور خداوندعالم کے تشریعی فیصلوں کو اپنی زندگی پر حاکم قرار دیں، اور اس کی مرضی کے خلاف قدم نہ اٹھائیں، لہذا قانون سازی میں خداوندعالم کی تشریعی ربوبیت کی رعایت ضروری ہے.اسی پہلو کے تحت اسلامی معاشرہ میں قوانین اپنی مخصوص شناخت کے حامل ہیں جو انسان کے بنائے ہوئے قوانین کے ساتھ کئی رخ سے امتیاز رکھتے ہیں۔

اس کو مختصر الفاظ میں یوں عرض کروں کہ اسلامی معاشرہ میں خدا یا جس کو خدا اجازت دی ہے،اس کی طرف سے قوانین کا وضع ہوناضروری ہے. اسی طرح کی بات قوانین کا نفاذ کرنے والوں کے لئے بھی ہے، کیونکہ قانون کانافذ کرنے والا گویا ایک طرح سے معاشرہ کے لوگوں کی زندگی میں تصرفات سے کام لیتا ہے،اور ان کو قوانین الٰہی پر عمل کرنے کے لئے مجبور کرتا ہے، کبھی کبھی جرم وسزا کے قوانین کو جاری کرتا ہے او رمجرمین کے لئے ان کے جرم کے تحت مخصوص پابندیا ں لگاتا ہے.بہر حال یہ وہ تصرفات ہیں جو خدا کے بندوں کی زندگی میں انجام پاتے ہیں، او ریہ تصرفات سوائے ان حضرات کے کہ جن کو خداوندعالم کی طرف سے اجازت حاصل ہے،کسی کے لئے بھی جائز نہیں ہے۔

قانون نافذکرنے والوں کے لئے بھی اذن خدا کی ضرورت

ممکن ہے کہ بعض لوگ سوال کریں کہ جب ہم نے قانون کو قبول کرلیا اور اس کے سر چشموں اور نفاذ کے راستوں کوبھی پہچان لیا اور یقین کرلیا کہ فلاں سلسلے میں مثلاً فلاں قانون پر عمل در آمد ہونا چاہئے، توکیا فرق پڑتاہے کہ قانون کا جاری کرنے والا زید ہو یا عمرو؟ جب خدا کابنایا ہوا صحیح قانون نافذ کرنا ہے تو یہ خدا کی اجازت کی کیا ضرورت ہے؟ ہم قبول کرتے ہیں کہ معاشرہ میں قوانین الٰہی کا نفاذ ہوناچاہئے، لیکن قانون کا نفاذ کرنے والے کے لئے خدا کی اجازت کی کیا ضروت ہے؟

یہ سوال اگر فقہی فضاء میں اٹھایاجائے تو جواب بھی فقہی اصولوں اور فقیہوں کی روش کے مطابق دیاجائے گا، لیکن اگر کوئی اس بات کو عوامی اسٹیج سے بالکل آزاد ماحول میں وسیع سطح پر اٹھائے،او رفقہی بنیادوں اور فقہ اسلامی کے مروجہ تحقیقی طریقوں سے کوئی کام نہ رکھےاور کھلم کھلا عوام کے مجمع میں یہ بات چھیڑے اور ایسے جواب کا خواہش مند ہو جو عمومی طور پر قابل فہم ہوتوایسے لوگوں کے لئے اپنی روز مرہ کی اجتماعی مثالوں اور نمونوں کے ذریعہ عام فہم زبان میں بات کرنی ہوگی ، مثلاً یہ کہیں گے آپ گھریلو زندگی میں خاندانی سطح پر کچھ قوانین بناتے ہیں جن کا اپنے خانوادے یعنی بیوی اور بچوں کے درمیان نفاذ کرنا ہوتا ہے، تو آپ کہہ دیتے ہیں کہ کوئی دوسرا کسی کی چیزکو ہاتھ نہیں لگائے گا، یہاں تک کہ چھوٹے چھوٹے بچے بھی اپنے کھلونوں او رکاپیاں، کتاب اور پینسل وغیرہ

کے سلسلے میں اس قانون کی رعایت کرتے ہیں، اگر ان میں سے کوئی بغیر اجازت کے کسی دوسرے کی چیز کو اٹھاتا ہے، تو اس پر سب اعتراض کرتے ہیں، اس طرح دو خاندان اور دو پڑوسیوں کے درمیان اگر اجازت کے بغیر آپ کا پڑوسی گھر میں داخل ہوکر آپ کا کوئی سامان اٹھالے جائے، چاہے وہ سامان آپ کے یہاں بے کار ہی کیوں نہ پڑا ہو، آپ فوراً اعتراض کرتے ہیں کہ میری اجازت کے بغیر کس طرح میرے گھر میں داخل ہوئے یا کیوں ہمارے سامان کو اٹھا کر لے گئے، یہاں تک کہ اگر اس نے آپ کے ساتھ کچھ احسان بھی کر رکھا ہو تب بھی آپ کو یہ حق حاصل ہے کہ اس پر اعتراض کریں۔

دوسری مثال لے لیجئے کسی ادارہ میں کچھ قوانین و دستور نافذ ہونا ہیں لیکن ابھی ادارہ کے ڈائریکٹر کی طرف سے حکم نامہ حاصل نہیں ہوا ہے، اگر کوئی آکر کہے کہ میں ایک قابل اطمینان، صحیح و سچا انسان ہوں، اور نئے دستور کی تمام شقوں سے اچھی طرح واقف ہوں اور پھر چیئرمین کی کرسی پر بیٹھ کر نئے قوانین کے مطابق یکے بعد دیگرے حکم جاری کرنا شروع کر دے، تو کوئی اس کو اس کام کی اجازت نہیں دیگا؛ یہاں تک کہ اگر وہ شخص وہی ہو جس کو آئندہ کے لئے چیئرمین مقرر کیا گیا ہو، جب تک حکم نامہ نہ آجائے کسی کو حق نہیں ہے کہ کرسی پر بیٹھ کر حکم لگانا شروع کردے۔

اور اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو مجرم قرار پائے گا، اور ہوسکتا ہے کہ اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی جائے اور سزا بھی ہوجائے، جب اس نے خدمت کی ہے او روہی کام انجام دیا ہے جو کچھ دنوں بعد انجام پانے والا تھا، چونکہ یہ اصول تمام عقلاء قبول کرتے ہیں کہ قانونی طور پر جب تک اوپر سے حکم جاری نہ ہوجائے کسی کو اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ وہ کوئی قانونی کام بھی انجام دے اور تصرف سے کام لے خلاف قانون کام کی تو دور کی بات ہے۔

اجتماعی زندگی میں اس قبول شدہ اصول کے پیش نظر ہم آسانی سے یہ بات سمجھ سکتے ہیں، کہ ایک ایسے معاشرہ میں جو خدا والا ہے اور جہاں کی عوام خدا کو اپنا رب تسلیم کرتی ہے، اگران میں کوئی ان کے رب کی اجازت کے بغیر حکومت کرنا چاہے تو اس کی مثال،

اس شخص کی سی ہوگی کہ جو کسی ادارہ میں ریاست کرنا ، یا ملک کا وزیر اعظم بننا چاہے، اور تمام کاموں کو اپنے ہاتھ میں لے لے ؛ بغیر اس کے کہ اس کو اعلیٰ حکام نے مقرر کیا ہو یا عوام نے منتخب کیا ہویا کسی قانونی رخ سے عنان منصب کو ہاتھ میں لیا ہو، یہاں تک کہ اگر اس کے کام اچھے اور مناسب ہوں تب بھی اس سے جواب طلب کیا جائے گا، اور ممکن ہے کہ اس کو سزا بھی ہوجائے، اسی وجہ سے ہم کہتے ہیں کہ اسلامی قوانین کے نفاذ کے لئے بھی خدا کی طرف سے تقرر اور جازت ضروری ہے ، جو لوگوں کا اصلی اور حقیقی مالک ہے، ورنہ حکام سے باز پرس ہوگی، جیسا کہ ہم نے ابھی مثال میں عرض کیا کہ حکام بالا کی طرف سے تقرری کے بغیر کسی ادارہ کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں لے لینا قانونی جرم ہے، اور اگر یہ فرض کرلیں کہ جواب طلبی ، نہیں ہوگی ، تو بھی لوگوں پر اس کی اطاعت واجب نہیں ہوگی، یہاں تک کہ اسی قانون کے نفاذ کے بارے میں لوگ کہیں گے آپ کی تقرری کا آرڈر کہاں ہے؟کس کے حکم سے آپ یہاں کے ڈائریکٹر بن بیٹھے ہیں؟ اور جب تک لوگ یہ یقین نہ کرلیں کہ اس کو کسی افسر بالا نے اس عہدہ پر فائز کیا ہے اس کی اطاعت قبول نہیں کرتے ۔

اسلامی نظریہ کے لحاظ سے ،معاشرہ کے تمام افراد خدا کی مخلوق اور خدا کے بندے ہیں،وہ سب کا مالک و مختار ہے، اور مالک کی اجازت کے بغیر کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ اس کے امور میں مداخلت کرے خدا کی اجازت ضروری ہے، یہاں تک کہ قانون الٰہی کو بھی وہی مقرر و معین شخص نافذ کرسکتا ہے جس کو خدا کی طرف سے اجازت حاصل ہے، اسی وجہ سے اسلامی انقلاب کے قائد اور اسلامی نظام حکومت کے بانی حضرت امام خمینیؒ نے اس اسلامی طرز فکر کے مطابق جو اسلام اور اسلامی کتب پر استوار تھی اسلامی حاکم کی حیثیت سے صدر مملکت کے حکم تنفیذ میں ہر جگہ صاف تحریر کیا ہے کہ ''میں تم کو نصب کرتا ہوں'' آپ نے کسی بھی موقع پر صرف لوگوں کے ووٹ کو صدارت کے لئے کافی نہیں جانا ہے، حتی بعض موقعوں پر تحریر فرمایا ہے: میں اُس ولایت کی رو سے جو رکھتا ہوں آپ کو اس عہدے پر منصوب کرتا ہوں، ایک موقع پر آپ نے فرمایا تھا '':ان لوگوں کی باتوں پر کوئی توجہ نہ دیجئے جو اسلامی نظریات کے مخالف ہیں،

اور خود کو روشن فکر تصور کرتے ہیں اور ولایت فقیہ کو قبول نہیں کرتے، چنانچہ اگر ولی فقیہ درمیان میں نہ ہو اور وہ منصوب نہ کرے تو طاغوت ہے اگر صدر جمہوریہ کو ولی فقیہ منصوب نہ کرے حکومت غیر قانونی ہوگی اور جب غیر قانونی ہوگی تو طاغوت ہے، اور اس کی اطاعت طاغوت کی اطاعت ہوگی[۱]'' یہ کوئی امام خمینیؒ کا ذاتی نظریہ نہیں ہے بلکہ یہ نظریہ قرآن وحدیث سے اخذ کیا گیا ہے، اور بہر حال یہ اس شخص کا نظریہ ہے جس نے اس اسلامی نظام حکومت کی بنیاد رکھی ہے۔

لہٰذا قانون کا نفاذ کرنے والا، حتیٰ اگر تمام قوانین اسلامی اصولوں کے مطابق ہوں خدا کی طرف سے اذن یافتہ ہونا چاہئے. اور یہ اذن کبھی خاص ہوتا ہے، جیسا کہ حضرت رسول خداؐ اور ائمہ معصومین علیہم السلام کے لئے نص موجود ہے یا ان لوگوں کے بارے میں ہے جن کو خود آنحضرتؐ نے منصوب فرمایا ہے، مثلاً جس طرح حضرت امیرالمومنین علی علیہ السلام کے زمانہ میں آپ کی طرف سے بعض افراد اسلامی ریاستوں کے والی وحاکم کے طور پر معین ہوتے تھے، یا جس طرح امام زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کی غیبت صغریٰ کے زمانہ میں نواب اربعہ خاص طور پر منصوب ہوئے ہیں۔

ان تمام مقامات پر مخصوص افراد، مخصوص اجازت سے منصوب ہوئے ہیں تاکہ مخصوص دائرے میں حکومت الٰہی کے احکام وقوانین بیان اور جاری کریں. کبھی یہ اجازت دینا یا منصوب کرنا عمومیت رکھتا ہے؛ جیسا کہ اس وقت امام زمانہ علیہ السلام کی غیبت کے زمانہ میں، یا اُن ائمہ علیہم السلام کے زمانہ میں جو مبسوط الید یعنی وسیع اختیارات کے مالک نہیں تھے اور حکومت ان کے ہاتھوں سے لے لی گئی تھی، ایسے زمانوں میں باصلاحیت افراد کو اذن عمومی کے تحت احکام الٰہی کے نفاذ کے لئے اجازت حاصل تھی، مثلاً حضرت امام صادق علیہ السلام نے اپنے شیعہ فقہاء کو اجازت دے رکھی تھی کہ جن علاقوں میں لوگوں کی امامؑ تک رسائی ممکن نہ ہو، وہ احکامات الٰہی کی تعلیم ونفاذ کا اہتمام کریں اور حکومتی کاموں کو انجام دیں اور زمانۂ غیبت میں تو یہ مسئلہ بدرجہ اولیٰ ثابت ہے۔

---

[۱] صحیفہ نور ج۹ص۲۵۱.

کیونکہ جب معاشرے میں حاضر امام معصوم مبسوط الید نہیں ہے یا تقیہ کے عالم میں رہ رہا ہے، تووہ حکم عام کے تحت معتبر افراد کواجازت دیدیتا ہے کہ وہ اس کی طرف سے لوگوں کے حکومتی مسائل میں مداخلت کریں تو کیا یہ کام امام علیہ السلام کی غیبت کے زمانہ میں جب کہ امام علیہ السلام تک لوگوں کی رسائی ممکن نہیں ہے اولیٰ اور مناسب نہیں ہے؟اس وقت، فقہی اصولوں کی تشریح اور شرعی دلیلیں پیش کرنا مقصود نہیں ہے ،ہم صرف اس مسئلہ کی وضاحت کردینا چاہتے ہیں کہ اسلام میں حتیٰ اسلامی قانون کو جاری کرنے والے کے لئے بھی خدا کی اجازت کی ضروت ہے؟ اور خداوندعالم نے قانون کا نفاذ کرنے والوں کوکس عنوان سے اجازت دی ہے،چنانچہ ہم نے عرض کیا کہ یہ اجازت یا توکسی خاص شخص کو خاص حکم کے تحت دی گئی ہے، یا عمومی حکم کے تحت ہے،جیسا کہ جامع الشرائط فقہاء کرام کے لئے ہے۔

اس نظریہ پر ،قانون سازی کے پہلو سے ہو یا قانون کے نفاذ کے پہلو سے بعض شبہات اٹھائے جاتے ہیں ،جن میں سب سے اہم بات یہ تھی کہ یہ نظریہ انسانوں کی اصل آزادی کے مخالف ہے، جس کا ہم نے گذشتہ گفتگو میں مفصل جواب عرض کردیا ہے.ان شبہات کا ایک اور رخ خصوصاً قانون کے نفاذکے بارے میںیہ ہے ،کہ ولایت فقیہ کا نظام ، جمہوریت کے ساتھ میل نہیں کھاتا. جمہوریت ایک ایسا نظام ہے جس کو تمام عقلائے عالم نے قبول کیا ہے ،یہاں تک کہ سوشلسٹ ممالک بھی عملی میدان میں جمہوریت کا مقابلہنہ کر سکے، اور مجبورہو کر انھیں بھی جمہوری نظام کو قبول کرنا پڑا. لہٰذا آج کا انسان کم از کم عصر حاضر میں،ڈیموکرٹیک نظام کو قبول کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رکھتا، اوریہ اسلامی حکومت جو حکومت ولایت فقیہ کے نام سے معروف ہے ، ڈیموکریسی سے ہم آہنگ نہیں ہے۔

جمہوریت کا مفہوم اوراس کا انقلابی استعمال پہلے ہم ضروی سمجھتے ہیں کہ لفظ ''جمہوریت''اورڈیموکریسی 'Democrasy" کے بارے میں کچھ وضاحت کردیں، کیونکہ ہوسکتا ہے بعض لوگ اس لفظ کے بارے میں کافی معلومات نہ رکھتے ہوں، جمہوریت کا لفظی ترجمہ ہے؛ لوگوں کی عوامی حکومت ؛یعنی معاشرہ کے تمام افراد حکومت کے معاملات میں مثلاًقانون سازی ہو یاقانون کا نفاذ یا دوسرے

حکومتی امور میں اپنا حق رکھتے ہیں اور کوئی دوسرا قانون سازی اور اس پر عمل درآمد کرنے کا حق نہیں رکھتا، یہ ہے لفظ ڈیموکریسی کا اصل مطلب۔تاریخ میں ''جمہوریت'' مختلف طریقوں سے بیان ہوئی ہے: شروع میں جیسا کہ تاریخ سے پتہ چلتا ہے حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام کی ولادت سے پانچ سو سال پہلے یونان کے پایۂ تخت ''آتھن'' میںیہ نظریہ وجود میں آیا اور کچھ مدت کے لئے اس پر عمل درآمد کیا گیا۔

اس طرح کہ تمام لوگ، سوائے غلاموں اور ۲۰سال سے کم عمر والوں کے،اپنے سیاسی اور معاشرتی مسائل میں براہ راست دخیل تھے. جس وقت کوئی بھی ۲۰ سال کا ہوجاتا تھا اپنے شہر کے سیاسی کاموں میں حصہ لے سکتا تھا. البتہ کسی پر لازم نہیں تھا بلکہ اس امر مہم میں لوگ آزادو خود مختار تھے. اس زمانہ میں لوگ کسی بڑے میدان میں جمع ہوجاتے تھے اور اپنے شہر کے مسائل کے بارے میں نظریات پیش کرتے تھے، بحث و گفتگو ہوتی تھی اور اسی کے نتیجہ میں فیصلے ہوتے تھے اور ان ہی پر عمل ہوتا تھا،حکومت کی یہ شکل جس میں کوئی مخصوص شخص یا مخصوص گروہ حکومت کے لئے معین نہیں ہوتا تھا،

بلکہ خود عوام براہ راست اپنے سماجی وسیاسی مسائل میں فیصلے کرتے تھے.اسے جمہوریت یاعوام کی حکومت کا نام دیا جاتا تھا، ڈیموکریسی کا یہ انداز ایک مدت کے لئے یونان کے مرکز ایتھنس میں چلتا رہا، لیکن اس سے قطع نظر کہ بڑے بڑے دانشور اور فلاسفہ نے اس نظریہ کی بھرپور مخالفت کی ہے،اور اس کو بہت گرے ہوئے الفاظ سے یاد کرتے،اور گنواروں کی حکومت کہتے تھے، عملی طور پر بھی یہ جمہوری حکومت بہت سی مشکلات سے دوچار تھی، اسی وجہ سے یہ حکومت زیادہ دن نہیں چل سکی۔

ظاہر ہے یہ طرز حکومت بڑے بڑے ممالک اور کثیر آبادی والے شہروں میں قابل عمل نہیں تھا کیونکہ تمام لوگ ہمیشہ اپنے تمام اجتماعی مسائل میں براہ راست حصہ لے سکیں ممکن نہیں ہے. چھوٹے شہروں میں یہ انداز حکومت کچھ مدت کے لئے ممکن ہے بروئے کار لایا جایا، لیکن لاکھوں کی آبادیوں والے شہروں میں کس طرح ممکن ہے کہ روز مرّہ کے کاموں میں سب مل کر کوئی

فیصلہکریں؛بہر حال یہ انداز ختم ہوگیا، یہاں تک کہ بیداری کی تحریک ''رینیسانس'' کے بعد ڈیموکریسی کی ایک دوسری شکل پیش کی گئی،اور وہ اس طرح کہ عوام اپنے کچھ نمائندے حکومت کے کاموں کے لئے منتخب کرے، اور وہ لوگوں کی نمائندگی میں حکومت کریں؛ چونکہ لوگوں کی براہ راست مداخلت ممکن نہیں ہے. اس کے بعد سے اس نظریہ کے حامیوں کی تعداد بہت زیادہ ہوتی چلی گئی اور آہستہ آہستہ بعض ممالک میں اس طرح کی حکومت رائج ہوگئی،یہاں تک کہ انیسویں صدی عیسوی میں تقریباً پورے یورپ اور دوسرے برآعظموں میں بھی اس طرح کی حکومت لوگوں میں مقبول ہوگئی اور اسی طرز پر حکومتیں بننے لگیں۔

ہمارے ملک میں بھی ڈیموکریسی کا یہی طریقہ رائج ہے، اور عملی طور پر عوام تمام حکومتی شعبوں اور ڈھانچوں پر مختلف انتخابات (الیکشن) میں شرکت کرتے اور نمائندے منتخب کرتے ہیں. مثلاً صدر جمہوریہ کا اور اسلامی پارلیمنٹ کے نمائندوں کا ہم ووٹنگ میں حصہ لے کر انتخاب کرتے ہیں جو عوام کی نمائندگی میں قوانین بناتے اور ان کو جاری کرتے ہیں .

اسی طرح کارپوریشن اور دوسرے سرکاری اداروں کے انتخابات ہیں کہ جن کا ذکر ایران کے آئین میں موجود ہے شرکت کرتے ہیں. پس ڈیموکریسی کی یہ دوسری شکل جو ہر قسم کے نظام حکومت میں ایک خاص شکل کی حامل ہے ملک کے سیاسی واجتماعی مسائل میں لوگ اپنے پارلیمانی نمائندوں کا انتخاب و ووٹنگ میں شرکت کے ذریعہ کرتے ہیں۔

عصر حاضر میں جمہوریت کا مفہوم

آج کے زمانے میں اپنے اصل مفہوم سے الگ ڈیموکریسی ایک خاص معنی پیدا کرتی جارہی ہے اوراسی حکومت کو جمہوری یا ڈیموکریٹک حکومت کہتے ہیں جس میں دین کا کوئی کردار نہ ہو،لہٰذا جس وقت یہ کہتے ہیں: ''فلاں حکومت جمہوری حکومت ہے او رفلاں ملک میں ڈیموکرٹیک طریقہ پر حکومت چل رہی ہے''،تو اس کا مطلب یہ ہوتاہے کہ اس معاشرہ میں دین کا کوئی کرادر نہیں ہونا چاہئے،یعنی قانون بنانے اورنافذ کرنے والے کسی بھی میدان میں دین کی دخیل نہ کریں.

البتہ ڈیموکریسی کا یہ انداز دین کی نفی نہیں کرتا، لیکن سیاسی اوراجتماعی مسائل میں دین کی مداخلت قبول نہیں کرتا، اور اس چیز کی اجازت نہیں دیتا کہ قانون کا نافذ کرنے والے افراد قوانین پر عمل درآمد کے وقت دین کی بات کریں، کوئی بھی ضابطہ اور دستور العمل دینی احکام و معیارات پر جاری نہیں ہونا چاہئے. درحقیقت ڈیموکریسی کا یہ طریقہ ''لائیک'' اور ''سیکولر'' نظام کی بنیاد پر استوار ہے جو سیاسی اوراجتماعی مسائل سے دین کو بالکل جدا اور الگ مانتے ہیں.

البتہ ہوسکتا ہے کہ خود قانون سازیا قوانین پر عمل درآمد کرانے والے مذہبی اور دیندار افراد ہوں جو ہفتہ وار کلیسا میں جائے اور وہاں نذر ونیاز بھی کرتے ہوں. ممکن ہے یہ لوگ دینی انجمنوں کے ممبر بھی ہوں اور حکومت کے سرکاری کاموں کے دائرے سے باہر عام انسانوں کی طرح قومی، عوامی یامحلے کی سطح پر مخصوص دینی کاموں میں بھی مشغول نظرآئیں. لیکن حکومت اور حکومت کے کاموں میں چاہے قانون سازی کا شعبہ ہو یا عدالت کا شعبہ ہو، قوانین پر عمل درآمد ہو یا نظام حکومت کا مرحلہ، کہیں دین کی کوئی بات یا دین کی کوئی علامت نہیں ظاہر ہونی چاہئے ۔

اگر آپ سنتے ہیں کہ ''فرانس ''کی مانند ملک میں، جو آزادی اور جمہوریت کا گہوارہ مانا جاتا ہے ایک برقعپوش لڑکی کو کالج اور یونیورسٹی میں جانے سے روک دیاگیا، تو اس کی وجہ یہی ہے کہ یہ لوگ دینی کاموں سے روکنا ڈیموکریسی کا ایک حصہ خیال کرتے ہیں،اور کہتے ہیں کہ ہماری حکومت ایک لائیک حکومت ہے، اور دین کی کوئی علامت ہمارے کسی بھی سرکاری ادارے میں نظر نہیں آنی چاہئے،مقنع پہننا اور سر ڈھانکنا دین کی طرفداری کی ایک نشانی ہے، اور حکومتی اسکولوں کی مانند سرکاری اداروں میں اس کا پہننا ممنوع ہے ؛جی ہاں!اگر کوئی اسکول کلیسا سے وابستہ ہو یا کوئی پبلک اسکول ہواوراس میں تمام لڑکیاں روسری پہنتی ہوتیں تو کوئی پریشانی کی بات نہیں تھی، لیکن سرکاری کالج اور یونیورسٹیوں میں جو حکومت کے زیر نظر ہیں اور جہاں سرکاری منظوری سے سند دی جاتی ہے یا، اسی طرح سرکاری اداروں اور وزارتخانوں میں دین کی کوئی علامت نظر نہیں آنا چاہئے. یہ جمہوریت کی ایک نئی تفسیر ہے جس کی بنیاد پر دینی علامتیں اور اقدار و معیارات جمہوریت کے ساتھ منافات رکھتے ہیں۔

ڈیموکریسی کی روایتی تعریف یا اس کی دوسری شکل جس میں ڈیموکریسی کا مطلب لوگوں کی حکومت ہے، اگر ملک کے لوگ دیندار ہوں اور چاہیں کہ اس کے اداروں میں دینی آداب ورسوم پر عمل ہو، تواس کی مخالفت نہیں ہونا چاہئے؛ کیونکہ یہ کام لوگوں کی مرضی اور اس قانون کے مطابق ہے جو خود انھوں نے بنایا اور قبول کیاہے اور خود ہی اس کا نفاذ بھی کیا ہے، ڈیموکریسی کا تقاضا ہے کہ لوگ ہر جگہ حتی مدارس، وزارتخانوں اور دوسرے اداروں میں لباس پہننے میں آزاد ہوں، اب اگر لوگوں کی واضح اکثریت دیندار ہے اور وہ اپنے دینی رجحان کی وجہ سے کوئی مخصوص قسم کا لباس پہننا چاہیں یا دینی رسم ورواج پر عمل کرنا چاہیں،

تو کسی کو انھیں روکنے کا حق نہیں ہونا چاہئے. جس وقت لوگوں کی مرضی اور خواہش سے یہ قانون بنادیا گیا کہ وزارتخانوں، یونیورسٹیوں اور سرکاری اداروں میں نماز جماعت قائم کرنا ضروری ہے تویہ ڈیموکریسی کا جو مفہوم ہم جانتے ہیں، اس کے خلاف نہیں ہے، کیونکہ خود عوام نے اس قانون کو بنایا ہے اوروہ خود ہی اس پر عمل درآمد کررہے ہیں، لیکن ڈیموکریسی کی نئی تفسیر عصر حاضر کے مطابق سیاسی اور اجتماعی مسائل میں عوام کے دینی رجحان کا جلوہ نہیں ہونا چاہئے۔

جمہوریت کے نئے مفاہیم سے سامراجی نظام کا فائدہ اٹھاناجیساکہ ہم نے عرض کیا وہ نئی تعریف جو سامراجی حکومتیں کررہی ہیں اور اپنے مفادات اورمقاصد کے تحت اس کو بروئے کار لا رہی ہیں ڈیموکریسی بھی لائیک اور سیکولرنظام کیساوی ہے جس میں کسی عنوان سے سیاسی اوراجتماعی امور میں دین کو مداخلت کی اجازت نہیں ہے. یہاں تک کہ اگر خود عوام یہ کہیں کہ ہم اس دین کو قبول کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ سرکاری دفاترمیں ہم اپنے دینی رسم ورواج پر عمل کریں، تو بھی وہ لوگوں کے اس مطالبہ کو ڈیموکریسی کے خلاف قرار دیتے ہیں ۔

یہی وجہ ہے کہ جب ''الجزائر'' میں الیکشن ہوا اور وہاں ایک اسلامی پارٹی کامیاب ہوئی اوراس نے ڈیموکریسی کے اصولوں پر اس ملک کے قوانین کے مطابق حکومت بنانا چاہی اور اسلامی احکام کو جاری کرنا چاہا ، مخالفوں نے محسوس کیا کہ اب یہ پارٹی حکومت

کرے گی اور یہ مستقبل میں ایک اسلامی حکومت تشکیل دینا چاہتی ہے تو فوجی بغاوت کردی اور عوامی انتخابات کو باطل قرار دے کر اس پارٹی کے لیڈروں کو پکڑپکڑ کر جیل میں ڈال دیاگیا، اور اس پارٹی کو ختم کرکے غیر قانونی قرار دے دیاگیا. اور آج کئی سال گذر جانے کے بعد بھی اس پارٹی کوفعالیت کی اجازت نہیں ہے، باوجود اس کے کہ اس اسلامی ملک نے لاکھوں قربانیاں دے کر آزادی و مختاری حاصل کی تھی، اور قربان ہونے والے وہی مسلمان تھے جنھوں نے اسلامی جذبے کے تحت اپنی اسلامی پہچان باقی رکھنے کے لئے سامراجی حکومت سے جنگ لڑی تھی یہاں تک کہ الجزائز کے لوگوں کو آزادی نصیب ہوئی، آج وہاں کی حالت بہت زیادہ خراب ہے اورجیسا کہ اخباروں میں ہم پڑھتے رہتے ہیں ہر روزاس ملک میں دسیوں افراد کوبڑے ہی بے رحمانہ اور در دناک طریقے سے قتل کردیا جاتا ہے۔

وہاں رونما ہونے والے ان تمام حادثات اور اس حکومت کے باوجودجو فوجی بغاوت کے ذریعہ قائم کی گئی ہے اور جس نے قتل وغارت گری اور گھٹن کا ماحول ایجاد کر کے حکومت کررہی ہے، پھر بھی سوپر طاقتوں اور سامراجی حکومتوں کے نزدیک یہ حکومت اور اس کی ایجاد کردہ صورت حال اس حکومت کے مقابلہ میں زیادہ قابل قبول ہے جو عوامی انتخابات او رلوگوں کی رائے سے وجود میں آئی تھی مگر ملک میں دین اور اس کے احکامات جاری کرنا چاہتی تھی. اس خوف سے کہ کہیں دنیا میں ایک اور اسلامی حکومت قائم نہ ہو جائے سامراجی قوتوں نے اپنی ''اس طرح کی روش کو جمہوری روش کانام دیاہے، لیکن اگر خود عوام اپنے ووٹ اور اپنی خواہش سے اسلام اور اسلامی حکومت قائم کرنا چاہیں تو یہ عمل غیر ڈیموکرٹیک اور غیر جمہوری ہے کیونکہ لوگ مذہب کی طرف رجحان رکھتے ہیں''، معلوم ہوا جمہوریت کی نئی تفسیر کی بنیادپر دین کو سیاسی و معاشرتی مسائل میں ہر گز مداخلت نہیں کرنا چاہئے، یہاں تک کہ کوئی لڑکی مقنع پہن کر کالج نہیں جاسکتی؛ جیسا کہ ترکی میں بھی اسی طرح ہوتارہا ہے۔

اسلامی ممالک میں موجود سامراجی ایجنٹ بھی اسی فکر میں ہیں کہ تمام اسلامی ممالک میں بھی اسی طرز کی جمہوریت قائم ہونا چاہئے یعنی ملک کے نظام اور حکومتی مسائل میں دین کے لئے کوئی جگہ باقی نہیں رہ جائے وہ قانون سازی کا شعبہ ہویا قانون کے نفاذ کا؛ حتی وہ

ممالک جو اسلامی حکومت قائم کرنے کی طرف بہت زیادہ مائل ہیں ان میں ثقافتی یلغار اور یونیورسٹیوں میں اثر و رسوخ کے ذریعہ مذہبی جذبے اور اسلامی رجحان کو ضعیف وکمزور کردینا چاہتے ہیں، اور جمہوریت کو اسی اپنے معنی میں رائج کرنا چاہتے ہیں، وہ اپنے تصور میں اس گمان میں ہیں کہ چند دہائیوں کے بعد جب یہ نسل بدل جائے گی اور انقلابی نسل کنارے لگ جائے گی اور ان کی جگہ جدید نسل آجائے گی جو انقلاب کے اصولوں سے واقف نہیں ہے، وہ ڈیموکریسی کی نئی تفسیر کو بروئے کار لانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

معلوم ہوا کہ جمہوریت کے تین مطالب اور تین تفسیریں ہیں:

۱۔ ''حکومتی مسائل میں عوام کی براہ راست مداخلت''،جیسا کہ کچھ عرصے کے لئے یونان کے ایک شہر میں جمہوریت حکمراں رہی اور پھر ختم ہوگئی۔

۲۔ عوام کی اپنے منتخب کردہ نمائندوں کے ذریعہ حکومت کے امورمیں مداخلت، جیسا کہ آج دنیا کے مختلف ممالک میں جمہوریت قائم ہے حتی خود ہمارے ملک میں بھی موجود ہے۔

۳۔ جمہوریت کا تیسرا مفہوم یہ ہے کہ حکومت کے تمام امور سے (قانون سازی ہو یا قانون کا نفاذ) دین کو الگ رکھا جائے، یعنی ڈیموکرٹیک ہونے کی شرط حکومت کا سیکولر اور لائیک ہونا ہے۔

اسلام کی نظرمیں جمہوریت کی مطلوب روش اس سوال کے جواب میں کہ اسلام ان میں سے کون سا طریقۂ حکومت قبول کرتا ہے ؟ ہم نے قانون سازی کی بحث میں عرض کیا تھاکہ اگر قانون سازی کے دائرے میں جمہوریت کا یہ مطلب ہے کہ اگر لوگوں کی اکثریت یعنی پچاس فیصدی سے زائد افراد کسی قانون کی حمایت کردیں تووہ قانون معتبر اور واجب الاتباع ہو جاتاہے چاہے وہ قرآن کی نص کے خلاف ہی کیوں نہ ہوتو اسلام، قانون سازی کے مرحلے میں ایسی ڈیموکریسی کو نہیں مانتا، وہ اسلام جو خودملک اور حکومت چلانے

کے مختلف شعبہ میں خواہ وہ عدالت کے مسائل ہوں یا انتظام وانصرام کے، معاشی اصول ہوں یا اقتصاد کے، چھوٹے چھوٹے مسائل سب کے لئے قوانین رکھتا ہے وہ اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا کہ قرآن کے صریحی احکام اور نص کے مخالف قوانین سرکاری حیثیت پیدا کرلیں، اور اگر ہم نے اس طرح کے قوانین کو سرکاری طور پر تسلیم کرلیا تو گویا ہم نے اسلام کو نظر انداز کر دیا ہے۔

ایسی جمہوریت کا اسلامی قانون سازی کے ساتھ میل نہ کھانا، دو دو چار کی طرح بالکل واضح ہے اور اس کے لئے کسی استدلال کی ضرورت نہیں ہے. اگر کوئی یہ کہے کہ قانون سازی میں جمہوریت کا مطلب ہے ایک ایسے قانون کا معتبر ہونا جو اسلام کے احکام سے میل نہیں کھاتا ہوتو، ظاہر ہے اسلام بھی اس کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہوسکتا، اور جب اصل ڈھانچے میں ہی مطابقت و ہم آہنگی نہ پائی جاتی ہوتو اس کے لئے کوئی دلیل پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اور جب کسی ڈھانچے کی تشکیل ہی اسلام کی مخالفت پر ہوئی ہو تو یہ سوال کرنا فضول ہے کہ اسلام اس کے ساتھ ہم آہنگ ہے یا نہیں؟ کیونکہ خود اصل ڈھانچہ اسلام کی مخالفت میں بنایا گیا ہے، پس اگر قانون سازی کے دائرے میں جمہوریت کا مطلب یہ ہو کہ وہ قوانین جو اسلام کے ساتھ سازگار نہ ہوں ان کو معتبر مان لیا جائے اور پھر ہم یہ تصور کر لیں کہ اسلام اس قانون کو معتبر جانتا ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہوگا کہ جو چیز اسلام کے ساتھ سازگار نہیں ہے وہ سازگار ہوجائے! یہ ایک واضح سی بات ہے اور کسی استدلال کی ضرورت نہیں ہے ۔

ہاں! جس چیز کی مزید وضاحت کی ضرورت ہے اور جس پر بحث کرنے کا ہم نے وعدہ بھی کیا ہے، وہ عمل درآمد کے دائرے میں جمہوریت کا مسئلہ ہے؛ یعنی قانون کا نفاذ کرنے والے حکمرانوں کے تعین میں لوگوں کا کیا کردار ہے؟ اسی طرح ان لوگوں کے انتخاب میں جو ملک کے انتظامی قوانین اسلامی اصولوں کے دائرے میں بنانا چاہتے ہیں (یعنی اسلامی پارلیمنٹ کے اراکین) ان کے انتخابات میں لوگوں کی کیا حیثیت ہے؟. وہ مسائل جہاں اسلام نے کوئی مستقل اور دائمی حکم نہیں دیا ہے، اور وقت گزرنے کے ساتھ،

انسانی زندگی میں رونما ہونے والے تغیر وانقلاب کے ساتھ نئی ایجادات ہوں اور پرانے ڈھانچے ٹوٹتے رہتے ہیں اور جہاں ترقی یافتہ دنیا میں نئی ایجاد اور نئی ضرورتوں کے پیش نظر نئے قوانین کی ضرورت پڑتی ہے، اسلام نے حکومت کی قانونی مشینری کو اجازت دی ہے کہ وہ اس دائرہ میں جس کو شہید صدر علیہ الرحمہ نے ''منطقۃ الفراغ''یعنی غیر معینہ علاقہ قرار دیا ہے، اسلامی معیارات کے بنیادی دائروں میں رہتے ہوئے ضروری قوانین بنائے جائیں مثلاً سڑکوں پر آمد ورفت سے متعلق قوانینکہ گاڑیاں داہنی طرف سے چلیں یا بائیں طرف، یا ان کی رفتار کتنی ہو، ظاہر ہے قرآن واحادیث میں اس طرح کے مسائل پر کوئی مخصوص حکم نہیں ہے.

اور اس قسم کے وقتی قوانین زمانہ اور جگہ کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں، اور یہ کام اسلامی حکومت کا ہے کہ وہ اسلام کے اصول وکلیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے فقہی اور آئینی نظریات کے دائرے میں مناسب قوانین بنائے اور نافذ کرے ۔

مذکورہ مطالب کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ جمہوریت اور قانون کا نفاذ قانون سازی کرنے والوں کے تعین اور انتخابات میں، جواسلامی بنیادوں کی رعایت کرتے ہوئے وقتی قسم کے متغیرہ قوانین بنائے جاتے ہیں اس میں عوام اہم کردار ادا کرسکتی ہے. دوسرے الفاظ میںیوں عرض کیا جائے کہ یہ جمہوریت پوری سنجیدگی کے ساتھ اسلامی حدود وقیود کی رعایت کرتے ہوئے نمائندوں کے انتخاب اور معین شدہ خصوصیات کو مدنظر رکھتے ہوئے تمام سرنوشت ساز فیصلوں میں عوام الناس کی شرکت کی شکل میں ایران میں رائج ہے اور ابتدائے انقلاب ہی سے امام خمینیؒ کے زمانہ سے اس پر عمل ہوتا چلاآیا ہے. چنانچہ اسلامی پارلیمنٹ کا انتخابات (الیکشن)، صدر مملکت کا انتخابات، خبرگان رہبری کا انتخابات اور کارپوریشن کا انتخابات اس کی نمایاں ترین مثال ہیں. البتہ لوگوں کے منتخب نمائندوں کے یہاں مخصوص شرائط کا ہونا ضروری ہے. یعنی مسلمان اور اسلامی احکامات کے پابند ہوں اور قانون بناتے وقت اسلامی قوانین و اصول کی پابندی کریں. اقلیت کے چند نمائندوں کے علاوہ پارلیمنٹ کے تمام نمائندوں میں، ان تمام شرائط کے علاوہ جو پارلیمانی نمائندے کے لئے ضروری ہیں مسلمان ہونااور احکامات اسلامی کا پابند ہونا بھی ضروری ہے ۔

اور اس خیال کے تحت کہ کہیں پارلیمنٹ کے نمائندے غفلت اور بے توجہی سے ایسے قوانین پاس نہ کر دیں کہ جس میں اسلام کے احکام کا پاس و لحاظ نہ کیا گیا ہو،ماہرین کی ایک کونسل ، شورای نگہبان کا فریضہ ہے کہ پارلیمنٹ کے منظور کردہ قوانین کا جائزہ لے کہ آیا وہ اسلامی شرع اور آئین سے مطابقت رکھتے ہیں یا نہیں،تاکہ آئین سے مطابقت کی صورت میں ان کی تائید کردیں او راگر اسلامی شرع وآئین کے مطابق نہ ہوں تو پارلیمنٹ میں تجدید نظر کے لئے واپس بھیج دیں، ہمارے ملک میں قانون سازی اور اس کے نفاذ کا یہ سسٹم ہے جس کو سب قبول کرتے ہیں او رکوئی بھی اس نظام کا مخالف نہیں ہے۔

اسی طرح قانون کا نفاذ کرنے والوں کے لئے جن میں سرے فہرست صدر مملکت کا نام آتا ہے اسلامی قوانین و ضوابط کی پابندی ضروری ہے. سب سے پہلے صدر مملکت میں وہ شرائط و خصوصیات اور وہ لیاقتیں ہونی چاہئے جو آئین میں ذکر ہوتی ہیں اور اسلامی احکام و قوانین سے ماخوذ ہیں چنانچہ حکومت کا کنٹرول ہاتھ میں لینے کے لئے خدا کی طرف سے ایک طرح کی اجازت رکھتا ہو،اس طرح سے کہ لوگوں کی اکثریت کے ووٹ حاصل کر لینے کے بعد عوام کی خواہش پر ولی فقیہ کے ذریعہ منصوب کیا جائے،اس صورت میں اس کی حکومت شرعی اور قانونی ہوگی، یہ وہ چیز ہے جو ہمارے ملک میں انجام پاتی ہے۔

اسلامی نظام میں عوام کے کردار اوران کی مداخلت کیحوالے سے صحیح طرح سے آشنائی کے لئے ہم ایک مثال پیش کرتے ہیں؛ فرض کیجئے کہ اگر ہم لوگ حضرت علی علیہ السلام کی حکومت کے زمانہ میں ہوتے او راپنے شہر میں کسی لائق اور نیکو کار ، شخص کو شہر کی ولایت کے لئے مناسب سمجھتے اور امام علیہ السلام کی خدمت میں جاکر عرض کرتے کہ فلاں شخص ہمارے شہر کا والی ہونے کی صلاحیت رکھتاہے تو ممکن تھا امام علیہ السلام ہماری اس تجویز پر اس شخص کو شہر کے والی کے عنوان سے منصوب فرمادیتے.

اب اگر لوگوں کی اکثریت امام علیہ السلام کی خدمت میں یہ مشورہ پیش کرتی تو بطریق اولیٰ امام علیہ السلام اس پیشکش کو قبول فرما لیتے، اور اس شخص کو اپنی حکومت کے ایک علاقہ کی ولایت کے لئے منصوب فرمادیتے، معلوم ہوا کہ حکومت کے ڈھانچے اور حکومتی

فیصلوں میں تھیوری اور نظریے کے لحاظ سے عوام کا کردار یہ ہے کہ افراد تحقیق وجائزہ لیں کہ قانون سازی یا قانون پر عمل در آمد کے لئے کون سے افرادزیادہ مناسب ہیں اور پھران کو ووٹ دیں او رلوگوں کا انتخابات میں شرکت گویا رہبری کو تجویز اورمشورہ دینے کے مرادف ہے اور در حقیقت یہ ولی فقیہ سے ایک طرح کاعہدوپیمان ہے کہ اگر ان کے منتخب کردہ شخص کو بہ عنوان حاکم معین کریں توعوام اس کی اطاعت کریں گے،اسی وجہ سے جب امام خمینیؒ کے زمانے میں لوگوں کی اکثریت کسی کو صدر مملکت کے عنوان سے منتخب کرتی تھی، تو حضرت امام خمینیؒ فرماتے تھے :میں ان کو جنھیں لوگوں کی تائید حاصل ہے صدر جمہوریہ کے عنوان سے منصوب کرتا ہوں،یعنی لوگوں کے ووٹ ایک مشورہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور میں اس کو قبول کرتا ہوں ۔

یہ اسلامی حکومت کی تھیوری ہے جو جمہوریت سے اس کے دوسرے معنی میں کوئی فرق نہیں رکھتی، اور سالہا سال سے ہمارے ملک میں رائج ہے او رکوئی مشکل پیدا نہیں ہوئی ہے. لیکن اگر جمہوریت کا مطلب یہ ہو کہ معاشرہ کے امور میں دین کی کسی طرح کی مداخلت نہ ہو،سرکاری اداروں میں کسی بھی عنوان سے مذہبی علامتیں ظاہر نہ ہوں تو کیا یہ چیز اسلام سے ہم آہنگ کہی جا سکتی ہے ؟ بے شک جمہوریت کا وہ تیسرا مفہوم جو آج کی بڑی طاقتیں پیش کرتی ہیں اور دوسروں پر اس کو مسلط کرنا چاہتی ہیں، سو فی صدی اسلام کے خلاف ہے، کیونکہ اس کا مطلب اسلام کا انکار ہے۔

لیکن جمہوریت، دوسرے معنی میں ان شرائط کا لحاظ رکھتے ہوئے جو اسلام نے قانون سازوں، قانون کا نفاذ کرنے والوں عدلیہ کے فیصلوں کے لئیکیا ہے وہ اسلام میں قابل قبول ہے یعنی عوام کو حق ہے کہ وہ صالح اور باصلاحیت افراد کو قانون سازی اور قانون کے نفاذ کے لئے انتخاب کریں اور انتخابات میں پوری دلجمعی سے اپنی شرکت کے ذریعہ اسلامی حکومت کے ساتھ تعاون اور وفاداری کا ثبوت پیش کریں اور خود کو ملک کے مسائل میں شریک و سہیم جانیں. جمہوریت کی یہ شکل اسلام کی نظر میں مقبول ہے اور ہمارے ملک میں اس پر عمل بھی ہوتا ہے، اور اگر کسی مسئلے میں خلاف ورزی ہوئی ہو تو وہ ان ہی خلاف ورزیوں کی طرح ہے جو گاہے بہ گاہے دوسری جگہوں پر ہوتی رہتی ہیں اور ہم کو کوشش کرنا چاہئے کہ دوبارہ اس قسم کی خلاف ورزی نہ ہو۔

بائیسویں تقریر

اسلام اور جمہوریت

گذشتہ مطالب پر ایک نظر ہم نے گذشتہ تقریر کے دوران اسلام کے سیاسی نظریہ سے متعلق اٹھائے گئے ایک شبہ کے بارے میں گفتگو کی تھی ،اور وہ شبہ یہ تھا کہ اگر قوانین کا خداوند عالم کی طرف سے معین ہونا اور ان کا نفاذ کرنے والوں کا بھی خدا کی طرف سے معین ہونا لازم ہے تو یہ جمہوریت کے ساتھ میل نہیں کھاتا، ہم نے اس شبہ کے جواب میں عرض کیا تھا کہ جمہوریت کا ایک قطعی اور واضح وروشن مفہوم بیان نہیں ہوا ہے کہ جس کے دائرے محدود اور معین و مشخص ہوں.

جمہوریت کا آغاز یونان کے شہر ایتھنس میں اس طرح ہوا کہ شہر کے تمام لوگ شہری انتظام اور فیصلوں میں براہ راست حصہ لیتے تھے.اور اس طریقہ پر اس کے عملی نہ ہونے کے علاوہ دوسرے دلائل کی وجہ سے بھی دانشوروں اور فلاسفہ کو اعتراض ہوا.اور یہ طریقہ مسترد قرار دیدیا گیا یہاں تک کہ ''رینیسانس'' کے بعد ظالم حکومتوں کی مطلق العنانی کے رد عمل میں جمہوریت ایک دوسری شکل میں پیش کی گئی۔

اور مغربی ملکوں کے بڑے بڑے فلاسفہ نے اس نظریہ کی تشریح شروع کردی یہاں تک کہ اس کی ایک قابل قبول شکل نکل آئی اور اس کے بعد دوسرے تمام ملکوں میں اس کو پہنچا دیا گیا.اس کی موجودہ صورت یہ ہے کہ عوام فقط پارلیمنٹ کے ممبران کے انتخابات میں شرکت کرتے ہیں، اور اس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ قوۃ مجریہ کے سربراہ صدر اور وزیراعظم یا قوۃ قضائیہ کے سربراہ (چیف جسٹس) کے انتخاب میں عوام براہ راست شریک ہوں دراصل، اس نظریہ میں حکومت کی کوئی مخصوص شکل وصورت معین نہیں ہے اسی وجہ سے مختلف قسم کی حکومت شاہی، پارلیمانی، یا صدراتی حکومتیں اپنے کو جمہوری اور عوامی حکومت تصور کرتی ہیں، کیونکہ اس حکومت کے ڈھانچے میں کسی نہ کسی طریقہ سے لوگوں کا ایک کردار ہوتا ہے۔

سیکولر جمہوریت اور اس کی فلسفیانہ طرفداری جیسا کہ ہم نے عرض کیا،مغربی ممالک کے سیاست دانوں نے جمہوریت کی ایک نئی شکل پیش کی ہے کہ جس میں ''لائک ایزم'' کے مفہوم کو سمو دیا گیا ہے. یعنی ایک طرف تو عوام حکومت کے امور میں مداخلت رکھتی ہو اور دوسری طرف حکومت کی کسی بھی سرکاری مشینری میں دین کا کوئی نام ونشان نہ ہو.دین نہ توقانون سازی میں دخیل ہو اور نہ ہی قانون کا نفاذکرنے والے دین کے نام پر حکومت کریں،یہاں تک کہ جوادارے اور مراکز حکومت سے وابستہ ہیں ان میں بھی دین کی کوئی نشانی اوردینی اعتقاد یا اس کی طرفداری کی کوئی علامت موجود نہ ہو. اسی وجہ سے سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں پردہ دار خواتین کوجانے سے روکا جاتا ہے، کیونکہ دین و مذہب کی علامتوں کے ساتھ کالج میں داخلے کا مطلب یہ ہے کہ حکومت اس کی حمایت کرتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جمہوریت کا یہ جدید مطلب سوفی صدی دین کے خلاف ہے، اور راس طریقۂ حکومت کو جمہوریت کا نام دینے کے بجائے ''بے دینوں کی ڈکٹیٹر شپ'' کہنا زیادہ مناسب ہے، کیونکہ یہ لوگ جمہوریت کے نام پر لوگوں کو معاشرہ میں اپنے دینی اعتقادات ظاہر کرنے اور مذہبی امور انجام دینے کی اجازت نہیں دیتے، اورانھوں نے سرکاری اداروں میں دینی امور پر عمل کرناممنوع قرار دیدیا ہے ۔

یہ طریقہ کار، جس کی کوئی فلسفی بنیاد نہیں ہے کوئی فلسفی نظریہ نہیں ہے، اسی لئے دین دشمن سیاستدانوں نے مغربی ممالک میں دین، اسلام کے فروغ کو روک دینے کی بات اٹھائی ہے ، اور اپنی تمام تر کوشش کررہے ہیں کہ مغربی ممالک یہاں تک کہ ان سے وابستہ اسلامی ممالک میں بھی جمہوریت کی حمایت کے نام پر ایسطرز حکومت کو مسلط کردیں کہ جس کا نمایاں ترین نمونہ الجزائر اور ترکی میں دیکھا جا سکتا ہے۔

طبعی طور پر اس راہ کو ڈکٹیٹر شپ کی مکروہ صورت کو بدل کر ایک نرم و لطیف عوام پسند جمہوریت کی شکل میں پیش کرنے کے لئے فلسفہ تراشی ضروری تھی تاکہ دینداروں کے اعتراضات کا مقابلہ نہ کرنا پڑے، اور ان کے غصہ کو ٹھنڈا کیا جا سکے،اسی وجہ سے حکومتی امور میں اپنے اس نظریے کی دلیل کے طور پر یا سرکاری مراکز میں دینی نشانیاں نہیں ہونا چاہئے فلسفیانہ وضاحت پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں،جیسا کہ انسانی حقوق کے منشور میں بھی موجود ہے تمام انسان انسانیت میں برابر ہیں اور ان میں کوئی طبقہ بندی نہیں ہےاور ہمارے درمیان پہلے طبقے یا دوسرے طبقے کے انسان نہیں ہیں،اب اگر دینداروں کے لئے ہم کسی امتیاز کے قائل ہوتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے ان کو دوسرے تمام لوگوں سے بالاتر قرار دیا ہے۔پس دین کا احترام یا سرکاری مراکز میں دینی رسم ورواج کی ادائیگی،گویا دینداروں کو ایک طرح کا امتیاز دینا ہے جبکہ ہم تمام انسانوں کو برابر سمجھتے ہیں اور کسی کو دوسرے پر امتیاز دینے کے قائل نہیں ہیں!

لیکن یہ سوال اپنی جگہ باقی رہ جاتا ہے کہ یہ حکومتیں کس طرح تمام گروہوں اور جماعتوں کو اجازت دیتی ہیں کہ وہ جس طرح چاہیں عمل کریں جس طرح کا کپڑا پہننا چاہیں پہنیں،لیکن دیندار لڑکیوں سے پردہ کرنے، مخصوص کپڑے پہننے اور اپنے بال چھپانے کا اختیار چھین لیتے ہیں اور مذہب کی تاسی پر پابندی ہے، درحقیت یہ بعض شہریوں کی آزادی کی نفی اور ان کے حقوق کی پامالی ہے۔

سیکولر نظام کی فلسفیانہ بنیادوں میں مغالطہ

بہر حال،وہ اپنی راہ وروش کے لئے مذکورہ توجیہ کو بہ طور وضاحت پیش کرتے ہیں،لیکن اس میں ایک بہت بڑا مغالطہ اور فریب یہ پایا جاتا ہے کہ تمام انسانوں کا انسانیت میں یکساں اور برابر ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تمام شہری، شہری ہونے میں بھی یکساں اوربرابر ہوں۔انسانیت میں تمام انسانوں کے برابر ہونے کی بحث سب سے پہلے اور سب سے زیادہ زور دے کر اسلام نے اٹھائی ہے، جیسا کہ خداوندعالم ارشاد فرماتا ہے: (یَاأَیُّہَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاکُمْ مِنْ ذَکَرٍ وَأُنْثَیٰ وَجَعَلْنَاکُمْ شُعُوباً وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ

أَتْقَاكُمْ[1]) ''اے لوگو! ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور ہم ہی نے تم کو مختلف قبیلےاور برادریوں میں قرار دیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو،(یہ چیزیں امتیاز کا معیار نہیں ہیں) خدا کے نزدیک تم میں زیادہ عزت دار وہی ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے''قرآن کریم واضح طور پر انسانوں کے درمیان فرق اور امتیاز کی نفی کرتا ہے اور ان کو ایک ہی آدم وحوا کی اولاد کہتا ہے جو آپس میں بہن بھائی کی طرح ہیں، ان میں کوئی فاصلہ اور امتیاز نہیں ہے. یہ بات کسی بھی دوسری آسمانی کتاب میں اس حسن وکیفیت کے ساتھ بیان نہیں ہوئی ہے. اور ہم بھی ایک مسلمان کی حیثیت سے معتقد ہیں کہ تمام انسان انسان ہونے کی حیثیت سے برابر ہیں اور انسانیت پہلے درجہ اوردوسرے درجے کی نہیں پائی جاتی،شیخ سعدی کا وہ مشہور شعر بھی اسی بات کی طرف اشارہ ہے

بنی آدم اعضای یکدیگر اند   کہ درآفرینش زیک گوھرند

لہٰذا جوہر انسانیت تمام انسانوں میں ایک ہے اور انسانوں میں پہلے درجہ اور ودسرے درجہ کے انسان نہیں ہیں، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تمام انسان تمام چیزوں میں یہاں تک کہ ایک ملک کی شہریت اور شہری سہولتوں سے استفادہ کرنے میں بھی برابر ہوں. تمام دنیا میں اس اصول کوایک بین الاقوامی قانون کے طور پر قبول کیا گیاہے ہر ملک کی شہریت کے کچھ خاص شرائط اورکچھ خاص سہولتیں ہوں. ممکن ہے کوئی شخص اپنے ملک سے مہاجرت کرے اور کئی سال کسی دوسرے ملک میں زندگی بسر کرے اوراِس ملک کے لئے مفید ہو اور وہاں کے لوگوں کے لئے بہت سی خدمات انجام دے؛ پھر بھی اس کو وہاں کی نیشنلٹی کا حق حاصل نہ ہو۔

چونکہ مہاجر افراد کو شہریت کا حق ملنے کے مخصوص شرائط وقوانین ہیں. علاوہ ازیں جس وقت کسی کو نیشنلٹی دی جائے تو ممکن ہے اس کو دوسرے درجہ کا شہری قرار دیا جائے،اوراس کو پہلے درجہ کی شہریت والی سہولتیں حاصل نہ ہوں. یہ مسئلہ تمام دنیا میں پایا جاتا ہے اور باجودیکہ تمام انسانوں کو انسانیت میں برابر مانا جاتا ہے، شہریت کے حقوق اور سہولتیں قومیت کے لحاظ سے برابر نہیں ہیں، اور

---

[1] سورہ حجرات آیت ۱۳۔

لوگ پہلے درجہ اور دوسرے درجہ کے شہری شمار ہوتے ہیں ،لہٰذا یہ کہنا محض ایک مغالطہ ہے کہ تمام انسان چونکہ انسانیت میں شریک ہیں ہم کو انسانوں کو پہلے درجہ اوردوسرے درجے میں قرار دینے کا حق نہیں ہے، لیکن شہریت میں درجہ بندی کر سکتے ہیں اور اس چیز کو اسلام نے بھی قبول کیا ہے۔

ہمیں ہوشیار رہنا چاہئے اور توجہ رکھنا چاہئے کہ مغربی حکومتیں اپنی ڈکٹیٹرانہ حکومت کو بھی جمہوری حکومت کا عنوان دیتی ہیں، تاکہ اپنے شرمناک مقاصد کو عملی جامہ پہنا سکیں، ہمیں ان کی ماسک میں چھپی پُر فریب شکل سے دھوکا نہیں کھانا چاہئے، حقیقت میں ان کی بیان کردہ جمہوریت کی جدید شکل ایک طرح کی ڈکٹیٹر شپ ہے جس کے تحت وہ ان ملکوں میں مسلمان عوام کو حجاب اور دوسرے مذہبی مراسم سے محروم کر رہے ہیں. جبکہ ''انسانی حقوق کے عالمی منشور '' میں صاف طور پر مذہبی آزادی دی گئی ہے اور سبھی لوگ اپنے دینی فرائض پر عمل کرنے میں آزاد ہیں، اوراس میں کسی طرح کی کوئی قید و شرط نہیں ہے کہ سرکاری مراکز میں مذہبی ظواہر اور اعمال وآداب انجام پائیں یا نہ پائیں، لیکن سیاسی بازیگر جہاں چاہتے ہیں اپنے مفاد میں قانون کی تفسیر وتشریح کرتے ہیں اور جنگ کو صلح کا نام دیتے اور دوسروں کے حقوق کی پامالی کو حقوق بشر کی حمایت کے عنوان سے پیش کرتے ہیں، اور ہم آپ ہر روزان کے ظلم وزیادتی اور دھوکہ دھڑی کا تماشا دیکھتے رہتے ہیں۔

مدیریت کے دائرے میں جمہوریت کا کردار

جیسا کہ ہم نے عرض کیا جمہوریت کے تین معنی ذکر کئے گئے ہیں جو سب کے سب فلسفۂ سیاست سے تعلق رکھتے ہیں ، لیکن بعض اہل قلم جو خود کو روشن فکر مذہبی کہتے ہیں ادعا کرتے ہیں کہ جمہوریت فلسفۂ سیاست سے کوئی ربط نہیں رکھتی، جمہوریت ایک ایسا مفہوم ہے جو مدیریت سے مربوط ہے ،اور اس کو حکومت کی کوئی قسم یا حکومتی روش سمجھنا صحیح نہیں ہے،اور بنیادی طور پراس کی سیاسی فلسفہ میں کوئی جگہ نہیں ہے. ہم ان لوگوں کے جواب میں مختصر طور پر عرض کریں گے: کہ سیاسی فلسفے کی کتابوں کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ سیاسی فلسفہ کے بارے میں کوئی کتاب ایسی نہیں ہے کہ جس میں جمہوریت سے بحث نہ کی گئی ہو، اب اگر

جمہوریت کا فلسفہ سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے تو پھر سیاسی فلسفے کی تمام کتابوں میں اس موضوع پر اتنی زیادہ بحث کے کیا معنی ہیں؟ دراصل ان کے دعوے کا راز یہ ہے کہ جمہوریت کی جو نئی تعریف مغربی ممالک کے بعض لیبرل دانشوروں اور مصنفوں نے تازہ طور پرپیش کی ہے اس کے تحت چاہتے ہیں کہ اس کو سیاسی مفہوم کے قالب سے خارج کر کے سماجیات کی شناخت کے دوسرے میدانوں میں داخل کردیں. ان کا کہنا ہے کہ جمہوریت صرف کسی حاکم کے اقتدار کو محدود کرنے یا مخالف گروہوں اور کئی پارٹیوں اور جماعتوں کے درمیان مفاہمت ایجاد کرنے یا صرف حکومتی مشینریوں سے مربوط نہیں ہے بلکہ کسی بھی انتظامی شعبہ میں اس کو بروئے کار لایا جا سکتاہے: فرض کیجئے اگر کسی کارخانہ کے مختلف شعبوں کے منتظمین کے درمیان اختلاف نظرپیدا ہوجائے، تو ان میں اتفاق و ہم آہنگی ضروری ہے

کیونکہ اگر یہ اختلاف بڑھتا چلاگیا تو یہ اختلاف اس کارخانہ یا ادارہ کے فائدے میں نہیں ہے، لہٰذا اس کارخانہ یا ادارہ کے منافع کی حفاظت کے لئے افراد کو ایک دوسرے سے مشورہ کرنا ہوگا کہ ان میں اتفاق نظر پیدا ہو جائے یا یہ کہ اکثریت کی رائے کو مان لیا جائے، اسی طریقہ کار کو جمہوریت کہا جاتا ہے۔

معلوم ہوا کہ جمہوریت کسی ادارہ کے اندر رونما ہوجانے والے اختلافات کو ختم کرنے کا ایک طریقہ ہے،اور جمہوریت کی یہ تعریف سیاسی فلسفہ کے دائرے سے خارج ہے اور مدیریت کے دائرے میں عمومی مفہوم کی حامل ہے. اگرچہ حکومت اور ایک بڑے معاشرہ کا انتظام و انصرام سنبھالنا بڑے پیمانہپر ایک طرح کی مدیریت ہے، لیکن بہرحال اس کا ایک مخصوص دائرہ ہے، لہٰذا یہ لوگ جمہوریت کے معنی کووسعت دینے کے لئے کہتے ہیں کہ جہاں کہیں بھی دوگروہوں میں اختلاف ہواور وہ مذکورہ طریقہ سے آپس میں مفاہمت کرلیں تو اسی کا نام جمہوریت ہے. اس بارے میں مزید وضاحت کے لئے ان کا کہنا ہے کہ دوگروہوں کے درمیان اختلاف کی صورت میں یہ بھی ممکن ہے کہ ایک گروہ زیادہ مضبوط ہو اور قوت کے بل پر دوسرے گروہ کو دبالے اور اپنے نظریہ کو

اس پر زبردستی مسلط کردے، تو ظاہر ہے یہ طریقہ جمہوری نہیں ہے؛ لیکن اگر آپس میں اتفاق نظر ہوجائے اور اکثریت کے نظریہ کو سب تسلیم کرلیں تو گویا انھوں نے جمہوریت کو تسلیم کرلیا ہے۔

یقیناً ہم کسی اصطلاح کی ایجاد یا کسی علمی اصطلاح کو وسعت دینے کے مخالف نہیں ہیں، لیکن یہ فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ درحقیقت یہ مفہوم سیاست کے دائرے میں ہی آتا ہے جس کو دوسرے دائروں میں بھی وسعت دیدی گئی ہے. سماجیات میں اس طرح کے بہت سے مفاہیم موجود ہیں جن کا شروع میں ایک خاص میدان میں ہی استعمال ہوتا تھا لیکن بعد میں ان کے مفہوم میں وسعت دیدی گئی اور دوسرے میدانوں میں میں بھی ان کا استعمال کیا جانے لگا،مثال کے طور پر آپ ''حکمت عملی یا (Strategy)''کی اصطلاح سے آگاہ ہیں جو اب تقریباًتمام میدانوں میں استعمال ہوتی ہے.

جب کہ بنیادی طور پر یہ اصطلاح ''سوق الجیشی'' قسم کی ہے جو فوجی اہمیت کی حامل ہے جو ''حکمت عملی'' کے لئے استعمال ہوتی تھی اور اسٹراٹیجک اس کو کہا جاتا تھا جو جنگ کا نقشہ ترتیب دیتا اور میدان جنگ کی کمان اپنے ہاتھ میں رکھتا تھا ، مثلاً وہ شخص جو حملہ کا پلان بناتا، اور جنگی کارواں کی راہنمائی کرتا ہے، یہ مفہوم فوج کی ہدایت یا اس کے طریقۂ حرکت کو بیان کرتا ہے اور جہاں سے فوج حرکت کرتی تھی یا جہاں پر پڑاؤ ڈالتی تھی یا جہاں سے حملہ شروع ہوتا تھا اس علاقہ کو سوق الجیشی یا اسٹرٹیجک علاقہ کہا جاتا تھا۔

بعد میں دھیرے دھیرے اس لفظ کو وسعت دیدی گئی اور دوسرے تمام علوم میں بھی اس کا استعمال کیا جانے لگا، منجملہ موجودہ سیاسی بحث میں بھی ''اسٹریٹجک کا لفظ ،سیاست اسٹراٹیجک کے عنوان سے رائج ہوگیا ہے۔ یہاں تک کہ تعلیم و تربیت کے میدان میں اور مختلف انتظامی مدیریت کے میدان میں بھی اسٹریٹجک مسائل بیان ہوتے ہیں، اور ہمارے ملک کے آئین میں بھی ایسے بہت سے اصول ہیں جو اسٹرایٹجک پہلو رکھتے ہیں، مثال کے طور پر آئین کی وہ شق جو یہ کہتی ہے کہ ملک کے قوانین کو اسلامی قوانین کے مطابق ہونا چاہئے. لیکن ہمیں تو ان لوگوں پر تعجب ہے جو کبھی تو اس طرح آئین کا دم بھرتے ہیں اور اس کا حوالہ دیتے

ہیں جیسے ایران کا آئین قرآن اور وحی الٰہی سے بھی بالاتر کوئی چیز ہے اور کبھی اس طرح اس کی مخالفت کرتے ہیں کہ گویا آئین کی ان کی نظر میں کوئی اہمیت ہی نہیں ہے. جہاں پر آئین میں عوام کی رائے کے احترام کی بات کیجاتی ہے اس کا ذکر یوں کرتے گویا قرآن مجید کو بھی اس کے خلاف کچھ کہنے کی اجازت نہیں ہے.

پیغمبر اسلامؐ ائمہ معصومین اور امام زمانہ علیہم السلام کو بھی اس کی مخالفت کا حق نہیں ہے.؟لیکن آئین کی وہ شق جو کہتی ہے کہ ملک میں نافذ کئے جانے والے تمام قوانین کا اسلامی قوانین کے مطابق ہونا ضروری ہے،اس کو بھول جاتے ہیں اور اس کی مخالفت کی پیشکشکرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ معیار لوگوں کی رائے ہے کیا اسی آئین میں نہیں کہا گیا ہے کہ اس ملک کے قوانین کو اسلامی قوانین کے مطابق ہونا چاہئے؟

لہٰذا اگر کوئی چیز اسلام کی نظر میں حرام ہے آپ آئین کو سند بنا کر کس طرح اس کو جائز کر سکتے ہیں؟ اس آئین کے پیش نظر جس میں قوانین اسلام کی پابندی پر اتنی زیادہ تاکید کی گئی ہے یہ کہہ کر کہ آئین میں اخبارات کو اظہار کی آزادی حاصل ہے ، کس طرح اسلامی مقدسات اور اسلام کے ضروری احکامات کی توہین کی جاسکتی ہے؟ اخبارات ورسائل ایک خاص قوانین کے دائرے میں آزاد ہیں نہ یہ کہ ان کی آزادی قانون سے بالاتر ہے . جب اسلامی قانون میں مذہبی مقدسات کے احترام کو واجب قرار دیا گیا ہے اور ضروریات دین کا انکار اور اسلامی قوانین کا مذاق اڑانا ، نیز خدا وپیغمبرؐ کی اہانت کرنا جو مرتد ہونے کا سبب ہے تو نشر واشاعت کے قوانین اس کو کس طرح جائز کر سکتے ہیں.ملک کا آئین بنیادی طور پر اس لئے مرتب کیا گیا ہے کہ اسلامی جمہوریہ کے مفہوم کو بیان کرے ۔

جمہوریۂ اسلامی میں اسلام وولایت فقیہ کا مقام بالاتر ہےانقلاب کی کامیابی کے بعد پہلے ہی سال یعنی ۱۳۵۸ھ شمسی بمطابق ۱۹۸۰ عیسوی میں طے پایا کہ '' اسلامی جمہوریہ ''کی برقراری کے لئے ایک ملک گیر رائے عامہ '' رفرنڈم "Referendum" ''ہو

جائے جس میں حکومت کی شکل و نوعیت کے لئے کچھ عنوانات تجویز دئے گئے کہ لوگ ان کے بارے میں ووٹ ڈالیں. ان میں بعض عنوانات کچھ اس طرح تھے، ''جمہوریہ'' ''جمہوریہ ڈیموکرٹیک''، '' جمہوریۂ ڈیموکرٹیک اسلامی، ''جمہوریۂ اسلامی'' تھے. لیکن امام خمینیؒ نے فرمایا: فقط و فقط ''جمہوریۂ اسلامی'' نہ ایک لفظ کم نہ ایک لفظ زیادہ، اور ایران کے ۹۸ فی صدی لوگوں نے ''جمہوریۂ اسلامی'' کے حق میں ووٹ دئے، یعنی اسلامی حکومت کی قید و شرط کو نہیں ہٹایا جاسکتا اور اس کی جگہ ''ڈیموکریٹک کی'' لفظ نہیں رکھی جاسکتی. اب اگر ڈیموکریٹک کی لفظ اسلام سے بالاتر کوئی چیز تھی تو کیوں امام خمینیؒ نے اجازت نہیں دی کہ اس لفظ کو اسلامی حکومت کے عنوان میں بڑھا دیا جائے اور اگر ''جمہوریت'' ہی ''ڈیموکریسی'' ہے تو جب جمہوریت ہے ڈیموکریسی بھی ہے، لہٰذا ڈیموکریسی کی لفظ کے بڑھانے کی ضرورت ہی نہیں ہے؛ پھر جب بعض لوگ ''جمہوریۂ ڈیموکریٹک'' پر کیوں اصرار کررہے تھے؟! اور کیوں امام خمینیؒ اور ان کی پیروی میں عوام نے اس کی مخالفت کی؛ معلوم ہوا کہ ڈیموکریسی کے مختلف معنی بیان کئے جاسکتے ہیں اور بعض معنی کے تحت جمہوریت میں بعض چیزوں کا اضافہ بھی ہوسکتا ہے، جس کی نفی کی گئی ہے اور وہ وہی اسلام کے نظریات سے زیادہ لوگوں کے ووٹوں کو اہمیت دینے کی بات ہے جس سے روکا گیا ہے۔

بہرحال ہماری حکومت کا نظام ''جمہوریۂ اسلامی'' ہے کہ جن کے ستون لوگوں کے شانوں پر استوار ہیں لوگوں نے ہی انقلاب کیا ہے اور اپنے انقلاب کی اسلامی قوانین کے دائرے میں حفاظت کررہے ہیں. علامہ شہید مطہریؒ مرحوم نے اس سلسلہ میں ایک خاص تعبیر ذکر کی ہے جو ممکن ہے ہمارے لئے راہ گشا ہو آپ کہا کرتے تھے'': جمہوریت کا لفظ حکومت کی شکل کو بیان کرتا ہے اور اسلامیت کا لفظ حکومت کے آئین و مطالبکی حکایت کرتا ہے''، حکومت کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی واحکام قوانین کو نافذ کیا جائے لیکن حکومت کی شکل وصورت بادشاہت کے مقابلے میں جمہوری ہے. لہٰذا ہماری حکومت میں شاہی نہیں چلے گی، بلکہ اس کی شکل جمہوری اور اس کے قوانین اسلامی ہیں یعنی حکومت کی اصل وحقیقت اپنے مفاہیم کے ساتھ اسلامی احکام و معیارات سے وابستہ ہے اور ہمارے لئے کوئی بھی چیز اسلام سے پہلے یا اسلام سے بالاتر نہیں ہے ۔

حضرت امام خمینیؒ مکرر فرمایا کرتے تھے جمہوریۂ اسلامی میں کسی بھی حکومت یا کسی بھی عہدیدار کے منصب کا جواز ولی فقیہ کی اجازت پر موقوف ہے، اور یہی وہ چیز ہے جس پر ولایت فقیہ کی تھیوری قائم ہے، اور ہم نے اس مسئلہ کو فقہائے کرام اور ان سب سے زیادہ امام خمینیؒ سے سیکھا ہے، جس کی عقلی ونقلی دلیلیں بھی تائید کرتی ہیں. کیونکہ ولی فقیہ امام معصومؑ کا جانشین ہے اور تمام چیزیں الٰہی فیصلے کے تحت قانونی حیثیت حاصل کرتی ہیں اور چونکہ ولی فقیہ کو امام معصومؑ اور خداوندعالم کی طرف سے اجازت حاصل ہے، لہٰذا نظام کی قانونی حیثیت ولی فقیہ کی اجازت پر موقوف ہے۔

البتہ یہ نظریہ ان لوگوں کے نظریات سے میل نہیں کھاتا جو مغربی تمدن کے عادی ہوگئے ہیں. ہم اگر اس نظریہ پر روز دیتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ نظریہ توحید پر استوار فکری واسلامی اصولوں کے مطابق ہے اور اس کی جڑیں اسلامی اصولوں میں پیوست ہیں؛ نہ یہ کہ صرف علمائے کرام کے ذہن کی پیداوار ہو. اور انھوں نے اپنی صنف کے مطابق گڑھ لیا ہو. جیسا کہ ہم پہلے بھی وضاحت کر چکے ہیں کہ خداوند عالم کی تشریعی ربوبیت تقاضا کرتی ہے کہ قانون سازی اور قانون کے نفاذ میں بھی خدا کی اجازت کا لحاظ ضروری ہے ،اوراگر اس کے علاوہ ہے تویہ ایک قسم کا شرک ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس معاشرہ میں عوام کا کوئی کردار نہیں ہےاس حکومت میں عوام کا کردار اسلام کے معین کردہ نقطۂ نگاہ سے، سوفی صدی ہے اور اس سلسلہ میں کوئی بھی دوسری چیز اپنے اثر و کردار کے لحاظ سے اس کا بدل نہیں بن سکتی۔

لیکن ایک نظام کی قانونی حیثیت اورمقبولیت میں فرق کا قائل ہونا ضروری ہے۔ مزید وضاحت کے لئے عرض کروں ''رینسانس'' کے بعد سے اصولی طورپر مغربی طرز تفکر میں قانونی، فلسفی اور اجتماعی گفتگو میں خدا یا دین کے لئے کوئی جگہ نہیں رکھی گئی ہے، البتہ مغربی طرز تفکر سے ہماری مراد مغربی ممالک میں زندگی بسر کرنے والے تمام لوگوں کا طرز تفکر نہیں ہے، بلکہ وہ طرز تفکر ہے، جو مغرب میں حکمراں نظام نے لوگوں پر مسلط اور جاری کر رکھا ہے. مثلاً جس وقت انسانی حقوق کے عالمی منشور میں انسانوں کے حقوق کی بات ہوتی ہے تو اس میں خدا سے انسانی رابطہ کا کوئی ذکر نہیں کیا جاتا. اور اگر مذہب کی آزادی کی بات ہوتی ہے تو اس پہلو

سے کہ ہر انسان اپنے مذہب کے انتخاب میں آزاد ہے، وہاں اس طرح کی کوئی گفتگو نہیں ہے کہ کون سی چیز حق ہے یا کون سی چیز باطل ہے؟ خدا ہے یا نہیں ہے؟ ایسی باتیں بالکل نہیں ہوئی ہیں.

جس جگہ اجتماعی حقوق بیان ہوئے ہیں چاہے وہ بنیادی حقوق ہو یا شہری جزا و سزا کے قوانین ہوں یا یہ حقوق خدا سے کوئی تعلق رکھتے ہیں اس کی کوئی گفتگو نہیں ہے، سرے سے یہ بات بیان ہی نہیں ہوئی ہے کہ خدا بھی لوگوں پر کوئی حق رکھتا ہے یا نہیں؟ خدا کے سلسلے میں انسانوں کا کوئی فریضہ ہے یا نہیں؟ انھوں نے اپنے حقوق قانونی مسائل میں خدا کے لئے کوئیحق تسلیم کرنا نہیں چاہا ہے، لیکن اگر ہم چاہتے ہیں کہ اپنے اعتقادات کی بنیادپر اسلامی تعلیمات اور الٰہی قوانین کے تحت اپنے ملک کے قوانین و حقوق کا تعین کریں تو ان کو بھی ہمیں اس حق سے محروم کرنے کا کوئی حق نہیں ہے.

ہم لوگ خدا پرست مسلمان موحد اور پابند اسلام ہونے کے ناطے اس بات کے معتقد ہیں کہ تمام قانونی مسائل میں خواہ اجتماعی قوانین ہوں یا،شہری جزا و سزا کے قوانین ہوں یا سیاسی تمام جگہوں پر خدا کا لحاظ ضروری ہے اور تمام حقوق سے بالاتر خدا کے حقوق ہیں،اور اس کے تئیں ہمارے حقوق اور فرائض ہیں جن کو ہمیں انجام دینا چاہئے۔

دوسری طرف صرف انسانوں کے حقوق کی ہی بات نہیں ہونا چاہئے بلکہ حقوق وفرائض دونوں ساتھ ساتھ بیان ہونے چاہیئے اور سب سے بالاتر وہ فریضہ ہے جوایک انسان پر خدا کے سلسلہ میں عائد ہوتا ہے. خداوند عالم کی تشریعی اور قانونی ربوبیت کا حق یہ ہے کہ تمام انسان سیاسی اورمعاشرتی مسائل میں خدا کے احکام کو قبول کریں.اگر کوئی خدا پر ایمان نہیں رکھتا ہے ہم اس کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کرتے لیکن ہم مسلمان ہونے کے ناطے یہ حق رکھتے ہیں کہ اپنے اعتقادات کا سیاست اور ملک کے نظام میں پاس و لحاظ کریں.چنانچہ ہمارے ملک کے آئین میں یہ کام ہوا ہے اسی وجہ سے ہمارے نزدیک یہ بہت ہی اہم ہے اور اس کو ہر چیز پر اولیتحاصل ہے اور ملک کے آئین کا احترام، اسلام کے احترام کے مانند ہے۔

اسلام میں قابل قبول جمہوریت

پس جمہوریت اپنے ایک معنی میں اسلام کے موافق ہے اور ایک معنی ہیں کہ جس کو مغرب نے پیش کیا ہے یعنی اس کا تیسرا معنی اسلام کے سوفی صدی خلاف ہے. جمہوریت کا دوسرا مفہوم مخصوص شرائط و قیود کے ساتھ قابل قبول ہے لیکن وہ تیسرا مفہوم کسی بھی قید و شرط کے ساتھ مطلق طورپر قابل قبول نہیں ہے. یہ مسئلہ کہ اسلامی احکام واقدار کا پاس و لحاظ ضروری ہے اور قانون سازی میں کسی کو بھی یہ حق حاصل نہیں ہے کہ اسلام کے ضروری احکام کی مخالفت کرے دین اسلام کا ایک بنیادی اصول ہے جس کو سب قبول کرتے ہیں، لہذا اس اصول کو محفوظ رکھتے ہوئے ہم جمہوریت کو قبول کرتے ہیں؛ لیکن اگر اس اصول کو نہ مانا جائے اور جمہوریت کا مطلب الٰہی حدود کی پامالی اور احکامات اسلامی کی مخالفت ہو اور اس کو جائز سمجھ لیا جائے تو پھر ہم اس جمہوریت کی سوفی صدی مخالفت کرتے ہیں. ہاں، جمہوریت کے بارے میں اختلافات حل کرنے کے عنوان سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ جہاں کہیں اختلافات حل کرنے کے لئے اسلامی احکامات کافی ہوں ان کو مقدم رکھیں گے لیکن اگر کوئی ایسا اختلاف ہو جہاں اسلام نے کوئی راہ حل معین نہ کیا ہو صلاحیت کے لحاظ سے کسی کو ترجیح حاصل نہ ہو تو پھر اکثریت کی رائے کو مقدم مانا جائے گا، یعنی اگر کسی مسئلہ میں کوئی دلیل شرعی یا ماہرانہ نظر ترجیح کے لئے کسی فریق کے حق میں موجود نہ ہو۔

مثلاً کچھ لوگ قانون کے دائرے میں کسی اہم فیصلے کے لئے ایک کمیٹی بنائیں اور تمام لوگ اسلام کے معتقد ہوں اور اسلامی اقدار کے پابند ہوں لیکن کسی مسئلہ میں اختلاف ہوجائے، اکثریت کی کچھ نظر ہو اور اقلیت کی کچھ اور، اوران دونوں نظریات میں کوئی وجہ ترجیح بھی نہ ہو تو ایسے میں اکثریت کی نظر مقدم ہے اور اکثریت کی نظر کی مخالفت کرنے سے ترجیح بلا مرجح لازم آئے گی اور کمتر کو بالاتر پر مقدم کرنا لازم آئے گا۔

خلاصہ یہ کہ جہاں کوئی مرجح نہ ہواگر اکثریت کی نظر سے ہمیں ظن (گمان) حاصل ہوجائے تو وہ ظن معتبر اور مرجح ہے،اور اگر نادانوں کی اکثریت کے ذریعہ ظن حاصل نہ ہوتو ان کی نظر کو ترجیح دینا ''ترجیح بلا مرجح'' ہوگا جو عقلا کے نزدیک ایک مذموم اور غلط ہے. یہ

طریقہ بس اسی حد تک معتبر ہے،لیکن اس طریقہ سے غلط فائدہ اٹھانا کہ عام لوگوں کی اکثریت کو ماہرین کی اقلیت کے مقابلہ میں کھڑا کرنے کی کوشش کریں تو صحیح نہیں ہے، مثلاً فرض کیجئے ایک فوجی منصوبہ ،فوج کے لئے دس ماہر افسروں نے تیار کیا ہو اور دوسری طرف عوام کے ایک ہزار افراد کہ جن کو فوجی مسائل سے کوئی آشنائی نہ ہو،ایک منصوبہ پیش کریں تو اگر عام لوگوں کے منصوبے پر توجہ دی جائے اور اس کو مان لیا جائے اور فوج کے ماہر افسروں کی رائے پر عمل نہ کیا جائے تو یہ کام عقل سے دور کہا جائے گاتمام عقلاء کہیں گے کہ ماہرین کی نظر غیر ماہرین کی نظرپر تقدم رکھتی ہے. لہٰذا جمہوریت اختلافات کو حل کرنے کے لئے ایک خاص دائرے میں شرائط کے ساتھ معتبر ہے؛ لیکن اگر ہر اکثریت کی رائے کو ہر اقلیت کی رائے پر ترجیح دی جائے تو اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

تیئسویں تقریر

انسانیت اور شہریوں کی قومیت میں اتحاد کی اساس

اسلام کی نظر میں حقوق کی بنیاد

فلسفۂ سیاست کی بحثیں چونکہ فلسفۂ قانون سے بہت قریب ہیں اور دونوں کپہلو تقریباً ایک جیسے ہیں اس لئے بعض وقت مشترک اور مشابہ مسائل اٹھائے جاتے ہیں مثال کے طور پر سیاست کی بحث میں کبھی کبھی ایک قانونی مسئلہ پر بحث چھڑ جاتی ہے اسی بنیاد پر ہم گزشتہ تقریر میں فلسفۂ قانون کی ایک بحث یعنی انسانوں کے اپنی انسانیت کے اعتبار سے ایک ہونے پر بحث کی تھی اور عرض کیا تھا کہ اگرچہ تمام انسان اپنی انسانیت میں مشترک ہیں ۔

اور اسلام کی نظر میں انسانوں کے مابین پہلے درجے اور دوسرے درجے کے انسان نہیں ہیں لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ سماجی مسائل میں تمام انسان حقوق اور فرائض کے اعتبار سے بھی مساوی ہوں، اس بارے میں کچھ افراد نے تو مکمل طور پر ان مسائل سے آگاہ نہ ہونے یا سوء استفادہ کی غرض سے،تاکہ اپنے اسلام مخالف اور انقلاب مخالف نظریات کے ساتھ خود کو مسلمان او رانقلابیوں کی صفوں میں کھڑا کر سکیں اوراسلامی انقلاب کے ثمرات سے فائدہ اٹھائیں،اورکچھ لوگوں نے صرف انقلاب مخالف کوششوں کے تحت ایک مغالطہ سے کام لیاکہ معاشرہ میں چونکہ پہلے درجے اور دوسرے درجے کے انسان نہیں ہیں لہٰذا تمام افراد کے حقوق برابر ہونا چاہیئے مثلاً ہر ایک کو پارٹیاں بنانے کا حق ہونا چاہئے یا ملک کا ہر شخص حکومتی یا فوجی عہدے پر فائز ہو سکتا ہے.

ان کے نظریہ کے مطابق ہر شخص چاہے وہ کسی بھی عقیدہ اور نظریہ کا ماننے والا ہی کیوں نہ ہو وہ صدر مملکت یا چیف جسٹس وغیرہ ہوسکتا ہے اور حسب خواہش پارٹی بنا سکتا ہے۔ان کا استدلال یہ ہے کہ جب انسانوں کے مابین پہلا درجہ اور دوسرا درجہ نہیں ہے اور تمام انسان برابر ہیں توچاہے ہم انقلاب اسلامی اوراس کے آئین کو تسلیم کرتے ہوں یا نہ کرتے ہوں ہمیں یہ حق حاصل ہے کہ تمام

حقوق میں برابر کے حصہ دار ہوں اس مغالطہ کے بارے میں ہم نے عرض کیا کہ صحیح ہے انسانوں کے درمیان پہلا درجہ اور دوسرا درجہ نہیں ہے، لیکن تمام حقوق وفرائض کا سر چشمہ صرف انسانیت میں سب کا مشترک ہونا نہیں ہے بلکہ بعض حقوق وفرائض کی بنیاد انسان ہونے سے قطع نظر دوسری خصوصیات بھی ہیں، کچھ افراد نے یا تو اس بات کو صحیح طور پر نہیں سمجھا ہے یا کسی مقصد کے تحت اس بات کی غلط تفسیر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ فلاں صاحب ہم شہریوں کے مابین پہلے درجے اور دوسرے درجے کی شہریت کے قائل ہیں اور شہریوں کے پہلے درجہ سے مراد علماء ہیں اور دوسرے درجے کے شہری دوسرے تمام لوگ ہیں۔

چنانچہ ہم آج کی تقریر اس غلط تفسیر اور اس کے جواب سے مخصوص کرنے پر مجبور ہیں اس موضوع کی وضاحت کے لئے ایک بحث جو دنیا کے قانون دانوں فلسفیوں کے درمیان پوری سنجیدگی سے ہوئی ہے اور جس کے مختلف جوابات بھی دیئے گئے ہیں پہلے اس کی طرف توجہ ضروری ہے اور وہ بحث یہ ہے کہ. اصولی طور پر حق کی بنیاد اور اس کا سر چشمہ کیا ہے؟ یعنی کس طرح کوئی صاحب حق بنتا ہے، یہ جو کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص حق رکھتا ہے یا نہیں رکھتا ہے تو یہ حق کہاں سے پیدا ہوتا ہے؟ ہم کس بنیاد پر کہتے ہیں کہ کوئی شخص فلاں کام انجام دینے کا حق رکھتا ہے یا فلاں حق نہیں رکھتا؟ فلسفۂ حقوق وقوانین کے مختلف، مکاتب مثلاً تاریخی حقوق کے مکاتب، پازیٹوازم فطری یا نیچرل حقوق اور اسی طرح اور حقوق کے دوسرے مکاتب نے اس سوال کے مختلف جوابات دئے ہیں.

اسلام کا اس بارے میں خاص نظریہ ہے یعنی اسلام کے توحیدی طرز تفکر میں تمام حقوق کی بازگشت دراصل خداوند عالم کی طرف ہوتی ہے. چونکہ ہستی اسی کی دی ہوئی ہے اور ہر کسی شخص کے پاس جو کچھ ہے وہ اسی کا دیا ہوا ہے. تخلیقی مرحلہ میں، ہمارا وجود اور جو کچھ بھی ہمارے پاس ہے خدا سے ہے ''انا للہ ''اور تمام چیزیں ''من اللہ '' ہیں اسی طرح تشریعی یا قانونی امور بھی خدا کی طرف سے مستند ہونے چاہیئے. حقوق کے سرچشمے اور پیدائش کے بارے میں یہ ہمارے کلی اصول ہیں جس کو ہم نے مختصر طور پر بیان کیا ہے کہ خداوند عالم کی طرف سے ہی دوسروں کو حقوق ملتے ہیں ۔

مگر سوال یہ ہے کہ کیا وہ تمام انسانوں کو مساوی حقوق عطا کرتا ہے ؟ یا اپنے بعض بندوں کو کچھ ایسے مخصوص حق بھی عطا کرتا ہے جو دوسروں کو نہیں دیتا ؟ یہاں مجمل طور پر تو ہم جانتے ہیں کہ خدا وند عالم نے انبیاء کو کچھ حقوق عطا کئے ہیں جو دوسروں کو نہیں دیئے ہیں اس نے ماں باپ کو کچھ حقوق عطا کئے ہیں اور اولاد کو کچھ اور حقوق دیئے ہیں.اب دیکھنا یہ ہے کہ۔ (معاذاللہ) خدا وند عالم کے فیصلے بغیر کسی حساب وکتاب کے ہوا کرتے ہیں اور خداوند عالم بغیر کسی معیار و میزان کے کسی کو ایک حق دیدیتا ہے اور دوسرے کو نہیں دیتا یا نہیں،بلکہ وہ مخصوص معیارات کے تحت فیصلے کرتا ہے ؟

اب اگر کچھ معیار ات ہیں تو وہ کیا ہیں؟ تو وہ حقوق جو خداوندعالم اپنے بندوں کو عطا کرتا ہے ان کا معیارو موقعیت اور وہ صورت حال ہے جووجود اور ہستی کے اندر ہے حالات ہی تقاضا کرتے ہیں کہ جو فرائض اس سے مخصوص کئے گئے ہیں ان کے تئیں ان کو کچھ حقوق حاصل ہیں.ہم سب کو خداوند عالم نے اس لئے پیدا کیاہے کہ ہم اپنے ارادہ و اختیار سے حقیقی کمال اورابدی سعادت کی طرف حرکت کریں، لہٰذا ہم پر ایک کلی فریضہ عائد ہوتاہے کہ ہم کمال اور وارتقاء کی طرف قدم بڑھائیں جسکو اسلامی ثقافت میں ''خدا کی عبادت '' کہتے ہیں جیسا کہ خداوند عالم قرآن مجید میں فرماتاہے:(أَلَمْ أَعْهَدْ إِلَيْكُمْ يَا بَنِيْ آدَمَ أَنْ لاَ تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِيْنٌ وَأَنِ اعْبُدُوْنِي هٰذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيْمٌ[1].) ''اے آدم کی اولاد کیا میں نے تم سے عہد نہیں کیا تھا کہ (خبردار) شیطان کی پرستش نہ کرنا وہ تمہارا کھلا دشمن ہےاور دیکھو صرف میری ہی عبادت کرنا یہی (نجات کی) سیدھی راہ ہے ''

اور دوسری آیت میں ارشاد فرماتاہے: (فَأَرْسَلْنَا فِيْهِمْ رَسُوْلاً مِنْهُمْ أَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ[2]۔).''اوران کے درمیان ہم نے ان ہی میں سے ایک کو رسول بنا کر بھیجا ،کہ خدا کی عبادت کرو۔

[1] سوره یٰس آیت ۶۰.
[2] سوره مومنون آیت ۳۳.

چنانچہ تمام انبیاء کی دعوت میں سر فہرست خدا کی پرستش رہی ہے اور تمام انسانوں کے لئے یہ کلی فریضہ کچھ حقوق کا متقاضی ہے یعنی جب انسان کمال کی راہ طے کرنا اوراللہ سے قریب ہونا چاہتا ہے تو اس کے لئے کچھ لازم و ضروری چیزیں اس کے اختیار میں ہونی چاہئے اسی طرح معاشرہ میں کچھ قوانین اور چارہ کار بھی ہونا ضروری ہے جو ان کی راہ کا رخ معین کر سکے. جب انسان خداوند عالم کی طرف بڑھنا چاہتاہے تو اس کو حیات ملنا چاہئے معلوم ہوا حق حیات جو سب سے پہلا حق ہے انسانوں کو اسی بنیاد پر ملا ہے. دوسرا حق آزادی کے ساتھ کمال کی طرف حرکت کا حق ہے کیونکہ یہ سفرزبردستی کا نہیں ہے پس انسان کو راستہ کے انتخاب میںآزاد ہونا چاہئے، تیسرا حق، اس مادی دنیا کی نعمتوں کے استعمال کا حق ہے کیونکہ اگر انسان اس دنیا کی نعمتوں سے استفادہ نہیں کرے گا تو زندہ کیسے رہے گا؟وہ اپنی حیات کو باقی کیسے رکھ سکے گا،اسے اپنی حیات کو باقی رکھنے اور اس آخری حقیقی کمال یعنی خدائے ہستی تک پہنچنے کے لئے ضروری وسائل اور اس دنیا کی کھانے پینے اور پہننے کی چیزوں سے استفادہ کرنے کا حق حاصل ہے۔

خداوند عالم نے جو خواہشات انسان کے وجود میں ودیعت کی ہیں منجملہ ان کے جنسی خواہش بھی ہے او رانسان کو اس سے استفادہ کا حق ہے،چنانچہ بیوی یا شوہر کا انتخاب انسان کا قانونی حق ہے اس طرح آپ خود مشاہدہ کر سکتے ہیں کہ حقوق اور فرائض آپس میں ایک دوسرے سے منسلک اور جڑے ہوئے ہیں۔

گذشتہ بحثوں میں ہم بھی حقوق اور فرائض کے باہمی رابطے میں اشارہ کر چکے ہیں چونکہ ہم پر خداوند عالم کی طرف سے فریضہ ہے کہ ہم اس کی طرف بڑھیں اوراس کی اطاعت کریں، اس کے مقابلہ میں اس نے ہم کو کچھ حقوق دئے ہیں کہ ان حقوق سے استفادہ کرتے ہوئے ہم اس راہ پہ بڑھتے رہیں۔

اسی بنیاد پر، معاشرہ میں جو چیز بھی لوگوں کی عمومی زندگی میں، ان کے کمال و ارتقاء اور خدا تک پہونچنے میں رکاوٹ ہو، اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے کہ اس کو بر طرف کرے اور حکومت کا فریضہ ہے کہ وہ اسلامی معاشرہ کی راہ سے ان تمام رہزنوں کو دور

کردے جو خدا تک پہنچنے میں حائل ہورہے ہوں، اسی طرح اپنی شخصی اور انفرادی زندگی میں بھی ہرانسان کا فریضہ ہے کہ وہ کمال وارتقاء کی راہ طے کرنے کے وسائل و اسباب خود مہیا کرے او ران کوقوت واستحکام عطا کرتے ہوئے،او راس راہ میں جو رکاوٹیں ہیں ان کو دور کرے، اس بنا پر حقوق کے حصول کا معیار افراد کی صلاحیت اورترقی وکمال کے ظرفیت و لیاقت ہے جس کو سامنے رکھ کر ہی فرائض اور ذمہ داریاں معین کی جاتی ہیں اور ان ہی کی روشنی میں ان کو حقوق دیئے جاتے ہیں۔

فرائض ا ور حقوق کے متفاوت ہونے میں طبعی اور اکتسابی اختلافات کا موثرہونااب تک بیان کئے گئے مطالب کی روشنی میں کیاصرف اس بنیاد پر کہ ہم سب انسان ہیں اور اصل انسانیت میں ایک دوسرے کے شریک ہیں ہم سب کے حقوق وفرائض کا برابر ہونا بھی ضروری ہے ؟ صحیح ہے ہم تمام انسان اصل انسانیت میں شریک ہیں لیکن خود انسانوں کے وجود میں درونی طور پر بہت زیادہ اختلافات پائے جاتا ہے جن کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(الف) ۔جبری و طبعی تفاوت و اختلافات انسانوں کے درمیان اختلافات کا بڑا حصہ طبعی اختلافات کی طرف پلٹتا ہے مثال کے طورجنسی اختلافات، ''بایولوجک'' (زیست شناسی)مفہوم میں نہ کہ منطقی مفہوم کے اعتبار سے،جو مرد اور عورت کے درمیان پائے جاتے ہیں. ان دونوں کے مابین علم الابدان (فیزیولوجی) اور علم الحیات (بایولاجی)نیز نفسیاتی اور احساساتی مسائل میں گہرے اختلافات پائے جاتے ہیں.اور یہی اختلافات انسانوں کے مابین فرائض اور حقوق میں فرق کا سرچشمہ ہیں یعنی یہ صحیح ہے کہ عورت بھی انسان ہے اور مرد بھی انسان ہے اور دونوں ہی پہلے درجہ کے انسان ہیں،انسانیت میں دو سرادرجہ نہیں پایا جاتا لیکن عورت اپنے جسم کی مخصوص بناوٹ اوراس کے تحت اپنی نفسیاتی ساخت کی وجہ سے مخصوص فرائض کی حامل ہے۔

چنانچہ عورت جو کردار بچے کی پیدائش اور اس کو دودھ پلانے اور پالنے میں ادا کرتی ہے مرد کبھی بھی اس ذمہ داری کو ادا نہیں کرسکتا. اور اس بارے میں ان دونوں کے لئے مساوی کردار کا تصور نہیں کیا جاسکتا .کیونکہ یہ مسئلہ عورت اور مرد کے تخلیقی اور

وجودی اختلاف سے مربوط ہے اوران کے اسی جسمانی اختلاف کی بنیاد پر مخصوص فرائض ان کے ذمہ عائد کئے گئے ہیں. اب جب کہ عورت کواپنی نسوانی خصوصیات اور طبعی ساخت کی وجہ سے یہ فریضہ سونپا گیاہے کہ وہ بچے کی نو مہینے تک اپنے پیٹ میں پرورش کرے، اور اس کے بعد دوسال تک بچہ کو دودھ پلائے اور پالے پوسے تو اس کے مقابل اس کے لئے مخصوص حقوق بھی نظر میں رکھے گئے ہیں.

اب اگر یہ طے پا جائے کہ عورت اپنی جسمانی ساخت اورنسوانی خصوصیات کی وجہ سے بچہ پیدا کرے،اس کے بعد بچہ کو دودھ پلاکر بڑا کرے اور اسی کے ساتھ مردوں کی طرح کام بھی کرے اور خود ہی اپنی زندگی کے اخراجات بھی پورے کرے، تو وہ اپنے اصل فرائض ادا نہیں کر سکے گی اور اگر ادا کرے گی تو اس پر ظلم ہوگا پس بچہ پیدا کرنے اور بچہ کو دودھ پلانے جیسی سخت ذمہ داریوں کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو مخصوص حقوق دئے جائیں یعنی مرد کا فریضہ ہو کہ وہ عورت کے خرچ پورے کرے، اور روزی روٹی کی فراہمی کے فریضہ سے اس کو آزاد رکھا جائے ورنہ اگر یہ طے ہو کہ عورت خود کام کرے تو ممکن ہے بہت سے کام ایسے ہوں جو بچہ کے اسقاط کا سبب بن جائیںیا بہت سے کام ایسے ہوں جو بچہ کو وقت پر دودھ پلانے میں مانع ہوں جذبہ و احساسات کے نقطہ نظر سے بھی اگر عورت کو اقتصادی امن وسکون حاصل نہ ہو اور زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرنے کی فکر میں رہے تو یہ اضطراب و بے چینی بھی بچہ پر اثر انداز ہوسکتی ہے ۔

علمی اعتبار سے یہ ثابت ہوچکا ہے کہ عورت کو نفسیاتی لحاظ سے جتنا زیادہ آرام وسکون ہوگا اتنا ہی صحت وسلامتی کے ساتھ بچہ کی تربیت کر سکے گی. اسی وجہ سے اسلام میں عورت کے لئے خاص حقوق رکھے گئے ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ اقتصادی طور پر بیوی کا خرچ شوہر کے ذمہ ہے، یہاں تک کہ بیوی بچہ کو دودھ پلانے کے عوض اپنے شوہر سے اجرت لے سکتی ہے یعنی ان زحمتوں کے بدلے میں کہ جن کے لئے وہ اپنی جان جوکھم میں ڈالتی ہے، خاندان اور گھر میں اس کوخاص اہمیت حاصل ہونی چاہئے۔ معلوم ہوا کہ مرد وعورت کے حقوق اور فرائض کے بارے میںیہ تصور کہ دونوں انسان ہیں، لہذا ان کے حقوق اور ذمہ داریاں بھی

ایک ہی ہونا چاہئے یہ غلط ہے. یقیناً دونوں انسانیت میں شریک ہیں لیکن عورت اور مرد ہونے میں دونوں شریک نہیں ہیں مرد مرد ہے اور اپنی خاص خصوصیات کا حامل ہے اور عورت عورت ہے اوراپنی مخصوص خصوصیات کی حامل ہے یہی مخصوص خصوصیات فرائض میں اختلاف کی سر چشمہ ہیں اور ان کے مقابل حقوق میں اختلاف کا سبب بنتے ہیں ۔

بنا بریں، انسانوں کے درمیان کچھ اختلافات تو طبعی اور ان پر قانون جبر حاکم ہے. یعنی کوئی بھی عورت خود اپنے انتخاب سے عورت نہیں ہوتی اور اسی طرح کسی بھی مرد نے مرد ہونا خود سے منتخب نہیں کیا ہے یہ مسئلہ الٰہی فیصلے سے مربوط ہے ،خدا فرماتا ہے: (يَهَبُ لِمَن يَشَاءُ إِنَاثًا وَ يَهَبُ لِمَن يَشَاءُ الذُّكُورَ.[1]) ''(خدا) جسے چاہتاہے بیٹیاں دیتا ہے اور جسے چاہتاہے بیٹے عطا کرتاہے'' معلوم ہوا کہ خود افراد کا ارادہ اوراختیار اپنی اور اپنی اولاد کی جنس معین کرنے میں دخیل نہیں ہے یہ مسئلہ پوری طرح الٰہی فیصلے کے ساتھ وابستہ ہے. لیکن جب کسی کو ایک جنس میں قرار دیدیاگیا اور مرد یا عورت بنادیا گیا توجنس کے لحاظ سے مخصوص فرائض بھی اس پر عائد ہو جاتے ہیں جن کا انجام دینا نہ دینا اختیاری ہے اور اس کے کچھ حقوق بھی ہوں گے جن کو وہ وصول کرسکتا ہے لہٰذا اس طرح کے اختلافات جو حقوق اور فرائض میں بھی اختلافات کا باعث بنتے ہیں طبعی اختلافات کہے جاتے ہیں۔

(ب)انسانوں میں دوسرے طرح کے اختلافات اختیاری ہیں جو افراد زندگی بسر کرنے کی خاطر خاص حالات اختیار کرتے ہیں مثلاً فرض کرلیجئے جو شخص علم حاصل کرتا ہے اپنے اندر وہ صلاحیت پیدا کرلیتا ہے کہ معاشرہ میں ایک ایسا فریضہ انجام دے سکتا ہے جو کوئی جاہل شخص انجام نہیں دے سکتا. یا وہ افراد جو کسی فن میں مہارت حاصل کر لیتے ہیں ان کا صرف اس لحاظ سے کہ تمام انسانوں کے حقوق مساوی ہیں کسی طرح کی زحمت نہ اٹھانے والے افراد کے ساتھ یا جنھوں نے کسی فن میں کوئی مہارت حاصل نہیں کی ہے ان کے ساتھ مقابلہ نہیں کیا جاسکتا .

[1] سورہ شوری آیت۴۹۔

اگر کوئی پڑھ لکھ کر ہزار زحمتوں کے ساتھ پائلیٹ بن جائے تو اس کے مقابلے میں ایک بے پڑھا لکھا، نکما قسم کا شخص جو فنی مہارت نہ رکھتا ہو اگر یہ دعویٰ کرے کہ میں بھی پائلیٹ بنا چاہتا ہوں تو اس کی یہ بات کوئی قبول نہیں کرے گا بیشک تمام افراد اس سے یہی کہیں گے کہ اگر تم پائلیٹ بنا چاہتے ہو تو پہلے علم حاصل کرو.

اسی طرح اگر سیاسی مسائل سے نا واقف کوئی جاہل یہ کہے کہ میں بھی وزیر اعظم یا صدر جمہوریہ بننے کا حق رکھتا ہوں تو اس سے یہی کہیں گے کہ:وزیر اعظم بننے کی کچھ شرطیں ہیں اگر تم ان شرطوں کوپیدا کر لیتے اورتم میں سیاسی قیادت کی توانائی موجود ہے تو تم بھی کنڈیڈیٹ ہو سکتے تھے اور لوگوں کے انتخاب سے منتخب ہو سکتے تھے.یہاں وہ یہ نہیں کہہ سکتا تھا چونکہ انسانوں کے درمیان کوئی پہلا اور دوسرا درجہ نہیں پایا جاتا لہٰذا میں بھی وزیر اعظم ہونے کا حق رکھتا ہوں.

ایسا نہیں ہے کہ ہر انسان، خواہ وہ ملت کی راہ کے خلاف کیوں نہ چل رہا ہو،اور ملک کے آئین کو ہی قبول نہ کرتا ہو،یہ کہنے لگے کہ "؛ میں بھی چونکہ انسان ہوں صدر جمہوریہ بننے کا حق رکھتا ہوں؟ صرف اس وجہ سے کہ آپ انسان ہیں، ملک کا کوئی بھی عہدہ حاصل کر سکتے ہیںآپ کو یہ حق نہیں ہے کیونکہ ہر عہدے کے لئے کچھ نہ کچھ شرطیں ہیں.مثال کے طور پر اسلامی ملک میں صدر جمہوریہ کو مسلمان ہونا چاہئے، ایک غیر مسلم،ان تمام احترامات کے ساتھ کہ جس کے ہم قائل ہیں اور آئین میں بھی ہم اس کے حقوقائل ہیں،وہ صدر جمہوریہ نہیں ہو سکتا .

شہریت کے قوانین میں لوگوں کی درجہ بندی

دنیا کے تمام ممالک میں حساس عہدوں کے لئے مخصوص شرطیں رکھی گئی ہیں منجملہ ان امور کے جو خاص شرطوں کے حامل ہیں ایک قومیت وشہریت کا مسئلہ بھی ہے اور عالمی حقوق میں یہ بات بالکل واضح اور مسلم ہے کہ شہریت سب کی یکساں اور برابر نہیں ہوتی اور خصوصی بین الاقوامی حقوق سے مختصر آشنائی رکھنے والے انسان بھی اس بات کو جانتے ہیں.

فرض کیجئے اگر ایک ایرانی کسی یورپی یا امریکی ملک کی شہریت چاہتا ہے تو اولاً اس کی شہریت کے لئے کچھ شرطوں کا ہونا ضروری ہے پھر اگر اس کو شہریت بھی دیدی جائے تو اس کو صدر جمہوریہ بننے کی اجازت نہیں دی جائے گی. کیونکہ وہ دوسرے درجہ کا شہری ہے ممکن ہے سالہا سال تک طویل مدت آزمائشوں میں کامیاب ہوکر وہ دوسرے درجہ کی شہریت سے پہلے درجہ کی شہریت حاصل کرلے.مگر تمام حقوق مساوی ہوں امکان نہیں ہے۔

بہرحال،ہر وہ شخص جو کسی ملک کی شہریت حاصل کرتا ہے ایسا نہیں ہے کہ وہ تمام حقوق جو اس ملک کے اصل باشندے رکھتے ہیں اس شخص کو بھی دیدیئے جائیں.کیونکہ شہریت میں فرق ہے اور درجات رکھتی ہے ،اور اس بات کو بنیاد بنا کر کہ انسانیت کا پہلا اور دوسرا درجہ نہیں ہوتا یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ شہریت اور قومیت کے درجے نہیں ہوتے،. ہر ملک اپنے باشندوں کے لئے خاص شرطوں کا قائل ہے اسلام میں بھی خاص شرطیں پیش نظر رکھی گئیں ہیں پس صرف اس بنیاد پر کہ تمام انسان انسانیت میں شریک ہیں یہ مطلب نہیں نکال سکتے کہ ''شہریت'' میں بھی سب برابر ہیں.

لہٰذا ہر ملک کے عوام اس ملک کے باشندے شمار کئے جاتے ہیں پھر بھی وہ تمام عہدوں اور منصبوں کے لحاظ سے ایک جیسے نہیں ہیں، ان کے حقوق بھی الگ الگ ہیں . لیکن یہ سوال کہ کس معیار و میزان پر ان کے حقوق معین ہوتے ہیں؟ اس کے مختلف جواب دیئے جا سکتے ہیں،ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ یہ تمام باتیں اذن الٰہی کی طرف پلٹنا چاہئے جب کہ وہ لوگ جو لیبرل یا ڈیموکریٹک ممالک میں زندگی بسر کرتے ہیں اور الٰہی قوانین کو قبول نہیں کرتے کہتے ہیں کہ صرف عوام کی رائے کا تابع ہونا چاہئے. لیکن ہم کہتے ہیں کہ: لوگوں کے ووٹ کے علاوہ خدا کی اجازت بھی ہونی چاہئے، ایسا نہ ہو کہ ہمارے ووٹ، مطالبے اور حق خدا کے قانون اور اذن الٰہی کے خلاف ہوں.بہرحال کوئی بھی ملک تمام افراد کے لئے مساوی شہریت کا قائل نہیں ہے اور اس بنیاد پر انسانیت میں درجہ بندی نہیں ہے کوئی شہریت میں درجہ بندی کا مخالف نہیں ہے، ہمارے ملک کے آئین میں بھی اس مسئلہ کا ذکر موجود ہے،

اور ہمیں تعجب ہوتا ہے ان لوگوں پر جو آئین کی اس شق پر توجہ نہیں کرتے ،جس میں کہا گیا ہے '':جن لوگوں نے ایرانی نیشنلٹی حاصل کی ہے یا حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ تمام حقوق جو ایرانیوں کے لئے معین ہیں ان سے بہرہ مند ہو سکتا ہے سوائے صدر جمہوریہ کے منصب، وزرات وزرا کی کفالت، یا کسی بھی طرح کی خارجی سیاسی ذمہ داری وہ بھی ان سے بہرہ مند ہیں ''یعنی جو شخص بھی ایران کی شہریت قبول کرتا ہے اس کو کسی سیاسی اور سفارتی عہدہ یا سفیر بننے کا حق نہیں ہے اور نہ ہی وہ وزیر بن سکتا ہے اس نے اگر چہ ایرانی شہریت قبول کرلی ہے اور ایرانی حکومت نے بھی اس کا ایرانی شہری ہونا تسلیم کر لیا ہے پھر بھی اس کو اس طرح کے حقوق مانگنے کا کوئی حق نہیں ہے یہ ہمارے آئین میں لکھا ہوا ہے ۔

پہلے درجہ اور دوسرے درجہ کی شہریت اسلام کی نگاہ میں یہاں ہم شہریت ثابت ہونے کے بارے میں اسلامی نقطہ نظر کو تفصیلی طور پر بیان کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے، اس لئے کہ یہ بحث فلسفۂ حقوق سے تعلق رکھتی ہے اور ہماری بحث کا موضوع فلسفۂ سیاست ہے۔ لیکن مختصر طور پر یہ عرض کردیں کہ ممالک کی حد بندی کے لئے بنیادی طور پر اسلام کا حقوقی نقطۂ نظر اعتقادات کو اصل قرار دیتا ہے جغرافیائی حد بندی کی کوئی اصل و حقیقت نہیں ہے۔

اسلام کا سب سے پہلا منصوبہ یہ ہے کہ ایک عالمی اسلامی حکومت قائم ہو جو انشاء اللہ امام زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کے ظہور کے بعد قائم ہوگی جس میں جغرافیائی حد بندی اٹھالی جائے گی اور پوری امت اسلامیہ ایک ملک کی شہری اور ایک ہی حکومت کی رعایا ہوگی اور ان کی شہریت کا معیار اسلام ہوگا اس حکومت میں غیر مسلموں کے حقوق اور فرائض مسلمانوں سے مختلف ہونگے، غیر مسلمین نہ تو ایک مسلمان کے تمام فرائض کے حامل ہوں گے ،اور نہ ہی ان کو ایک مسلمان کے تمام حقوق حاصل ہوں گے یہ اسلام کا اولین منصوبہ ہے۔ لیکن مخصوص حالات میں ولی فقیہ اور اسلامی حکومت ثانوی منصوبہ کے عنوان سے جغرافیائی حد بندی کو معتبر سمجھ سکتی ہے اس بنا پر اگر ہم آج جغرافیائی حد بندیوں کو معتبر سمجھتے ہیں تو یہ اسلام کے منصوبہ اوّلیہ کی بنیاد پر نہیں ہے، بلکہ منصوبہ ثانوی کے تحت بعض مصلحتوں کی وجہ سے ہے جو علاقائی اور بین الاقوامی قوانین کے تابع ہے اور یہ قوانین ولی فقیہ کے اذن کے

ذریعہ ہمارے لئے قانونی حیثیت حاصل کرتے ہیں یا یہ تمام حد بندیاں دراصل ولی فقیہ کے ذریعہ معین اور تائید کی جاتی ہیں. معلوم ہوا اسلام کے اولین منصوبے اور آئیڈیل نظام میں شہریت کے شرائط میں سے ایک اسلام ہے اور مسلمانوں کی پہلے درجہ کی اور غیر مسلمین کی دوسرے درجہ شہریت شمار ہوتی ہے لیکن مخصوص حالات میں جغرافیائی حد بندی معتبر مانی گئی ہے اور قانون کی بنیاد پر شہریت کے لئے مخصوص شرطوں کو نظر میں رکھا گیا ہے جو ولایت فقیہ کے نظریہ کی بنیاد پر ہے جب ان شرائط اورقانونی بنیادوں پر ولی فقیہ دستخط فرمادیں تو تمام احکامِ اسلامی کی طرح ،وہ بھی واجب الاطاعت ہوں گے، جیساکہ حضرت امام خمینیؒ نے فرمایا ہے ''اسلامی حکومت کے قوانین کی اطاعت کرنا واجب ہے''

نظام ولایت فقیہ کا دوسرے نظاموں سے علمی فرق

جو افراد ہمیشہ جمہوریت اور عوامی حکومت کا دم بھرتے ہیں او راپنی حکومت کو ولایت فقیہ کی بنیاد پرقائم ہونے کو اپنے لئے عار سمجھتے ہیں اس ملک کے لئے ولایت فقیہ کی خدمات کی طرف ان کی توجہ نہیں ہے،وہ اس بات پر توجہ نہیں کرتے کہ ولایت فقیہ کے نظریہ کی بنیاد پر اسلامی حکومت کے احکام وضوابط اور اسلامی پارلیمنٹ میں منظور شدہ قوانین کی شورای نگہبان کے ذریعہ تائید کے بعد اطاعت کرنا شرعی طور پر واجب ہے، کیونکہ ان کو ولی فقیہ کی اجازت حاصل ہے،اور ان کی اجازت خدا کی اجازت کے تحت ہے، اس نظام کا ایک بڑا امتیازیہی ہے، لیکن اگر ہم ولایت فقیہ کو تسلیم نہ کریں توکم ازکم مروجہ وجوب کی بناپر قوانین و ضوابط کا اتباع ضروری ہے کیونکہ لوگ اپنی خواہش سے قانون کے حق میں ووٹ دے چکے ہیں،اور اپنے عہد کی وفاداری ان پر فرض ہے،اور اگر دل چاہے تو اس عہد سے پلٹ جائیں اور اپنی خواہش پر تجدید نظر کریں اور اپنی خواہش سے قانون میں تغیر وتبدیلی کریں، اس صورت میں جمہوری نظام حکومت میں لوگوں پر قوانین کی اطاعت کے لئے شرعی طور پر کوئی لزوم ووجوب نہیں ہوگا۔اسلامی حکومت میں ولی فقیہ کی اجازت اور دستخط سے قانون اعتبار پیدا کرتے ہیں اورووٹ کے ذریعے لوگوں کے عہد کی بنیاد پر اس کی پابندی وجوب عرفی کے علاوہ وجوب شرعی بھی رکھتی ہے اور اس کی مخالفت گناہ اور الٰہی سزا کا باعث بھی بنتی ہے۔

اسلامی حکومت کے قوانین کی پیروی میں اور ان قوانین کی اطاعت میں جو صرف لوگوں کے ووٹ کے پابند ہوتے ہیں کتنا فرق ہے چونکہ پارلیمنٹ کے نمائندوں کو لوگوں کی اکثریت نے ووٹ دے کر منتخب کیا ہے خود پر ان کا اتباع کرنا لازم قرار دیا ہے اب جن نمائندوں نے کسی کے حق میں ووٹ نہیں دیا ہے یا وہ اقلیت جنھوں نے اس پارلیمنٹ کے نمائندوں کو ووٹ نہیں دئے ہیں ان پر اس قانون کی کس حدتک پیروی لازم ہوگی، ایک سوال ہے ؟جو قانون لوگوں کی اکثریت کے ووٹ سے بنایا گیا ہو کیا نفسیاتی، جذباتی اور قلبی اعتبار سے اس قانون کے مخالف افراد پر بھی اس قانون کا اتباع لازم ہوگا؟ وہ کس طرح قلبی طور پر، لوگوں کی اکثریت کی خواہش کی پابندی خود پر لازم قرار دیں گے ؟

جو قوانین اسلامی حکومت میں پارلیمنٹ کے نمائندوں کے ذریعے منظور ہوتے ہیں، اور ولی فقیہ بھی ان کی تائید کر دیتا ہے اس کی پابندی خداوندعالم کی طرف سے واجب ہوتی ہے، حتی جن افراد نے ان قوانین کے حق میں ووٹ نہیں دیا ہے ان پر بھی شرعی طور پر ان کا اتباع لازم ہے، اوریقیناًتمام مسلمان عوام اس بات سے واقف ہے اور اسلامی حکومت کے قوانین جن کو الٰہی اجازت سے شرعی و قانونی حیثیت حاصل ہے تہہ دل سے تسلیم کرتے ہیں اور ان کی مخالفت نہیں کرتے .کیونکہ وہ الٰہی اسلامی حکومت کے ڈھانچے اور اصول وضوابط سے آشنا ہیں۔

اس سطح پر قوانین و ضوابط کو قبول کرنا اور اس کا اتباع کرنا الٰہی نظام کے خصوصیات میں سے ہے جو ہمارے ملک میں ''نظام ولایت فقیہ'' کے عنوان سے قائم ہے گزشتہ اسلامی تحریک اورانقلاب کی تاریخ کے مطالعہ سے ہمیں صاف پتہ چلتا ہے کہ اسلامی قیادت اور ولی فقیہ کی وسیع سطح پر عوامی اطاعت اور ان کے ارشادات اور راہنمائیوں کی طرف خالصانہ قدم اٹھانے ہی کیباعث ہم انقلاب میں کامیاب ہوئے ہیں ،اور انقلاب کی کامیابی کے بعد بھی یہی چیزاسلامی حکومت کی بقا کی ضامن ہے، اور فی الواقع نا برابر جنگ میں کامیابی اور سرفرازی کا رازبھی یہی ہے۔

دنیا میں کون سا ایسا شخص ہے جو یہ نہ جانتا ہو کہ انقلاب اسلامی ایران کی کامیابی میں ایک اہم چیز لوگوں کا اپنی مذہبی رہبری پر اعتقاد اور ان کی اطاعت کو واجب سمجھنا تھا، اس وقت یہ کہنا بہت ہی بے انصافی ہوگی کہ جس ملک میں شہیدوں نے اپنی جانفشانی اور قربانیوں سے امام خمینیؒ اوردیگر مراجع تقلید کے حکم سے جہاد کیا اور اس راہ میں شہید ہوگئے اور جس کی برکت سے اسلامی نظام وجود میں آیا اور یہ آزاد فضا جو شہیدوں کے خون اوران کی قربانیوں کا ہی نتیجہ ہے اس سے فائدہ اٹھاکر کچھ لوگ قلم اٹھائیں اور لکھ دیں کہ : امام خمینیؒ ایک موج پر سوار ہوگئے اورانھوں نے عوامی تحریک کو انقلاب اسلامی کا نام دیدیا،کیا اس دعوے کی کوئی حقیقت ہے؟ اگر ایران کا عوامی انقلاب کے موقع پر اپنے دینی اور شرعی وظیفہ کو انجام دینے کے لئے قیام نہ کرتے اور گولیوں کی بوچھار میں اپنے سینوں کو سپر نہ بناتے تو کیا انقلاب کامیاب ہوجاتا ؟اور اگر امام خمینیؒ کا حکم نہ ہوتا تو کیا وہ اس کام کو انجام دیتے؟ حقیقت کو بھلانا اور اس کا انکار کرنا بے انصافی ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ دین اور امام خمینیؒ کی رہبریت ہی نے انقلاب کے کامیاب ہونے،اس کے دوام پانے اس کے بعد جنگ میں کامیابی پانے اور تمام مشکلوں اور سختیوں میں لوگوں کے ثابت قدم رہنے کے سلسلہ میں بنیادی کردارادا کیا ہے، اور انشاء اللہ حضرت امام خمینی قدس سرّہ کے لائق وشائستہ جانشین (حضرت آیت اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای مدظلہ العالی) اور ان کی حکیمانہ تدبیروں کے زیر سایہ یہ کامیابی وموفقیت ایران کے فداکار لوگوں کی یکتائی اور ہمدلی کے ذریعہ اسی طرح باقی رہے گی،اور لوگ ولی فقیہ کے سایہ میں کمال اور ترقی کے مزید مراحل کو طے کریں گے۔

خلاصۂ کلام یہ ہواکہ شہریت کی درجہ بندی کرنا ایک ایسی چیز ہے جس کو پوری دنیا کی تمام حکومتوں میں تسلیم کیا گیا ہے البتہ اسلام کے نقطۂ نظر اور دوسروں کے نقطۂ نظر سے شہریت کے ملاک اور اس کی شرطوں میں فرق ہے، لیکن شہریت کے درجہ میں اختلاف ایسی چیز نہیں ہے کہ جس کو ہم نے ایجاد کیا ہو،اور شہریت کے درجہ میں یہ فرق انسانیت میں لوگوں کے مشترک ہونے سے کوئی ربط نہیں رکھتا ہے،تمام انسان انسانیت کے درجہ میں ایک ہیں، لیکن یا تو ان میں طبیعی طور پر وہ شرطیں موجود ہوتی ہیں جو وظائف اور حقوق

کے اختلاف کا سبب ہوتی ہیں یا وہ جو خصوصیات، طاقت اور قابلیت کو حاصل کرتے ہیں ان کی وجہ سے ان کو کچھ منصب دئے جاتے ہیں او ران کے عوض میں ان کو حقوق دئے جاتے ہیں، تو اب حقوق اور وظائف کے مابین فرق یا تو طبیعی ہے یا افراد کے انتخاب اور اختیار کی وجہ سے ہے، مثال کے طور پر اگر کوئی خاص دین کو تسلیم کرلے یا کسی فن میں مہارت حاصل کرکے کسی منصب کو حاصل کرلے، اور اس میں کوئی شک وشبہ ہی نہیں ہے کہ یہ اختلاف اور کسب شدہ خصوصیات اور منجملہ اصول مبانی کو تسلیم کرنا انسان کی شہریت میں مؤثر ہوسکتا ہے۔